

دلچسپ خط

گھر کے ہر فرد کے لئے

کراچی

پاکستان

ماہنامہ

جولائی 2013

نگران اعلیٰ سوا
معراج رسول

عشیرہ سید اور رفعت سرارج کے دلکش سلسلے بار ناول

www.ourstory.com

مکمل ناول ناولت افسانے مضامین اور بہت کچھ

مدیر اعلیٰ
عذر رسول
مدیر
انجم انصار
معاون
آمنہ محمد

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے مدیرہ 15

افسانے

میراج جانی انجم انصار 49
عبدالستار کی شادی نصرت جبین ملک 87

ناولٹ



56

کہیں کی کہیں دل قیصرہ حیات

منتظر بہار سکینہ فرخ 144



108

شاہ شہریار کی عزیزہ سید



18

امانت رفعت سراج

پبلشر پرو پرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیضان ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرینٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

منی ناول



182

گمشدہ جنت صائمہ اکرم

مکمل ناول



226

مشرقی جہنم کی اور خالدہ نسیم

99 غزالہ فرخ باری کا بخار
135 عقیلہ حق بیٹیاں بوجھ نہیں
175 فرح طاہر قریشی چنگاری میں دہی خواہش
221 نگہت اعظمی درو بیکران

خصوصی مضامین

267 نیلو فر عباسی میر کے ہر قدم کا سہارا
272 شائستہ زریں گلشن ہے سدا آباد تیرا
277 انجم انصار شادی مبارک

مستقل عنوانات

16 ادارہ دین کی باتیں
282 مدیرہ بہنوئی کی محفل
291 عظمی آفاق سعید پاکیزہ ڈائری
295 انجم انصار جلت رنگ
297 صفری زیدی میر اکثر گنگنائی ہو
299 پاکیزہ بھنیں سندھیہ
300 ادارہ ریحانی مشورے
302 ہومیوکلینک

شعبہ منبر اشتہارات محمد نواز خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
اشتہارات نمائندہ لاہور فراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528
ماڈل: عیسا میک اپ: روز بیوٹی پارلر..... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا
جلد 41 • شماره 04 • جولائی 2013 • 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 021 35895313 • فیکس: 021 35802551 E-mail: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



قارئین کرام! نیکیوں کا موسم بہار پوری ملت اسلامیہ پر چھا جانے والا ہے۔ اجر و ثواب کا موسم..... شروع ہونے کو ہے۔ آپ سب کو یہ مقدس ماہ مبارک ہو..... آئیے..... اس کا استقبال کریں۔ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ رمضان المبارک کا پہلا عشرہ رحمت، دوسرا عشرہ مغفرت اور آخری عشرہ دوزخ سے نجات کا ہے۔ اس ماہ مبارک کی ایک عظمت یہ بھی ہے کہ اس میں لیلۃ القدر ہوتی ہے، جس کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔ ”بے شک ہم نے نازل کیا قرآن کو لیلۃ القدر میں اور تم کیا جانو لیلۃ القدر کیا ہے..... لیلۃ القدر بہتر ہے ہزار مہینوں سے..... اس میں نازل ہوتے ہیں، ملائکہ، اس مبارک مہینے کی راتوں میں جاگنے کا بڑا ثواب ہے۔ سحری کھانے کا بڑا درجہ ہے۔ عموماً لوگ غفلت برتتے ہیں اور رات کو ہی سحری کھا کر سو جاتے ہیں تاکہ ان کی نیند خراب نہ ہو، حالانکہ لقمہ سحر کو دنیا کی نعمتوں سے افضل کہا گیا ہے۔

بہت سی روایتوں میں آتا ہے کہ افطار کے وقت دعا قبول ہوتی ہے مگر ہم عموماً اس وقت کھانے پر اس طرح گرتے ہیں کہ دعا مانگنے کی کہاں فرصت، افطار کی دعا پڑھنی بھی یاد نہیں رہتی۔ رمضان المبارک کی ایک عظمت یہ بھی ہے کہ اس ماہ مبارک میں عبادات کا اجر و ثواب کئی گنا زیادہ کر دیا جاتا ہے۔ سرکار دو عالم کا ارشاد ہے۔ ایک رمضان دوسرے رمضان تک کفارہ ہے گناہوں کا۔

یہ مقدس مہینہ اپنے جلو میں فیوض و برکات کا گراں بہا خزانہ لے کر آتا ہے اور پوری دنیا میں لٹا دیتا ہے، یہ بندے کے اپنے ظرف پر منحصر ہے کہ وہ فیوض و برکات کے اس خزانے سے کتنا حصہ حاصل کرتا ہے۔ اس لیے جائزہ لیجیے حقوق کی ادائیگی کا کہ اصل مفلس وہ ہے، جس کی نیکیاں روز قیامت حق دار لے جائیں۔

زندگی کا کیا بھروسہ، اگلے سال ماہ رمضان ملے یا نہ ملے..... تو کیوں ناں.....؟ اپنے ہاتھ پھیلا کر مالک برحق سے یہ کہیں۔ اے پاک پروردگار! ہم مسلمانوں کو صحیح معنوں میں رمضان المبارک کی مقدس نیکیوں کے موسم بہار سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرما..... اور ہماری عبادات، ملاقات، زکوٰۃ، خیرات اور ہر نیک عمل کو اپنی بارگاہ میں منظور اور مقبول فرما کر ہماری اور ہمارے مرحومین کی بخشش کا ذریعہ بنادے۔ (آمین ثم آمین)

مدیر

انجم انصار

اے اہل کتاب بے شک تمہارے پاس ہمارا پیغمبر آگیا جو تمہارے لیے کتاب (اللہ یعنی تورات و انجیل) کی وہ بہت سی باتیں ظاہر کرتا ہے جنہیں تم چھپاتے تھے اور (تمہاری) بہت (خطاؤں) سے درگزر کرتا ہے بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور ایک (حق) ظاہر کرنے والی کتاب آچلی (یعنی قرآن مجید) (۱۵) اس کے ذریعے سے اللہ اس شخص کو نجات کے راستوں پر لاتا ہے جو اس کی خوشنودی کا پیرو ہو اور ان کو (کفر کی روح فرسا) تاریکیوں سے (اسلام کی دلربا) روشنی کی طرف اپنے حکم سے نکال لاتا ہے اور انہیں راہ راست پر پہنچا دیتا ہے (۱۶) بے شک وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ مسیح بن مریم ہی ہیں (اے نبی ان سے) کہہ دو کہ اگر اللہ مریم کے بیٹے مسیح اور ان کی ماں اور (بلکہ) تمام ان لوگوں کو جو زمین میں ہیں ہلاک کرنا چاہے تو اللہ (کو اس کے ارادہ) سے (روکنے کا) کون کچھ اختیار رکھتا ہے اور اللہ (کے سامنے کسی کا اختیار کیسے چل سکتا ہے اس) ہی کا ہے آسمانوں اور زمین کا ملک اور جو کچھ آسمان و زمین کے درمیان میں ہے جو چاہتا ہے وہ پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے (۱۷) اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں (اے نبی ﷺ ان سے) پوچھو کہ پھر تمہیں تمہارے گناہوں کے سبب سے (اللہ) عذاب کیوں کرتا ہے (تمہارا یہ کہنا بالکل خلاف ہے) بلکہ تم (بھی) اس کی مخلوق میں سے ایک بشر ہو وہ جسے چاہتا ہے اسے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب کرتا ہے اور آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے اس کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جاتا ہے (۱۸) (سورہ مائدہ آیت نمبر ۱۸ تا ۱۸)



سیدنا احمد علیہ السلام

آنحضرت ﷺ کی احادیث مبارکہ

4- حضرت حسان بن ثابت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت سات آٹھ سال کے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں۔ اس وقت مجھے اتنا شعور تھا کہ بات کو سمجھ لیتا تھا۔ ایک دن ایک یہودی نے صبح کے وقت چیخا چلانا شروع کر دیا۔ کہنے لگا۔ ”اے یہودیوں! ادھر آؤ، میری بات سنو۔“ اس کی آواز پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ لوگ اس سے پوچھنے لگے۔ ”تجھے کیا ہو گیا ہے اور کیوں چیخ رہا ہے؟“ وہ کہنے لگا۔ ”اے گروہ یہود! احمد مجتبیٰ علیہ السلام کا ستارہ آج طلوع ہوا ہے، وہ آج کی شب پیدا ہوں گے۔“ (سیرت ابن ہشام)

۲- سب سے زیادہ اللہ کی تعریف کرنے والے

1- حضرت حذیفہ بن الیمان کا بیان ہے کہ میں نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے ایک حصے میں نماز پڑھتے دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یوں پڑھتے تھے اللہ اکبر (تین بار) ذوالملک والجبوت والکبریاء والعظمت پھر دعائے استسحاج پڑھتے تھے بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ فاتحہ کے بعد سورہ بقرہ پڑھ کر رکوع کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکوع طوالت میں مانند قیام کے تھا اور اس میں سبحان ربی العظیم پڑھتے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع سے سر اٹھایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قومہ مانند قیام کے تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں لربی الحمد پڑھتے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور سجدہ مانند قومہ کے تھا۔ سجدہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سبحان ربی الاعلیٰ پڑھتے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ سے سر اٹھایا۔ دو سجدوں کے درمیان مانند سجدہ کے بیٹھتے تھے اور رب اغفر لی، رب اغفر لی پڑھتے تھے اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکعتیں پڑھیں اور ان میں سورہ بقرہ، سورہ آل عمران، سورہ نساء و سورہ مائدہ یا سورہ انعام ختم کیں۔ (بخاری)

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس

لہو سے سینچے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سائیہ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نموِ یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

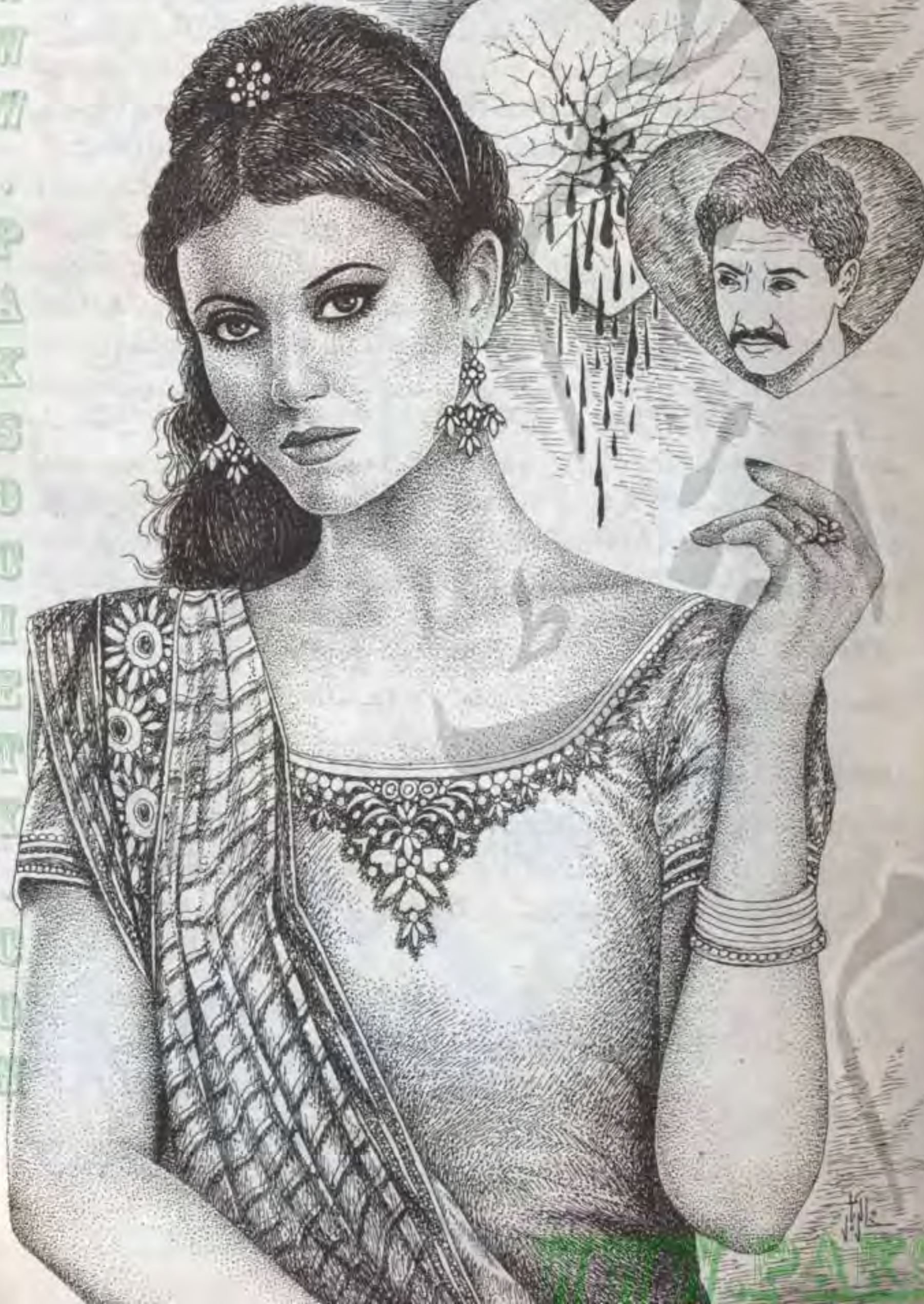
امانت

نعت سراج

تذکرہ

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے،
زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور..... چاند کی چاندنی
امانت..... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی
اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے
چہار سو اجالا کر دیتی ہیں۔

امانت و خیانت کو واضح کرتی ایک پردرد و مگر خوب صورت تحریر



”خان مجھے ڈر لگتا ہے۔ بی بی جان کہیں مجھے بھی بہت سارا پڑھا لکھا نہ بنا دیں.....“ اصیل خان نے مسکرا کر گل جان کی طرف دیکھا پھر اپنی بے قرار نگاہیں ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے مسکرانے لگا۔

”کیوں بھی تمہیں پڑھا لکھا ہونے سے کیوں ڈر لگتا ہے؟“

”بس بھی میرا اتنا دماغ کھپانے کو دل نہیں چاہتا۔ بی بی جان کہتی ہیں بارہ جماعت پڑھنا بھی کوئی پڑھنا ہے۔ اس سے تو اچھا ہے نہ ہی پڑھے۔ چٹا آن پڑھ ہی رہے۔“ گل جان نے برا سامنہ بنایا۔

اصیل خان قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”پڑھائی زور زبردستی سے نہیں ہوتی، گل جان بی بی۔ یہ تو اپنے، اپنے شوق اور دلچسپی کی بات ہوتی ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے تمہاری بی بی جان کی ڈاکٹری پڑھنا بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ اس نے تو مجھے انتظار کی سولی پر لٹکا دیا ہے۔“

گل جان نے ادھر ادھر دیکھا پھر شرارت آمیز انداز میں اصیل خان کی طرف جھک کر بولی۔

”خان بابا سے بات کریں۔ بابا سے کہیں مجھے بہت ضروری کام ہے۔ شادی کی جلدی ہے۔ باہر جانے کا بہانہ بنا دینا.....“

”بے وقوف اگر میں نے باہر جانے کا نام بھی لے لیا تو چاچا سائیں کہیں گے یہ تو بہت اچھا ہے.....“

مہر جان باہر پڑھائی کرے گی ویسے بھی وہ بولتے رہتے ہیں کہ میں اسے پڑھنے کے لیے باہر بھیجوں گا۔“ اصیل خان نے گل جان کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

اسی وقت مہر جان کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ جدید تراش خراش کے خوب صورت لباس کے ساتھ تراشیدہ بال جو شانوں سے ذرا اوپر تھے۔ پٹکے کی ہوا میں ہلکورے لے رہے تھے۔ مہر جان نے اندر آتے ہی بڑی غصے بھری نگاہ اصیل خان پر ڈالی اور اسے نظر انداز کر کے گل جان سے مخاطب ہوئی۔

”تمہارے پاس بہت ٹائم ہے فضول لوگوں سے فضول باتیں کرنے کا..... چلو جاؤ اپنا کام کرو۔“

اصیل خان کی پیاسی نظریں مہر جان کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ گل جان بڑی بہن کی جھاڑ کھا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور منہ بسورنے لگی۔

”بی بی جان گھر میں کوئی مہمان آتا ہے تو اس سے کوئی بات بھی کرنا پڑتی ہے۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے بات و ات کرنے کی اور کون سا مہمان.....؟ کس بن بلائے مہمان کی بات کر رہی ہو۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔ میں بھی لیٹ ہو رہی ہوں۔ بابا جان کو بتا دینا میں ڈی سی ہاؤس جا رہی ہوں۔“

گل جان نے اپنی شریر مسکراہٹ بڑی مشکل سے دباتے ہوئے چوری، چوری اصیل خان کی طرف دیکھا اور اپنا پراندہ لہراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

مہر جان نے بھی قدم بڑھائے اور اسی اثنا میں اصیل خان نے لپک کر مہر جان کا بازو پکڑ لیا۔ خوب صورت، صحت مند اور گرم جوش اصیل خان کی گرفت اس کے اندر کے جذبوں کی قوت کا مظہر تھی۔ مہر جان نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا مگر چھڑا نہ سکی۔ اس نے اصیل خان کی طرف بڑی غصے بھری نظر سے دیکھا۔ وہ خود دراز قامت تھی مگر اصیل خان اس سے بھی ایک ہاتھ اونچا تھا۔

”کیوں ناراض ہو؟ جب آتا ہوں ناراض ہی ملتی ہو۔ کبھی ہنس کے بھی بات کر لیا کرو۔“

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیو روج میں تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ وہ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں..... اصیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور مستند خاص تھا۔ مہر جان، رابی کی شادی مہراب خان سے طے کرتی ہیں جو عمر میں رابی سے کافی بڑا ہے۔ اس شادی پر رابی تیار نہیں ہوتی۔ کا ناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور رومانہ بیسٹ فرینڈ ہیں لیکن مہر جان کو رومانہ کی اتنی دوستی بھی پسند نہیں۔ سب انسپکٹر جابر علی نے آج تک بھی رشوت نہیں لی تھی۔ رزق حلال کی کمائی سے اپنے گھر کو چلایا اس کی بیوی صابرہ، بیٹا برہان اور بیٹیاں شبنم اور ستارہ اسی کمائی میں گزارہ کر رہے تھے لیکن کبھی کبھی ستارہ اپنے حالات سے تنگ آ جاتی ہے۔ شبنم اپنے والد جابر علی سے چھپ کر اپنی دوست فائزہ کے گھر جاتی ہے وہاں اس کی ملاقات فائزہ کے بھائی احمر سے ہوتی ہے۔ احمر کو وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ ایس پی شیر زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریک کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے۔ جابر علی، صابرہ سے رشتے کی بات کرتا ہے تو صابرہ اسے گھر بلانے کو اور بیٹے برہان سے مشورے کا کہتی ہے۔ برہان، وارث علی کو دیکھتا ہے تو صابرہ سے کہتا ہے کہ وہ جابر علی سے کہے کہ ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں۔ مہر جان کو کمرے میں بے ہوش دیکھ کر گل جان، اصیل خان کے ساتھ انہیں اسپتال لے کر جاتی ہے، جابر علی، برہان کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تو برہان گھر سے چلا جاتا ہے۔ رابی گھر چھوڑ کر مری چلی جاتی ہے۔ جابر علی ایس پی سے جھجکے کے بارے میں بات کرتا ہے تو ایس پی کہتا ہے کہ وہ اس بارے میں پریشان نہ ہو۔ گل جان کو کا ناز اور شاہ عالم سے بہت ڈھارس ہوتی ہے، مہر جان کو ڈاکٹر آپریشن بتاتے ہیں، برہان اپنے کلاس فیلو نعمان کے پاس چلا جاتا ہے اور اس کے سمجھانے پر صابرہ کو فون کرتا ہے۔ گل جان، شاہ عالم کی شکر گزار ہوتی ہے کہ انہوں نے رومانہ کا خیال رکھا۔ رابی مری میں..... چیزیں فروخت کرنے والی ایک عورت سے بہت متاثر ہوتی ہے کہ وہ اس بڑھاپے میں اپنا بوجھ خود اٹھائے ہوئے ہے۔ اس عورت کے پوچھنے پر رابی اسے بتاتی ہے کہ وہ ڈاک بنگلے میں رہتی ہے اور اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ صابرہ، جابر علی سے کہتی ہے کہ وہ برہان کو واپس لے آئے۔ مہر جان کا آپریشن ہو گیا لیکن انہیں ہوش نہیں آتا تو گل جان بہت پریشان ہوتی ہے لیکن نرس اسے تسلی دیتی ہے۔ رومانہ کا ناز اور شاہ عالم کے ساتھ اسپتال آ جاتی ہے۔ شبنم، جابر علی پر خط کے ذریعے شادی کے لیے اپنی آمدگی ظاہر کر دیتی ہے۔ واسطی صاحب فون پر اصیل خان کو بتاتے ہیں کہ وہ لڑکی تک پہنچ گئے ہیں اور اب کسی بھی وقت وہ پولیس کی حراست میں ہوگی۔ جابر علی کہتا ہے کہ اب شادی شبنم کی نہیں ستارہ کی ہوگی۔ برہان اخبار میں اشتہار دیکھ کر شاہ عالم کے پاس انٹرویو کے لیے جاتا ہے اور وہ اسے کا ناز کو پڑھانے کے لیے رکھ لیتے ہیں۔ رابی ہوٹل میں اپنے کمرے میں ہوتی ہے کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے وہ دروازہ کھولتی ہے تو سامنے پولیس کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔

اب آگے پڑھیں

گل جان اور اصیل خان لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ گل جان بڑی بے نیازی اور الہڑپن سے اپنے بالوں میں شیشے جڑا پراندہ باندھ رہی تھی اور اصیل خان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اصیل خان ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس کی بے قرار نگاہیں ادھر ادھر مہر جان کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ شاید گل جان نے اس کی تڑپ جان لی تھی تبھی چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔

”خان اب بی بی جان کو جلدی سے لے جاؤ.....“

اصیل خان، گل جان کی بات سن کر چونک پڑا۔ حیرت کے ساتھ ساتھ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی کھیل رہی تھی۔ اس نے بڑی دلچسپی سے گل جان کی طرف دیکھا۔

”کیوں بھی تمہیں کیوں اتنی جلدی ہے؟ جلدی تو مجھے ہونی چاہیے اور مجھے بالکل بھی جلدی نہیں ہے۔“

گل جان اس کی بات سن کر ہنس پڑی۔

شبینہ اپنے پرانے سوٹ میں کچھ جدت پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی وقت سلائی مشین کی موٹر کی آواز کے ساتھ ساتھ صابرہ کی آواز بھی سنائی دی۔

”کیا سی رہی ہو شبینہ؟ ایک گھنٹے سے لگی ہوئی ہو؟“

”امی، میرا یہ سوٹ رکھا ہوا تھا کب سے۔ آؤٹ آف فیشن تھا اس لیے میں تھوڑا سا اس کے دامن وغیرہ میں بارڈر لگا رہی ہوں۔ دیکھیں تو سہی بالکل نیا ہو گیا ہے۔“ اس نے موٹر سے اپنا ہاتھ ہٹایا تو کمرے میں ایک سکوت سا طاری ہو گیا۔ صابرہ قریب چلی آئی تھی۔ اس نے جھک کر شبینہ کی شرٹ اٹھائی اور اسے پھیلا کر دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں ستائش تھی۔

”ماشاء اللہ بہت ہنرمند ہے میری بیٹی۔ اللہ نصیب اچھا کرے۔“ اس نے بیٹی کو ممتا بھرے لہجے میں دعا دی۔

شبینہ ماں کی دعا پر کسی پھول کی طرح کھل اٹھی۔ دعا کا اثر ہی ایسا ہوتا ہے اور ماں کی دعا میں تو عجیب ہی جادو ہوتا ہے۔ وہ ایک سرشاری کی کیفیت میں صابرہ سے اپنی شرٹ لے کر ادھر اُدھر کام مکمل کرنے لگی۔ اس نے جیسے ہی کام شروع کیا صابرہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ڈرارکنے کے لیے کہا۔

شبینہ اپنا کام چھوڑ کر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ صابرہ عجیب شش و پنج میں نظر آئی۔

”کیا بات ہے امی! اب کیا پریشانی ہے۔ پھر کوئی نئی بات ہو گئی ہے کیا؟“

”ہاں بیٹا بس قسمت کی بات ہے روز ہی کوئی نئی بات ہو جاتی ہے۔“ صابرہ نے ادھر اُدھر دیکھا اور بڑی گہری سانس لے کر بڑے افسردہ انداز میں مسکرائی۔

”اب کیا ہو گیا؟“ شبینہ نے عجیب نڈھال سے لہجے میں پوچھا۔ جیسے خبر سے پہلے ہی کسی بری خبر کا یقین ہو۔

”ستارہ کہاں ہے اتنی دیر سے نظر نہیں آئی؟“ صابرہ نے ادھر اُدھر دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں پوچھنے لگی۔

شبینہ نے ماں کے انداز پر چونک کر دیکھا تھا کیونکہ صابرہ کے انداز سے لگتا تھا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ معمول سے ہٹ کر پھر کچھ ہوا ہے۔

”تھوڑی دیر پہلے میں کمرے میں گئی تھی تو وہ لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اب پتا نہیں کیا کر رہی ہوگی۔ کافی دیر سے خاموش ہے، ہو سکتا ہے سو گئی ہو۔“ شبینہ نے اپنی سماعتوں کو پوری چوکسی کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے خاصے یقین سے جواب دیا۔

”امی بتائیں ناں کیا ہوا ہے؟“ اس سے پیشتر کہ صابرہ کچھ بولتی شبینہ نے خود ہی پوچھ لیا۔ کیونکہ ایک زبردست قسم کا جھجکاؤ اس کے اندر بیدار ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل ہٹا پٹکیں جھپکائے ماں کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

”وہ مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے بیٹا اور میں چاہتی ہوں کہ جو بات تم سے کرنے جا رہی ہوں وہ ابھی ستارہ کو پتا نہ چلے۔“ صابرہ بہت ہی آہستہ آواز میں بات کر رہی تھی۔

”ایسی بھی کیا بات ہے امی، گھر میں کوئی بات ہوتی ہے تو وہ گھر والوں سے کتنی دیر چھپی رہ سکتی ہے۔“ شبینہ نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا۔

”ہاں، یہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ بات چھپی نہیں رہ سکتی اور یہ بات چھپنے والی ہے بھی نہیں..... لیکن میں

مہر جان نے جواب دینے کے بجائے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ اصیل خان نے اس کے بازو کو زور سے جھٹکا دیا اور مہر جان کو اپنی طرف موڑتے ہوئے شریر انداز میں گویا ہوا۔

”مہر جان سچی پوچھو تمہارا نام مجھے دل سے پسند ہے۔ جب میں تمہیں مہر جان کہتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں تمہیں میری جان کہتا ہوں۔ ہوناں میری جان؟“ وہ اس کا بازو پکڑے اس سے پوچھ رہا تھا۔

مہر جان نے پوری قوت کے ساتھ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔

”جانتے ہو یا بابا کو بلاؤں؟“ اس نے گویا دھمکی دی۔

”یہ تم مجھے بابا کی دھمکیاں نہ دیا کرو۔ یہ یاد رکھنا شادی کے بعد ان دھمکیوں کا حساب ایک ہی دفعہ میں لے لوں گا۔“

”اصیل خان تم حساب لے سکتے ہوناں تو میں خود تم سے حساب لینے والی ہوں۔ چھوڑو میرا بازو اور مجھ سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ فون کرتی ہوں تو اٹھاتے نہیں ہو۔ گھر آ جاتے ہو تو ایسے شو کرتے ہو جیسے فدا ہوئے جا رہے ہو مجھ پر.....“

”تو کیا شک ہے کہ فدا نہیں ہوں تم پر؟ ارے تم شہر میں آ کر دیکھو۔ دس میرے آگے ہوتی ہیں، بیس میرے پیچھے لیکن میں..... میں صرف مہر جان کا ہوں.....“ اصیل خان زبردست مسکرایا۔ اب اس نے مہر جان کو دونوں کندھوں سے تھام لیا اور اس کے چہرے کو بہت غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”کسی اور کو بے وقوف بناؤ جا کر..... آ جاتے ہیں دو مہینے بعد فدا ہونے کے لیے۔“ اس نے اصیل خان کو دونوں ہاتھوں سے پیچھے دھکیلا اور پاؤں پٹختی، بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

”یار بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ایک تو اس کا غصہ جلدی نہیں اترتا۔ کچھ کرنا پڑے گا۔“ اصیل خان نے اس کے جاتے ہی ایک گہری سانس لی اور شریر انداز میں مسکراتے ہوئے اپنے آپ سے مخاطب ہوا۔

اصیل خان نہ جانے کب تک ماضی کے حسین منظر میں گم رہتا کہ اچانک گل جان کی آواز نے ماحول کا سارا جادو ہوا میں اُڑا دیا۔

”اصیل خان..... اصیل خان۔“ گل جان اسے دور سے پکارتی آرہی تھی۔ اصیل خان ہڑبڑا کر فرش سے اٹھا اور اس طرف دیکھنے لگا جہاں سے آواز آرہی تھی۔ گل جان بڑی تیزی سے اس کی طرف آرہی تھی۔

”کیا کر رہے ہو اصیل خان، میں تمہیں کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔ بڑی اچھی خبر ہے۔ بی بی جان کو ہوش آ گیا ہے لیکن ڈاکٹر نے ابھی اُن کے پاس جانے اور بات کرنے سے منع کیا ہے۔ میرا خیال ہے میرے اسپتال جانے کا ابھی کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے سوپ بنایا ہے۔ وہ اسپتال لے جاؤ۔ اگر ڈاکٹر اجازت دیں تو نرس کو دے دینا۔“

”جی ٹھیک ہے چلا جاتا ہوں۔“

”ہاں مگر دیکھ لو ڈاکٹر ایور ہے بھی یا کہیں باہر نکلا ہوا ہے۔ ایک تو اس کم بخت کو ہر وقت گھر سے باہر جانے کی پڑی رہتی ہے۔ عین کام کے وقت اسے ڈھونڈنا پڑتا ہے۔“ گل جان کچن کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

اصیل خان نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر سر جھکا کر کسی خیال میں کھو گیا۔

☆☆☆

”میں تو یہ کہہ رہی ہوں بیٹا کہ ستارہ کو کسی طرح سمجھاؤ کہ اپنے باپ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لے۔ ایک دفعہ رو کر پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لے گی تو بہت بچت ہو جائے گی۔ باپ ہیں۔ کیا خبر بیٹی کے آنسو اور معافی ان کا دل موم کر دے اور کوئی مجزہ ہو جائے۔ اب تو اس کی جان بچانے کا ایک یہی راستہ ہے۔“

”جی امی راستہ تو یہی ہے مگر آپ کو پتا ہے ناں اس کی طبیعت، جب وہ اپنے آپ کو ٹھیک کہتی ہے تو پھر دوسری بات نہیں کرتی۔ بالکل ایسا جان پرگنی ہے۔ اڑ جاتی ہے اور اسی وجہ سے تو آج اس پر برا وقت آیا ہے۔“

”پھر بھی بیٹا، میں کہتی اچھی نہیں لگتی۔ تم بڑی بہن ہو۔ تھوڑا سا بہلا پھسلا کر تھوڑا سے چکار کر اسے سمجھانے کی کوشش تو کرو۔ زندگی بھر کسی دوزخ میں جلنے سے بہتر نہیں ہے کہ دو منٹ باپ کے سامنے اس کے قدموں پر سر رکھ کر آنسو بہا لے۔ ہو سکتا ہے دلیل ہار جائے بیٹی کے آنسو جیت جائیں۔“ صابرہ بڑے شکستہ لہجے میں کہہ رہی تھی اور آنے والے وقت کا سوچ کر شبینہ کے اعصاب شل ہو رہے تھے۔ بڑی بے بسی کی کیفیت میں وہ ماں کی طرف بس دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

”دادا جان آپ نے ٹھیک سے انٹرویو تو کر لیا تھا ناں..... کوئی ایسے ہی تو اونگے بونگے سے ٹیوٹر نہیں رکھ لیے۔ آپ تو کہہ رہے ہیں وہ کوئی مرد بیچر ہے۔“ کاناز تو مشکل سے مطمئن ہو رہی تھی۔

”ہاں بیٹا لڑکا ہوا ہے۔ وہ بھی انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ ہے اور تمہاری لائن بھی انجینئرنگ کی ہے۔“

”اومامی گاؤ! ابھی تو وہ خود اسٹوڈنٹ ہیں مجھے کیا پڑھا میں گے.....؟“ کاناز نے آنکھیں پھاڑ کر شاہ عالم کی طرف دیکھا اور دھپ سے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

شاہ عالم بے ساختہ مسکرا دیے۔

”بیٹا بعض اوقات پروفیشنل ٹیوٹر سے یہ لڑکے اچھی ٹیوشن دے سکتے ہیں کیونکہ یہ ضرورت مند ہوتے ہیں تو وقت نکالتے ہیں۔“

”لیکن جیب ان کا مجھ پر رعب ہی نہیں ہوگا تو خاک پڑھوں گی۔ دیکھیے ناں لڑکے کا بھی کوئی رعب ہوگا؟ میں تو سوچ رہی تھی کوئی موٹے موٹے گلاسز لگائے ہوئے آپ کی عمر کا بندہ آئے گا اور بڑے رعب سے کہے گا۔“ چلو بی بی پڑھنا شروع کرو“ اور میں ڈر کے مارے پڑھنا شروع کر دوں گی۔“

”بیٹا! جو شخص بھی آپ سے سینئر ہوتا ہے۔ آپ سے زیادہ علم رکھتا ہے اس کا تو ویسے ہی رعب ہوتا ہے جو بھی اپنے سے زیادہ قابل ہو اس کی عزت کرنی چاہیے۔ یہ رعب و عجب کچھ نہیں ہوتا اصل چیز تو وہ عزت ہے جو ہم دوسرے کو دیتے ہیں یا دوسروں سے لیتے ہیں۔“ شاہ عالم بہت پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھانے لگے۔

”چلیں خیر، یہ تو ٹھیک ہو گیا۔ میرا ایک مسئلہ تو حل ہو گیا۔ تھوڑا سا ریلیکس فیل کر رہی ہوں لیکن دادا جان کچھ بھی ہواب میں خوش نہیں ہو سکتی۔“ کاناز نے بڑی اداسی سے منہ لٹکا کر کہا تو شاہ صاحب فکر مند سے ہو گئے۔

”یا اللہ خیر! کیوں بیٹا، خدا نخواستہ کیا ہو گیا؟ جو آپ خوش نہیں ہو سکتیں۔ خوش ہونے پر کوئی پابندی لگی ہے؟“

”دادا جان آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ میری اتنی پیاری دوست پریشان ہے۔ مجھے تو اس کی فکر زیادہ

چاہتی ہوں جتنی دیر تک اس سے چھپائی جاسکے چھپائی جائے۔“

”امی بتائیں ناں آخر ہوا کیا ہے؟ ایسی کیا بات ہے جو آپ اتنی احتیاط سے بات کر رہی ہیں بلکہ ستارہ سے ڈر رہی ہیں؟“

صابرہ نے اپنا ہاتھ پیشانی پر زور سے مارا۔

”بیٹا! اس کی زبان سے ڈرتی ہوں۔ اس سے کیوں ڈرنے لگی۔ وہ ہے ناں مردہ بولے کفن پھاڑ کر بولے۔ دیکھو بیٹا میں تم سے صرف اپنے دل کی بات کر رہی ہوں..... کیونکہ میرے دل پر بوجھ ہے..... لے دے کے اب تم ہی تو ہو جس سے میں اپنے دل کی بات کر سکتی ہوں۔“

”بولیں امی جان!“ شبینہ بولی تو تھی لیکن اس کی آواز سے لگتا تھا جیسے اس کا دل ڈوبا جا رہا ہو۔ انجانے وسوسے اور اندیشے اسے ستانے لگے تھے۔

”بات یہ ہے بیٹا کہ گھر میں تمہاری شادی کی بات ہو رہی تھی لیکن اب تمہاری شادی نہیں ہو رہی.....“

شبینہ نے حیرت سے ماں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو امی اتنی افسردہ اور دکھی کیوں ہیں۔ امی تو اس شادی کی سب سے بڑی مخالف تھیں۔ انہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ اس نے سوچا ضرور مگر بولی کچھ نہیں اور ماں کے مزید کچھ کہنے کا انتظار کرنے لگی۔

”بیٹا! تمہارے ابا جان نے فیصلہ کیا ہے کہ تم سے پہلے ستارہ کی شادی ہوگی۔“ صابرہ نے بالآخر کہہ دیا۔

صابرہ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ جیسے بارود کے گولوں کی طرح شبینہ کے دائیں بائیں بھٹے تھے۔ اس نے بے یقینی کی کیفیت میں ماں کی طرف دیکھا۔ سمجھ ہی نہیں آئی کہ جواب میں کیا کہے۔ کیا رد عمل ظاہر کرے۔ ابا جان نے اگر فیصلہ کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر پر لکیر کھینچ گئی ہے جو کہہ دیا ہے وہ تو اب ہوگا۔

ابا جان کے منہ سے نکلا ہوا لفظ دو ہی طریقوں سے ٹل سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جس کے لیے فیصلہ سنایا گیا ہے وہ دنیا سے رخصت ہو جائے یا پھر کل کی آتی قیامت ابھی آجائے۔ وہ ماں کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ یوں جیسے قوت گویائی سے محروم ہو گئی ہو یا الفاظ اس کی گرفت میں آ کر نہ دے دے رہے ہوں۔

”بس یہی بات بتانے تمہیں آئی تھی بیٹا اور وہ ہے ناں کہ بلی کے گلے میں گھٹی کون باندھے؟ کیسے اسے بتائیں کہ تمہارا یہ بے دھڑک بولنا کیسے عذاب لے کر آیا ہے۔ بتاؤ کہاں وارث علی کہاں ستارہ..... کوئی جوڑ ہے۔ اس لڑکی نے اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے گڑھا کھودا ہے۔ کیا کروں میں، کچھ سمجھ نہیں آرہی مجھے۔“ صابرہ نے عجیب بے بسی کی کیفیت میں کہتے ہوئے شبینہ کی طرف دیکھا تھا جس نے فوراً ہی ماں سے نظریں چرائی تھیں کیونکہ جو حال ماں کا تھا وہی اس کا تھا۔

”اب کیا ہوگا امی جان! کون بات کرے گا ستارہ سے..... اور کیا وہ مان جائے گی۔ اگر نہیں مانے گی تو پھر کیا ہوگا.....؟“

”تو پھر کیا ہوگا بیٹا! کچھ بھی کرے آخر کار اسے باپ کے فیصلے کے سامنے سر تو جھکانا ہے ناں۔ وہ جتنا بولے گی ان کا غصہ بڑھے گا۔ اگر انہوں نے ایک ہفتے بعد کی شادی کی تاریخ دی ہے تو ہو سکتا ہے اس کی زبان کی وجہ سے اس کا نکاح کل ہی پڑھو ادیں۔“

شبینہ نے بے اختیاری کی کیفیت میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا تھا جیسے اپنے پھرکتے ہوئے دل کو سنبھال رہی ہو۔

شبینہ بیڈ پر سر جھکائے بہت خاموش، خاموش بیٹھی تھی۔ ستارہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ شاید وہ اتنی جلدی شادی ہونے اور گھر چھوڑ کے جانے کے خیال سے اداس ہو رہی ہے۔ وہ بہن کے برابر آ کر بیٹھ گئی اور بازو پھیلا کر اسے کندھے سے تھام لیا اور بڑے پیار سے اس کے سر سے اپنا سر ٹکا کر بولی۔

”تم نے تو بڑے دل و جان سے ابا جان کا فیصلہ مان لیا۔ اب کیوں اداس نظر آ رہی ہو؟“

شبینہ نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔

”اب تم چلی جاؤ گی ناں تو میرا کام ڈبل ہو جائے گا..... لیکن شکر ہے تمہاری جان تو چھوٹے گی یہ ہر وقت کی چیخ پکار..... تو بہ کام سے پہلے ہی بندہ تھک جاتا ہے۔“

”اچھا بس اب چپ ہو جاؤ، بولے چلی جاتی ہو۔“ شبینہ نے چڑ کر اسے ٹوک دیا۔ ستارہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”بھئی زبردستی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے خود پر ظلم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فرمانبردار تا بعد از بیٹیوں کو شوقیٹ نہیں ملتے۔ زندگی بھر کا معاملہ ہے اب بھی سوچ لو۔“ ستارہ اپنے اسی..... بے ساختہ انداز میں گویا ہوئی۔

”خدا کے لیے ستارہ خاموش ہو جاؤ۔“ شبینہ نے..... دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ یوں جیسے کہ اسے چکر آ رہے ہوں۔

”سب مجھے ہی بس خاموش کراتے رہتے ہیں۔ میں بھی خاموش ہو گئی تو یہ گھر قبرستان لگے گا شہر خموشاں۔ ایک میں ہی تو بولتی ہوں۔“ ستارہ نے یہ کہا اور ایک جھٹکے سے انھی، پاؤں پچھتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

شبینہ کے چہرے سے لگتا تھا جیسے اس کے اعصاب شل ہو رہے ہوں۔ بے بسی کی انتہا پر چند آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکے اور گالوں سے پھسلتے ہوئے گریبان میں جذب ہو گئے۔ وہ ایک آنے والی قیامت کے خوف سے لرزاں تھی۔

☆☆☆

گل جان، بی بی جان کے کمرے کی صفائی کروا رہی تھی۔ اس نے مہر جان کی پسندیدہ بیڈ شیٹ بیڈ پر بچھائی اور غور سے دیکھنے لگی۔ سرخ بڑے بڑے گلاب سفید زمین پر بکھرے ہوئے بہت حسین دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سرخ گلاب کے پھولوں کو بہت غور سے دیکھنے لگی اور جیسے ماضی کا ایک بند درپچہ کھل گیا تھا۔

☆☆☆

مہر جان لان سے بہت سارے گلاب توڑ کر اندر آ رہی تھی اور اسیل خان بڑی تیزی سے باہر کی طرف جارہا تھا۔ وہ گلاب کے پھولوں میں اتنی محو تھی کہ اپنی دھن میں اسیل خان سے ٹکرائی۔ اسیل خان کو تو جیسے اس سے قریب ہونے کا بہانہ چاہیے تھا۔ اس نے مہر جان کو دونوں کندھوں سے تھام لیا۔

”ڈارلنگ دیکھ کے چلو، ضروری نہیں ہر دفعہ اسیل خان سے ٹکر ہو جائے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے اس..... بے چارے کا دل نیچے پڑا ہو اور تمہارے قدموں تلے آ کر پکلا جائے۔“ وہ بہت مخمور و مدہوش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”یہ تم نے ڈارلنگ کسے کہا؟“ مہر جان اس کی طرف دیکھ کر دانت پیس کے بولی۔

ہے۔ اگر وہ فیل ہو گئی تو وہ جوئیئر ہو جائے گی میں سینئر..... اور پھر ہمارا ملنا جلنا بھی بہت کم ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے نقصان پر مجھے دکھ تو ہو گا ناں..... آپ خود بتائیں۔“ کا ناز بڑی محسوسیت سے دادا سے پوچھنے لگی۔

شاہ صاحب نے ایک گہری سانس لی اور جیسے خود کو سنبھالا انہیں بھی بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ انہیں احساس تھا کہ ڈاکٹر مہر جان کے گھر پر کیسی قیامت برپا ہے۔ ظاہر ہے رومانا اثر ہے تو کا ناز پر تو اثر ہونا ہی ہے۔ وہ ایسے الفاظ تلاش کرنے لگے جو اتنے مناسب تو ہوں کہ کا ناز بہل جائے۔

”بتائیں ناں دادا جان، ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟“ کا ناز نے انہیں خاموش پا کر پھر پوچھا۔ شاہ صاحب کے ہونٹوں پر ایک پھکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”بیٹا! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن جس دوست کی فکر آپ کو تنگ کر رہی ہے۔ اس دوست کو ایک بہت مضبوط دوست کی اس وقت ضرورت ہے جو اس کا حوصلہ بڑھائے، اسے گرنے نہ دے اور اس کے اندر اتنی توانائی بھر دے کہ وہ اتنے سخت حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ میں تو بہت دل سے دعا کر رہا ہوں بیٹا اس کے لیے مجھے بھی ان کے دکھ پر بہت دکھ ہے۔“

”اللہ تعالیٰ آپ ہی کی دعا سن لے دادا جان، مجھے تو یوں لگتا ہے کہ اگر رومانا خوش نہیں ہوئی تو میری ساری زندگی اداس ہو جائے گی۔“

”خدا نہ کرے۔“ شاہ صاحب نے تڑپ کر بے ساختہ کہا تھا اور کا ناز کو ہاتھ بڑھا کر اپنے قریب لے آئے۔

”بری بات ہے بیٹا ایسی مایوسی کی باتیں اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ آپ رومانا کا حوصلہ بڑھائیں بلکہ میں تو کہہ رہا ہوں کہ آپ رومانا کو بھی ٹیوشن کے لیے بلا لیں آپ دونوں ساتھ پڑھیں گی تو دونوں کا فائدہ ہو گا۔ وہ ہوتا ہے ناں کمبائن اسٹڈی کا بھی بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ آپ بھول گئیں تو وہ یاد دلائے گی۔ وہ کچھ بھول جائے گی تو آپ اس کی ہیلپ کر دینا۔“ یہ بات سن کر کا ناز کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے دادا جان۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ اس طرح رومانا بڑی ہو جائے گی۔ میں ابھی رومانا سے بات کرتی ہوں۔“ کا ناز ایک دم پرجوش ہو کر اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور اس نے یوں چٹکی بجائی تھی جیسے اس کا کوئی بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہو۔

شاہ صاحب دیکھ رہے تھے کہ وہ رومانا سے بات کرنے کے لیے فون کی طرف بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

ستارہ، شبینہ کی شرٹ ہاتھ میں پکڑے بڑی تنقیدی نگاہ سے دیکھ رہی تھی پھر اس نے شرٹ کا گولا سا بنایا اور بیڈ کی طرف اچھال دیا۔

”پرانے کپڑے سی سی کر پہننے کی کیا ضرورت ہے؟ اب تو تمہاری ایک امیر آدمی سے شادی ہو رہی ہے۔ کتنے اچھے، اچھے منگے کپڑے آئیں گے اور پھر وہ تمہیں شادی کے بعد شاپنگ کے لیے بھی تولے کر جائے گا ناں، اپنی پسند کے کپڑے خریدو گی جو مرضی خرید لینا۔ سنا ہے نئی نئی شادی ہوتی ہے تو دولہا بڑی اچھی شاپنگ کراتا ہے۔ وہ تو جب شادی پرانی ہو جاتی ہے۔ تب آٹے دال کے بھاؤ کی باتیں چلتی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے ستارہ بڑی شوخی سے مسکرا رہی تھی۔

”اپنی ڈارلنگ کو اور کسے..... کسی اور کی ڈارلنگ کو تو اپنی ڈارلنگ نہیں کہا جاسکتا ناں.....! جوتے کھانے کا شوق نہیں ہے مجھے۔“ وہ شوخی سے کہہ رہا تھا۔

”بات سنو..... میرے ساتھ اس طرح کے بیہودہ مذاق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مجھے یہ چپ باتیں بالکل پسند نہیں سمجھتے تم؟“ مہر جان نے سارے گلاب کے پھول کارپٹ پر پھینک دیے اور دونوں ہاتھوں سے اصیل خان کا ہاتھ دبوج لیا اور اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے بولی۔

”کیوں تم میری ہونے والی بیوی نہیں ہو؟ مجھے صرف مذاق ہی کرنا ہوگا تو میں کہیں اور کسی محلے کی لڑکی کو چھیڑوں گا۔“

”پتا نہیں کتنوں کو چھیڑتے ہو گے۔ یہاں پر بڑے آجاتے ہیں پارسا بن کر۔“

”ابھی تک ناراض ہو؟ مہر جان اتنا غصہ نہیں کرتے۔ میں سچ بتا رہا ہوں یا ر میں بہت برا پھنسا ہوا تھا۔ دیکھو معاف کر دو۔ جب تک تمہارا موڈ ٹھیک نہیں ہوگا، مجھے ٹھیک سے نیند آئے گی نہ بھوک لگے گی۔ ایک ہفتے میں ہی لمبا بیمار پڑ جاؤں گا۔ پھر خود ہی کو بیٹھ کر تیمارداری کرنا پڑے گی..... چلو خیر کسی بہانے ہی سہی میرے پاس کئی دن بیٹھی تو رہو گی۔“

”میں تمہاری ان چکنی چڑی باتوں میں آنے والی نہیں اصیل خان..... پتا نہیں کیوں تم جو کچھ کہتے ہو مجھے یقین نہیں آتا۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی۔ اصیل خان نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا تھا اور اس کے گال کو انگلی سے چھو کر کہا تھا۔

”بہت مزہ آتا ہے مہر جان تمہیں..... تڑپتا ہوا بہت اچھا لگتا ہوں کیا میں..... ویسے ہی کہہ دو۔“

مہر جان نے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا تھا۔

”تم ہمیشہ خاص مواقع پر غائب ہوتے ہو اصیل خان۔ جب مجھے تمہارے فون کا انتظار ہوتا ہے۔ تبھی تمہارا فون نہیں آتا۔ جب کراچی چلے جاتے ہو تو تمہارا کوئی پتا نہیں چلتا کہ تم کہاں ہو، کیا کر رہے ہو۔ ہفتہ دس دن میں فون آتا ہے۔ وہ بھی ایسا فارل سا..... جیسے پتا نہیں پورا پاکستان تم ہی چلا رہے ہو۔“

”یار یقین کرو، میں بہت بڑی ہوتا ہوں۔ نیا نیا سیٹ اپ ہے۔ دن رات کام کرنا پڑتا ہے لیکن سارا الزام مجھ پر نہیں ہے۔ میں تو جب یہاں فون کرتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ تم ویک اینڈ پر بھی گھر نہیں آئیں۔ ہاسٹل میں مزے کر رہی ہو۔“

”میں وہاں مزے نہیں کرتی، پڑھتی ہوں سمجھ۔“ مہر جان نے اسے غصے سے گھورا اور ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر آگے بڑھ گئی۔ وہ لاؤنج سے باہر نکلی تبھی گل جان اندر آ گئی۔ اس نے اصیل خان کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھا تو شرارت سے کھنکھارتے ہوئے بولی۔

”کیا ہوا ہے، آج پھر مذاکرات ناکام ہو گئے؟“

”تم بہت مذاق اڑاتی ہو۔ ایک دن تم سے بھی رگن رگن کر بد لے لوں گا۔ تم میری وکیل صفائی نہیں بن سکتیں کیا؟“

”جی نہیں، مجھے سرکاری وکیل بننے کا کوئی شوق نہیں اور سرکاری وکیل کو تو پھر بھی کچھ فیس مل جاتی ہے، مجھے مفتے کا وکیل بننے کا کوئی شوق نہیں۔“

”بولو کیا فیس ہے تمہاری؟ یہی دو چار شیشے اور گھنگرو والے پراندے اور دس پندرہ کلو آئس

کریم.....“ اصیل خان دھپ سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا اور اس نے قریب کھڑی گل جان کی چوٹی کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا تھا۔

”ہاں جیسے بڑی آکس کریم کھلاتے ہو۔“ گل جان نے یہ سن کر اصیل خان کے بال بکھرا دیے تھے اور بناوٹی غصے سے بولی تھی۔

”لارہا تھا کراچی سے باہر ہی پھینکنی پڑی ساری پکھل گئی تھی۔“ وہ شوخی سے کہہ رہا تھا۔

”ارے، یہ اتنے سارے گلاب کے پھول یہاں کس نے پھینک دیے؟“ گل جان ہنسی ہوئی اس کے برابر میں ہی بیٹھ گئی اور بیٹھتے ہی اس کی نظر کارپٹ پر پڑے ہوئے پھولوں پر پڑی۔

”اسی ظالم نے جسے کسی کے پھول جیسے دل کا کوئی خیال نہیں۔“ اصیل خان نے ٹھنڈی آہ بھر کر جواب دیا تھا۔

گل جان ہنس ہنس کر لوٹ رہی تھی۔

☆☆☆

ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ گل جان ایک دم اپنے خیالات سے باہر آ گئی۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور خود کلامی کی کیفیت میں بولتی تیزی سے باہر کی طرف بڑھی۔

”اوہ میرے خدایا! شاید اسپتال سے ہی فون ہوگا۔ اللہ کرے اچھی خبر ہو۔“ وہ لاؤنج میں آئی تھی پھر اس نے دیکھا اصیل خان اس سے پہلے لاؤنج میں آ کر فون اٹھا چکا تھا۔ وہ جہاں تک آئی تھی وہیں رک گئی اور رک کر اصیل خان کی طرف دیکھنے لگی۔ جو ٹیلی فون پر بات کرنے میں مصروف تھا۔

”جی، جی واسطی صاحب میں ڈاکٹر صاحبہ کے گھر سے ہی بات کر رہا ہوں۔ میں نے آپ کو پہچان لیا۔ آپ سے پہلے بھی بات ہوئی تھی۔“ اتنا کہہ کر وہ جیسے دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

گل جان کا پورا وجود سماعت بنا ہوا تھا۔ وہ ایک دم چوکس ہو کر اصیل خان کے منہ سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کو سن رہی تھی۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں..... کراچی پہنچ گئی۔ گرفتار کر کے لائے ہیں..... جی، جی..... جی ہاں..... جی ہاں وہ ڈاکٹر صاحبہ کی ملازمہ ہی ہے۔ جی وہ ڈاکٹر صاحبہ تو ابھی تک اسپتال میں ہی ہیں۔ بہر حال میں ان کو یہ اچھی خبر سنا دوں گا۔ آپ کی بہت مہربانی۔“ اس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ رہیسیور رکھ کر پلٹا تو گل جان کو اپنی طرف دیکھتا پا کر نظریں جھکا لیں۔

”کس کا فون تھا اصیل خان؟ اور کس کی گرفتاری کی بات ہو رہی تھی؟“ گل جان سکتے کی کیفیت میں اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”وہ گل جان بی بی، رابی کو پولیس گرفتار کر کے کراچی لے آئی ہے..... یا لارہی ہے، مجھے ٹھیک سے سمجھ نہیں آئی۔“

گل جان نے آنکھیں پھاڑ کر اصیل خان کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے اصیل خان کی بات سمجھ ہی نہ آئی ہو۔ پھر ایک دم جیسے چونک پڑی تھی۔ آنکھوں میں خوف کے سائے متحرک تھے۔

☆☆☆

صابرہ بچن میں برتن دھو رہی تھی۔ ستارہ اور شبنم اپنے کمرے میں تھیں۔ جابر علی کافی دیر پہلے دفتر سے گھر

اس کا اتنا خیال رکھا کہ سال میں تین چار مرتبہ ڈائریا ہو جاتا تھا کسی معصوم بچے پر ڈائریا کے جلدی جلدی حملے جنت میں پہنچنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔

مگر پھر جابر علی کا کیا ہوتا۔ ایک سہمی ہوئی کینز کیسے میسر آتی؟ کینز بھی ایسی کہ قدیم یونان کی غلامی کی مکمل پروفاں۔ آداب غلامی اتنے مکمل کہ تہذیب شرمائے۔

ماں بننے کا عمل اس کی زندگی میں پہلا ٹھنڈی ہوا کا خوشگوار جھونکا تھا۔ تین جگر کے ٹکڑے، آنکھوں کا نور، کلیجے کی ٹھنڈک۔ انہیں پا کر اتنی مصروف و مگن ہوئی کہ سختی، ظلم، بد نصیبی جیسے الفاظ بے معنی ہو کر رہ گئے۔ مگر پانی ڈھلان کی طرف ہی بہتا ہے۔ دکھوں کو بھی ایک ڈھلوانی رستہ چاہیے ہوتا ہے اور شاید وہ بہترین ڈھلان تھی۔ ادھر ادھر سے دکھ لڑھکتے اس تک پہنچ ہی جاتے تھے۔

”امی کون آیا ہے۔ ابا کس کی بات کر رہے تھے.....؟“ صابرہ جیسے ہی کچن میں آئی فوراً ہی شبینہ اس کے پیچھے چلی آئی اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آواز دبا کر ماں سے بولی۔

”وہی آیا ہے وارث علی.....“ شبینہ کے سوال پر صابرہ نے اس کی طرف دیکھا اور سمجھ گئی کہ شبینہ نے شاید ماں باپ کی بات سن لی ہے۔ اس نے گہری سانس لی اور بہت افسردہ سے انداز میں گویا ہوئی۔

”اوہ..... آپ کا مطلب ہے وہ وارث علی جس سے رشتے کی بات چل رہی ہے۔“ صابرہ نے شبینہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور کیتلی میں چائے بنانے کے لیے پانی ڈالنے لگی۔

”امی آپ جائیں آرام کریں۔ میں بناتی ہوں چائے۔“ شبینہ نے ماں کے ہاتھ سے کیتلی لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں بیٹا بنا لیتی ہوں چائے، تم جاؤ پڑھائی کرو۔“ صابرہ نے خالی خالی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”امی کہہ رہی ہوں ناں میں بنا لیتی ہوں۔ آپ جائیں پتا نہیں اتنی رات کو کیا ضرورت تھی آنے کی۔ عجیب شخص ہے۔ شام کو بھی تو آسکتا تھا۔“ شبینہ چولہا جلا کر بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

صابرہ اپنی جگہ گم صم کیفیت میں کھڑی تھی جیسے اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ شبینہ کی بات سن کر بھی اس نے کوئی رد عمل نہیں ظاہر کیا اور بدستور اپنی جگہ کھڑی جانے کیا سوچتی رہی۔

”امی چپکے سے جا کر سنیں تو سہی کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ اتنی رات کو کیوں آیا ہے؟“ شبینہ نے کیتلی چولہے پر رکھی اور مڑ کر ماں کی طرف دیکھا پھر اس کے قریب آ کر سرگوشی کے انداز میں گویا ہوئی۔

”بیٹا چھپ کر سنیں یا سامنے جا کر کوئی فرق پڑتا ہے؟ یہ بتاؤ ستارہ کیا کر رہی ہے سو گئی ہے کیا؟“ صابرہ نے خالی خالی آنکھوں سے شبینہ کی طرف دیکھا اور بڑی اداسی سے مسکرائی۔

شبینہ نے بے اختیار دروازے کی طرف نظر اٹھائی اور انکار میں سر ہلا دیا۔

”جاگ رہی ہے امی، کوئی ناول وغیرہ پڑھ رہی ہے شاید۔“ صابرہ نے زور سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔

”ارے یہ ناول وغیرہ کہاں سے اٹھا کر لے آئی پھر سے۔ تمہارے ابا کی نظر پڑ گئی تو پھر مسئلہ شروع۔ انہوں نے تو بڑی سختی سے پابندی لگائی ہوئی ہے کہ گھر میں کوئی رسالہ، ناول نہیں آئے گا۔ ان کا خیال ہے کہ یہ رسالے، ناول پڑھ کر لڑکیاں خراب ہو جاتی ہیں۔ کیا اسے پتا نہیں ہے کہ اس کا

آچکا تھا اور رات کا کھانا کھا کر صحن میں اب ٹھنڈی ہوا کھا رہا تھا۔ صابرہ کو تو اس طرف سے گزرتے ہوئے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا جیسے جابر علی اسے دیکھے گا اور کوئی ایسی بات بولے گا جو اس کی رات کی نیند اڑا کر رکھ دے گی۔ اسی لیے وہ چپ چاپ اپنے کاموں میں مصروف تھی۔ برتن بھی اتنی احتیاط سے دھو رہی تھی کہ کھڑپٹر کی آواز باہر نہ جائے مگر اسی وقت گھر میں پھیلا ہوا جامد سناٹا کال بیل کی آواز سے ٹوٹ گیا۔

”یا اللہ، اب رات کو کون آگیا۔ ہو سکتا ہے کوئی جابر علی سے ملے آیا ہو۔ اب برہان کو پوچھنے والے تو نہیں آئیں گے۔“ برہان کا خیال آتے ہی اس کے سینے میں جیسے ایک ہوک اٹھی تھی۔ وہ کچن میں ہی سن رہی تھی کہ جابر علی اٹھ کر دروازہ کھولنے گیا ہے۔ اس کے کان باہر ہی کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ بہر حال، ایک نجس تو تھا کہ کون آیا ہے پھر اس نے جابر علی کی بڑی گرم جوش آواز سنی۔ یہ انداز، یہ آواز اتنے کم ہو گئے تھے کہ جب کبھی جابر علی کی طرف سے مظاہرہ ہوتا تھا تو وہ بے یقینی کی کیفیت میں ڈوب جاتی تھی کہ آیا وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا جگ آہستگی سے رکھ دیا اور اپنے دوپٹے سے ہاتھ پونچھنے لگی۔ اس وقت جابر علی کی آواز سماعت سے ٹکرائی تھی۔

”بھئی وہ شبینہ کی ماں کہاں ہو، کیا کر رہی ہو؟“ وہ غالباً اسے ادھر ادھر تلاش کر رہا تھا۔ صابرہ جلدی سے آگے بڑھی اور کچن کے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

”جی، میں ادھر کچن میں کام کر رہی ہوں۔“ ”وہ وارث علی آیا ہے۔ چائے پانی کا بندوبست کرلو۔“ جابر علی نے بالکل مشینی انداز میں کہا اور جانے کے لیے واپس پلٹ گیا۔

”وہ بات سنیں کیا وارث علی..... وارث علی میں سمجھی نہیں۔“ صابرہ جتنا کچھ سمجھ گئی تھی وہ اسے خوف زدہ کر رہا تھا۔ وہ جابر علی کے منہ سے یہ سننا چاہتی تھی کہ آنے والا مہمان وہ نہیں ہے جس کے آنے کے خیال سے وہ

سہم گئی ہے لیکن یہ تو خود کو دھوکا دینا ہی تھا۔ اگر وہ اس وقت نہیں آیا تھا مگر کبھی نہ کبھی آنے والا تو تھا، جابر علی نے اس کا الجھا ہوا سوال دیکھ کر گھور کر دیکھا تھا اور بہت آواز دبا کر بولا تھا۔

”بھئی وارث علی جس سے ستارہ کی شادی کر رہا ہوں۔“ صابرہ کی رہی سہی جان بھی جیسے نکل گئی تو یعنی اب آنا جانا شروع ہو گیا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا اس بھیا تک حقیقت کو پھر قبول تو کرنا ہی تھا۔ کاش وہ کھڑے

کھڑے مری جاتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنا کچھ سہنے کی ابھی طاقت باقی ہے۔ آخر ایسا کیا ہوتا ہوگا کہ انسان کھڑے کھڑے مری جاتا ہوگا لیکن کسی کو آج تک کھڑے کھڑے مرتے نہیں دیکھا۔ اسی لیے اللہ نے کہا ہے کہ وہ

کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ نہیں ڈالتا۔

”یا اللہ سہہ تو رہے ہیں لیکن کس طرح یہ تو جانتا ہے۔ مجھ پر رحم کر دے۔“ اس کی آنکھوں سے ایک تو اتر سے آنسو بہنے لگے اس نے یوں قدم بڑھائے جیسے من من بھر کے ہو رہے ہوں، بہر حال چائے تو بنانا تھی۔

ستارہ تو شاید چھت پر تھی۔ شبینہ البتہ اپنی عادت کے مطابق کوئی مصروفیت نکالے بیٹھی تھی۔ شاید آج پرانے کپڑے الگ کرنے کا کام لے کر بیٹھ گئی تھی۔ زندگی کو ہلکا پھلکا تو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

یوں بھی اس معاشرے میں جس عورت کی پشت کمزور ہو اسے تو اپنا انسان ہونا بھی یاد نہیں رہتا۔ ماں مر گئی تو دن رات خوش قسمت عورتوں پر رشک کرنے اور کڑھتے رہنے والی تائی نے تایا کے خوف سے پرورش کی۔

باپ منع کرتا ہے۔ کیا کروں اس لڑکی کا۔“ صابرہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے جانے لگی اور شبینہ چائے کے کپ ٹرے میں لگانے لگی۔

☆☆☆

وارث علی زیورات کے کئی ڈبے کھولے جابر علی کے سامنے بیٹھا تھا اور بڑے فخریہ انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر اس کے تاثرات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”یہ آپ نے بہت تکلف کیا وارث جلی! میں نے آپ سے کوئی ڈیمانڈ کی نہ فرمائش۔ میری طرف سے آپ دو کپڑوں میں نکاح کر کے بچی کو لے جائیں۔ میں یہ نمود و نمائش اور دکھاوے کا قائل نہیں ہوں۔“ جابر علی تو زیورات کا ڈھیر دیکھ کر جیسے اپنے حواس ہی کھو بیٹھا تھا۔ اس نے بہر حال خود کو سنبھال کر بہت پروقار انداز میں وارث علی کو اتنا تواضع و احساس دلایا تھا کہ مادیت کے اس اظہار سے وہ بالکل بھی متاثر نہیں ہوا۔

”آپ نے کیا بات کی جناب! میں یہ سب کچھ اس لیے تو نہیں لایا کہ آپ دنیا کو دکھائیں اور بتائیں کہ لڑکی کی سسرال سے اتنا زیور آیا ہے، یہ تو میں آپ کے لیے لایا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کی بیٹی کے لیے ہے۔ آپ کی بیٹی کی ملکیت ہے۔“ وارث علی نے بہت مؤدبانہ اور مہذبانہ انداز میں کہا تھا۔

اس کی سادگی اور عاجزی پر جابر علی تو جیسے مر ہی مٹا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کتنے بے وقوف ہیں اس کے گھر والے خبر ہی نہیں انہیں کہ اللہ نے کتنی بڑی نعمت سے نوازا دیا ہے۔ شکر کرنا چاہیے اس دور میں تو اچھے رشتے ملنا ویسے ہی ایک مسئلہ ہے۔ پتا نہیں ہزاروں لڑکیاں باپ کی دبلیز پر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہیں مگر ان لوگوں کو اللہ کا شکر ادا کرنا نہیں آتا۔

”تو انکل آپ یہ سنبھال لیجیے۔ میرا مطلب ہے کہ امی کے حوالے کر دیجیے تاکہ وہ سنبھال کر رکھ دیں۔“ وارث علی بہت ننھا بن کر یوں کہہ رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی اٹھارہ بیس سال کا لڑکا ہو۔

جابر علی نے لاشعوری طور پر اس پر ایک نگاہ کی۔ اس سے عمر میں بہ مشکل چار یا پانچ سال ہی چھوٹا تھا۔ یہ بھی زندگی کا انوکھا تجربہ تھا کہ ہم عمر دکھائی دینے والا اسے انکل کہہ رہا تھا بلکہ اب تو اس نے کہتے ہی رہنا تھا۔

وارث علی نے تمام زیورات کے ڈبے بند کیے پھر اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر بہت ادب، تمیز اور عاجزی کے ساتھ جابر علی کو پیش کیے۔ جابر علی نے وہ ڈبے تھام لیے، جانے کیوں ڈبے تھامتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ شاید دولت میں بہت قوت تھی جو اس کی برداشت سے بہت زیادہ تھی۔ اس کے ہاتھ یہ بوجھ بہ دقت سنبھال رہے تھے۔

”میں ابھی گھر والی کے حوالے کر کے آتا ہوں اور چائے بھی لاتا ہوں۔ میرا خیال ہے تیار ہوگئی ہوگی۔“ وہ ڈبے لے کر کمرے سے باہر نکلا تو وارث علی نے ایک زوردار انگڑائی لی اور صوفے کی بیک سے ٹیک لگا کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ ”دولت اچھے اچھوں کے پول کھول دیتی ہے۔ ہاتھ آئی دولت کو ٹھکرانا کوئی آسان نہیں۔“ وہ سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

جابر علی زیورات کے ڈبے اٹھائے اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ہی اس کی نظر صابرہ پر پڑ گئی۔ اس نے صابرہ کو اشارے سے اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔

صابرہ بھی زیورات کے ڈبے دیکھ چکی تھی۔ اتنے سارے ڈبے دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا۔ طرح،

امانت

طرح کے وہمستانے لگے۔ ”یہ کون ہے؟“ کیوں ہم پر اتنی مہربانی کر رہا ہے۔ اتنا سارا زیور..... اس کے خاندان کا کوئی شخص ہمارے گھر آیا ہے۔ نہ کوئی ماں، بہن، خالہ، پھوپھی، تائی، چچی۔ یا اللہ میرا دل کیوں گھبرا رہا ہے۔“ وہ جابر علی کی تقلید میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو جابر علی نے پلٹ کر صابرہ کی طرف دیکھا۔

”یہ سنبھال کر رکھ دو..... بلکہ رکھنے سے پہلے کھول کر دیکھ لو۔ ویسے تو یہ ہمارے پاس امانت ہیں مگر تمہاری بیٹی کی لاٹری نکل آئی ہے۔ دیکھو تو سہی کس قدر زیور لے کر آیا ہے۔ تم عمر کو رو رہی تھیں۔ ارے مرد کماؤ ہونا چاہیے شریف ہونا چاہیے اور ان دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ اگر وہ پانچ وقت نماز بھی پڑھتا ہے تو سمجھو کہ ہمارے بھاگ کھل گئے۔ خوش نصیبی نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے۔ ایسے نیک داماد تو نصیب سے ملتے ہیں۔“ وہ صابرہ کو ڈبے پکڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”چائے ابھی تک نہیں تیار ہوئی؟“ وہ کمرے سے باہر نکلنے لگا تو اچانک خیال آیا کہ صابرہ تو چائے بنانے گئی تھی۔

”ہاں، وہ میرا خیال ہے شبینہ نے بنالی ہوگی۔“

جابر علی یہ سن کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ یقیناً اس کا رخ پکن کی طرف تھا جہاں سے اس نے چائے کی ٹرے اٹھانا تھی۔ اس کے نکلنے ہی ستارہ اندر آئی تھی۔ شاید وہ جاننا چاہتی تھی کہ گھر میں کون مہمان آیا تھا اور اس کا اندازہ تھا کہ ماں یا تو پکن میں ہوگی یا کمرے میں اس لیے وہ اپنے کمرے سے نکل کر پہلے ماں کے کمرے میں چلی آئی تھی لیکن ماں کے ہاتھ میں اتنے سارے زیورات کے ڈبے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ حیرت اور خوشی کا تاثر بہت واضح تھا۔

”امی اتنا سارا زیور؟“ صابرہ نے ڈبے ایک دم پیچھے کر لیے۔

”اچھا چھوڑو، جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔“

”امی آپ دکھائیں تو سہی۔ زیور دیکھنے کا تو سب کو شوق ہوتا ہے۔ واہ بھی واہ۔ شبینہ کی تو لاٹری نکل گئی۔ ایک دم سے اتنا سارا زیور..... یہ سارا گولڈ کا ہے؟ آرٹیفشل تو نہیں ہے؟ کھول کر تو دکھائیں۔“

”ابھی مہمان گھر میں ہیں۔ آواز نیچی کرو کیوں مری جا رہی ہو۔ یہیں پڑے ہیں دیکھ لینا، دیکھتی رہنا۔“ صابرہ نے دانت پیس کر ستارہ کی طرف گھورا اور دبی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔

صابرہ نے بیٹھنے کے انداز میں وہ تمام ڈبے بیڈ پر رکھ دیے۔ ستارہ کو ماں کے انداز پر تھوڑی سی حیرت تو ہوئی مگر زیورات دیکھنے کی لگن نے اسے کچھ اور سوچنے کی مہلت نہیں دی۔ اس نے ماں کے تاثرات یکسر نظر انداز کر کے جلدی جلدی ڈبے کھول کر دیکھنا شروع کیے جو جو ڈبا کھولتی جاتی تھی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جاتی تھیں۔

”امی دیکھیں تو سہی آپ نے تو شاید ابھی تک دیکھے ہی نہیں ہیں کس قدر خوب صورت سیٹ ہیں اور امی یہ جھومر..... او میرے خدایا کتنا بڑا جھومر، یہ تو پتا نہیں کتنے لاکھ کا ہوگا۔ آج کل سونا بھی کتنا مہنگا ہو رہا ہے۔“

”میں کہہ رہی ہوں بس بند کرو۔ گھر میں مہمان ہیں اگر سن لیا تو کیا سوچیں گے کہ کتنے بھوکے ہیں ہم لوگ زیور، کپڑے، کے، بند کرو جب مہمان چلے جائیں گے دیکھ لینا، لاؤ مجھے دو اٹھا کر رکھتی ہوں۔“ صابرہ نے پھر اس کی طرف گھورا۔

”امی پلیز دیکھنے تو دیں مجھے، یہاں کون آرہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ یہ بندہ تو کہیں سے ڈاکا مار کر

تھا اور حقیقت تو بہن کے غم سے ٹوٹ رہی تھی۔

ستارہ نے کوئی جواب نہ پا کر برا سامنہ بنایا اور تیز روشنی بجھا کر اپنے بستر پر چلی آئی۔ اسے تو یہی محسوس ہوا تھا کہ شبینہ اس بڑے عمر کے آدمی سے شادی پر خوش نہیں ہے۔ اس لیے اتنا چڑکرات کر رہی ہے۔

☆☆☆

اصیل خان رات کے آخری پہر عالم استغراق میں دعائے نیم شب کے عمل سے گزر رہا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ دعا کر رہا تھا۔ ”یا اللہ جو ایک نئی قیامت آنے والی ہے۔ مجھے وہ منظر دکھانے سے پہلے موت دے دے۔ میں اس لائق تو نہیں ہوں کہ میری سزا مختصر ہو مگر میرے گناہ سے بڑا تو تیرا رحم ہے۔ مجھے معاف کر دے میرے مالک..... شاید وہ منظر دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں۔ تو رحمن اور رحیم بنے اور میں ازل سے خطا کا پتلا۔ تجھے تو سزا دینے کے لیے کوئی اور بھی مل جائے گا میرے رب مگر مجھے معاف کرنے والا مجھے بخشنے والا تیرے سوا اور کون ہے؟“ یہیں تک وہ دعا مانگ سکا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ الفاظ ذہن میں تو تھے لیکن لبوں تک آنے سے قاصر تھے۔ اس کا وجود ہچکیوں کی زد میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی شکستہ کشتی گرداب میں پھنسی ہوئی ہو۔

☆☆☆

”روما مجھے کچھ نہیں پتا، آنٹی کو اب ہوش آ گیا ہے۔ اب تمہیں ٹینس ہونے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ وہ دو چار روز میں گھر آ جائیں گی۔ بس آج تم میرے ساتھ ٹیوٹر سے پڑھو گی۔“ کاناز کانچ سے سیدھی روما کے پاس چلی آئی تھی۔

”لیکن کاننا اب پتا نہیں اماں جان ٹیوٹر سے پڑھنے کی اجازت دیں گی یا نہیں، میں ان سے پوچھے بغیر کیسے ٹیوشن لے سکتی ہوں۔ تم خود ہی سوچو تمہیں تو سب پتا ہے ناں۔“ روما ڈبل مائنڈ ڈی ہو کر کہہ رہی تھی۔ کاننا ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر رہ گئی۔ جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو پھر ایک اچھی امید کے ساتھ روما کی طرف دیکھ کر بولی۔

”دیکھو میرا خیال ہے کہ آنٹی اب پہلے والی سختی نہیں کریں گی اور تم کون سا غلط کام کر رہی ہو۔ تم پڑھائی تو کرو گی ناں۔ وہ پڑھنے سے کیوں منع کریں گی۔“ کاننا نے اصرار کے انداز میں کہا تھا جیسے اب روما کو اس کی بات ماننا ہی پڑے گی۔

”میرا خیال ہے کاننا، اماں جان اجازت نہیں دیں گی۔ آج تک انہوں نے ٹیوشن پڑھنے کے بارے میں کبھی کوئی بات ہی نہیں کی اور نہ کبھی میں نے ان سے کہا کہ مجھے کسی سبیکٹ میں ٹیوشن کی ہیلپ کی ضرورت ہے۔ یہ ان کے لیے ذرا نئی سی بات ہو گی۔“

”بس تم چھوڑو نئی بات ہو گی۔ کبھی تو نئی بات ہوتی ہے ناں، کہہ دینا تم کہ بھی تمہیں میتھ بڑا مشکل لگ رہا ہے۔ تمہیں ڈر ہے کہ تمہاری پرنسپل اچھی نہیں آئے گی۔ ابھی وقت ہے کچھ اچھا ہو سکتا ہے۔“ کاننا نے ایک وکیل کے انداز میں اس سے جرح کی۔

روما کا تو بہت دل چاہ رہا تھا کہ کاننا کے ساتھ کا یہ موقع ہاتھ سے نہ جائے لیکن جو کچھ چند دنوں پہلے گھر میں ہوا تھا۔ وہ اتنی زیادہ محتاط ہو چکی تھی کہ خود سے کچھ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جب پہلے کبھی فیصلہ نہیں سنایا، ضد نہیں کی تو اب تو صورت حال بہت نازک تھی۔

ہمارے گھر زیور چھپانے لے آیا ہے۔“

صابرہ نے اپنا ہاتھ اب یوں بلند کیا جیسے ستارہ کو تھپڑ لگا دے گی۔ اس نے جلدی سے اپنا سر جھکا لیا اور ڈبے بند کر دیے۔

”امی اب بہت زیادہ چھپا کر نہ رکھ دیجیے گا۔ سب نہیں دیکھے ہیں میں نے، مہمان چلے جائیں تو تب دیکھوں گی۔“ وہ یہ کہہ کر بڑے آرام سے مسکراتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ صابرہ نے اپنے سر پر زور سے ہاتھ مارا تھا گویا اپنی بے بسی پر مہر لگائی تھی۔

☆☆☆

وارث علی چائے پی کر فوراً ہی چلا گیا تھا۔ شبینہ کچن سمیٹ کر اپنے کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا کہ ستارہ بے چینی سے اس کی منتظر ہے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چہرہ تھمتار ہا تھا۔ ”ارے یہ تو سچ سچ بہت امیر آئی ہے۔ تم نے دیکھا کتنا زیور لے کر آیا ہے۔ ارے واہ، ہم تو ایک رات میں ہی امیر ہو گئے اسے کہتے ہیں اور نائٹ چیج..... واقعی تم بہت لکی ہو۔“

”اچھا بس کرو۔ تمہارے پاس یہ فضول باتیں کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اتنی رات ہو گئی ہے۔ سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔ صبح کالج بھی جانا ہے۔“

”کالج جانے کی کیوں فکر ہو رہی ہے اور کالج جا کر تمہیں کیا ملے گا جو ملنا تھا وہ تو مل گیا۔ بھی میرا مطلب ہے اتنا امیر آدمی۔ فالٹو میں کیوں اپنی جان کھپاتی ہوں۔“

”ستارہ تم بس بولے چلی جانی ہو۔ کوئی بیماری ہے تمہیں کیا..... بہت رات ہو گئی ہے۔ صبح کو آنکھ نہیں کھلی ناں نماز کے وقت تو دیکھنا اباجی کی صلو اتیں سن کر ہی اٹھو گی۔“ شبینہ نے آف موڈ میں اس کو ایک طرح سے ڈانٹ دیا۔ وہ بہت الجھی ہوئی تھی۔ ایک بہت بڑا پہاڑ سر کرنا باقی تھا۔ اس میں تو بہر حال اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ستارہ کو لے کر بیٹھتی اور بتاتی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ لیکن اتنا اہم مرحلہ طے ہونا باقی تو تھا اور ظاہر ہے اس کی بے چاری مجبوری ماں نے ہی یہ مرحلہ طے کرنا تھا۔ اب بعد میں جو بھی رد عمل آئے۔ ساپ نکل جانے کے بعد لکیر پینے کے مترادف ہو گا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ ستارہ نے شبینہ کو بڑی گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر بے ساختگی سے پوچھا تھا۔

”بھئی میں کچھ بھی سوچوں، تم سے مطلب اور میں جو کچھ بھی سوچوں گی ناں تم سے شیئر نہیں کروں گی۔ چُھ رہی ہے میرے کانوں میں تمہاری آواز..... بندے کو ایک دفعہ بول دیتے ہیں تو مان بھی لینا چاہیے۔“ شبینہ یہ کہہ کر دھپ سے بستر پر اوندھی لیٹ گئی یوں جیسے وہ اپنے چہرے کے تاثرات بھی چھپا رہی ہو۔ وہ دکھ جو امند امند کر اس کی آنکھوں سے جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ستارہ کو اس کا شائبہ بھی محسوس ہو۔

”اتنادل چاہ رہا تھا کہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر وہ سارے زیور دیکھوں گی مگر تم تو بہت بور ہو۔ اتنے سارے زیور دیکھ کر تو لڑکیاں پاگل ہو جاتی ہیں۔ چلو امی کے بقول عمر کا زیادہ ہے تو کیا ہوا۔ امیر بندہ تو ہے۔ امیر بندے کی بیوی کی اپنی ہی ثور ہے۔ کیا شان ہوتی ہے..... کون دیکھتا ہے جب ایک عورت لگژری کار سے نیچے اترتی ہے کہ اس کا میاں بڑھا ہے کہ جوان۔“ ستارہ عادت سے مجبور تھی۔ بولے بنا رہ نہ سکی لیکن شبینہ نے بھی بڑے صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ کیونکہ اس کا کلیجا دکھ سے پھٹ رہا تھا۔ وہ ستارہ پر غصہ نہیں ہو رہی تھی یہ تو بظاہر غصہ

بیٹھی تھی۔

”یہ سوڈ کبھی اچھا بھی ہوتا ہے؟ یا تم تو ابھی سے بیویوں کی طرح اکڑی رہتی ہو۔ مجھے تو فکر ہو گئی ہے کہ شادی کے بعد میرا کیا بنے گا؟“ وہ مہرجان سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔

”مجھ سے یہ فضول باتیں نہ کیا کرو۔ کون کر رہا ہے تم سے شادی.....؟“

”میں فضول باتیں کرتا ہوں؟ ارے یہ فضول باتیں سننے کے لیے تو لڑکیاں مرتی ہیں۔“ اصفیل خان نے پھر کہا۔ ابھی تک اس کے ایک، ایک انداز میں شرارت جھلک رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے مہرجان کو چھیڑنے میں مزہ آتا تھا۔

”نہ جانے وہ کون سی فضول اور نامعقول لڑکیاں ہوتی ہیں جو یہ باتیں سن کر خوش ہوتی ہیں اور اس طرح کی باتیں سننا چاہتی ہیں۔ مجھے تو ایسی باتیں سن کر بہت غصہ آتا ہے۔“

اصیل خان اس کی طرف دیکھے بغیر پھر مسخرے انداز میں ٹیبل بجاتے ہوئے گنگنا نے لگا۔ مہرجان نے اب غصے سے باؤل ایک طرف سرکا دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اتنی دور سے یہ بیکار باتیں کرنے کے لیے آتے ہو؟“ وہ بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھی مگر اصفیل خان بڑی پھرتی سے اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر اس کی راہ میں حائل ہو گیا یوں جیسے مہرجان کے سامنے کوئی دیوار کھڑی ہو گئی۔ مہرجان نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”یہ غصہ کیسے اترے گا؟ یا راتے دن ہو گئے؟ مسلمان تین دن سے زیادہ ناراض نہیں رہتے۔ منع کیا ہے؟“ وہ شریر ہوا۔

”پتا ہے کتنے بچے مسلمان ہو تم، ہٹو میرے راستے سے اور میں نے نہیں کہا تھا یہاں آؤ۔“ مہرجان نے اس کی طرف گھورا۔

”تم نے نہیں کہا تھا..... لیکن تمہاری خفگی تو کہہ رہی ہے کہ مجھے یہاں جلدی جلدی آنا چاہیے۔ جب بھی دیر کروں گا تو ایسی ہی سزا ملے گی۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے مہرجان کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ ”اچھا یا راب مسکرا بھی دو۔ بہت سخت سزا کاٹ لی۔ اب تو رحم کر دو۔ مسکرا دو میری جان۔“

اصیل خان نے اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے چھو کر چہرہ اونچا کیا۔ مہرجان کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو چمک رہے تھے۔ اصفیل خان اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر حیران رہ گیا بلکہ اچھا خاصا پریشان ہو گیا۔

”کیا ہوا مہر.....؟ کیوں رو رہی ہو؟ تمہاری آنکھوں میں آنسو۔ یا تم تو رلانے والوں میں سے ہو۔ رونے کب سے لگیں؟“

”تم مجھے شروع سے ہی ستارہ ہو اصفیل خان۔ تمہیں پتا ہے ناں میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو بہانے، بہانے سے اپنے دل کی بات کہہ دیتی ہیں۔ تمہارے فون کا انتظار کرتی ہوں مگر تمہیں میرا بالکل بھی احساس نہیں۔ پتا نہیں کس دنیا میں رہتے ہو؟ کہاں تو اتنے، اتنے دن پوچھتے نہیں۔ آتے ہو تو جان چھڑکنے لگتے ہو۔ پھر یہ سب کچھ مجھے ڈراما لگتا ہے۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔ آخر اپنی انا کو بھی تو سنبھالنا تھا۔

”یار! میں نے تمہیں بتایا ناں، بزنس پھیل رہا ہے۔ کراچی جاتا ہوں تو سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تم تو اتنے دنوں سے آئی نہیں۔ آؤ ناں دیکھو میرے صبح، دوپہر، شام کیسے گزرتے ہیں؟ میں تو تم سے آج شادی

”کاناز میں اماں جان سے بات کر کے پھر تمہیں کچھ بتا سکتی ہوں اور جو کچھ تم ٹیوٹر سے پڑھو گی میں اسے فالو کر لوں گی۔ کالج میں تم سے پوچھ لوں گی۔“ وہ ہنسی پچھاتے ہوئے کہہ رہی تھی اور یہ ہنسی پچھاتے ہوئے تھی کہ وہ واقعی کاناز کے ساتھ ٹیوشن لینا چاہتی تھی۔ گھنٹا دو گھنٹا اس بہانے اس کے ساتھ بیٹھنا چاہتی تھی۔ اس کے قریب رہنا چاہتی تھی۔ یہ تو ایک بہت ہی اچھا راستہ نکل رہا تھا مگر مہرجان کی وجہ سے وہ الجھ رہی تھی اور کاناز سے وہ بات کر رہی تھی جو اس کے دل کی بات نہیں تھی۔ کاناز نے اس کی طرف دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”تم نے تو غبارے سے ساری ہوا ہی نکال دی۔“

”تمہیں پتا تو ہے پھر اس خوش فہمی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔“ رومابولی۔

”زندہ رہنے کے لیے خوش فہمیوں کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ ہر وقت مایوسی اور برا سوچنے سے کچھ بھی نہیں ملتا۔ جب سوچنا ہی ہے تو اچھا ہی سوچ لیں۔ خوش فہم ہونے میں کوئی خرچہ آتا ہے کیا؟“ کاناز نے لا ابالی پن سے جواب دیا تھا۔

”تم کتنی لکی ہو کاناز جو دل میں آتا ہے کہہ دیتی ہو، اچھا، اچھا سوچ سکتی ہو مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اچھا سوچنے کے لیے بھی کوئی بیس (Base) ہونی چاہیے۔ اماں جان کی اجازت کے بغیر تو آج تک کبھی کچھ نہیں کیا تو اب کیسے سوچ سکتی ہوں۔“ رومانے بڑی اداسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”چلو ٹھیک ہے، آنٹی گھر آ جائیں ناں تو تم خالہ جانی کے ذریعے بات کرنا، ڈائریکٹ نہ کرنا۔ خالہ جانی اپنے انداز میں ان سے بات کر لیں گی۔ میرا خیال ہے کہ پڑھائی کے معاملے میں آنٹی اتنی Strict نہیں ہوں گی۔ پرمیشن دے دیں گی تمہیں۔“ رومانے جانے کس سوچ کے تحت بڑی خالی خالی نظروں سے کاناز کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ذہنی طور پر غیر حاضر تھی۔ کیونکہ اس کے مد نظر سب کچھ تھا اور کاناز کے سامنے صرف اس کی خواہش تھی۔

☆☆☆

”او میرے دل کے چین

چین آئے میرے دل کو دعا کیجیے“

اصیل خان ڈائمنگ ٹیبل پر انگلیوں سے یوں میوزک بجا رہا تھا جیسے پیانو بجا رہا ہو۔ اس کی آواز بہت دلکش تھی۔ بھاری، پرسوز اور بھرپور مردانہ پُرکشش آواز..... مہرجان ہاف بوائے کاٹنے میں پھنسا کر منہ تک لے کر ہی گئی تھی کہ اس نے کاناز واپس باؤل میں رکھ دیا اور اصفیل خان کی طرف گھور کر دیکھنے لگی۔

اصیل خان اس کی طرف دیکھنے کے بجائے ٹیبل پر انگلیاں چلاتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔

”یوں تو اکیلا بھی اکثر گر کر سنبھل سکتا ہوں میں

تم جو پکڑ لو ہاتھ میرا دنیا بدل سکتا ہوں میں

مانگا ہے تمہیں دنیا کے لیے

اب خود ہی صنم فیصلہ کیجیے

او میرے دل کے چین“

اصیل خان گنگنا تے ہوئے شریر نظروں سے مہرجان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو غبارے کی طرح منہ مچلائے

سوچتے ہوئے گزرا ہے اور یہ سارا گزرا ہوا وقت میری اصل کمائی ہے۔ اتنے آرام سے مرنے کی باتیں کرتے ہو۔ جیسے تم مر جاؤ گے تو میں زندہ رہوں گی۔“ مہرجان نے ایک دم اپنا ہاتھ اصریل خان کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ مہرجان کی آواز پر آنسوؤں کا تاثر غالب تھا۔ اسی وقت اصریل خان کی پشت سے گل جان کی کھنکھار اور شریر آواز سنائی دی۔

”بھئی یہ فلمی سین کسی بند کمرے میں ہونا چاہیے۔ ہائے اللہ مجھے تو بہت شرم آرہی ہے۔“ اس کی آواز سن کر مہرجان ایک دم اچھل کر اصریل خان سے دور ہوئی تھی۔

”جب تم نے یہ حسین منظر دیکھ ہی لیا تھا تو اتنا پاس آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دور سے واپس نہیں جا سکتی تھیں؟ جینس ہو رہی ہو تم اپنی بہن سے۔“ اصریل خان نے پلٹ کر گل جان کی طرف دیکھا۔ اصریل خان بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ گل جان کی مداخلت پر نہ وہ جھجکا اور نہ اسے کچھ محسوس ہوا۔ بہت ڈھٹائی سے مسکراتا ہوا وہ ایک طرف چل پڑا تھا۔ مہرجان چھوٹی بہن سے نظریں چرا رہی تھی۔ گل جان نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

☆☆☆

”ڈاکٹر صاحبہ آپ تھوڑا سا جوس پی لیجیے۔ گل جان بی بی ڈاکٹر سے بات کر رہی ہیں۔ بس ابھی آتی ہی ہوں گی۔“ اصریل خان جوس کا گلاس لیے ہوئے مہرجان سے مخاطب تھا۔ مہرجان کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں

کرنے کے لیے تیار ہوں مہر! مگر تم نے ہی روکا ہوا ہے۔ تمہیں ہی شوق ہے ڈاکٹر بننے کا۔ باہر جا کر پڑھنے کا۔ یہ تو میں ہی جانتا ہوں کہ انتظار کی یہ گھڑیاں میں کیسے گزار رہا ہوں۔ چھوڑو یا ر! یہ بڑھائی ڈھائی۔ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ جینا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جینا ہے۔ ڈاکٹر بن جاؤ گی تو یہاں ہوتے ہوئے بھی مجھ سے دور ہو جاؤ گی پھر تم ہو گی اور تمہارے پیشہ..... نہ بابا نہ.....“

مہرجان نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے گالوں پر آنے والے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے صاف کیا۔

”یہ بابا جان کا خواب ہے اصریل خان! وہ بچپن ہی سے کہتے چلے آئے تھے کہ مجھے ڈاکٹر بننا ہے اور میں یہ سمجھتی ہوں کہ وہ بیٹا نہ ہونے کی محرومی کو اس طرح سے مٹانا چاہتے ہوں گے۔ وہ بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے۔ بہت مان ہے انہیں مجھ پر۔ بس ان کی خواہش اب میری بھی خواہش بن گئی ہے۔ تھوڑے سے دنوں کی بات ہے۔“ مہرجان اب بہت دوستانہ اور صلح جو انداز میں اصریل خان سے بات کرنے لگی تھی۔

”تم بچپن سے سنتی چلی آرہی ہو کہ تمہیں ڈاکٹر بننا ہے لیکن تم بچپن سے یہ بھی تو سنتی آرہی ہونا کہ تم اصریل خان کی منگ ہو۔ اصریل خان کے نام کے ساتھ تمہارا نام وابستہ ہے۔ اصریل خان نے تو دنیا میں ہوش سنبھالنے کے بعد یہی سنا کہ وہ ایک بہت خوب صورت بندھن میں بندھا ہوا ہے، آزاد نہیں ہے۔ تم سے کتنی ہی دور چلا جاؤں ایک زنجیر میرے پاؤں میں کھن کھن بجتی ہے۔ وہ کھن کھن نہیں ایک مدھر موسیقی ہے۔ جس کے سُروں میں تمہارا نام گونجتا ہے۔“ اصریل خان بہت مخمور و سرشار لہجے میں کہہ رہا تھا اور نظروں ہی نظروں میں اس پر نثار ہو رہا تھا۔

مہرجان کو یوں محسوس ہوا کہ زندگی میں کوئی کمی نہیں ہے۔ مال، دولت، حسن، جوانی اور ایک چاہنے والا مرد ایک جوان لڑکی کو اس عمر میں اور کیا چاہیے ہوتا ہے؟

اصریل خان کی نظروں میں اتنی تپش اور گرم جوشی تھی کہ مہرجان جیسی مضبوط کردار کی لڑکی اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی تھی۔ یوں بھی وہ ہمیشہ سے محسوس کرتی تھی کہ اصریل خان کے سامنے آکر وہ کمزور پڑنے لگتی ہے۔ وہ اس کے سامنے ہوتا ہے تو جیسے پورا چاند ہوتا ہے جس کی روشنی میں اس کا وجود دھندلانے لگتا ہے۔ وہ کمال کی باتیں کرتا تھا۔ ایسی باتیں جنہیں سن کر الف لیلوی داستانوں کا شہزادہ یاد آتا تھا۔ جس پر کسی شہزادی نے دل ہارا ہوتا تھا۔ لیکن اس شہزادی کو پانے کے لیے بڑی سخت شرائط کو پورا کرنا اس شہزادے کی مجبوری ہوتی تھی۔ ان شرائط کی خاطر کوہ قاف کے جنگلوں میں بھٹکنا اس کا مقدر ہوتا تھا اور جنگل بھی ایسا کہ جہاں پلٹ کر دیکھنا بھی منع تھا کیونکہ پلٹ کر دیکھنے والا پتھر کا بن جاتا تھا۔ مہرجان کی زندگی بھی الف لیلٰی کی کسی ایک رات کے جیسی تھی۔

”اچھا اب سامنے سے ہٹو..... مجھے جانے دو۔“ مہرجان نے بڑے ناز سے کہا تھا اور اصریل خان کو دونوں ہاتھوں سے ایک طرف دھکیلنے کی کوشش کی تھی لیکن اصریل خان اپنی جگہ کسی چٹان کی طرح ڈٹا ہوا تھا۔ اس نے مہرجان کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا تھا۔

”نہیں پہلے یہ کہو کہ اب تم مجھ سے ناراض نہیں ہو..... بلکہ آئندہ کبھی مجھ سے ناراض نہیں ہوگی۔ ورنہ میں اپنی شکار والی گن سے خودکشی کر لوں گا بتا رہا ہوں۔“

”کتنے بے رحم ہوا اصریل خان تم۔ بولتے ہوئے کچھ تو سوچ لیا کرو۔ آج تک جتنا بھی وقت گزرا ہے تمہیں

سیر نسوان حسن کاراز

ہلوسم بریسٹ ڈولپنگ ایڈوانسنگ کریم (ہرمل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے

بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔

Rs.250/=

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

گلیسی

حقیقی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور سرسبز سے تیار کردہ۔ بدھاداغ، دھبوں، مہاسوں کو بھی صاف کر کے رنگ گورا کرتی ہے۔

آپ آ کر یا طاری کرنا چاہتے ہیں تو آن لائن SKYPE آن لائن آ کر یا سٹاک کرنا چاہتے ہیں۔

اپنا نمٹ کے ہارے میں مفت آپ کی معلوماتیں۔ 0345-7000088

کریم گھر منگوانے کیلئے رقم ایڈری لوڈ کرنا یا ایڈریس SMS کریں۔

051-5502903-5533528

042-7666264

Cell: 0333-5203553, Website: www.devapk.com

ماہنامہ پاکیزہ 38 جولائی 2013

مہر جان کی آنکھیں بند تھیں۔ انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
”گل جان رانی کا کچھ پتا چلا؟“ پھر بہت آہستہ آواز میں مخاطب ہوئی۔

یہ سن کر جیسے رومانے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ اس کے اندر تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مہر جان کے اعصاب پر رانی سوار تھی اور رانی ابھی تک گھر نہیں پہنچی تھی مگر گل جان نے کچھ اس طرح سے بات کی کہ مہر جان کو اچانک خبر سے کوئی شاک بھی نہ پہنچے اور بات بھی ہو جائے۔

”بی بی جان آپ بس اٹھ کر بیٹھ جائیں اور سمجھیں کہ رانی کہیں نہیں گئی۔ گھر میں ہی ہے۔ میں آپ کو صحیح بتا رہی ہوں۔“

مہر جان نے بے یقینی کی کیفیت میں گل جان کی طرف دیکھا پھر نظروں کا رخ روما کی طرف موڑ لیا۔ روما بھی بڑی حیرت سے مہر جان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ اصیل خان اور گل جان نے ابھی تک روما کو رانی کی گرفتاری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے بڑی بے اختیاری کی کیفیت میں گل جان سے کچھ پوچھنے کے لیے منہ کھولا لیکن فوراً ماں کا خیال آ گیا تو چپ ہو گئی۔

”بی بی جان ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آپ ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں اور زیادہ بات بھی نہ کریں۔ انشاء اللہ آپ ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی اور آپ کو اچھی خبریں ہی ملیں گی سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔“ گل جان نے بولتے ہوئے روما کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں اسے کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

روما اگرچہ کچھ سمجھی تو نہیں لیکن جیسے اس نے گل جان کی بات ماننا بہتر سمجھا اور چپ چاپ کمرے سے باہر چلی گئی۔

مہر جان نے گل جان کی طرف پھر اسی انداز میں دیکھا۔ جیسے وہ بہت گہری نیند سے جاگی ہوں اور نیند کے غلبے کی وجہ سے آنکھیں بار بار بند ہوئی جا رہی ہوں۔

☆☆☆

”سر وہ ناں آپ کو ایک اور ٹیوشن پڑھانا پڑے گی۔ آپ ابھی سے اپنا ماسٹرمیک اپ کر لیجیے۔“ کاناز اپنی نوٹ بک کھولتے ہوئے برہان کی طرف دیکھنے لگی۔ برہان نے بہت احتیاط سے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔

”جی وہ مجھ سے شاہ صاحب نے تو اس طرح کی کوئی بات نہیں کی۔“ اس نے بہت آہستگی سے جواب دیا۔ سر قدرے جھکا ہوا تھا۔

”سر وہ تو ٹھیک ہے۔ دادا جان نے آپ سے بات نہیں کی تھی لیکن میں تو آپ سے بات کر رہی ہوں ناں اور ہاں آپ یہ نہیں سمجھیں گے کہ میری فیس میں اسے بھی پڑھانا پڑے گا۔ اس کی فیس ہم الگ سے دیں گے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔“

کاناز کی بے ساختگی پر برہان نے بھی بے ساختہ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا اور بہ مشکل اپنی مسکراہٹ کو دبایا تھا۔

”جی میں نے فیس کی تو بات ہی نہیں کی۔ میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ دادا جان نے بھی مجھے یہی کہا کہ اس

جیسے پلکیں اٹھانا دو بھر ہو۔ ابھی وہ مکمل طور پر ہوش میں نہیں آئی تھیں۔ انہوں نے اصیل خان کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر چند لمحے دیکھنے کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔
”اصیل خان، گل جان کو بلاؤ۔“ ان کے ہونٹ کانپے۔

اصیل خان جوس کا گلاس ٹرائی میں رکھ کر تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔
مہر جان نے بہ مشکل اپنی آنکھیں کھول کر جاتے ہوئے اصیل خان کی طرف دیکھا تھا اور بہت آہستہ آواز میں بڑبڑائی تھیں۔

”اصیل خان! مجھے رانی چاہیے۔ اصیل خان پتا کرو رانی کہاں ہے۔ اگر رانی..... اگر رانی میرے سامنے نہیں آئی تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ اس لیے کہ ذلت کی اس انتہا پر واپس زندگی کی طرف پلٹنا مجھے منظور نہیں۔“ ان کی آواز آہستہ آہستہ معدوم ہوتی گئی۔ چند لمحے بعد ہی گل جان ہانپتی کانپتی اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے روما بھی آرہی تھی۔ گل جان نے اصیل خان سے سنا تھا کہ مہر جان نے بات کی ہے۔ اسی لیے اس پر جوش و خروش سوار ہو گیا تھا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ لیکن یہ کیا..... مہر جان تو پہلے کی طرح آنکھیں بند کیے یوں نظر آرہی تھیں جیسے موم کا کوئی مجسمہ..... اس نے بڑی ہمت کر کے مہر جان کو آواز دی۔ روما بھی اس کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہو گئی تھی اور ماں کی طرف بہت آس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”بی بی جان!“ گل جان کی آواز سے ماحول میں ایک ارتعاش پیدا ہوا۔
مہر جان نے گل جان کی آواز سن کر بہت آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ یوں جیسے ان کی پلکوں پر منوں بوجھ دھرا ہو۔ روما ماں کو آنکھیں کھولتا دیکھ کر جیسے خوشی سے پاگل ہو گئی۔
”اماں جان آپ ٹھیک ہیں ناں، تھینک گاڈ آپ کو ہوش آ گیا۔“ روما بڑی بے ساختگی سے اپنے دل کی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

انہوں نے روما کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تیر رہی تھی۔ رومانے زندگی میں شاید پہلی بار ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ ٹپ کر ماں کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دبا لیا۔

”اماں جان کیا بہت درد ہو رہا ہے؟“
مہر جان نے آنکھیں بند کر کے سر نفی میں ہلایا۔

”بی بی جان یہ فریش جوس ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آپ کو تھوڑا سا جوس پلا دیا جائے۔ میں آپ کو سہارا دے کر تھوڑا سا بٹھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ کیا آپ بیٹھ سکیں گی؟“ گل جان اُن کی طرف بڑی والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ بہن کو ہوش میں دیکھ کر اسے جیسے کوئی روحانی سکون مل گیا تھا۔ اب اس کے چہرے پر زندگی کی رمت بھی تھی اور لہجے میں ایک جوش و خروش بھی۔

مہر جان نے آنکھ کے اشارے سے جوس پینے سے انکار کر دیا۔
”کیوں بی بی جان تھوڑا سا تو پی لیں۔ دیکھیں ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ آپ کو تھوڑا سا جوس پی لینا چاہیے۔“

”ہاں اماں..... تھوڑا سا جوس تو پی لیں۔ میں پلاؤں آپ کو؟“ روما اور قریب ہو کر ماں سے پوچھنے لگی۔

گھر میں مجھے ایک لڑکی کو ٹیوشن پڑھانا ہے۔“

”تو کیا ہوا سر!“ کانناز نے فوراً ہی برہان کی بات کاٹ دی تھی۔ ”اگر آپ کو پتا نہیں تو اب تو پتا چل گیا ناں اور آپ تو ٹیوٹر ہیں۔ ایک کو بھی پڑھا سکتے ہیں گیارہ کو بھی پڑھا سکتے ہیں اور پھر ہم دونوں تو ایک ہی کلاس میں پڑھتے ہیں پھر ہمارے سبکیٹ بھی ایک ہی ہیں۔ آپ کو کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔“ کانناز نے جلدی جلدی وضاحت کی۔ یوں جیسے تسلی دے رہی ہو۔

”اوکے، اوکے جب وہ آئیں گی تو دیکھ لیں گے..... لیکن وہ ابھی میرا مطلب ہے آج ہی سے آپ کے ساتھ کیوں نہیں پڑھ لیتیں؟“ برہان نے ذرا ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

”ایکچوئی اس کی مدرسیر۔ تسلی بیمار ہیں۔ اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ جیسے ہی وہ اسپتال سے گھر شفٹ ہو جائیں گی وہ آنا شروع کر دے گی۔ تو سر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے ناں؟ آپ پڑھا دیں گے ناں اسے بھی؟ بات یہ ہے کہ میں ہر کام اس کے ساتھ ساتھ ہی کرتی ہوں اور ہے ناں میں بس چاہتی ہوں کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاریں۔ پھر ہم کوئی غلط کام تو نہیں کر رہے ناں۔ بچے جب پڑھتے ہیں تو سب خوش ہی ہوتے ہیں کوئی ناراض تو نہیں ہوتا ہے ناں سر!“ کانناز کے انداز میں اتنی بے ساختگی اور معصومیت تھی کہ برہان کا جی چاہا کہ اسے ایک نظر غور سے تو دیکھ لے۔ مگر نہ جانے کیوں اس کے چہرے کے سامنے ہی شاہ صاحب کا چہرہ نظر آنے لگتا تھا اور وہ مارے احتیاط کے نظر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسے یوں لگا شاہ صاحب جیسے بزرگ نے اسے جو اعتماد دیا ہے۔ اس پر بھروسہ کیا ہے۔ وہ ہر صورت قائم رہنا چاہیے۔

”آپ اپنی دوست کو پڑھنے کے لیے بلا لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میرے خیال میں ایک ہی گھر میں دو ٹیوشن مجھے بھی سوٹ کر رہی ہیں۔“ برہان کو بہر حال کچھ تو کہنا تھا۔

کانناز تو جیسے یہ سن کر خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ آنے والا وقت بہت حسین ہے۔ وہ اور رومادونوں برہان سے ٹیوشن لے رہی ہیں۔

”سر ہمارے ایک ساتھ پڑھنے کا بہت فائدہ ہے۔ ہم ایک دوسرے کو ہیلپ آؤٹ کرتے ہیں۔ آپ یقین کریں وہ بہت ذہین ہے آپ کو زیادہ دماغ نہیں کھپانا پڑے گا۔ وہ تو بہت جلدی سمجھ جاتی ہے۔ بس مجھے ہی ذرا دیر لگتی ہے۔“ کانناز نے بڑی سادگی اور سچائی سے اپنی خامی کا لگے ہاتھوں اعتراف بھی کر لیا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے فی الحال آپ تو اسٹارٹ کریں۔ دکھائیں مجھے یہ شاید آج کا لیکچر آپ نے نکالا ہوا ہے۔“ اب برہان اپنی آنے والی بے ساختہ مسکراہٹ کو نہیں روک سکا تھا لیکن اس نے اپنا جھکا ہوا سر بھی نہیں اٹھایا تھا۔

”جی سر۔“ کانناز نے فوراً ہی نوٹ بک برہان کی طرف بڑھا دی۔ برہان نوٹ بک پر لکھے ہوئے لیکچر پر نظر دوڑانے لگا۔

”بہت خراب رائٹنگ ہے آپ کی۔“

”سر میری رائٹنگ خراب نہیں ہے۔ اس میں ہماری لیکچرار کا قصور ہے۔ اتنی اسپید میں بولتی ہیں۔ اتنی اسپید میں بولتی ہیں کہ انہیں احساس ہی نہیں رہتا کہ ہم لوگ غور نہیں کر رہے لکھ رہے ہیں اور میرا بال پوائنٹ بھی صحیح

نہیں چل رہا تھا۔ بس وہ دیکھیے ناں میں آپ کو دوسری نوٹ بک دکھاتی ہوں۔ کتنا نیٹ اینڈ کلین کام ہے آپ کو لگے گا جیسے Composed ہے۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے میں نے آپ کی بات پر اعتبار کر لیا۔ آپ کی رائٹنگ واقعی بہت خوب صورت ہوگی لیکن فی الحال اس لیکچر کو پڑھنا ایک بہت ہی بڑی ڈیوٹی ہے۔“ برہان نے ایک دم ہاتھ اٹھا کر اسے نوٹ بک سے نکالنے سے روک دیا۔ برہان نے یہ کہا اور دوبارہ اسی نوٹ بک پر نظر دوڑانے لگا۔

کائنات اس کی طرف بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ بہت خوب صورت، بہت محتاط اور کچھ ایسا خاص تھا جو محسوس تو ہو رہا تھا لیکن ان احساسات کو زبان دینے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ وہ برہان کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے آپ بک بھی نکال لیجیے۔“ برہان اس کی نظروں سے ذرا کونشس (Concious) سا ہونے لگا۔

کائنات ایک دم سے جیسے سنبھلی اور بیک سے بک نکالنے لگی۔

”اچھا اسٹوڈنٹ وہ ہوتا ہے کائنات جس کا پورا فوکس اپنی اسٹڈی اور نظریں اپنے ٹارگٹ پر ہوتی ہیں۔ آپ کو پتا ہے آپ کا ٹارگٹ کیا ہے؟“

”جی سر۔“ برہان کے سوال کے جواب میں جلدی سے اس نے کہا تھا۔ ”اے پلس تو لازمی ہے۔ ورنہ میرٹ پر ایڈمیشن نہیں ہوگا اور میرٹ پر ایڈمیشن نہ ہونا تو بہت بری بات ہوتی ہے، ہے ناں سر.....؟“

”بہت زیادہ بولنا بھی اچھی بات نہیں ہوتی، ویسے تو سب ٹھیک ہے، میں تو یہ سوچ رہا ہوں آپ اکیلی اتنا بول رہی ہیں تو جب آپ کی دوست آپ کے ساتھ پڑھیں گی تو آپ دونوں مل کر کتنا بولا کریں گی۔“ برہان نے بہر حال ہمت کر کے اسے ٹوک ہی دیا۔ تاکہ وہ سیریس ہو کر اپنی پڑھائی پر توجہ دے۔

”سر ایک بات تو بالکل پکی ہے۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میری جو دوست ہے ناں اس کے حصے کا بھی میں ہی بول لیتی ہوں۔ اس کی پریزنٹس میں بھی اور.... پیٹھ پیچھے بھی۔ آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔ آپ تو خود اصرار کریں گے کہ خدا کے لیے بات کرو۔“

”اتنا کم بولتی ہیں یقین نہیں آ رہا مجھے۔“ برہان نے بڑی دلچسپی سے کائنات کی طرف دیکھا تھا مگر دیکھنے کے اس عمل میں لاشعوری پن اور بے ساختگی تھی۔

”جب وہ آپ سے پڑھے گی ناں تو آپ کو یقین آ جائے گا۔ میں تو خود تنگ آ جاتی ہوں اور پوچھنے لگتی ہوں کہ روماتمہارا دل نہیں گھبراتا۔ اتنی، اتنی دیر تک خاموش رہتی ہو.....؟“

”اچھا تو آپ کی دوست کا نام روما ہے۔“ برہان نے فوراً ہی اس کی بات پکڑ لی۔

”نہیں سر اس کا نام تو روما نہ ہے۔ بس سب لوگ اسے پیار سے روما، روما کہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے فیملی ممبرز اور میں، دادا جان سب۔ اصلی نام تو کوئی بھی نہیں لیتا اس کا۔“

”چلیں ٹھیک ہے، اتنی دیر سے آپ اپنی دوست کی باتیں کر رہی ہیں۔ اب پڑھائی کی طرف توجہ دیجیے۔“ برہان نے اب سنجیدگی سے کہا۔

”سر! آپ تو سر بھی نہیں لگتے۔ پھر بھی سر کی طرح ڈانٹ رہے ہیں۔ آج تو میرا فرسٹ ڈے ہے۔“

”بس ہو گئی ناں باتیں۔ اب پڑھائی شروع کریں۔“ برہان نے کتاب کھولتے ہوئے کہا تھا۔



مَنَاجِ جَانِ

انجم انصار

ریڈیو کیب تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی اور جاوید کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر کو دیکھ رہے تھے۔ اپنے ملک میں آکر ایک سکون سامتا ہے۔ یوں جیسے کسی بچے کو اس کی ماں نے اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ اگر کراچی میں بار بار جاب نہ چھٹی تو وہ کبھی اپنے گھر اور اپنے وطن سے دور نہ جاتے۔ روزگار نے انہیں اپنے گھر سے دور کر دیا تھا۔ جس کی تکلیف وہ بھی محسوس کرتے تھے اور ان کی بیوی، بچے بھی۔

کاناز اب بھی غیر دماغی کی کیفیت میں تھی اور سوچ رہی تھی۔ ”اگر روم ہوتی تو شاید اچھی خاصی پڑھائی ہو جاتی۔ میرا دماغ تو اسی میں لگا ہوا ہے۔ لگتا ہے یہ سر تو بہت ڈانٹا کریں گے۔ دیکھنے میں ہی بہت reserve سے لگتے ہیں۔“

☆☆☆

اصیل خان اسپتال سے آگیا تھا۔ گل جان البتہ وہاں رک گئی تھی۔ روم بھی اس کے ساتھ آگئی تھی۔ گھر پہنچتے ہی مغرب کی اذان ہو گئی۔ اس نے مغرب کی نماز کے ساتھ ساتھ شکرانے کے دو نفل بھی ادا کیے۔ ابھی دعا مانگ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ دل بڑی تیزی سے دھڑکا تھا۔ پولیس رابی کو لے کر آرہی تھی۔ یقیناً رابی کراچی پہنچ گئی۔ یہ فون اسی سلسلے میں آیا ہوگا۔ اس کے دل میں یقین کی کیفیت اتر رہی تھی۔ کیونکہ اسپتال سے اب اسے کسی خطرناک فون کے آنے کا اندیشہ نہیں تھا۔

ڈاکٹر، مہر جان کی طرف سے بہت پُر امید تھا کہ اب وہ جلدی سنبھل جائیں گی۔ اصیل خان جانماز طے کرتا ہوا بڑی تیزی سے لاؤنج کی طرف آیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا دور دور تک نہ کوئی نوکر نظر آیا نہ روم۔ اس نے آگے بڑھ کر ریسپور اٹھایا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے جو آواز ابھری اس نے اس کے گمان کو حقیقت میں بدل دیا۔ فون واقعی پولیس اسٹیشن سے تھا۔ کوئی انسپکٹر بات کر رہا تھا۔

”ڈاکٹر صاحبہ سے بات ہو سکتی ہے؟“

”جی وہ تو اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ آپ مجھے بتا دیجیے کیا خبر ہے۔“ بولتے ہوئے اصیل خان کی آواز کانپ گئی۔

”خبر یہ ہے کہ لڑکی کراچی پہنچ گئی ہے۔ اس وقت پولیس اسٹیشن میں موجود ہے۔ بیگم صاحبہ کی طرف سے اس کو لینے کون آئے گا کیونکہ ضابطے کی کارروائی ہونا باقی ہے۔ گھر سے کوئی آئے گا تو لڑکی اس کے حوالے کر دی جائے گی۔“

”جی میں آجاتا ہوں۔“ اصیل خان نے اسی طرح لرزتی کانپتی آواز میں خود کو سنبھالتے ہوئے کہا تھا۔

”تم کون ہو؟“

”جی میں ڈاکٹر صاحبہ کا ملازم ہوں۔ برسوں سے ان کے ساتھ اس گھر میں رہتا ہوں۔ میرا مطلب ہے ان کی خدمت کرتا ہوں۔“

”اچھا، اچھا اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑکی کو تو تم بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ ابھی اب یہ ہے کہ کسی نہ کسی کو تو ادھر آنا ہے۔ کہو تو حوالات میں بند کر دیتے ہیں۔ بیگم صاحبہ خود آنا چاہیں تو انتظار کر لیتے ہیں۔“ انسپکٹر اپنی ٹون میں بڑے پتھرے انداز میں بات کر رہا تھا۔ ایک دم جذبات سے عاری ساٹ لہجہ۔

”حوالات؟..... نہیں، نہیں..... میں واسطی صاحب سے بات کرتا ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہا تھا۔

(جاری ہے)

رہی ہوگی تو جان لو سالگرہ سے پہلے میں بالکل نہیں بتاؤں گا کہ میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔“

”جاوید میرا دل چاہتا ہے کہ اب آپ واپس نہ جائیں۔“

”اگر واپس نہیں جاؤں گا تو جاب ختم ہو جائے گی۔“

”یہاں پر ہی کوئی چھوٹا موٹا بزنس کر لیں مگر اب آپ یہیں گھر پر رہیں۔ بچیاں بڑی ہو رہی ہیں“

اب انہیں آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔“

”آج کل تو بزنس کرنے والے گھرانوں کے بزنس گھائے میں جا رہے ہیں، میں نا تجربے کا شخص کیسے بزنس کر سکتا ہوں۔“

”رازق تو اللہ تعالیٰ ہے کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا مگر اب آپ باہر نہ جائیں۔“

”اس بارے میں پھر بھی سوچیں گے مگر تم یہ تو خیال کرو کہ مجھ پر صرف اپنے گھر کے خرچے کی ہی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اپنی بیوہ بہن اور اس کے بچوں کی بھی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ فلیٹ اپنے ہیں ورنہ کرایے کی مد میں ہزاروں نکل جایا کرتے۔“

”پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ اب آپ کو کہیں نہ جانے دوں۔“ شہلا کا لہجہ بے قرار سا تھا۔

”ہینڈ سم شوہر کی جانب سے بیویاں کتنی فکر مند رہتی ہیں۔ بے فکر رہو تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتی۔“

جاوید نے مسکرا کر دیکھا اور شوخ لہجے میں بولے۔

”ارے..... سب بھول جاتے ہیں دوسری کو دیکھ کر پہلی والی کس کو یاد رہتی ہے۔“

”اور جب پہلی والی نے ہی پاگل کر رکھا ہو.....“

تو میں کسی اور کی جانب کہاں دیکھ سکتا ہوں۔“ شہلا شوہر کی بات سن کر بے اختیار ہنسی چلی گئیں۔ وہ ہنستے ہوئے کتنی خوب صورت لگ رہی تھیں جاوید محو ہو کر دیکھنے لگے۔ واقعی وہ بہت پیاری تھیں۔ دہلی پتلی، نیلی آنکھوں والی۔ کسی طرح نہیں لگتا تھا کہ وہ دو جوان بچیوں کی ماں ہیں۔ اس پر ان کے گھنے دراز

آپ نہیں آسکتے۔“ شہلا کو شوہر کی بات بالکل پسند نہیں آئی تھی۔

”مائی ڈیئر میں ایک کمپنی میں جاب کرتا ہوں۔ کمپنی میری اپنی نہیں ہے۔ اس دفعہ نہیں آسکوں گا۔“

”اور جو ہماری شادی کی اٹھارہویں سالگرہ آ رہی ہے۔“ شہلا کا لہجہ تمسخر آمیز ہو گیا۔

”اگر بچیوں کے امتحانات نہ ہوتے تو میں تم سب کو دعائی بلوالتا مگر یہ تو میری آفس کی طرف سے مجبوری ہے کہ مجھے یہاں ہی رہنا ہوگا۔“

”میرے خیال سے جن خواتین کے شوہر ملک سے باہر جاب کرتے ہیں انہیں اپنی چھوٹی، چھوٹی خوشیوں کے لیے بھی ترسنا پڑتا ہوگا۔“

”نہیں شہلا، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہاں باہر جاب کرنے والوں کی بیویاں صابر تو ضرور ہوتی ہوں گی۔“

”مگر میرا نام صابرہ نہیں ہے۔“ شہلا کھپا کر بولیں۔

”میرا یہ وعدہ ہے کہ جیسے ہی آفس کے کام سے فارغ ہوں گا تو کراچی آنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔“ جاوید نے بیوی کو تسلی دی اور اب اچانک ان کے گھر آ جانے پر شہلا اپنے تمام شکوے شکایت بھول چکی تھیں۔

”تمہیں پتا ہے، میں اس مرتبہ کیوں آیا ہوں؟“

”ظاہر ہے، اپنی لاڈلی بیٹیوں کی وجہ سے۔“

”نہیں..... صرف تمہاری وجہ سے آیا ہوں۔“

”وہ کیوں بھلا؟“ وہ حیرت زدہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ بیٹھیں۔

”ایک ہفتے بعد ہماری شادی کی اٹھارہویں سالگرہ ہے۔ ایسے میں ہمیں یوں دور دور تو نہیں ہونا چاہیے نا۔“ انہوں نے بڑے پیار سے کہا۔

”ایک بات کہوں آپ سے؟“

”ضرور..... اپنے تحفے کے بارے میں پوچھ

”شہلا واقعی ایک آئیڈیل بیوی ہے اور ایسی بیوی واقعی قسمت والوں کو ملتی ہے۔“ گاڑی سگنل پر ایک جھٹکے سے رکی تو انہوں نے دیکھا ایک نوجوان پاگل سا ہوا ہر گاڑی پر لپک رہا تھا اور ایک ہی جملہ کہہ رہا تھا۔

”میری بیٹی مرگئی، تم نے کھانا نہیں دیا تھا ناں..... میری بیٹی مر گئی۔“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا دکھ گھلا ہوا تھا کہ ہر گاڑی سے اسے کچھ نہ کچھ مل رہا تھا۔

”سالا! ادا کار، کب سے پاگل بنا پیسے کما رہا ہے۔“ ڈرائیور نے اسے دیکھ کر غصے سے کہا۔

”تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ اداکاری کر رہا ہے؟“ جاوید نے حیرت سے پوچھا۔ اس شخص کو دیکھ کر ان کا دل بھی دکھ سے بھر گیا تھا۔ جس کے آنسو اس کے چہرے کو تر کر رہے تھے اور وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

”میری بیٹی بھوک سے مر گئی۔“ جاوید کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

”نہیں بھئی، مجھے یہ شخص جھوٹا نہیں لگ رہا۔“

جاوید اسے بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

”صاحب آپ کو کیا پتا کراچی میں گداگر طبقے میں کیسے کیسے فنکار موجود ہیں۔ اگر وہ یہ ادائیں نہ اپنائیں تو انہیں کون بھیک دے گا۔“ سگنل کھل گیا تھا کیسی تیزی سے آگے بڑھ گئی اور جاوید کے ذہن سے بھی وہ گداگر کہیں پہنچے ہی رہ گیا کہ دوسرے چوک کے بعد ان کا اپنا رہائشی علاقہ شروع ہونے والا تھا۔

اپنی گھڑی پر ایک نظر ڈال کر وہ خود کلامی میں بولے۔

”صرف دس منٹ کے اندر اندر..... انشاء اللہ میں اپنے گھر میں اپنی بیوی اور بچیوں کے ساتھ ہوں گا۔“

☆☆☆

جاوید صاحب کے اچانک گھر آ جانے پر گھر میں عید کا سماں ہو گیا تھا۔ فون پر انہوں نے بیوی کو یہی بتایا تھا کہ آفس میں کام کے باعث اس دفعہ وہ جون میں کراچی کا چکر نہیں لگا سکیں گے۔

”دعائی کوئی کراچی سے اتنی دور تھوڑی ہے جو

”شرین اپنی کوچنگ سے واپس آ چکی ہوگی۔“ لڑکیوں کو سڑک کر اس کرتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے سوچا۔ بڑی بیٹی شرین جو فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی وہ اپنی کزن کے ساتھ کوچنگ سینٹر جاتی تھی اور وہاں سے مغرب تک واپس آ جاتی تھی اور سین تو حسب عادت اپنی پھوپھی کے ہاں علیزہ کے ساتھ ہوگی۔“ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اس کا زیادہ وقت اپنی پھوپھی زاد اور اپنی دوست علیزہ کے ساتھ ہی گزرتا تھا اور یوں بھی یہ سب ایک ہی فلور پر رہتے تھے۔ فلیٹ سب کے اپنے، اپنے تھے مگر ایک ساتھ ہو جانے کی وجہ سے ملنا جلنا زیادہ تھا۔

”اب مجھے دیکھ کر سب ہی خوش ہو جائیں گے۔ شہلا اور بچیاں تو خوش ہوں گی ہی، شرین آپا کے دل کی کلی بھی پھل جائے گی۔“ اپنے بھائی سے انہیں کتنی محبت تھی یہ بتانے یا جتانے والی بات نہیں تھی۔ بیوگی کے بعد ان کے بھائی نے انہیں کیا سہارا دیا تھا اس کے لیے ان کا رُواں رُواں احسان مند تھا۔ اپنے سامان میں رکھے ہوئے ہینڈ بیگ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

”شہلا نے کہا تھا اپنی بچیوں کے ساتھ ساتھ اب علیزہ کے جہیز کی بھی ہمیں آہستہ، آہستہ تیاری کرنی ہے۔“ اور اس دفعہ اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ اپنی بھانجی کے لیے بھی سونے کا لاکٹ سیٹ لائے تھے۔ چھوٹا سا ہی سہی فی الوقت کچھ تو کرنا تھا اور بچیوں کی تیاری کا تو کچھ پتا نہیں چلتا۔ یہ بھی خدا کا فضل تھا کہ شہلا بے حد سکھڑ ہونے کے ساتھ ساتھ دل کی بھی بہت اچھی تھیں۔ کبھی بیوہ مند سے ایسی بات نہیں کی تھی جس سے انہیں کمتری کا احساس ہوتا بلکہ وہ جاوید کو ان کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے کے لیے کہتی تھیں۔

”ایسی بیوی کس کی ہوتی ہے جو سسرالی رشتوں کو بھی اپنا سمجھے۔“ وہ سوچ کر خود ہی مسکرا دیے۔

ماہنامہ پاکیزہ 50 جولائی 2013

خوب صورتی

رنگت نکھارنے اور داغ دھبے دور کرنے کے لیے سونف، خربوزے کے بیج، جو کا آٹا اور سنگترے کے چھلکے ہم وزن لے کر کوٹ لیں رات کو سونے سے قبل کچے دودھ کے اوپر جھاگ میں تھوڑا سا سونف ملا کر کریم سی بنالیں اور اس کریم کو خوب اچھی طرح چہرے پر ملیں صبح کے وقت کسی اچھے صابن سے چہرہ دھولیں۔ چند روز کے استعمال سے رنگت نکھر آئے گی باقاعدہ استعمال سے چہرہ بکھلا کھلا رہے گا۔

مرسلہ: جمیرا نوشین، منڈی بہاؤ الدین

بیٹیوں نے احتجاج کیا۔

”نہیں بیٹا، گھر چلو میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ جاوید جو سب کے لیے گرم گرم بھجے بھنوا کر لائے تو شہلا کو جانے کے لیے تیار دیکھ کر حیرت سے بولے۔

”ابھی رکو تو سہی۔“

”نہیں رات ہو رہی ہے، ہمیں گھر چلنا چاہیے۔“ ”تم بھی پاگل ہو سی سائڈ پر رات کو ہی تو مزہ آتا ہے۔“

”جاوید میرا دل گھبرا رہا ہے۔ خدا کے لیے گھر چلیں۔“ ”ٹھیک ہے، یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک اچھا ساریسٹورنٹ ہے وہاں سے ڈنر کرتے ہوئے چلتے ہیں۔“ شہلا کا دل چاہا کہ وہ کہہ دے کہ کھانا پیک کر والیں گھر جا کر کھائیں گے مگر انہیں معلوم تھا ان کی بات کوئی نہیں سنے گا وہ بھی چپ چاپ ڈنر کے لیے راضی ہو گئیں وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھیں۔ یہاں کھڑے ہو کر بھی ان کے دل میں ایک خوف سا بیٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

اس عورت کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ ”آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے یاد پہن لو ناں میرا فورٹ کلر۔“

”آپ بھی ناں اس عمر میں نئے دولہا بن جاتے ہیں؟ وہ تمہیں اور جب وہ سوٹ تبدیل کر کے آئیں تو جاوید کی نظر میں ان پر جم سی گئیں۔ وہ واقعی کوئی اپسرا لگ رہی تھیں۔ ان کی شادی کو اٹھارہ سال ہو گئے تھے اور شہلا کی عمر 36 سال کی تھی مگر ان کے چہرے اور دبے پتلے جسم کی وجہ سے وہ بہ مشکل تینیس یا چوبیس سال کی لگتی تھیں۔ چلتے وقت جب شہلا نے سیاہ حجاب پہنا تو جاوید کو یوں لگا جیسے نظر کا ٹیکا لگا لیا ہو یا چاند بادلوں میں سے جھانک رہا ہو۔

ان کی دونوں بچیاں اور نسرین آپا کی علیزہ سی سائڈ جا کر بے حد خوش تھیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے دور تک پانی میں جا رہی تھیں۔ چھٹی کا دن تھا، ساحل پر بے حد رش تھا اور سب لوگ اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ انجوائے کر رہے تھے۔ نسرین آپا کی علیزہ جب پانی میں زیادہ اندر جانے لگی تو شہلا کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی سی بجی۔

”اللہ نہ کرے یہ بچی اگر پانی میں جا کر ڈوب گئی تو نسرین آپا تو زندہ درگور ہو جائیں گی۔“ ”علیزہ جلدی باہر آؤ۔“ ان کو چلاتا دیکھ کر ساحل پر دو لا ابالی لڑکے بھی شوخی سے چیخے۔

”علیزہ باہر آؤ۔“ غیر لڑکوں کے منہ سے اپنی بھانجی کا نام سن کر شہلا نے مڑ کر دیکھا تو ہاتھوں میں شراب کی بوتل تھا مے جھومتے ہوئے لڑکے آگے بڑھ رہے تھے اور شہلا غصے اور دکھ سے پسینے میں نہا گئیں۔ بھاگ کر علیزہ کو باہر لے کر آئیں۔ گیلی چادر نیچوڑ کر اوڑھائی اور اسے بازوؤں میں چھپائے یوں گاڑی کی جانب لپکیں جیسے کوئی مرغی اپنے پروں میں اپنے چوزے کو سنبھالے جا رہی ہو۔

”امی ابھی رکے ناں اتنا مزہ آرہا ہے۔“

کے ہاتھ میں جب انہوں نے پچاس ہزار رکھے تو وہ حیران ہو گئیں۔

”یہ اس ماہ اضافی بونس ملا تھا کل ہماری سالگرہ ہے تم اپنے لیے کچھ لے لو۔“ ”مثلاً کیا.....؟“

”پچھلے سال تمہاری انگوشی گن پوائنٹ پر چھین لی گئی تھی اپنے لیے کوئی اچھی سی رنگ لے لو۔“ ”نہیں، اب میں نے سونے کی انگوشیاں پہننی ہی چھوڑ دی ہیں۔ آرٹیفشل رنگز اتنی خوب صورت آجاتی ہیں تو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم اپنا پیسہ سونے کے نام پر پتھر کریں۔“

”تو پھر تم اس سالگرہ پر کیا گفٹ لوگی۔ یہ پیسے تو صرف تمہارے لیے ہیں۔“

”اسے آپ بینک میں ڈال دیں کام آجائیں گے۔ میرے لیے آپ پھولوں کے ٹکٹن خرید کر دے دیجیے گا جو خوب صورت بھی لگتے ہیں اور سحر کن بھی۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“

سالگرہ کی شام کو اچانک ہی ہلکی سی بارش ہو گئی تو گرمی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ بچیاں سی سائڈ پر جانے کی ضد کرنے لگیں تو بھانجی علیزہ نے بھی شور مچا دیا کہ آج ماموں، مامی کی سالگرہ سی سائڈ پر ہی منائیں گے۔ شہلا نے صاف منع کر دیا۔ نسرین آپا پیر کی تکلیف کے باعث کہیں دور دراز نہیں جاتی تھیں اور شہلا کو یہ بات ہرگز منظور نہیں تھی کہ ان کی اکلوتی نندان کی خوشیوں میں شریک نہ ہوں اور جب نسرین آپا نے بصد اصرار کہا کہ وہ لوگ ان کی خاطر اپنا پروگرام خراب نہ کریں تو وہ بے دلی سے جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔

”تم نے اپنا شاکنگ پنک سوٹ نہیں پہنا جو میں نے تمہیں بوتیک سے دلوا یا تھا۔“ چلتے سے انہیں یوں سہل سا تیار دیکھ کر جاوید نے کہا۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو، اب کیا میں اتنا شوخ رنگ پہن کر سی سائڈ جاؤں گی۔ کوئی دیکھے گا تو کہے گا

بال ان کے حسن میں مزید اضافہ کر دیتے تھے۔

شادی کے شروع کے دنوں میں جب وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھوما کرتے تھے تو راہ چلتے اتنی حسین لڑکی کو دیکھ کر ٹھنک کر رک جایا کرتے تھے اور اب تو شہلا حجاب لیتی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ جب وہ گھر سے باہر نکلیں تو کسی کی نرم گرم نظریں ان کا احاطہ کریں۔ اپنی بچیوں کو بھی وہ چادر کے ساتھ اسکول اور کالج بھیجا کرتی تھیں۔

اس دفعہ نہ جانے کیوں ان کا دل جاوید کو باہر بھیجنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ ایسا آٹھ سالوں میں پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ شہلا کسی ضدی بچے کی طرح جاوید کو رکے کو کہہ رہی تھیں اور بار بار کہہ رہی تھیں۔

”اچھا بابا، کہاناں اب میں کراچی میں ہی جا ب ڈھونڈوں گا۔ اب تو خوش ہوناں!“

”ڈھونڈنے سے کیا کچھ نہیں مل جاتا۔ آپ کو اچھی جا ب ملی تو کچھ سوچے سمجھے بغیر باہر چلے گئے۔ اب کیا یہاں لوگ جا ب نہیں کرتے۔ آپ ڈھونڈیں گے تو دیکھیے گا جلد ہی کوئی اچھی سی جا ب مل جائے گی۔“

”شہلا پکا وعدہ..... کہاناں میں یہاں جا ب ضرور ڈھونڈوں گا ورنہ اپنی کمپنی والوں سے یہی کہوں گا کہ اس کی ایک شاخ میرے شہر میں بلکہ میرے علاقے میں بلکہ میرے گھر کے سامنے قائم کر دیں کہ آفس اور گھر ہمہ وقت نظروں میں رہیں۔“ شہلا ان کی لا ابالی باتیں سن کر برا ہی مان گئیں اور ان کی یہ ضد جاوید کے لیے نئی بھی تھی اور حیران کن بھی۔

☆☆☆

جاوید جب سے آئے تھے روزانہ ہی کہیں نہ کہیں گھوم رہے تھے کہ بچیاں باپ کی غیر موجودگی میں کہیں نہیں جاتی تھیں جہاں سسرال میں دعوتیں ہو رہی تھیں وہاں نسرین آپا بھی روزانہ ہی اپنے بھائی کی پسند کی کوئی نہ کوئی چیز پکا کر لے آتی تھیں۔ شہلا

انہیں وارننگ دے رہا ہو۔
 ”آپ جائے ناں گھر جلدی جائے۔“ شہلا
 نے تڑپ کر جاوید کو دیکھا اور التجائیہ لہجے میں
 بولیں۔ اب دوسرے گارڈ نے اتر کر گنتی شروع
 کر دی تھی۔ جاوید کو ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کوئی قیامت
 کا منظر ہو۔ ان کی متاع حیات گاڑی سے اتر کر
 آہستہ آہستہ بجیر کی جانب قدم بڑھا رہی تھیں اور
 جاوید سوچ رہے تھے کاش ان کی گاڑی میں بارود بھرا
 ہوتا تو وہ اپنی گاڑی اس بجیر سے ٹکرا دیتے۔ بچیاں
 باپ کی ہدایت کے تحت نیچے ہوئی گھٹی گھٹی سسکیوں کو
 یہ مشکل روک رہی تھیں۔

شہلا گاڑی کے قریب پہنچیں تو گاڑی میں
 بیٹھے ہوئے شرابی لڑکوں نے قہقہہ لگایا اور جاوید کو
 یوں لگا جیسے گدھ چیخ رہے ہوں اور وہ بجیر و آن کی
 آن میں اس تیزی سے تاریکی میں گم ہوئی جیسے وہ
 وہاں تھی ہی نہیں۔

☆☆☆

اس واقعے کو آج تین ماہ ہو چکے ہیں۔ وہ
 گاڑی کس کی تھی پتا نہیں چلا۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ جعلی
 تھی۔ وہ تینوں لڑکیاں اسکول اور کالج جانا چھوڑ چکی
 ہیں بلکہ خوف زدہ سی گھر میں محصور ہیں۔ جاوید مکمل
 سائیکسی ہو چکے ہیں۔ زیادہ وقت تو گھر میں دیوار کو
 ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ ہاں اکثر راتوں کو
 گھر سے باہر نکل جاتے ہیں اور ہر بڑی گاڑی کی
 طرف لپکتے ہیں اور روتے ہوئے کہتے ہیں۔

”ایک دھماکے میں میرے گھر کے سب لوگ
 مر گئے مگر میری ایک لاش کھو گئی ہے۔ اگر آپ نے میری
 بیوی کی لاش دیکھی ہو تو مجھے دے دو۔“ لوگ ان کی
 جانب ہمدردی سے دیکھتے ہیں اور پیسے دیتے ہوئے
 گزر جاتے ہیں اور کوئی دل جلا یہ جملہ بھی کہہ دیتا ہے۔
 ”آف بھیک مانگنے کے کیسے کیسے طریقے ہیں۔“

ساتھ اپنی بچیوں کو یوں دیکھا جیسے وہ وقتِ رخصت
 انہیں اپنی آنکھوں میں بھر لینا چاہتی ہوں۔
 ”مگر شہلا تم.....؟“ جاوید کی سمجھ میں کچھ نہیں
 آ رہا تھا کہ وہ کریں تو کیا کریں۔

”پلیز جاوید، یہ وقت جذباتی ہونے کا نہیں
 ہے۔ اس وقت میرے سامنے آپ اور تینوں بچیاں
 اہم ہیں۔ اگر میری اس قربانی سے آپ لوگ بچ گئے
 تو کیا ہو جائے گا۔“ اب پسینہ اور آنسو اس تیزی سے
 بہہ رہے تھے کہ ان دونوں میں فرق کرنا مشکل تھا۔
 ”اے کیا ایک منٹ کا مطلب نہیں سمجھتے تم
 لوگ؟“ وحشی سا گارڈ چلا یا۔

”جاوید اللہ حافظ!“ شہلا نے لرزتی ہوئی
 آواز میں کہا۔

”امی مت جائیں۔“ بچیاں سکتے ہوئے بولیں۔
 ”میری پیاری بیٹیوں، میری رانیوں اللہ تمہیں
 ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے اور تمہاری جان و
 آبرو کی حفاظت کرے۔“ شہلا نے رقت آمیز لہجے
 میں بیٹیوں کو دیکھ کر کہا۔

”امی.....!“ بچیوں کی گھٹی گھٹی سسکیاں ان
 کے دل و دماغ پر سنگ باری کرنے لگیں۔
 ”دیکھو رونا نہیں بلکہ دعا کرو۔“

”اے کیا ایک منٹ کا مطلب نہیں سمجھتے تم
 لوگ۔ کیا ایک گھنٹے میں اترے گی مہارانی یا گود میں
 آئے گی یا پھر گولی کی زبان سمجھو گے؟“ وہ وحشی گارڈ
 اب آگے بڑھ آیا تھا۔

”جاوید اللہ حافظ۔“ شہلا نے کپکپاتے لہجے
 میں یوں کہا جیسے پھانسی کا پھندا ان کے گلے میں ڈالا
 جانے والا ہو۔ شہلا گاڑی سے اتریں تو انہی کے
 ساتھ جاوید بھی گاڑی سے باہر نکلے۔

”اوئے الو کی دم تم نہیں۔ تم اپنی گاڑی میں
 جاؤ..... اندر دفع ہو۔“ گارڈ نے ان کے قدم
 بڑھانے سے پہلے کہا اور گن ان کی جانب تانی جیسے

اور شہلا اس وقت نزع کے عالم میں تھیں کہ کس طرح
 ان لڑکیوں کو اپنے سینے میں چھپالیں یا کوئی سلیمانی
 ٹوپی پہن کر یہاں سے بچیوں کو لے کر اڑن چھو
 ہو جائیں۔

”سن لے تو ہم صرف دس تک گنیں گے اور
 اس کے بعد سب کو ہمیں بھون دیں گے۔ سوچ لو،
 صرف ایک منٹ ہے تمہارے پاس۔“ دونوں گارڈ
 ان لڑکوں کے اشارے پر گنیں تان کر بولے۔

”ہم مرنے کے لیے تیار ہیں۔“ پھر جاوید نے
 شہلا سے آہستگی سے کہا۔ ”یہ لوگ جو چاہ رہے ہیں
 وہ کسی صورت نہیں ہو سکتا۔“

”یہ لوگ ہم دونوں کو مار کر ہماری تینوں بیٹیوں
 کو اپنے ساتھ بھی تولے جاسکتے ہیں۔“
 ”ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ جاوید نے مرے
 ہوئے لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے، میں ان کی گاڑی میں چلی
 جاتی ہوں اور جیسے ہی ان کی گاڑی چلے آپ اس
 گاڑی کا نمبر نوٹ کر کے پولیس کو فون کیجیے گا اور اپنی
 گاڑی گھر کی طرف بھگا دینا۔“

”کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی؟“
 ”نہیں، اس کے علاوہ کوئی بات میری سمجھ میں
 تو نہیں آرہی۔“

”مگر شہلا یہ جنگلی مسنڈے تمہارے ساتھ پتا
 نہیں کیا سلوک کریں گے۔“ جاوید کی آواز حلق میں
 پھنس رہی تھی۔

”ہاں، اچھے سلوک کے بارے میں تو سوچا
 بھی نہیں جاسکتا۔“

”تو پھر ہم سب مر جاتے ہیں۔“ جاوید نے اپنا
 لرزتا ہوا ہاتھ بیوی کے ہاتھ پر رکھا۔

”ہم مرنا بھی چاہیں تو اس وقت نہیں مر سکتے۔
 میری بیٹیاں، میری بھانجی اور آپ بچ جائیں تو یہی
 بہت ہے میرے لیے۔“ اس نے بہتے آنسوؤں کے

کھانا بہت مزیدار تھا سب نے خوب اچھی
 طرح کھایا۔ نسرین آپا کے لیے انہوں نے پیک
 کروالیا۔

”مامی آپ کیک بھی کاٹیں ماموں کے ساتھ۔“
 ”کیک تو گھر میں کاٹیں گے نسرین آپا خوش
 ہو جائیں گی۔“ ان کا لہجہ جلد باز سا تھا۔ ہوٹل سے
 باہر نکلتے وقت انہوں نے رسٹ وائچ پر نظر ڈالی
 رات کے بارہ بج رہے تھے۔

”اتنی جلدی جلدی کرنے میں بھی آدھی رات
 تو ہو ہی گئی ناں۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔

ابھی وہ سب گاڑی میں بیٹھے ہی تھے، جاوید
 نے گاڑی اشارٹ بھی نہیں کی تھی کہ ایک ”بجیر و آن
 کی گاڑی کے عین سامنے آ کر رکی۔ جاوید نے گاڑی
 پیچھے کر کے گاڑی باہر سڑک پر لی تو انہوں نے سکون
 کی سانس لی مگر ابھی وہ سیدھی سڑک پر جا ہی رہے
 تھے کہ وہی ”بجیر و آن کے سامنے یوں آ کر رک گئی
 جیسے آگے جانے کا راستہ روک رہی ہو۔“

”کیا بات ہے؟“ جاوید نے شیشہ نیچے کر کے پوچھا۔
 ”صاحب کہہ رہے ہیں ایک لڑکی کو گاڑی میں
 بھیج دو۔“

”آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہم شریف لوگ
 ہیں۔ میرا خیال ہے آپ ہمیں غلط سمجھ رہے ہیں۔“
 جاوید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔

”اے تیری سمجھ میں کیا بات نہیں آرہی۔ ایک
 لڑکی کو گاڑی میں بھیج دے۔ اس میں اتنی مغز ماری کی
 کیا ضرورت ہے؟“ تھوڑی دیر میں گاڑی میں سے
 چار شراب کے نشے میں چور لڑکے اترے اور غصے
 سے کہا۔

”جناب یہ نہیں ہو سکتا۔“ جاوید کا لہجہ آہنی
 ہو گیا۔ لڑکیاں پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں وہ بے اختیار
 رونے لگیں۔ دو اپنی بیٹیاں اور ایک نسرین آپا کی۔
 پندرہ، چودہ اور سترہ سال کی تین لڑکیاں ساتھ تھیں

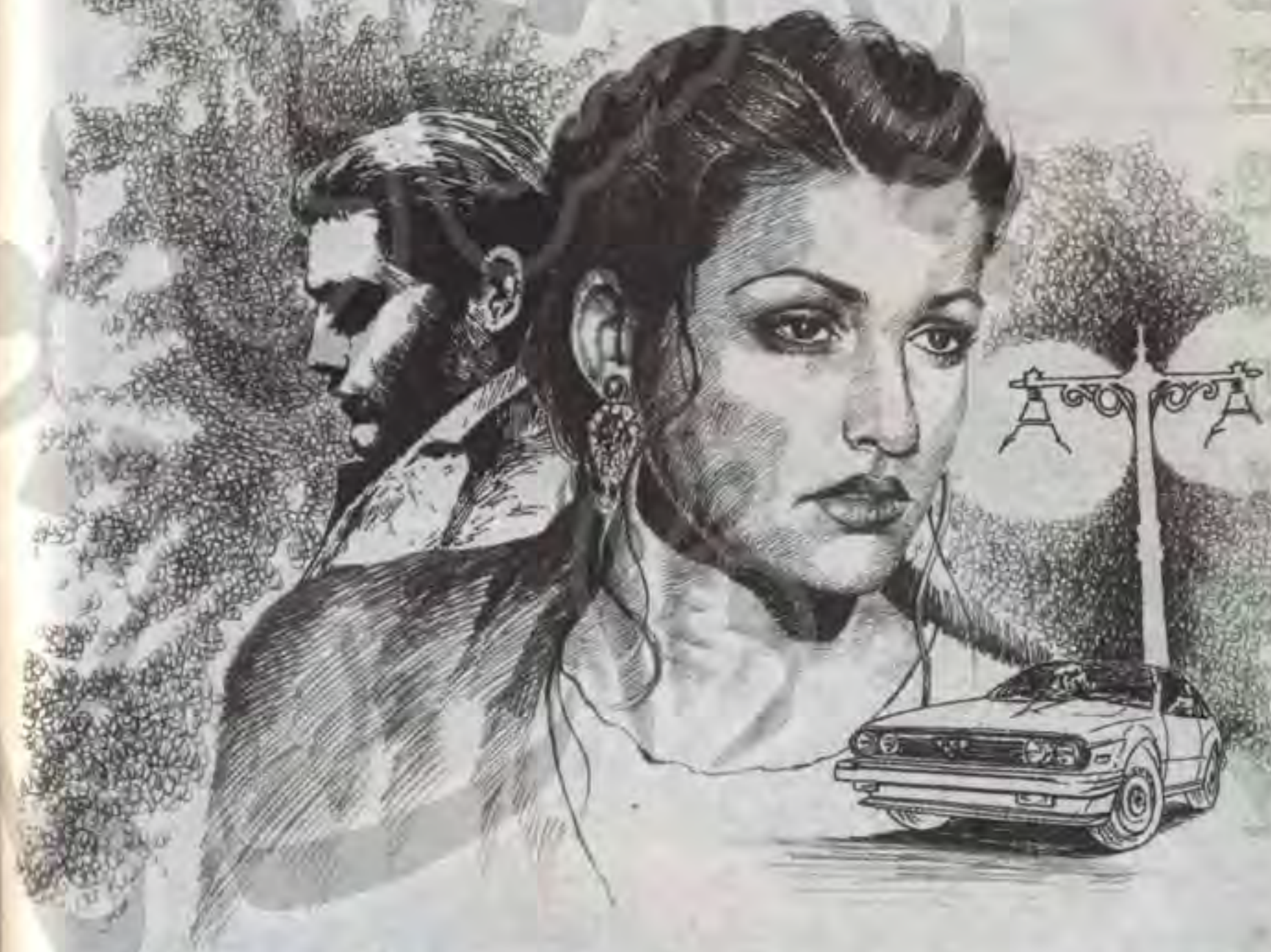


ناولٹ

کہیں دیکھ کر کہیں دل

قصہ حیات

دسواں حصہ



یہی کہ جب سے آزر کے جانے کی خبر ملی تھی وہ بہت زیادہ پریشان تھی۔ کاش..... وہ اسے ایک بار یہاں مل جاتا تو وہ اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑتی۔ وہ تو اسے اسی وقت ختم کرنا چاہتی تھی مگر حسد کی حالت دیکھ کر وہ حواس باختہ ہو گئی۔ اب بھی بیٹھے بیٹھے اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کہیں سے آزر کو ڈھونڈ کر لائے اور اس کا وہ حشر کرے کہ نشانِ عبرت بنا دے۔ آزر کی بے اعتبار

”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ..... الحمد للہ اتنا سچا

خواب۔ میری بیٹی نے اور کیا دیکھا؟“ قاری صاحب نے تجسس ہو کر پوچھا۔

”میں نے آپ کو احرام باندھے خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ اچانک آپ گرنے لگے تو ایک حبشی لڑکے نے ہاتھ بڑھا کر آپ کو اٹھایا۔“ یمنی نے بتایا تو قاری صاحب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”یہ..... یہ تو واقعی میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں گرنے لگا تھا کہ مجھے حبشی نوجوان نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ رش اتنا زیادہ نہیں تھا اس لیے میں جلد ہی اٹھ گیا۔ اگر رش زیادہ ہو تو کون کسی کو اٹھاتا ہے۔ اکثر لوگ پاؤں تلے آ کر کچلے جاتے ہیں لیکن میں تو حیران ہو رہا ہوں کہ تمہیں اتنے سچے خواب آتے ہیں۔ کیا اس سے پہلے بھی ایسے خواب آتے ہیں جو سچ ثابت ہوئے ہوں؟“ قاری صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں، اکثر مجھے ایسے خواب آتے ہیں۔“ یمنی نے جواب دیا۔

”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، اللہ کا میری بیٹی پر بہت کرم ہے۔ اتنے سچے خواب حقیقت میں ایسی بشارتیں ہوتی ہیں جن سے اللہ پر ایمان اور زیادہ پختہ ہوتا ہے۔ یقیناً تم اللہ کے بہت قریب ہو اور وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔“ قاری صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

”محبت۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ قاری صاحب ایک دم پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھے اور محبت اور نرمی سے اسے دلاسا دینے لگے۔

”بیٹا یہ رونے کی نہیں خوش ہونے کی بات ہے کہ اللہ کا تم پر اتنا کرم ہے۔ تم اچھی اور نیک بچی

کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

ایمن نے ناشتا لگوادیا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں قاری صاحب سے ملنے چلی گئیں اور ملازمہ کو ہدایات کر دیں کہ یمنی کو ناشتا کروا کے اندر بھیج دینا۔

”کیا کوئی مہمان آیا ہے اور ممما کہاں ہیں؟“ یمنی نے پوچھا۔

”بیگم صاحبہ ڈرائنگ روم میں ہیں..... آپ کے قاری صاحب آئے ہیں، ناشتا کرنے کے بعد آپ بھی وہاں چلی جائیے گا۔“ بیگم صاحبہ کا حکم ہے۔ یمنی نے نیچے آ کر قاری صاحب کی بات سنی تو اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”قاری صاحب؟“ وہ زیر لب بڑبڑائی اور رات کو دیکھا خواب اسے یاد آنے لگا۔ اس نے ناشتا دھوا چھوڑا اور سر پر دوپٹا لے کر ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی۔ یمنی نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے اٹھ کر محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”جیتی رہو..... خوش رہو۔“ قاری صاحب نے اسے دعا دی اور یمنی ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”ماشاء اللہ، قاری صاحب عمرہ کر کے آئے ہیں۔“ ایمن نے مسکرا کر اسے بتایا۔

”اور میرے لیے کھجوروں کے ساتھ گولڈن تسبیح بھی لائے ہیں۔“ یمنی نے مسکرا کر کہا تو قاری صاحب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کھجوروں کا لافانہ اور تسبیح نکال کر اسے دی تو وہ گولڈن ٹکڑی ہی تھی۔ ایمن بھی حیران رہ گئیں۔

”بیٹا، آپ..... آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں آپ کے لیے گولڈن ٹکڑی تسبیح لایا ہوں؟“ قاری صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

”میں نے آج رات آپ کو خواب میں دیکھا تھا۔“ یمنی نے صاف گوئی سے بتایا تو قاری صاحب کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

گزر کر اللہ سے دعا کرنے لگی اور سسکتے لگی اور یمنی روتے روتے سو گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کے قاری صاحب احرام پہنے بیت اللہ کا طواف کرنے میں مصروف ہیں۔ اچانک وہ گرنے لگتے ہیں تو ایک حبشی نوجوان ہاتھ بڑھا کر انہیں پکڑنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر وہ اپنا طواف مکمل کرتے ہیں..... خواب کے دوسرے حصے میں اس نے دیکھا کہ قاری صاحب ایک لفافے میں کھجوروں کے ساتھ ایک سنہرے رنگ کی تسبیح اسے دے رہے ہیں۔ یمنی ان کے سامنے بیٹھی رو رہی ہے اور قاری صاحب اٹھ کر اس کے سر پر پیار دیتے ہیں۔ یمنی کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس وقت فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ یمنی چونک کر اٹھ بیٹھی..... اور حیرت سے سوچنے لگی کہ قاری صاحب اچانک اس کے خواب میں کیسے آ گئے۔ وہ تو بچپن میں ان سے قرآن پاک پڑھا کرتی تھی..... اور پھر وہ کبھی کبھار ان کے گھر آیا کرتے تھے..... اور اب تو عرصہ ہی گزر چکا تھا۔ وہ کبھی نہیں آئے تھے..... یمنی ان کے بارے میں حیرت سے سوچتی رہی..... اور پھر سو گئی۔ صبح وہ دیر تک سوتی رہی..... بارہ بج رہے تھے..... جب ایمن اس کے کمرے میں آئیں..... اور اسے جگانے لگیں۔

”اٹھو بیٹا..... کافی دیر ہو گئی ہے..... تم کب تک سو تی رہو گی، میں نے تمہارے لیے خود ناشتا تیار کیا ہے..... فریش ہو کر آؤ اور ناشتا کر لو۔“ ایمن نے محبت سے کہا تو اس نے اٹھ کر جمائی لی۔

”ٹھیک ہے ممما..... میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“ اور وہ اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔

ایمن جا کر ڈرائنگ ٹیبل پر اس کے لیے ناشتا لگانے لگیں تو ڈور بیل بجی۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار نے انہیں آ کر کہا کہ قاری صاحب ان سے ملنے آئے ہیں۔

”انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں ابھی آتی ہوں۔“ ایمن ایک دم خوش ہو گئیں چوکیدار جی بہتر

محبت سے اس کا دل تو جوڑنا تھا..... حسنہ کی موت نے اسے اندر سے بے انتہا مضطرب کر رکھا تھا۔ جمال احمد کے ساتھ یہ سب شیر کرنے سے اس کا بوجھ تو کم ہوا تھا مگر ڈپریشن بہت بڑھ گیا گو کہ انہوں نے بھی نہایت صاف گوئی سے اسے گتہا گتہا بھرا دیا تھا..... وہ اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کرتی تھی..... کوئی کام کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا..... ہر وقت حسنہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہتی..... یا پھر آزر..... آزر نے کوئل کو مہرہ کیوں بنایا.....؟ اس نے اس پر الزام کیوں لگایا..... اور اب تو اسے یقین ہونے لگا تھا کہ کوئل بے گناہ تھی..... اس کا کوئی قصور نہیں تھا..... یہ آزر کے شاطر ذہن کی پلاننگ تھی..... اس نے کتنی آسانی سے یمنی کو بے وقوف بنایا اور وہ کوئل سے متنفر ہو گئی..... حسنہ اسے منع بھی کرتی تھی..... مگر وہ حسنہ کی کسی بات پر یقین ہی نہیں کرتی تھی..... وہ صرف آزر کو سچا سمجھتی تھی..... اس کی خواہشات نے اس کی آنکھوں پر کیسے پردہ ڈال دیا تھا کہ آزر کے علاوہ ساری دنیا اسے جھوٹی لگتی تھی کیونکہ اس کا دل آزر کی محبت سے سرشار تھا اور آزر کے خلاف کوئی بات سننا نہیں چاہتا تھا..... اور اب وہ آزر کی ہر بات، ہر حرکت کے بارے میں سوچنے بیٹھی تو اسے یقین آنے لگا کہ آزر اسے دھوکا دیتا رہا تھا..... مگر تب وہ ایسا سوچنے کو تیار ہی نہیں تھی..... اور اب دھوکا کھا چکنے کے بعد اسے یقین آ رہا تھا لیکن اب اس یقین کا کیا فائدہ تھا..... وہ بھی ایک عام سی لڑکی تھی..... جس نے محبت کے ہاتھوں بہت بری شکست کھائی تھی..... جس محبت پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کیا اس نے ہی اسے ڈس لیا..... وہ سسکتے لگی۔

”خدا کرے، آزر تمہیں کبھی سچی محبت نہ ملے..... تم محبت کو ترسو..... پھر تمہیں احساس ہو کہ تم نے کسی کی محبت کو ڈھال بنا کر کیسے اسے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی..... تمہاری ہر محبت ناکام ہو..... وہ

ہو۔“ قاری صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

”نہیں، میں نیک نہیں ہوں۔ میں اچھی نہیں ہوں۔ میں تو..... میں تو.....“ وہ ہونٹ بھیج کر سسکنے لگی۔

”تم جیسے لوگ تو جن کے لیے بھی دعا کریں وہ ضرور قبول ہوتی ہے کیونکہ جن کے دل پاک صاف ہوتے ہیں اللہ صرف انہیں ہی اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور انہیں اپنی محبت سے نوازتا ہے۔ تم ہمارے لیے دعا کیا کرو۔ تمہاری دعائیں ضرور پوری ہوں گی۔“ قاری صاحب نے مسکرا کر کہا۔

”اور بددعا؟“ یمنی نے اچانک پوچھا۔

”ہاں، شاید وہ دعا سے پہلے ہی پوری ہو جائے گی مگر بیٹا کوشش کرنا کسی کو بددعا نہ دینا۔ ہم اس نبیؐ کے امتی ہیں جنہوں نے بہت تکلیفوں کے باوجود بھی صرف دعائیں دیں۔“ قاری صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”کیا اس شخص کو بھی بددعائیں نہیں دینی چاہیے جو کسی انسان پر انتہائی ظلم کرے اور پھر دنیا سے چھپنے کی کوشش کرے۔ جس تک نہ قانون پہنچ سکے اور نہ ہی مظلوم؟“ یمنی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”اسی لیے تو فرمایا گیا ہے کہ مظلوم کی بددعا بے بچو کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔ بیٹا ایک عام مظلوم انسان کی بددعا میں جب اتنا اثر ہوتا ہے تو نیک لوگوں کی بددعا میں کتنا اثر ہوگا۔ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔“ قاری صاحب نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

”یمنی بی بی، آپ کا فون آیا ہے۔ میں نے ہولڈر رکھا ہے۔“ ساجدہ نے جلدی سے ڈرائنگ روم میں آکر اسے کہا تو وہ چونک گئی اور قاری صاحب سے اجازت لے کر باہر چلی گئی۔

”ماشاء اللہ، آپ کی بیٹی آپ کے لیے بہت بڑی رحمت ہے۔ اللہ آپ پر اور اس گھر پر خاص کرم فرمائے۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں کچھ اور

عزیزوں سے بھی ملاقات کرنی ہے۔“ قاری صاحب نے اپنا تھیلا اٹھا کر ایمن سے اجازت طلب کی اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئے۔ ایمن کے چہرے پر عجیب سی سرشاری اور اطمینان پھیلنے لگا۔

☆☆☆

یمنی لاؤنج میں کھڑی ٹیلی فون پر باتیں کر رہی تھی اور اس کے چہرے پر انتہائی پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے۔

”آپ کیا سمجھتی ہیں کہ حمزہ کا کوئی وارث نہیں جو آپ نے اسے یوں موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ آپ مجھے حقیقت بتائیں، بات کیا ہے ورنہ میں پاکستان آکر سب سے پہلے آپ کو ہی شوٹ کروں گا۔“ عمر نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

”کیا مجھے شوٹ کرنے سے حمزہ واپس آجائے گی اگر ایسا ممکن ہوتا تو میں سب سے پہلے اپنے آپ کو شوٹ کرتی۔ میں جانتی ہوں کہ حمزہ کی ڈیجھ کا آپ کو بہت بڑا شاک لگا ہے لیکن مجھے تو آپ سے بھی زیادہ شاک لگا ہے کیونکہ میں نے حمزہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے خودکشی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں اسے ایک لمحے کے لیے نہیں بھول سکتی۔“ یمنی نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔

”میں یہی تو جانا چاہتا ہوں کہ اس نے خودکشی کیوں کی؟“ عمر نے اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں جانتی۔“ یمنی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”آپ سب کچھ جانتی ہیں۔ آپ ہی اسے گھر سے لے کر کہیں گئی تھیں۔“ عمر نے خفگی سے کہا۔

”میرے پاس آپ کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں۔ آپ مجھے جو سزا دینا چاہتے ہیں، میں اس کے لیے تیار ہوں۔“ یمنی نے پُر اعتماد لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

ایمن اس کے پیچھے کھڑی اس کی باتیں سن رہی

تھیں۔ یمنی مڑی تو اس نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے فوراً نظریں چرائیں۔

”کس کا فون تھا، تم اتنی.....“ ایمن اس سے پوچھ ہی رہی تھیں اور وہ انہیں کوئی جواب دیے بغیر ہی چلی گئی۔ ایمن حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

آزر بہت خوش تھا۔ چند روز میں اس کی شادی ہونے والی تھی اور وہ شادی کی تیاریوں میں بہت زیادہ مصروف تھا۔ وہ اکثر غیثا کے ساتھ جا کر شاپنگ کرتا۔ اس کے ماں باپ بھی بہت زیادہ خوش تھے۔ آزر یہ خوشی کی خبر جواد کو سنانا چاہتا تھا۔ اس نے کبھی اسے اپنے موبائل سے کال نہیں کی تھی۔ ہمیشہ میٹ سے کرتا تھا۔ رات کافی گہری ہو گئی تھی۔ جب وہ اس کا نمبر ملارہا تھا۔ کافی بیلز کے بعد جواد نے فون اٹھایا تو آزر کی آواز سن کر انتہائی خوش ہونے لگا۔

”یار آزر، تم کہاں چلے گئے ہو کب واپس آؤ گے۔ میں تمہیں بہت مس کرتا ہوں۔ سچ ہمارے گروپ کو تو کسی کی نظر ہی لگ گئی ہے۔ بہت ہی عجیب و غریب باتیں سننے میں آرہی ہیں۔“ جواد فون ریسیو کرتے ہی آزر سے شروع ہو گیا۔

”کیوں، کیا مطلب؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”یار حمزہ کے بارے میں بہت عجیب و غریب باتیں سننے میں آرہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس کا مرڈ ہو گیا ہے کوئی کہتا ہے اس نے خودکشی کر لی ہے لیکن یہ بالکل confirmed ہے کہ حمزہ اس دنیا میں نہیں رہی۔“ جواد نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔

”کیا.....؟“ آزر نے حیرت سے چلا تے ہوئے کہا۔

”یار وہ اتنی اچھی لڑکی تھی۔ اتنی معصوم اور پاک باز..... کون اس کا مرڈ کر سکتا ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے تو اس بات کا یقین ہی نہیں آ رہا اور رہی خودکشی کی بات تو وہ خودکشی کیوں کرتی۔ اسے تو کوئی

کھیں دیب جلع کھیں دل

پرا بلیم، کوئی ڈپریشن نہیں تھا۔ وہ اپنی منگنی سے بھی خوش تھی۔ اسٹڈیز میں بھی ٹھیک تھی۔ معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس نے ایگزامز دیے اور نہ ہی یمنی نے..... ایگزامز کے بعد ہمیں پتا چلا کہ حمزہ کی ڈیجھ ہو گئی ہے۔ یقین مانو ساری کلاس اس کے غم میں روتی رہی۔ میں تو دودن نہیں سو سکا۔“ جواد نے گلوگیر آواز میں کہا تو آزر ایک دم خاموش ہو گیا۔

”تمہیں بھی دکھ ہو رہا ہے ناں اس لیے تم بھی خاموش ہو گئے ہو۔“ جواد نے کہا تو وہ ایک دم چونکا۔

”آں..... ہاں..... ہاں۔“

”ہاں یار، ایک بات یاد آئی۔ یمنی کا فون آیا تھا وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ تم یو کے چلے گئے ہو تو اس نے تمہارے لیے ایک پیغام دیا ہے کہ آزر سے کہنا کہ تم دنیا کے کسی کونے میں بھی چلے جاؤ میرا سایہ تمہارے تعاقب میں رہے گا۔“ جواد نے کہا تو وہ بری طرح بوکھلا گیا۔

”کیا.....؟“ اور پھر ایک دم وہ خاموش ہو گیا۔

”یار، تم نے اسے فون کیوں نہیں کیا۔ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے اسی لیے اس نے یہ کہا ہے کہ تم جہاں کہیں بھی جاؤ گے وہ تمہارے ساتھ ساتھ رہے گی۔“ جواد اپنی ہی لے میں بولتا چلا گیا اور آزر سے اس کی باتیں سننا محال ہو گیا۔ اس نے ایک دم فون بند کر دیا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

جواد ہیلو..... ہیلو کرتا رہ گیا مگر کال ڈراپ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی مگر یمنی کو ایک لمحے کے لیے بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ انتہائی مضطرب ہو کر کروٹیں بدل رہی تھی اور ہر کروٹ پر اسے آزر کی تلخ یاد آتی۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے وہ خوشگوار لمحے جنہیں وہ محبت سمجھتی تھی اور تب وہ اسے بہت مسرور رکھتے تھے۔ اب وہی خوب صورت یادیں

”ہاں، یہی بہتر ہے۔ ہمارے پاس سوچنے کا زیادہ وقت نہیں۔ اگر وہ لوگ آئے تو بہت مشکل ہوگی۔ یہاں سے بھاگنے کی جلدی کرو۔“ عظیم احمد نے کہا اور تینوں ضروری سامان لے کر گاڑی میں بیٹھ کر نہ جانے کہاں کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

یعنی صبح بیدار ہوئی تو اس کی طبیعت بہت بوجھل تھی اور آنکھیں بری طرح سوچی ہوئی تھیں۔ جمال احمد آفس جانے سے پہلے ہمیشہ اس کے کمرے میں ضرور جاتے تھے۔ وہ اس کے کمرے میں آئے تو یعنی کے چہرے کی طرف دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”کیا تم رات بھر نہیں سوئیں؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا پروہ خاموش رہی۔

”دیکھو بیٹا کب تک ایسا چلے گا۔ اب تمہیں اپنے آپ کو کمپوز کرنا چاہیے۔ اب نارمل لائف گزارنے کی کوشش کرو۔ تم اپنی اسٹڈیز اور دیگر ایکٹیویٹیز دوبارہ شروع کرو۔ یوں ہر وقت کمرے میں بند رہ کر سوچتے رہنے سے تم بیمار ہو جاؤ گی۔“ جمال احمد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی اور کوئی جواب نہ دیا۔

”کیا بات ہے تم اتنی خاموش کیوں ہو؟“ انہوں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

”پھر اس خاموشی کی وجہ؟“

”میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”بیٹا یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ زندگی یونہی صرف سوچ بچار میں نہیں گزر سکتی۔ زندگی میں کرائسز آتے رہتے ہیں اور یہ کرائسز انسان کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ پاز یٹو دے کر جاتے ہیں۔ ممکن ہے اسی میں سے تمہاری زندگی کے لیے کوئی بہتر راہ نکل آئے۔“ جمال احمد نے اسے

میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔“ آذر نے انتہائی غصے سے اس کے چہرے پر دو تین تھپڑ لگائے۔ ”تم نے مجھے مارا۔ مجھے تھپڑ لگایا مجھے..... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ نیشا نے غصے سے چلاتے ہوئے اتنا شور مچایا کہ آذر بھی گھبرا گیا۔ اس نے کمرے کی تمام سجاوٹیں نہیں کر دی اور دیگر چیزیں اٹھا اٹھا کر کارپٹ پر پھینکنے لگی پھر اس نے روتے ہوئے اپنا موبائل ہاتھ میں لیا۔

”میں ابھی پولیس کو کال کرتی ہوں۔“ اس کے نمبر ملانے پر آذر بری طرح گھبرا گیا۔ اس نے نیشا کے ہاتھ سے موبائل چھیننے کی کوشش کی اور اسی کوشش میں نیشا کا ہاتھ مڑ گیا۔ وہ اور زور سے چیخنے چلانے لگی اور باہر جانے کے لیے دروازہ کھولنے لگی۔ آذر نے اسے پیچھے سے کھینچا اور اسے روکنے کی کوشش کی مگر نیشا انتہائی غصے میں تھی۔ اس نے آذر کو زور سے دھکا دیا اور دوبارہ باہر جانے لگی تو آذر نے گھبرا کر سائنڈ ٹیبل پر پڑا میٹل کا ایک ڈیکوریشن پیس اس کی طرف پھینکا جو قدرے بھاری تھا۔ وہ اس کی کمر میں جا لگا۔ وہ وہیں لڑکھڑا کر گر پڑی اور زور زور سے چلانے لگی۔ آذر اس کا موبائل لے کر کمرے سے باہر نکل گیا اور جلدی سے دروازے کو لاک لگا دیا۔ وہ بھاگتا ہوا اپنے ماں باپ کے پاس آیا۔ دونوں اسے گھبرایا ہوا دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ آذر نے انہیں ساری بات بتائی تو وہ دونوں بھی بہت پریشان ہو گئے۔

”یہ..... یہ تو بہت برا ہوا..... اگر نیشا اور اس کے گھر والوں نے پولیس میں رپورٹ لکھوادی تو تمہیں جیل جانا پڑے گا اور یہاں پر تو سزائیں بھی بہت سخت ہیں۔ ہمیں یہ گھر بار چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا چاہیے۔ ورنہ نیشا کے گھر والے ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔ ایک بار ہم پھنس گئے تو پاکستان واپس جانا بھی ممکن نہیں ہوگا۔“ مسز عظیم کو یہی بات سوچھی۔

سکون نہ ملے۔ تو اس کی زندگی گوانٹوں کی ایسی سیج بنا دے کہ اسے ایک لمحے کو چین نہ آئے۔ اسے ہر لمحہ میں اور حسہ یاد آئیں پھر اسے یہ احساس ہو کہ اس نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔ حسہ کو موت کے منہ میں دھکیل کر اور مجھ سے زندگی کے سب رنگ چھین کر..... مجھے چلتی پھرتی لاش بنا کر۔ کاش وہ بھی ایسی لاش بن کر پھرے کاش.....!“ وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ وہ دونوں ہاتھ بلند کر کے اتنی شدت سے روئی کہ شاید زندگی میں اتنی شدت سے نہیں روئی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور اب اس کے اندر کا آتش فشاں آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا اور آنسوؤں کی روانی میں بھی کچھ کی آنے لگی تھی یا پھر آنکھیں آنسو بہا بہا کر تھک چکی تھیں اور اب ان میں مزید سکت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ اس کے اندر کے جذبات کا ساتھ دے سکیں۔

☆☆☆

یہ یعنی کی بددعاؤں کا اثر تھا یا آذر کے اپنے کروت سامنے آئے تھے کہ شادی کی پہلی رات ہی اس کی بے انتہا فیشن اسٹیل اور امریکن معاشرے کی پروردہ نیشا نے جب اپنے ہوش سے لے کر آج تک کے تمام لوا فیر ز آذر کو سنانے شروع کیے کہ جس میں ہر قسم کے تعلقات کی حدیں پار کی جا چکی تھیں۔ وہ مزے لے لے کر اسے قصے سناتی رہی اور آذر کی نگاہوں میں یعنی اور حسہ کی شیطانی گھومنے لگیں اور پھر جو ادکی زبانی یعنی کی بات کہ ”تم دنیا کے جس کونے میں بھی جاؤ گے میرا سایہ تمہارا تعاقب میں رہے گا۔“ اس کا دماغ چکرانے لگا اور اس نے غصے سے نیشا کی طرف دیکھا وہ مسکرا مسکرا کر اسے اپنی باتیں سنارہی تھی۔

”تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ میں تم سے تمہاری محبت اور relationship کی باتیں پوچھتا رہا تم مجھے narrow minded اور rigid کہتی رہیں۔ تم نے مجھے اتنا بڑا دھوکا دیا۔

اسے خون کے آنسوؤں لاری تھیں۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اس وقت اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل پھٹنے کو بے تاب ہو۔ اس کے اندر ایک آتش فشاں پھٹ رہا تھا۔ جس کا لاوا اس کے آنسوؤں کی صورت میں بہہ رہا تھا اسے اب بھی یقین نہیں آتا تھا کہ آذر نے اسے محبت کے نام پر دھوکا دیا ہے اگر وہ سب کچھ خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتی تو شاید کبھی یقین نہیں کرتی مگر اس نے تو سب کچھ دیکھا بھی تھا اور سنا بھی تھا اور اپنے لیے اس کی آنکھوں میں انتہائی نفرت بھی دیکھی تھی۔ وہ مضطرب ہو کر انھی اس کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں۔ اسے قاری صاحب کے الفاظ یاد آنے لگے۔

”بیٹا، تم ہمارے لیے دعا کیا کرو۔ تم جیسے لوگوں کی دعائیں بہت جلدی قبول ہوتی ہیں۔“

”اور بددعا کیں؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”شاید وہ دعا سے بھی پہلے لیکن تم کسی کو بددعا نہ دینا۔“ قاری صاحب نے اسے نصیحت کی تھی۔

”نہیں، آج میرا دل پھٹ رہا ہے، مجھے حسہ بھی بہت یاد آرہی ہے اور اپنی تذلیل بھی، یا اللہ..... وہ گنہگار شخص ہم دونوں کی زندگیوں میں زہر بھر کر کتنی آسانی سے چلا گیا اور اسے رتی بھر احساس نہیں کہ اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے۔ حسہ کے مگتیر عمر کی آہیں اور سسکیاں مجھ سے نہیں سنی جاتیں اور خود میرے اندر جو طوفان برپا ہے وہ اس سے بھی لا تعلق ہے۔ اسے احساس ہی نہیں کہ اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے! میں ایک زندہ لاش بن گئی ہوں۔ اب شاید زندگی بھر کسی سے محبت نہیں کر سکوں گی۔ اس نے میرے اندر کے اعتبار اور یقین کو کرچی کرچی کیا ہے۔ یا اللہ آج میں رات کے اس پہر اس شخص کے لیے دل کی گہرائی سے بددعا کرتی ہوں کہ اسے زندگی بھر چین نہ ملے۔ وہ محبت مانگے تو اسے محبت نہ ملے۔ وہ سکون مانگے تو اسے

اور بہت خوش بھی..... انہوں نے جلدی سے ان لوگوں کے لیے کھانا لگوا دیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جمال احمد نے اماں جی کو یمنی کے خواب کے بارے میں بتایا تو وہ بھی حیران رہ گئیں اور کافی دیر خاموشی سے کچھ سوچتی رہیں۔

”یہ کوئی معمولی بات نہیں..... بہت بھاری منزل ہے اور اس کے لیے بہت محنت اور کوشش کی بھی ضرورت ہے..... جمال احمد تم اسے کس کام میں ڈالنا چاہتے ہو..... اس کی شادی کرو اور یہ اپنا گھر بسائے۔ لڑکیوں کے لیے تو یہی ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھروں کو آباد کریں۔“ اماں جی نے رائے دی۔

”اماں جی..... یہ محض میری اور آپ کی سوچ تو ہو سکتی ہے مگر اس رب العزت کی نہیں جس نے ہم انسانوں سے مختلف کام لینے ہوتے ہیں۔“ جمال احمد نے کہا۔

”تم..... صرف اس کا ایک خواب سن کر اسے اس راہ پر ڈال رہے ہو..... ہر خواب حقیقت تو نہیں ہوتا ناں.....!“ اماں جی نے انہیں سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”اماں جی..... یمنی کے بیشتر خواب حقیقت ہوتے ہیں، اس پر مجھے پورا یقین ہے۔“ جمال احمد نے بیٹی کی طرف دکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا..... یہ اتنی اللہ والی کب سے ہو گئی؟ پہناتے تم اسے پیٹ اور شریں رہے ہو اور باتیں تم بڑی بڑی، اللہ والی کر رہے ہو..... مجھے تو تم باپ بیٹی کی سمجھ نہیں آرہی..... آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟“ اماں جی گہری سانس لیتے ہوئے بولیں۔

”اماں جی..... انسان کے لباس کا اس کی روح کے ساتھ وہ تعلق نہیں جو آپ سوچ رہی ہیں۔ انسان کی روح کا تعلق تو اس کے پاک دل اور اس کی سوچ سے ہو سکتا ہے۔“ جمال احمد نے رائے دی۔

وہ کبھی ممکن نہیں بنتی اور ممکن کام تو عام انسان بھی کر سکتے ہیں..... مگر ناممکن کاموں کے لیے اللہ اپنے خاص بندوں کا انتخاب کرتا ہے..... اس لیے میں..... پُر امید ہوں کہ تمہارے اس خواب کا کوئی نہ کوئی مطلب ہے..... اور اللہ تم سے جو بھی کام لینا چاہے گا اس کے لیے خود بخود راستے بنا دے گا..... اور تمہیں مدد بھی فراہم کرے گا..... لیکن بیٹا ایک بات یاد رکھنا..... ہر ناممکن کام کو صرف ایک چیز ممکن بناتی ہے اور وہ ہے انسان کا یقین کامل اپنے آپ پر اور اللہ پر کامل یقین..... ایسا یقین جس میں رتی برابر شک کی گنجائش نہیں ہو۔“ جمال احمد نے اسے سمجھایا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

اگلے روز وہ دونوں گاؤں جانے لگے تو ایمین حیران رہ گئیں وہ شوہر سے بھی جانے کی وجہ پوچھتی رہیں مگر وہ انہیں ٹالتے رہے۔ یمنی نے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ ایمین کے دل میں کھٹکا سا پیدا ہوا اور انہیں یقین ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی اہم بات ضرور ہے جسے اُن سے چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے..... انہیں یہ بھی افسوس ہو رہا تھا کہ جمال احمد اور یمنی ان پر اعتبار نہیں کر رہے تھے گو کہ جمال احمد نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ ماحول کی تبدیلی کے لیے یمنی کو اماں جی سے ملوانے لے جا رہے ہیں..... لیکن اتنی اچانک انہیں کیا سوچھی.....؟ یقیناً یمنی کے رشتے کے لیے اماں جی نے اسے بلایا ہوگا..... شاید اماں جی اسے لڑکے والوں کو دکھانا چاہتی ہیں اگر شادی کی بھی بات ہے تو ماں سے چھپانے کی کیا ضرورت ہے..... وہ سارا دن بیٹھی سوچتی رہیں اور خیالات کا تانا بانا بنتی رہیں مگر انہیں کوئی سرا نہیں مل رہا تھا۔

☆☆☆

یمنی اور جمال احمد اماں جی کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ بھی انہیں اچانک دیکھ کر حیران بھی ہوئیں

وہ پریشانی کے عالم میں سوچ رہی تھی کہ کس سے ذکر کرے..... بہت سوچنے کے بعد اسے قاری صاحب کا خیال آیا اور اس نے ان سے رابطہ کر کے اپنے خواب کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گئے تھے پھر کافی دیر سوچنے کے بعد گویا ہوئے۔

”بیٹا میرا خیال ہے اللہ آپ سے کوئی خاص کام لینا چاہ رہا ہے اور اس کے لیے وہ آپ کو تیار کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ گاؤں چلی جائیں اور اپنی دادی سے اس خواب کا ذکر کریں، مجھے امید ہے وہ آپ کے لیے کوئی بہتر راہ نکالیں گی۔“ قاری صاحب نے اسے سمجھایا۔

”مگر قاری صاحب یہ کیسے ممکن ہے..... میں تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے یہ خواب میرا کوئی واہمہ ہو۔“ یمنی نے بے یقینی سے کہا۔

”نہیں بیٹا..... میرے خیال میں یہ اللہ رب العزت کی طرف سے کوئی اہم اشارہ ہے۔ آپ اپنے والدین سے بات کریں اور گاؤں چلی جائیں۔“ قاری صاحب نے اس سے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔ وہ سارا دن بہت پریشان رہی..... کبھی خواب کے بارے میں سوچتی تو کبھی قاری صاحب کی تجویز کے بارے میں وہ عجیب الجھن میں مبتلا ہو گئی تھی۔ رات کو جمال احمد اس کے کمرے میں آئے تو اس نے ان سے اپنے خواب کے بارے میں ذکر کیا تو وہ بھی چونک گئے۔

”بیٹا تم اپنے اس خواب کا ذکر اپنی ماں سے نہ کرنا..... کل میں اور تم گاؤں چلیں گے اور اماں جی سے بات کریں گے۔“ جمال احمد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنی رائے دی۔

”ڈیڈی یہ کیسے ممکن ہے کہ میں.....؟“ ”بیٹا..... زندگی نا ممکنات کے سفر کا نام ہے..... اگر انسان کسی چیز کو ناممکن سمجھ کر چھوڑ دے تو

ایک راہ دکھائی۔

”اتنا سب کچھ ختم ہو جانے کے باوجود بھی آپ بہتری کا سوچ رہے ہیں۔ اب یہ ناممکن ہے۔“ یمنی نے مایوسی سے جواب دیا۔

”تو کیا تم اب ساری زندگی یونہی اس کمرے میں گزار دو گی؟“

”معلوم نہیں، میں کچھ نہیں جانتی۔“ جمال صاحب اس کی بات پر پریشانی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”اگر تم چاہو تو اماں جی نے جس پروپوزل کے لیے بات کی تھی تو کیا میں اسی سلسلے میں ان سے بات کروں؟“ انہوں نے آہستہ آواز میں پوچھا تو وہ ایک دم ہڑبڑا گئی۔

”شادی..... It's impossible..... no never“ وہ ایک دم ہائپرسی ہو گئی پھر باپ سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میں کبھی کسی مرد پر اعتبار نہیں کر سکتی۔“ وہ روتے ہوئے بڑبڑانے لگی تو جمال صاحب گھبرا گئے اور انہوں نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”ریلیکس مائی ڈیئر، میں تو تمہیں لائف میں بڑی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے اس آپشن کے بارے میں سوچا۔“ جمال صاحب نے فکر مندی سے کہا تو یمنی پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ اور وہ اسے محبت سے چپ کراتے رہے مگر یمنی کے دل کو سکون نہیں مل رہا تھا۔

☆☆☆

نیشا کی کئی گھنٹے کی بے ہوشی نے عظیم احمد کو فرار کا موقع دے دیا تھا۔ وہ پہلی فلائٹ لے کر دہلی آ گئے تھے۔

☆☆☆

یمنی نے پھر ایک خواب دیکھا تھا اور اس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ مضطرب ہو گئی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے۔

اپنے دماغ کو دیکھئے طاقت اور توانائی



دفتری، گھریلو کارکردگی بہتر بنائیے

BRAINICA

BRAIN ENERGIZER SYRUP

PCSIR
فود سیلیمنٹ کوئی سائنڈائٹکٹ نہیں
سے تصدیق شدہ

Rs.500/=

برینیکا

سیرپ

توانا اور متحرک دماغ بہتر زندگی!

مراد میڈیکو: اسٹیڈیم روڈ، نزد آغا خان ہسپتال
ہوٹل برینیکا
جیل کے نیچے

786 میل کیل اسٹور بلاک 17، گلستان جوہر چورنگی

www.facebook.com/castlegate.com.pk

میں جو شک پیدا ہو چکا تھا وہ اتنی آسانی سے دور نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ خاموش رہیں اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ جمال احمد بھی سوچ میں پڑ گئے کہ جو کچھ وہ کرنے جا رہے تھے وہ ٹھیک تھا یا نہیں.....؟

☆ ☆ ☆
خدیجہ بیگم تیار ہو کر لاؤنج میں آئیں۔ وہ ردا کی ساس کو دیکھنے جا رہی تھیں۔ فہام نے سنا تو شدید حیران ہوا کہ ردا اور روجیل دو دن پہلے تو مری کے لیے نکلے تھے..... اور اب واپس بھی آ گئے..... یہ سنتے ہی شملہ کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”مما میں تو آفس جا رہا ہوں، آپ شملہ کو ساتھ لے جائیں اور ڈرائیور آپ دونوں کو لے جائے گا۔“ فہام نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ خدیجہ بیگم بیٹے کو دیکھتی رہ گئیں۔

ماں جی بیڈ پر لیٹی تھیں..... خدیجہ اور شملہ بیڈ کے پاس کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ شملہ معنی خیز انداز میں آنکھیں گھما گھما کر کمرے کو دیکھ رہی تھی..... ردا مسلے ہوئے کپڑوں اور بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ چائے کی ٹرالی لے کر اندر داخل ہوئی تو خدیجہ نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھا۔

”بیٹا..... یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ خدیجہ نے آہستہ سے کہا۔

”بے چاری سارا دن مجھے سنبھالنے میں ہی مصروف رہتی ہے.....“ ماں جی شرمندہ، شرمندہ لہجے میں بولیں۔

”وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن..... ردا تمہیں اپنا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ تمہاری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں نہ چہرے کی وہ رنگت رہی..... اور نہ ہی صحت.....“ شملہ نے تاسف سے منہ بنا کر کہا تو ردا نے ایک دم گھبرا کر ماں جی کی طرف دیکھا۔

”آپ لوگ چائے لیں ناں۔“ ردا جلدی سے بولی تو اسی لمحے روجیل دوائیوں کا لفافہ پکڑے

”اماں جی آپ اس کی کچھ تربیت کریں اور پھر دیکھیں کہ یہ کس حد تک اس کام کو سنبھال سکتی ہے..... پھر ہم آگے کے لیے کچھ سوچیں گے۔“ جمال احمد نے کہا تو اماں جی نے گہری سانس لی۔

”ٹھیک ہے..... تم اسے میرے پاس چھوڑ جاؤ..... میں شام کو ہی مولوی رحمت اللہ کو بلانی ہوں اور ان سے تفصیل سے بات کرتی ہوں۔“ اماں جی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو جمال صاحب خاموش ہو گئے..... اور یمنی کو وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔

شام کو وہ گھر پہنچے تو ایمن شدت سے ان کی منتظر تھیں اور وہ اپنے ہی طور پر یمنی کی مشکلی اور شادی کے بارے میں منصوبے بنا رہی تھیں۔ جمال احمد کو اکیلے دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئیں۔

”آپ..... آپ یمنی کو کہاں چھوڑ آئے ہیں؟“
”وہ کچھ روز اماں جی کے پاس ہی رہے گی۔“

جمال احمد نے جواب دیا۔
”کیوں..... کیا کوئی رشتے کی بات چل رہی ہے؟ ایمن نے کریدنا چاہا۔

”رشتے کی بات.....؟ ارے نہیں..... نہیں تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔“ جمال احمد کو شدید حیرت ہوئی۔
”تو پھر آپ مجھ سے کیا چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں؟“ ایمن نے غصے سے پوچھا۔

”نہیں..... کچھ بھی نہیں..... تم یمنی کی حالت دیکھ رہی ہونا..... وہ ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ آئے..... ہنسے، بولے، کھائے، پیے..... یہاں میں اور تم اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے ہیں مگر وہ کچھ سنتی ہی نہیں..... جو یمنی میں اماں جی کے پاس بہت سی لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں اور پھر اماں جی کے ساتھ اس کی دوستی بھی ہے..... اسی لیے اسے وہاں چھوڑ آیا ہوں وہ اب کچھ دن وہیں رہے گی۔“ جمال احمد نے قدرے وضاحت کی مگر ایمن کے دل

”کیا لباس کے بارے میں اللہ نے احکامات نہیں دیے؟“ اماں نے سوال کیا۔

”ہاں..... بے شک لیکن لباس تقویٰ پر زیادہ زور دیا ہے اور جب انسان کی روح اس کے رنگ میں رنگ جاتی ہے تو جسم خود بخود ایسے لباس پہننا چھوڑ دیتا ہے جس میں اسے کراہیت محسوس ہوتی ہے..... میں نے یمنی پر کبھی اپنی مرضی مسلط نہیں کی..... نہ اسے مجبور کیا ہے کہ وہ سر پر دوپٹا اوڑھ لے..... لیکن مجھے یقین ہے یمنی جب خود اپنی مرضی سے کچھ سمجھ کر سر پر دوپٹا لے گی تو پھر وہ کبھی اس کے سر سے نہیں اترے گا۔“ جمال صاحب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اماں جی کی باتیں سن کر کچھ شرمندہ ہونے لگی اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

”ٹھیک ہے اگر تم دونوں اس بات پر متفق ہو اور یمنی سنجیدگی سے کچھ کرنا چاہتی ہے تو میں ہر ممکن تعاون کرنے کو تیار ہوں..... کیوں یمنی بیٹے کیا خیال ہے..... کیا تم اس بارے میں سنجیدہ ہو.....؟“ اماں جی نے اس سے پوچھا۔

”اماں جی..... میں تو کچھ بھی نہیں جانتی..... مجھے کیا معلوم کیا کرتا ہے..... کیا نہیں.....؟“ یمنی نے معصومیت سے کہا تو اماں جی نے چونک کر جمال احمد کی طرف دیکھا تو وہ بوکھلا گئے۔

”اماں جی..... یہ تو بچی ہے..... راستہ تو ہم نے اسے دکھانا ہے.....“ جمال احمد جلدی سے بولے۔

”جمال..... جمال..... جو بھی کرتا ہے اسے ہی کرتا ہے..... اگر ہم اتنی جدوجہد کریں اور اس کا دل اکٹا جائے..... اور یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس چلی جائے تو میں اور تم کیا کر سکیں گے۔ سارے کیے پر پانی پھر جائے گا ناں.....“ اماں جی نے قدرے رعب دار انداز میں کہا۔

”یمنی بیٹے..... تم ادھر کچھ روز رہو۔“ پھر وہ ماں سے مخاطب ہوئے۔

کمرے میں داخل ہوا۔

”آؤ رو حیل بیٹا..... کیسے ہو؟“ خدیجہ بیگم نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا اور باہر جانے لگا۔ شاید اس نے شمیلہ کے جلسے لیے تھے۔

”روحیل کہاں جا رہا ہے..... سب کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیو.....“ ماں جی نے گھبرا کر کہا تو وہ خاموشی سے ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

”روحیل بھائی..... زندگی کا سفر کیسا جا رہا ہے؟“ شمیلہ نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”یہ تو آپ ردا سے پوچھیں۔“ روحیل نے قدرے سختی سے جواب دیا۔

”ردا کو تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے..... بہت اداس اور مرجھائی ہوئی لگ رہی ہے۔“ خدیجہ بیگم نے آہ بھر کر کہا۔

”آپ کا مطلب ہے کہ میں اس کا خیال نہیں رکھتا یا وہ اس گھر میں خوش نہیں..... اگر ایسی بات ہے تو آپ ردا کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ آپ کے گھر تو وہ بہت خوش تھی ناں؟“ روحیل نے ایک دم غصے سے بھڑک کر جواب دیا۔

”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹا..... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔“ خدیجہ نے بری طرح گھبرا کر کہا۔

”روحیل..... بات کو مت بڑھاؤ۔ تھکے ہوئے ہو تو جاؤ یہاں سے۔“ ماں جی نے غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا تو روحیل تیزی سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

”معافی چاہتی ہوں..... میری بیماری نے روحیل کو چڑچڑا بنا دیا ہے۔“ ماں جی نے شرمندگی سے سمجھن کی طرف دیکھ کر کہا۔ خدیجہ بیگم کچھ دیر بے دلی سے وہاں بیٹھ کر اٹھ آئیں۔

خدیجہ بیگم گھر آ کر لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی زار و قطار رو رہی تھیں۔ زاہدہ ان کے پاس ہی

کارپٹ پر بیٹھی انہیں تسلیاں دے رہی تھی جبکہ شمیلہ دوسرے صوفے پر منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

”میری پھول سی بچی جس کی آنکھ میں، میں نے کبھی آنسو آنے نہیں دیا تھا..... بے بسی سے میری طرف دیکھ رہی تھی..... میں نے ہی برا کیا جو بغیر دیکھے بھالے اس کی اتنی جلدی شادی کر دی۔“

خدیجہ بیگم سسکی بھر کر بولیں تو شمیلہ معنی خیزی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ فہام اور حاتم اندر آئے اور ماں کو روتا دیکھ کر دونوں گھبرا کر ان کے پاس ہی بیٹھ گئے..... زاہدہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مما..... کیا بات ہے آپ تو ردا کی طرف گئی تھیں۔ کیا بات ہو گئی جو آپ رو رہی ہیں؟“ فہام نے گھبرا کر پوچھا۔

”اپنی بیٹی کی قسمت دیکھ کر.....“ خدیجہ بیگم نے سسکی بھر کر بیٹے کو دیکھ کر کہا۔

”کیا..... ہوا..... میری ردا کو.....؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

”روحیل نے تو ردا کو ملازمہ بنا کر رکھا ہے۔“ شمیلہ بظاہر تندگی ہمدردی کر بولی۔ ”ہماری زاہدہ کی حالت ردا سے کہیں اچھی ہے۔“ شمیلہ نے ابرو چڑھا کر زاہدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ روحیل نے اسے نوکر بنا کر رکھا ہے۔“ حاتم نے ایک دم غصے سے بھڑک کر پوچھا۔

”ارے بھئی..... نوکر سے بھی کم تر..... وہ تو ردا کو ابھی ہمارے ساتھ بھیجنے کو تیار تھا..... وہ تو اس کی ماں جی نے روکا۔“ شمیلہ نے مرجع مسالا لگا کر کہا۔

”تو آپ لوگ اسے چھوڑ کر کیوں آئیں؟“ حاتم نے غصے سے کہا۔

”حاتم اتنے جذباتی مت بنو، میرے دل پر کیا گزر رہی ہے تمہیں کیا پتا..... ہمیں ردا کے لیے آسانیاں پیدا کرنی ہیں، اس کا گھر نہیں خراب کرنا۔ اب وہ میریڈ ہے ماما اگر ردا پر کام کا برڈن

زیادہ ہے تو آپ اس کے لیے کوئی maid ارنج کر دیں۔ اسے pay ہم کر دیں گے۔“ فہام نے گہری سانس لے کر ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بیگم صاحبہ..... گاؤں میں میرے ماموں کی بیٹی بہت کام کا جو ہے۔ آپ اسے ردا بی بی کی طرف بھیج دیں.....“ زاہدہ جلدی سے بولی۔

”ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔“ فہام نے کہا تو سب خاموش ہو گئے۔

☆☆☆

ماں جی بیڈ پر لیٹی تھیں جہی ردا دودھ کا گلاس لے کر کمرے میں آئی۔

”ماں جی دودھ پی لیں.....“ ردا نے سائڈ ٹیبل پر دودھ کا گلاس رکھتے ہوئے کہا۔

”اوہ..... آپ نے تو شاید ابھی میڈ۔سز بھی نہیں لیں۔“ ردا نے جلدی سے پوچھا۔

”خدا تمہیں زندگی کی ساری خوشیاں دے۔“ ماں جی نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم جیسی اچھی لڑکی کے ساتھ روحیل کا یہ رویہ دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے..... خدا کی قسم وہ پہلے ایسا نہیں تھا..... نہ جانے اسے شادی کے بعد اچانک کیا ہو گیا ہے..... وہ اتنا بدل جائے گا مجھے یقین نہیں آتا۔“ ماں جی نے گلوگیر لہجے میں کہا تو ردا کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔

”بیٹی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں تمہاری مجرم ہوں..... مجھے معاف کر دو، میں بالکل بے قصور ہوں..... میں نے تمہارے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا۔“

ماں جی نے ردا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر معافی کے انداز میں کہا۔

”میں صرف آپ کی وجہ سے خاموش ہوں..... کیونکہ آپ نے مجھے بیٹی کہا ہے۔“ ردا نے گھبرا کر ماں جی کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا۔

”اور تم بیٹیوں سے بھی زیادہ میری خدمت

کھیں دیب طے کھیں دل

کر رہی ہو..... اللہ تمہیں اس کا صلہ دے.....“ ماں جی نے گہری سانس لے کر کہا تو ردا آنکھیں صاف کرتی ہوئی اٹھی۔

”آپ کوئی ٹینشن نہ لیں بس آرام کریں۔“ ردا نے ماں جی کے اوپر کبل ٹھیک کرتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ ماں جی اسے دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

ردا انتہائی تھکی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی..... اور جمائی لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی..... اس نے ایک نظر لیپ ٹاپ پر مصروف روحیل کی طرف ڈالی اور پھر منہ پھیر لیا..... روحیل نے انتہائی غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر تم یہاں خوش نہیں ہو تو اپنی ماں کے گھر چلی جاؤ.....“ وہ غصے سے لیپ ٹاپ آف کر کے ردا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ردا اسے حیرت سے دیکھتی رہی گئی۔

”تمہاری ماں..... کیا میری انسٹل کرنے یہاں آئی تھیں..... ضرور تم نے انہیں اپنی دکھ بھری باتیں سنائی ہوں گی۔“ روحیل نے انتہائی درشتی سے کہا۔

”آپ ہر بات کا قصور وار مجھے ہی کیوں ٹھہراتے ہیں۔“ ردا نے خفگی سے روحیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تم جان بوجھ کر اپنا حلیہ ایسے بنائے رکھتی ہو کہ تمہیں دیکھ کر لوگوں کو ترس آئے..... تم مظلوم دکھائی دو اور میں ظالم.....“ روحیل نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”اگر میں اچھے کپڑے پہن لوں..... تو بھی آپ طنز کرتے ہیں..... آپ نے میری زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے..... کیا کروں..... میں؟“

ردا بھی ایک دم غصے سے چلا تے ہوئے بولی۔

”چھوڑ دو مجھے.....“ روحیل نے خفگی سے اسے دیکھ کر کہا۔

ماہنامہ پاکیزہ 69 جولائی 2013

کر خود ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر بہت الجھن اور پریشانی تھی جیسے اندر کوئی کشمکش جاری ہو۔ ماں جی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا مگر ردا بے خبر رہی۔

”کیا سوچ رہی ہو.....؟“ ماں جی نے اس کی طرف بغور دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں.....“ ردا ایک دم ہڑبڑا کر بولی۔

”مگر تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم اس وقت بہت

پریشان ہو..... کیا بات ہے بیٹا؟“ ماں جی نے ذرا نرمی سے کہا تو ردا نے ماں جی کی طرف دیکھا۔

”مجھے بتاؤ کیا بات.....؟“ ماں جی نے

پریشان ہو کر محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں.....“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیا روچیل نے تمہیں کچھ کہا ہے..... یا پھر

کوئی اور مسئلہ ہے؟“ ماں جی نے محبت سے پوچھا تو وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔

”دیکھو بیٹا..... میاں، بیوی کا رشتہ اس وقت

تک بہت خوب صورت ہوتا ہے جب تک دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے چاہت ہوتی ہے،

عزت ہوتی ہے، جب چاہت نہیں رہتی تو پھر رشتہ بھی خوب صورت نہیں رہتا..... کیا تم دونوں میں

چاہت کی کمی ہے..... یا پھر کوئی اور بات ہے۔“ ماں جی نے گہری سانس لے کر کہا۔

”معلوم..... نہیں ماں جی.....“ ردا نے

بھرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”بیٹا..... آخر مسئلہ کیا ہے؟ تم دونوں کا رشتہ

اتنی جلدی کیسے کمزور پڑنے لگا ہے۔“ ماں جی نے جھنجھلا کر پوچھا۔

”میں نہیں جانتی۔“

”روچیل میں کوئی ایسی خامی یا برائی ہے، جسے تم قبول نہیں کر پا رہی اور اسی وجہ سے پریشان ہو؟“

ماں جی نے ایک دم رازدارانہ انداز میں پوچھا تو ردا

کر دیا۔“ ردا نے مسکرا کر کہا۔

”ارے نہیں باجی..... کام کرنے میں، میں بہت شیر ہوں۔“ اس نے جلدی جلدی چیزوں کو ادھر

ادھر کرنا شروع کر دیا۔ ردا وارڈ روب کھول کر کپڑوں کی ترتیب ٹھیک کرنے لگی۔ زرینہ نے

میٹرز اٹھایا تو اس کے نیچے سے روچیل کی میڈیکل رپورٹس والی فائل نکلی۔

”باجی کیا اس فائل کو واپس میٹرز کے نیچے ہی رکھنا ہے؟“ زرینہ نے پوچھا تو ردا نے چونک کر

اس کے ہاتھ میں پکڑی فائل کو دیکھا اور کھول کر پڑھنے لگی۔ وہ جیسے جیسے فائل پڑھ رہی تھی اس کے

چہرے پر حیرت اور پریشانی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

”باجی! کیا ہے اس میں..... جو آپ ایک دم پریشان ہو گئی ہیں؟“ زرینہ نے پوچھا۔

”ک..... ک..... کچھ نہیں..... تم ذرا ماں جی کمرے میں جاؤ اور ان سے پوچھ کر آؤ انہیں کسی چیز کی

ضرورت تو نہیں۔“ ردا نے اسے زبردستی باہر بھیجنا چاہا۔

”جی..... باجی.....“ زرینہ سب کچھ دیکھ چھوڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

ردا کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی اور اس نے فائل کو دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔

”تو شاید روچیل..... اسی لیے.....“ اس نے آہ بھر کر سوچا۔ اسی لمحے زرینہ کمرے میں داخل ہوئی

تو ردا نے اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

”یہ فائل وہیں رکھ دو جہاں سے نکلی ہے۔“

”ٹھیک ہے..... ہاں ماں جی آپ کو بلا رہی ہیں۔“ زرینہ نے فائل لیتے ہوئے کہا تو ردا کمرے سے باہر نکل گئی۔

”بیٹا..... مجھے میری میڈیسنز دے دو۔“ ماں جی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

”جی..... ماں جی.....“ وہ انہیں میڈیسنز کھلا

آؤں..... جی گاؤں سے سیدھا نہیں آ رہا ہوں۔“

عبدالشکور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن انہوں نے مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔“ ردا نے ایک دم بوکھلا کر جواب دیا۔

”میرے پاس اتنے فضول پیسے نہیں کہ تمہاری خدمت کے لیے نوکر رکھوں۔“ روچیل نے ان کی باتیں سن کر غصے سے کہا۔

”آپ تنخواہ کی فکر نہ کریں جی..... وہ بڑی بیگم صاحبہ دیا کریں گی۔ یہ بات طے ہو چکی ہے۔ زرینہ

یہاں صرف کام کرے گی۔“ عبدالشکور نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔

”کیا..... کیا.....؟ اب وہ ہم پر ترس کھائیں گی..... مجھے ذلیل کرنے کا ایک اور موقع انہوں نے

تلاش کر لیا ہے۔“ روچیل نے ایک دم غصے سے... بھرپور کر کہا۔

”شکور بابا..... آپ جائیں اور یہ زرینہ کو یہیں چھوڑ جائیں۔“ ردا نے گھبرا کر کہا تو شکور سلام کر کے

واپس چلا گیا۔

”زرینہ میرے لیے آئی ہے جب میں اس گھر سے جاؤں گی تو زرینہ کو بھی لے جاؤں گی۔“ ردا نے

روچیل کی طرف دیکھ کر کہا اور زرینہ کو لے کر کچن میں چلی گئی اور وہ غصے سے اسے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

☆☆☆

ردا زرینہ کو سارا گھر دیکھا کر کام سمجھا رہی تھی آخر میں وہ اسے اپنے بیڈ روم میں لائی۔

”روچیل کو صفائی بہت پسند ہے۔ وہ ذرا سی ڈسٹ بھی برداشت نہیں کرتے اس لیے اس کمرے کی

بہت اچھی طرح سے صفائی کرنا..... ماں جی کی بیماری کی وجہ سے مجھے ٹائم ہی نہیں ملا کہ میں اچھی طرح صفائی

کرتی۔ ایسا کرو آج میرے کمرے کی خوب اچھی صفائی کر دو۔ میں بھی تمہاری مدد کروادوں گی۔ کہیں تم یہ نہ کہو کہ باجی نے آتے ہی ڈھیر سارا کام کروانا شروع

”اگر یہی صورت حال رہی تو بہت جلد چھوڑ کر

چلی جاؤں گی۔ اب اگر میں اس گھر میں ہوں تو صرف ماں جی کی وجہ سے، انہیں سنبھالنے والا کوئی

نہیں اور میں صرف اللہ کے خوف سے ان کی خدمت کر رہی ہوں۔ آپ کی وجہ سے نہیں۔“ ردا نے سختی سے کہا اور تکیہ اٹھا کر غصے سے باہر چلی گئی۔ روچیل ہکا

بکا اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

صبح ہو چکی تھی ردا لاؤنج میں صوفے پر سو رہی تھی..... کھڑکی سے روشنی اور چڑیوں کے چہچہانے کی

آواز آئی تو اس کی آنکھ کھلی اس نے کلاک کی طرف دیکھا۔ جہاں سات بج رہے تھے۔

”اوہ..... ماں جی..... اور روچیل کے لیے ناشتا بھی بنانا ہے۔“ وہ جلدی سے اپنے بکھرے

بالوں کا جوڑا بنا کر اٹھ گئی۔ وہ جلدی سے واش روم کی طرف جانے لگی کہ ڈورنیل جی، باہر جا کر دیکھا تو

ایک ادھیڑ عمر شخص ایک نو عمر لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا غالباً باپ بیٹی تھے۔

”آپ ردا بی بی ہیں ناں..... میں زاہدہ کا

ماموں عبدالشکور ہوں جو فہام صاحب کے گھر کام کرتی ہے اور یہ میری بیٹی زرینہ ہے..... ہم لوگ

گاؤں سے آئے ہیں۔“ اس نے جلدی سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”آپ اندر آجائیں۔“ ردا حیران تھی کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ اس نے انہیں عزت سے

لاؤنج میں بٹھایا۔

”آپ لوگ یہاں کیسے آئے؟“ ردا نے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اسی لمحے روچیل آفس

جانے کے لیے تیار ہو کر لاؤنج میں آیا اور ردا کو ان لوگوں کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر چونکا۔

”کل بڑی بیگم صاحبہ کا فون آیا تھا کہ میں زرینہ کو آپ کے پاس کام کاج کے لیے چھوڑ

نے ایک دم شپٹا کر انہیں دیکھا۔

”بیٹا..... میاں، بیوی کو اللہ نے ایک دوسرے کا لباس کہا ہے..... جس طرح لباس جسم کی کسی بھی بد صورتی کو چھپا کر اس پر پردہ ڈالتا ہے..... اس طرح میاں، بیوی بھی ایک دوسرے کی خامیوں پر پردہ ڈال کر..... ایک دوسرے کی عزت اور بھرم رکھتے ہیں۔ تم دونوں اب ایک دوسرے کی عزت ہو۔“

ماں جی نے بغور اسے دیکھ کر کہا۔

”ماں جی اگر بیوی کو شوہر کی کسی ایسی بات کا پتا چلے جو خود اس کے لیے بھی تکلیف دہ ہو اور بیوی کے لیے بھی..... اور شوہر اسے چھپانا چاہے اور بیوی جب سب کچھ جان بھی لے تو وہ کیا کرے؟“ ردا نے ماں جی کی طرف دیکھ کر بڑا عجیب سوال پوچھا۔

”ایسی نیک اور پاکباز عورتوں کا اللہ کے ہاں بڑا درجہ ہوتا ہے جو بہت صبر سے کسی آزمائش سے گزرتی ہیں اور شوہروں کا پردہ رکھتی ہیں اور ان کی دلجوئی بھی کرتی ہیں۔ اللہ ایسی عورتوں کی بہت عزت کرتا ہے اور ان کے درجات بلند کرتا ہے مگر ایسی عورتیں بہت کم ہوتی ہیں آج کل کون کسی کا پردہ رکھتا ہے۔“ ماں جی نے کچھ نا سنجھی کی کیفیت میں ردا کی بات کا جواب دیا۔

”یہ بتاؤ کیا روچیل میں بھی ایسی کوئی بات ہے؟“ ماں جی نے اگلے ہی لمحے اس سے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں..... میں تو ایک کتاب پڑھ رہی تھی یونہی ذہن میں خیال آ گیا۔“ ردا نے ایک دم بوکھلا کر جواب دیا۔

”دنیا میں بڑی بڑی عظیم اور پاکباز عورتیں گزری ہیں..... اللہ کی رضا پر صبر کرنے والیاں..... دنیا میں تو وہ بہت آزمائش سے گزرتی ہیں مگر آخرت میں پروردگار انہیں بہت نوازتا ہے۔“ ردا ان کی بات پر خاموش رہی۔

جب سے زرینہ ردا کے گھر کام میں مدد کرنے

آئی تھی روچیل کا موڈ اور خراب ہو گیا تھا۔ وہ بات بات پر اس کے بے عزتی کرتا اور زرینہ، ردا بی بی کی خاطر برداشت کرتی..... ردا یہ سب دیکھ کر کڑھتی رہتی، روچیل کا رویہ ردا سے روز بروز برا ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

خدیجہ بیگم ہر نئی فصل کا اناج اور نئے موسم کا پھل غریبوں میں ضرور تقسیم کیا کرتی تھیں سواں مرتبہ بھی وہ زاہدہ کے ساتھ مل کر الگ، الگ پیکٹس بنا رہی تھیں جبھی شمیمہ وہاں چلی آئی۔

”خالہ جان..... یہ اتنا پھل اور یہ سب کہاں جا رہا ہے؟“ اس نے کڑی تیوریوں کے ساتھ پوچھا۔

”شمیلہ..... آج سے نہیں بلکہ تمہارے خالو کے زمانے سے یہ طریقہ چلا آ رہا ہے جس سے تم لوگ بھی بخوبی واقف تھے۔“ خدیجہ بیگم نے جتنا تے ہوئے انداز میں کہا۔

”مگر اب اس گھر کا سارا خرچہ فہام چلاتے ہیں اور میں یہ فضول خرچی نہیں ہونے دوں گی۔ غضب خدا کا مجھے تو کسی بات کا علم ہی نہیں ہوتا اور فہام کا پیسہ کس، کس طرح آپ لٹائے جاتی ہیں۔“

شمیلہ نے یہ اور اس طرح کی کئی تلخ باتیں خدیجہ بیگم کو کہیں اور وہ صرف ٹھنڈی آہیں بھرتی رہ گئیں۔ خدیجہ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شمیمہ کی باتیں ان کے کانوں میں بازگشت کی صورت میں گونج رہی تھیں۔

”آپ جیسی مائیں تو ویسے ہی بیٹوں کو اتنا قابو میں رکھتی ہیں کہ وہ بھی بیویوں کے ہو ہی نہیں پاتے۔ ہاں..... مفت کی کمائی ہے ناں..... ایک کمائے دوسرا اجاڑے.....“ شمیمہ کے الفاظ کسی نشتر کی طرح ان کے سینے میں پیوست ہو رہے تھے۔ وہ سسکیاں بھرنے لگیں۔

”میں شمیمہ کو کیا سمجھ کر بہو بنا کر لائی اور وہ مجھے کیا سمجھ رہی ہے؟ اپنی دشمن..... اپنی رقیب..... میں

نے تو کبھی اس سے کوئی شکوہ تک نہیں کیا اور اس سے میرا وجود بھی اس گھر میں برداشت نہیں ہو رہا۔“ انہوں نے سسکی بھر کر سوچا جبھی ایک دم دروازہ کھلا اور عاصم اندر آیا۔ خدیجہ بیگم جلدی سے اپنے آنسو صاف کرنے لگیں۔

”مما..... کیا آپ رورہی ہیں؟“ عاصم ان کے قریب بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

”ن..... ن..... نہیں تو۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

”بھلا شمیمہ بھابی کے ہوتے ہوئے اس گھر میں کون خوش رہ سکتا ہے۔ ممما..... آپ تو ہمیں ہمت دیتی تھیں اور اب خود ہی ہمت چھوڑنے لگی ہیں۔“ عاصم نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بیٹا..... میں کبھی تکلیفوں سے نہیں گھبرائی مگر میں اس کی مکاریوں سے ہارنے لگی ہوں۔“ انہوں نے بے بسی سے جواب دیا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں..... سامنے سے آنے والے حملہ آور کا ہاتھ تو پکڑا جاسکتا ہے مگر پیٹھ پیچھے چھرا گھوپنے والے کو انسان کیسے پکڑے..... میں بھی ذہنی طور پر بہت اب سیٹ ہو گیا ہوں۔ ہمارے گھر میں ایک عجیب سی ویرانی چھانے لگی ہے۔“ عاصم نے ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا۔

”کبھی کبھی صرف ایک انسان سارے خاندان کو ایسا توڑ کر رکھ دیتا ہے کہ وہ پھر کبھی جڑ نہیں پاتا۔“ خدیجہ نے زندگی کا تجربہ بیان کیا۔

”مما..... میں کچھ روز کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ اپنے فریڈز کے ساتھ..... گھر سے دور رہوں گا تو شاید سب کے لیے بہتر ہوگا اور خود میرے لیے بھی۔“ عاصم نے گہری سانس لے کر کہا۔

”بیٹا جلدی آ جانا..... تمہارے بغیر میں اب بہت تنہائی محسوس کرتی ہوں..... دونوں بڑے بھائی تمہارے تو اس کے قبضے میں آ گئے ہیں، تم ہی ہو

کھیں دیب جلع کھیں دل

میرے دکھ کو سمجھنے والے اور تم بھی جا رہے ہو۔“ وہ گھبرا کر بولیں۔

”آپ حوصلہ رکھیں..... میں جلدی آ جاؤں گا بس آپ نے ہمت نہیں ہارنی۔“ عاصم نے مسکرا کر ماں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”you are our brave mother“ عاصم نے مسکراتے ہوئے ماں کی پیشانی چومی تو وہ مسکرا دیں۔

”اللہ تم سب کو اپنی امان میں رکھے۔“ انہوں نے زخمی مسکراہٹ سے اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

کمرے میں نیم تاریکی تھی..... ردا اور روچیل دونوں ایک دوسرے کی طرف پشت کیے کروٹ کے بل لیٹے تھے۔ دونوں کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ سو نہیں رہے تھے۔ دونوں اپنے آپ سے مسلسل الجھ رہے تھے۔

”روچیل بہت اب سیٹ ہے، شاید یہی وجہ ہے۔“ ردا نے اپنے طور پر سوچا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ زندگی مجھے یوں ٹریٹ کرے گی۔“ روچیل نے خود سے بے آواز مکالمہ کیا۔

”زندگی نہیں..... شاید قسمت..... یا اللہ میں نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے جس کی تو مجھے اتنی بڑی سزا دے رہا ہے۔“ روچیل کے سینے سے جیسے آہ نکلی۔

”شاید روچیل رورہا ہے۔“ ردا نے گھبرا کر آنکھیں کھولتے ہوئے خود سے کہا اور چہرہ روچیل کی طرف کیا وہ بدستور اس کی طرف پشت کیے لیٹا تھا۔

”ایسی نیک اور پاکباز عورتوں کا اللہ کے ہاں بڑا درجہ ہوتا ہے جو بہت صبر سے کسی آزمائش سے گزرتی ہیں اور شوہروں کا پردہ بھی رکھتی ہیں اور ان کی دلجوئی بھی کرتی ہیں۔“ ردا کے کانوں میں ماں جی کے الفاظ گونجنے لگے..... ردا نے کچھ سوچا اور روچیل کی طرف ہاتھ بڑھانے لگی جبھی روچیل نے کروٹ بدلی۔ ردا نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کا

ہاتھ پکڑ لیا۔

”روحیل آپ کس بات سے اتنے ہرٹ ہو رہے ہیں۔“ ردا نے گہری سانس لے کر محبت بھرے لہجے میں اس سے کہا تو روحیل بے بسی اس کی طرف دیکھنے لگا اور پھر کروٹ بدل لی۔

”کیا آپ کو مجھ پر..... اور اپنی محبت پر کوئی اعتبار نہیں رہا..... آپ مجھ سے اپنے دل کی بات شیئر کیوں نہیں کرتے..... انھیں اور مجھے بتائیں کہ آپ کو کیا پر اہم ہے۔“ ردا نے اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا تو روحیل نے شکستہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور بیٹھ کر اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔

”روحیل..... پلیز..... حوصلہ کریں۔ میں آپ کے پاس ہوں ناں..... پھر آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں..... میں زندگی کے ہر مرحلے پر آپ کے ساتھ ہوں گی۔ پلیز مجھ پر ٹرسٹ کریں۔“ ردا نے قدرے جذباتی انداز میں کہا تو روحیل نے..... بے بسی سے اس کی طرف دیکھا..... ردا اس کے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرنے لگی تو روحیل نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

”ردا! مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑنا..... ورنہ میں.....“ روحیل نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔ ”میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی ہوں گی۔ چاہے کتنا مشکل وقت ہی کیوں نہیں آئے۔“ ردا نے مسکرا کر محبت سے کہا تو روحیل نے زخمی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا..... ردا نے محبت سے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ روحیل دھیرے دھیرے اس کے بازو پھپھتاہٹانے لگا اور ردا کو یقین آنے لگا کہ روحیل اس پر بھروسہ کرنے لگا ہے۔ وہ بہت جلد اپنے دل کی باتیں اسے کہہ دے گا اور اس کا سارا غم اور دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

☆☆☆

فہام کو بزنس میں کچھ loss ہوا تھا اور یہ

بات شمیلہ نے فہام کو فون پر کسی سے بات کرتے سن لی تھی..... اب اس کے ذہن میں کچھ چلنے لگا۔ جس دن سے خدیجہ بیگم نے پھلوں کی پیٹیاں اور اناج کے پیکٹس بنوائے تھے شمیلہ کو یہ سب کچھ بہت کھٹک رہا تھا..... جمبھی آج وہ بظاہر فہام کی اور اس کے گھر کی ہمدرد بن کر بات کر رہی تھی۔

”آپ کو بزنس میں loss کب ہوا ہے؟ آپ نے مجھ سے تو کبھی شیئر نہیں کیا؟“ شمیلہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”میں بزنس میٹرز گھر میں ڈسکس کرنا پسند نہیں کرتا۔“ فہام نے بے پروائی سے کہا۔

”ویسے بھی جس گھر میں شاہ خرچیاں عروج پر ہوں..... وہاں پر ایسے کرائسٹر تو آتے ہی ہیں ناں۔“ شمیلہ نے منہ بنا کر معنی خیز انداز میں کہا۔

”کیا مطلب..... میں سمجھا نہیں؟“ فہام نے ایک دم چونک کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جس گھر میں ملازموں کو اتنی چھوٹ ملے.....

کہ چاہے وہ اناج کی بوریاں اٹھا کر لے جائیں یا پھر پھلوں کے کریٹس..... اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہو تو وہاں قارون کے خزانے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔“ شمیلہ، فہام کی ہمدردی کہہ رہی تھی۔

”کیا ہمارے گھر سے کسی ملازم نے یہ سب کیا ہے مگر ہمارے سب ملازم تو بہت اچھے اور ایماندار ہیں۔“ فہام نے چونک کر پوچھا۔

”جو ایمانداری کی آڑ میں مالکوں کی آنکھوں

میں دھول جھونکے تو اسے آپ کیا کہیں گے پھلا؟“

اب وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھ رہی تھی۔

”تم کہنا کیا چاہ رہی ہو.....؟ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ فہام نے جھنجھلا کر کہا۔

”یہاں کے سب ملازم آپ لوگوں کو بے

وقوف بنا کر لوٹ کھسوٹ میں لگے ہیں۔ بس ان پر نظر رکھیں چور ہیں سب کے سب۔“ شمیلہ نے جیسے

اسے بڑی اہم اطلاع دی۔

”کیا.....؟“ وہ انتہائی حیرت سے بولا۔

”میں ناشتا لگا رہی ہوں، آپ جلدی آجائیں.....“ وہ یہ کہہ کر کمرے سے چلی گئی اور فہام گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”بیگم صاحبہ پھلوں کی پانچ پٹیاں ردابی بی کو بھجوا دی ہیں۔ پڑوس میں بھی دے دی ہیں۔ باقی کے بھی تمام بانٹ دیے ہیں.....“ زاہدہ نے آکر خدیجہ بیگم کو اطلاع دی۔

”اتنی پٹیاں آپ لوگوں میں بانٹ رہی ہیں؟“ فہام نے ایک دم چونک کر ماں سے پوچھا وہ جو آفس جانے کے لیے انہیں خدا حافظ کہنے آیا تھا ملازمہ کی بات پر چونک ہی تو پڑا۔

”ایسا میں پہلی بار تو نہیں کر رہی..... تمہارے ڈیڑی کی زندگی میں بھی یہی کرتی تھی..... اور تمہاری شادی سے پہلے بھی یہی ہوتا تھا۔“ انہوں نے بیٹے کے پوچھنے پر کہا۔

”تب کی بات اور تھی.....“ فہام نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”تب تمہارے باپ کی کمائی تھی..... اور اب تمہاری ہے ناں، ماں، باپ اولاد پر لاکھوں خرچ کریں..... وہ کبھی حساب نہیں لیتے اور اولاد چند روپے بھی خرچ کرے تو حساب مانگنے لگتی ہے۔“ خدیجہ بیگم نے تیز لہجے میں کہا۔

”مما..... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ فہام بوکھلا گیا۔

”تم وہی فہام ہو جس سے میں لاکھوں روپے لیتی تھی اور وہ کبھی سوال نہیں کرتا تھا اور آج چند پٹیاں تمہیں کھنک رہی ہیں۔“ انہوں نے خفگی سے کہا۔

”آئی ایم سوری..... میں..... میں... اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اتنے میں شہیلہ اسے ناشتے کے لیے بلانے آگئی۔ خدیجہ بیگم نے منہ پھیر لیا اور وہ اٹھ کر بیوی کے ساتھ باہر چلا گیا۔

☆☆☆

زیرینہ نے جا کر دروازہ کھولا تو خدیجہ بیگم کا ڈرائیور پھلوں کی پٹیاں لیے موجود تھا۔

”شوکت..... بابا..... آپ.....؟“ ردانے خوش ہو کر کہا۔

”سلام..... ردابی بی..... بڑی بیگم صاحبہ نے آپ کو یہ پھل بھیجے ہیں۔“ ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے کہا تو روحیل چائے پیتے ہوئے ایک دم رکا۔

”ہم کوئی بھکاری ہیں جو تمہارے گھر والے آئے روز چیزیں بھیجتے رہتے ہیں۔“ روحیل نے ردانے کے قریب آ کر انتہائی غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”صاحب جی..... یہ تو نئے موسم کے پھل ہیں، تحفے میں بھیجے ہیں بیگم صاحبہ نے۔“ ڈرائیور نے گھبرا کر کہا۔

”شٹ اپ..... اٹھاؤ یہ سب اور واپس لے جاؤ۔“ روحیل نے غصے سے کہا۔

”لیکن..... روحیل؟“ ردانے گھبرا کر روحیل اور پھر ڈرائیور کو دیکھا۔

”خبردار..... تم نے میری اجازت کے بغیر کوئی چیز لی..... واپس کرو یہ سب..... ورنہ۔“ وہ غصے سے دانت کچکا کر بولا۔

”شوکت..... بابا..... آپ یہ سب لے جائیں۔“ ردانے گھبرا کر ڈرائیور کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جی ردابی بی.....“ ڈرائیور نے اس کی طرف دیکھ کر ایک سر دآہ بھری اور وہ پٹیاں اٹھا کر واپس چلا گیا۔ روحیل ڈانٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھا تو ردانے جلدی سے بھاگتی ہوئی ڈرائیور کے پاس پہنچی اور اسے ماں کو کچھ بھی بتانے سے منع کر دیا۔ شوکت بابا سخت متذذب کی حالت میں گاڑی میں جا بیٹھے۔

”واہ..... مولا..... بیٹیوں کے نصیب بھی تو کیسے بناتا ہے۔ شہزادیوں کی طرح راج کرنے والی بیٹی کیسے خوار ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں اسے کیا پریشانی

کھیں دیپ طے کھیں دل

کیوں ہو..... اب رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو..... اس لیے جواب نہیں مل رہا۔“ شہیلہ غصے سے چلانے لگی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا..... تم ایسا بھی کر سکتی ہو۔“ خدیجہ بیگم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں نے خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے..... کیا آپ کو پھر بھی میرے بتانے پر یقین نہیں آ رہا۔ زاہدہ تم سچ ہوتے ہی یہاں سے چلی جاؤ تو بہتر ہے۔ ورنہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“ فہام نے غصے سے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

”نہیں صاحب جی..... خدا کے لیے میرے حال پر رحم کھائیں۔ میں بیوہ کہاں جاؤں گی۔“ زاہدہ نے اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”اس گھر میں چوروں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔“ شہیلہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور دل ہی دل میں اپنی چالاکی پر خوش ہوئی۔

”بیگم صاحبہ..... آپ میرے حال پر رحم کھائیں۔“ اس نے خدیجہ بیگم کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... ممما..... اب یہ یہاں نہیں رہے گی۔“ فہام خفگی سے بولا۔

”زاہدہ..... اب تم یہاں سے چلی جاؤ تو بہتر ہے۔“ خدیجہ بیگم نے بہت بے بسی سے زاہدہ کی طرف دیکھ کر کہا اور وہ روتے ہوئے باہر چلی گئی۔

شہیلہ کے چہرے پر فاقہ خانہ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

☆☆☆

ردا، ماں جی کو میڈیسنز دینے کے بعد ان کی ٹانگوں پر کبیل ٹھیک کر رہی تھی..... وہ چہرے سے بہت خاموش اور اداس لگ رہی تھی۔ ماں جی اسے غم آنکھوں سے دیکھے جا رہی تھیں۔

”ماں جی ایک دو دن میں آپ کی ڈاکٹر کے پاس اپنا کمٹنٹ ہے۔“ ردانے ایک دم بولی تو ماں جی کو اپنی طرف بغور دیکھتے ہوئے دیکھ کر وہ چونک اٹھی۔

”شوکت بابا نے غم آنکھوں سے سوچا اور گاڑی اشارت کر دی۔ ردانے کھڑی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ واقعی ماں، باپ بیٹیوں کو سب آسائش دے سکتے ہیں لیکن اچھا نصیب نہیں۔“

☆☆☆

”زاہدہ ہم تو تمہیں بہت ایمان دار سمجھتے تھے مگر تم نے بھی بے ایمانی اور چوریاں شروع کر دی ہیں۔“ فہام نے ملازمہ کی طرف دیکھ کر غصے سے کہا۔

”نہیں، نہیں فہام بھائی میں ایسا کیوں کروں گی۔“ زاہدہ نے گھبرا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”زاہدہ کبھی چوری نہیں کر سکتی.....“ خدیجہ بیگم نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

”اگر اس نے چوری نہیں کی تو پوچھیں اس سے کہ اس کے کوارٹر میں اتنے زیادہ پھلوں کے کریش کہاں سے آئے ہیں۔ آپ نے تو اسے ایک دیا تھا۔“ شہیلہ طنزیہ انداز میں بولی تو زاہدہ کا رنگ ایک دم فق ہو گیا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے خدیجہ بیگم کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں زاہدہ بتاؤ وہ سب کہاں سے آئے؟“ خدیجہ بیگم نے حیرت سے پوچھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

”زاہدہ..... خدا کے لیے یہ باتیں بڑی بیگم صاحبہ کو نہیں بتانا۔ ردابی بی نے رورو کر درخواست کی تھی۔“ زاہدہ کے کانوں میں شوکت بابا کے الفاظ گونجنے لگے تو وہ آنکھوں میں آنسو لیے خاموش رہی۔

در اصل ردانے گھر سے واپسی پر شوکت بابا نے وہ کریش اس کے پاس رکھوائے تھے کہ بعد میں ہم کہیں بانٹ دیں گے اور یہ ساری بات شہیلہ نے نہ جانے کہاں سے سن لی تھی۔ جیسی باتوں، باتوں میں فہام کو لے کر گھر کے پچھلے حصے کی طرف گئی اور اس کے کوارٹر سے پھلوں کی پٹیاں دریافت کر لیں۔ زاہدہ منہ میں جھکی کہ ردانے کی بات رکھے یا اپنی نوکری بچائے۔

”ہاں بولو..... جواب دو..... اب خاموش

”آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ادھر آؤ..... میرے پاس بیٹھو۔“ ماں جی نے گہری سانس لے کر اسے اپنے پاس بلاتے ہوئے کہا تو وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”تم میں کتنا حوصلہ اور صبر ہے؟“ ماں جی نے اس کے چہرے پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ ردا ایک دم حیرت سے بولی۔

”روحیل کی کسی بات کا بھی تم نے مجھ سے آج تک شکوہ نہیں کیا.....“ ماں جی افسردہ لہجے میں بولیں۔ ”بیٹا..... وہ تم سے کیوں ایسا کرتا ہے..... پہلے تو وہ تم سے بہت محبت کرتا تھا۔“ ماں جی نے نرمی سے پوچھا تو ردا کی آنکھیں بھینکنے لگیں۔

”معلوم نہیں..... شاید یہ سب کچھ میرے نصیب میں ہی لکھا ہے۔“ ردا نے بے دلی سے مسکرا کر جواب دیا۔

”لیکن..... وہ ایک دم کیوں بدل گیا۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔ ایسا مرد تب کرتا ہے جب وہ اپنی کوئی خامی یا برائی چھپانا چاہتا ہے اور عورت پر حاوی ہو کر اسے خاموش کرنے کی کوشش کرتا ہے یا پھر عورت کی.... کسی کمزوری کا اسے پتا چل جاتا ہے۔“ ردا نے ایک دم گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”کیا روحیل میں بھی ایسی کوئی برائی ہے؟“ ماں جی نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں..... وہ تو بہت اچھے ہیں.....“

ہر لحاظ سے۔“ ردا جلدی سے آہستہ آواز میں بولی۔

”پھر جانے کیوں وہ ایسا کر رہا ہے..... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ انہوں نے افسردگی سے کہا تو ردا خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

خدیجہ بیگم لاؤنج میں صوفے پر بہت افسردہ

بیٹھی تھیں۔ شوکت ان کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر بہت سنجیدگی اور پریشانی چھائی تھی۔ وہ ہر جھکا کر خدیجہ بیگم کی باتیں سن رہا تھا۔

”شوکت..... اب ہر کام بہت سوچ سمجھ کر کرنا..... بہتر یہی ہے کہ ہر بات فہام کو بتا دیا کرو۔“ خدیجہ آہ بھر کر بولیں۔

”کیوں بیگم صاحبہ.....؟“ شوکت نے چونک کر پوچھا تو زاہدہ چادر اوڑھے اور اپنے سامان کا بیگ اٹھائے اندر داخل ہوئی..... اس کے ہاتھ میں چابیاں تھیں اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ زاہدہ نے چابیاں لا کر ٹیبل پر رکھیں۔

”بیگم صاحبہ..... میں گاؤں جا رہی ہوں۔ یہ کوارٹر کی چابیاں ہیں۔“ زاہدہ نے سسکی بھر کر خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر کہا۔

خدیجہ بیگم کو زاہدہ پر پورا بھروسہ تھا..... وہ کسی طور یہ سب ماننے کو تیار نہیں تھیں مگر زاہدہ نے بھی سچ بول کر نہ دیا۔ شوکت بابا نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ زاہدہ شوکت کو شمیلہ کی حقیقت بتا کر اس گھر سے رخصت ہو گئی کہ اب وہ بیگم صاحبہ کا خیال رکھے۔ یہ سب شمیلہ کا کیا دھرا تھا۔

☆☆☆

فہام کو..... کچھ ایسے..... بزنس پر اہل مز

آ رہے تھے جن کی وجہ سے وہ بہت پریشان رہنے لگا

تھا۔ اس سے پہلے ایسے... پر اہل مز اسے کبھی نہیں آئے

تھے اور وہ دونوں بھائیوں کو ان تمام کاروباری

الجھنوں سے دور رکھتا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے

ان دونوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس

کی ایک شپمنٹ لیٹ ہو گئی تھی اور اس کے لیے اس

نے اپنے تمام ورکرز کو لائن حاضر کر لیا تھا۔ سب

جانتے تھے کہ فہام جتنا اچھا اور نیک دل انسان ہے

کاروباری معاملات میں اتنا ہی زیادہ اصول پسند اور

سخت ہے۔ پوری فیکٹری میں ایک ہلچل سی مچی تھی۔

خود پسندی

شوہر نے کہا۔ ”سنئے آئے ہیں کہ خوب صورت عورتیں عام طور سے کم عقل ہوتی ہیں، چالاک مرد آسانی سے انہیں بے وقوف بنا لیتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک سنا ہے تم نے!“ بیوی نے تیزی سے کہا۔ ”میں کم عقل نہیں ہوتی تو کبھی تمہارے پلے سے نہ بندھی ہوتی۔“

مرسلہ: سعدیہ سرفراز، کراچی

”کیا پر اہلم ہے.....؟ اگر تمہیں کوئی مسئلہ ہے تو سامنے آ کر بات کرو۔“ فہام نے خفگی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”وہ بھی کروں گا..... میں تم سے ڈرنے والا نہیں۔“ جواب میں کہا گیا۔

”تم ہو کون.....؟“ اس نے پوچھا مگر فون بند ہو چکا تھا۔ فہام پریشان ہو کر چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

”کون ہو سکتا ہے.....؟“ فون کرنے والے کا لب ولہجہ دھمکی آمیز تھا۔ کوئی جان بوجھ کر اسے ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”یا تو کوئی فیکٹری ورکر ہو سکتا ہے..... یا کوئی بزنس کلائنٹ..... یا پھر..... کون.....؟“ فہام انتہائی متفکر ہو کر سوچنے لگا مگر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کسی نے بارہا اس کا تعاقب بھی کیا تھا۔ وہ بہت زیادہ الجھنے لگا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہونے لگا۔

زاہدہ کے گھر سے جانے کے بعد خدیجہ بیگم بہت زیادہ اداس اور تنہا ہو گئی تھیں۔ زاہدہ کے ساتھ مزاج شناسی کی وجہ سے دونوں میں بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ نہ خدیجہ بیگم نے اپنے آپ کو کبھی مالکین سمجھا اور نہ زاہدہ نے اپنے آپ کو ملازمہ..... ردا کے جانے کے بعد زاہدہ نے انہیں بہت خوصلہ اور تسلی دی تھی۔ دونوں شمیلا کی مکاریوں کو خوب سمجھتی تھیں۔

تمام ورکرز کے ساتھ میٹنگ کے بعد وہ اپنے آفس میں آیا تو خاصا پریشان تھا۔ حاتم اس کے روم میں آیا تو اسے یوں پریشان دیکھ کر وہ بھی مضطرب ہو گیا۔ ”فہام بھائی..... آج آپ بہت پریشان لگ رہے ہیں اور فیکٹری میں بھی بہت ہانپل مچی ہے کہ آپ کبھی اتنے غصے میں نہیں آئے جتنا آج آپ کو دیکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ کیا شیمنٹ کالیٹ ہونا ہے؟“

”ہاں..... اور اس کے علاوہ بھی بہت سے ریزنز ہیں۔“ فہام نے پریشانی سے کہا۔ ”مثلاً..... کیا.....؟“ حاتم نے پھر حیرت سے پوچھا۔ ”پتا نہیں یار..... دل پر اک عجیب سا بوجھ محسوس کرنے لگا ہوں۔ کچھ اضطراب سا بڑھنے لگا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ فہام نے مضطرب ہو کر کہا۔ اسی لمحے انٹرکام بجا اور سیکرٹری نے ایک بزنس کلائنٹ سے میٹنگ کے لیے کہا۔

”حاتم..... پلیز تم حیدری گروپ آف انڈسٹریز کے میجنگ ڈائریکٹر سے میٹنگ کرلو۔ اس وقت میں بہت اپ سیٹ ہوں۔“ فہام نے کہا تو وہ آفس سے باہر چلا گیا۔

فہام کا موبائل بجا تو اس نے بغور نمبر دیکھا پھر ہیلو ہی کہا کہ کال آف ہو گئی پھر موبائل بجا تو فہام نے ہیلو کہا دوسری جانب کسی مردانہ آواز نے جواب دیا اور پھر کال ڈراپ ہو گئی۔ تیسری مرتبہ پھر فون آیا تو فہام غصے سے چلانے لگا۔

”کون ہو تم..... اور کیوں مجھے بار بار کال کر رہے ہو؟“

”کیوں بے صبر ہے ہو رہے ہو، بتا دوں گا۔“ اتنا کہہ کر پھر فون بند ہو گیا۔ فہام سوچ میں پڑ گیا اور کافی سوچنے کے بعد اس نے حیدر کا نمبر ملایا مگر بار بار نمبر ملانے کے باوجود حیدر سے رابطہ نہ ہو سکا تو اس نے موبائل آف کر دیا۔

فہام کے نمبر پر پھر اس نمبر سے کال آنے لگی تھی۔

نے جانے کو کہا۔“ زرینہ نے جلدی سے جواب دیا۔
”اور واپس کب آئے گی؟“ روچیل نے اسی
دُشٹی سے پوچھا۔

”ویسے شام کو آنے کا کہا تھا۔“ زرینہ نے
آہستہ سے کہا اور کام میں مصروف ہو گئی۔

شام ہو چلی تھی اور دونوں ماں، بیٹی کی دکھ سکھ
پر مٹی داستان ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ وہ ماں
ہی کے کمرے میں تھی جہی شمیمہ وہاں چلی آئی۔

”ارے ردا تم کب سے آئی ہوئی ہو، مجھے بتایا
بھی نہیں۔“

”ہاں تمہیں اپنے کمرے سے فرصت ملے تو کسی
طرف دیکھو بھی۔“ خدیجہ بیگم نے ناک چڑھا کر کہا۔ اتنے
میں دونوں بھائی بھی دفتر سے واپس آگئے تھے۔

”ارے واہ..... ردا آئی ہوئی ہے..... کیسی
ہے میری ڈول.....؟“ سب سے پہلے فہام آگے
بڑھ کر ملا پھر حاتم نے بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر
خیریت پوچھی۔ سب خدیجہ بیگم کے کمرے میں ہی
بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

”ردا، روچیل نہیں آیا تمہارے ساتھ.....؟ اچھا
چلو تم ایسا کرو اتنے دن بعد آئی ہو آج..... یہیں رک
جاؤ۔“ فہام نے بڑی محبت سے کہا۔

”نہیں بھائی، ماں جی کی وجہ سے میں رک نہیں
سکتی اب چلوں گی۔“ ردا نے جلدی سے کہا۔

”اچھا تم کھانا کھا کر چلی جانا۔“ شمیمہ نے بھی
لگاؤ سے کہا۔

ردا کافی فکر مند ہو رہی تھی کہ روچیل بھی آفس
سے آگیا ہوگا۔ سب گھر والوں نے ردا کے ساتھ
رات کا کھانا کھایا مگر ماحول میں کچھ تناؤ تھا۔ جسے ردا
نے کافی شدت سے محسوس کیا۔

”چلو اب سب باہر آؤں کریم کھانے چلتے
ہیں۔“ فہام نے بہن اور ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”نہیں..... نہیں۔“ ردا ایک دم گھبرا کر بولی۔

”اور ماما..... آپ سب کچھ جانتے ہوئے
بھی.....؟“ ردا حیرت سے بولی۔

”بہت بے بس اور مجبور ہوں..... میں تو دیکھتی
اور سمجھتی رہتی ہوں..... مگر کچھ کہہ نہیں پاتی..... کچھ کر
نہیں پاتی۔“ انہوں نے اس کی بات کاٹ کر افسردگی
سے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے آپ تو مجھ سے بھی زیادہ
اذیت میں ہیں۔“ وہ سخت پریشان ہو گئی تھی۔

”اور اس اذیت کو سمجھنے والا بھی کوئی نہیں.....
زائدہ سے میں کچھ کہہ لیتی تھی مگر وہ بھی چلی گئی۔“ وہ
بے چارگی سے بولیں۔

”کیوں؟“ ردا نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

”وہ بھی شمیمہ کی چالوں کی نذر ہو گئی۔“ خدیجہ
بیگم نے غم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ماما یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ ردا نے گھبرا کر کہا۔

”گھروں میں جب عذاب آتے ہیں تو ایسے ہی
دوری، بے اتفاقی اور نفاق پیدا ہوتا ہے۔ اب خدا ہی ہے
کہ وہ ہم پر رحم کرے۔“ خدیجہ بیگم نے سرد آہ بھر کر کہا۔

☆☆☆
شام کو روچیل آفس سے گھر آیا تو گھر میں ایک
عجیب سا سناٹا اور خاموشی تھی۔ اس نے ادھر ادھر

دیکھا۔ اسے ردا کہیں دکھائی نہیں دی۔ اس نے بیڈ
روم کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ ردا وہاں بھی نہیں تھی۔

ماں جی کے کمرے میں جھانکا تو وہ بھی سو رہی تھیں۔

”ردا..... کہاں جاسکتی ہے؟“ روچیل نے
منظرب ہو کر سوچا۔ وہ جلدی سے کچن کی طرف گیا

مگر وہاں زرینہ کھانا پکانے میں مصروف تھی۔

”ردا کہاں ہے؟“ زرینہ کو دیکھ کر اس کا چہرہ تن گیا۔

”وہ اپنی امی کے گھر گئی ہیں۔“ زرینہ نے
جلدی سے بتایا۔

”کیوں..... کب اور کس کی اجازت سے؟“
روچیل نے اسی سے جواب دہی شروع کر دی۔

”التا کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ماں جی

”اور میں آپ کے لیے اداس ہونے کے باوجود
آپ کو یاد کر سکتی ہوں اور نہ ہی آپ کا ذکر.....“
نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا تو خدیجہ بیگم گھبرا گئیں۔

”کیوں بیٹا، کیا روچیل تم پر سختی کرتا ہے؟“
”وہ سختی کرتا ہے یا ظلم..... میں نے تو سب کچھ

قسمت سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔“ وہ دکھی لہجے میں بولی۔

”تم میں اتنا صبر، اتنا حوصلہ کہاں سے آگیا؟“
انہوں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”اس خدا نے ہی دیا ہے جس نے روچیل
میرے نصیب میں لکھا ہے۔“

”میں ہی تمہاری گھنگار ہوں، میں نے
تمہاری شادی میں جلدی کی..... یہ سوچ کر کہ روچیل
تمہیں بہت خوش رکھے گا۔“ وہ یہ کہتے ہوئے پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگیں۔

”خوش..... خوشی تو شاید اس گھر سے رخصت
ہوتے ہی مجھ سے روٹھ گئی۔“ ردا نے زخمی مسکراہٹ

سے جواب دیا۔

”اور تمہارے جانے کے بعد سے خوشی اور
سکون یہاں بھی نہیں رہا۔“ ماں کی اس طرح کی بات

پر وہ چونک اٹھی۔

”گھر کا ہر فرد ایک دوسرے سے متنفر ہو چکا ہے۔
اتنے فاصلے اور دوریاں بڑھ گئی ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے

کبھی مل نہیں پائیں گے۔“ وہ افسردگی سے گھر کے
حالات بتا رہی تھیں اور ردا حیرت سے سن رہی تھی کہ اس

کے جاتے ہی اس کے میکے میں کیا کیا ہو گزرا۔

”شمیلہ بھابی اس حد تک بھی جاسکتی ہیں.....
فہام بھائی..... کیا انہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا؟“

”جب سچ..... مکارانہ سازشوں کی پلیٹ میں آ
ہے تو بری طرح دھندلا جاتا ہے بیٹا..... تم بچوں میں

سے کسی نے ایسی مکاریاں دیکھی ہیں اور نہ سنی ہیں مگر
اب تو سب ہی بوکھلا گئے ہیں اور اس کی چالوں میں

شمیلہ جب بھی خدیجہ بیگم کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتی
تو زائدہ ان کا حوصلہ بڑھاتی۔ وہ اس کی کمی کو بہت

شدت سے محسوس کرنے لگی تھیں۔ سارا سارا دن
اپنے کمرے میں بند رہتیں کسی سے کوئی بات نہ کرتیں۔

فہام اور حاتم سے بھی بہت ضروری بات کر کے
خاموش ہو جاتیں۔ اس دن اچانک ردا کا فون آگیا

تو خدیجہ بیگم بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں
تو ردا بھی ایک دم پریشان ہو گئی۔

”ماما! آپ کیوں رو رہی ہیں، پلیز کچھ تو
بتائیں؟“ ردا نے گھبرا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں..... بس یونہی..... تمہاری آواز سن
کر میرا دل بھر آیا۔ بس میں تمہیں یاد کر کے بہت

اداس ہو رہی ہوں۔“ خدیجہ بیگم نے سسکی بھرتے
ہوئے کہا۔

”اداس تو میں بھی بہت ہوں مگر ماں جی کی وجہ
سے نہیں آسکتی۔“ ردا نے اپنی مجبوری بتائی۔

”ٹھیک ہے بیٹا..... پھر بات کروں گی.....“
خدیجہ بیگم نے شکستہ لہجے میں کہہ کر فون رکھ دیا۔

ردا ماں کی آواز سن کر بہت مضطرب ہو گئی تھی۔ ماں
جی کے پوچھنے پر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

”بیٹا..... تم ایسا کرو، جاؤ اپنی ماما سے مل
آؤ..... کافی دن ہو گئے ہیں۔ زرینہ میرے پاس

ہے، اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں فضیلت کو بلا لوں
گی۔“ ماں جی نے بڑی محبت سے کہا تو ردا ایک دم

بچوں کی طرح کھل اٹھی اور ماں جی کا شکریہ ادا کر کے
زرینہ کے پاس آئی۔ اسے ماں جی کا خیال رکھنے کو کہا

اور تمام ضروری کاموں کی ہدایات دے کر وہ خدیجہ
بیگم کے پاس اچانک جا پہنچی۔ خدیجہ بیگم بیٹی کو

اچانک دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

”اچھا کیا تم آگئیں۔ تمہارے بغیر میں کتنی
اداس ہو گئی ہوں، بتا نہیں سکتی۔“ انہوں نے ردا کے

چہرے کو جذباتی انداز میں چومتے ہوئے کہا۔



عبدالستار کی شادی

نصرت جبین ملک

ثریا گھر میں داخل ہوئی... سر پر اوڑھی چادر کو چارپائی پر اتار کر پھینکا اور وہیں پر بیٹھ کر بیٹی کو آوازیں دینے لگی۔
 ”ارے کہاں مرگنی نازہ جلدی سے میرے لیے چائے لے آئے۔ نازو نے گرم گرم چائے کپ میں انڈیلی اور آکر ماں کو کپ تھما دیا اور خود ساتھ خاموشی سے بیٹھ گئی۔
 ”ارے تو نے پوچھا نہیں کہ مجھے رشتہ پسند

کے لیے باہر لے گئے ہیں۔“ خدیجہ بیگم نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔
 ”آپ کا مطلب ہے میں نے اسے قید کر رکھا ہے؟“ روحیل نے خفگی سے کہا۔
 ”نہیں..... نہیں، میرا یہ مطلب نہیں۔“ وہ گھبراہٹ میں کہا۔
 ”مما کی طبیعت بہت خراب ہے اور اسے گھوٹے پھرنے سے فرصت نہیں۔“ روحیل نے سخت لہجے میں کہا۔
 ”میں ابھی ردا کو فون کرتی ہوں، آپ بیٹھیں بیٹا۔ وہ ابھی آ جاتی ہے۔“
 ”اوکے..... اس سے کہیں کہ وہ جلدی آئے..... میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں.....“ روحیل نے اپنی کلانی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”میں..... ابھی فون کرتی ہوں۔“ خدیجہ بیگم نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا تو روحیل خفگی سے مزہ بنا کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلنے ٹہلنے وہ میک شیلف کے پاس آ گیا اور اس میں سے کتابیں نکال نکال کر دیکھنے لگا۔ یہ بک شیلف خدیجہ بیگم نے ردا کے کمرے سے اٹھا کر اپنے پاس رکھوا لیا تھا کہ بھی کبھی کتاب پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ اس نے ایک شاعری کی کتاب نکالی اور اسے کھول کر جونہی پڑھنے لگا تو اس میں سے ایک خوب صورت لفافہ نکلا..... اس نے کمال جستجو سے اسے کھول کر دیکھا اور پڑھنے لگا۔ یکا یک اس کے چہرے پر انتہائی غصے اور حیرت کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ وہ غصے سے مٹھیاں بھینچنے لگا، خط کو موڑ کر جیب میں رکھا اور کتاب واپس شیلف میں رکھ دی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ کیا کرے۔
 ”مکار..... دھوکے باز.....“ وہ غصے سے بڑبڑایا اور ہونٹ بھینچتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور خدیجہ بیگم کو کچھ بتائے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ وہ اسے پکارنی رہ گئیں۔
 (باقی آئندہ)

”ہاں جاؤ..... بیٹا بھائی کہہ رہا ہے۔“ خدیجہ بیگم نے جلدی سے جواب دیا۔
 ”گڈ ماما..... آپ بھی چلیں۔“ فہام نے ماں سے اصرار کیا۔
 ”نہیں..... میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔
 ”اچھا..... ٹھیک ہے پھر آپ آرام کریں.....“ فہام نے کہا اور وہ سب باہر چلے گئے۔
 ☆☆☆
 روحیل، ردا کو گھر میں کافی مس کر رہا تھا..... اور جب زرینہ نے اسے اطلاع دی کہ ردا آج رات شاید اپنے میکے میں ہی رہے گی تو روحیل کو غصہ آ گیا اور وہ ماں جی کے منع کرنے کے باوجود اسے لینے نکل گیا۔ تمام راستہ وہ یہی سوچتا رہا کہ ردا کو کیا کہے گا وہ اسے کیوں لینے آیا ہے۔ کیا وہ اسے بتا پائے گا کہ اس کے بغیر گھر کتنا سونا لگ رہا تھا اور اسے دیکھے بغیر اسے چین نہیں آ رہا تھا۔
 ”نہیں، مجھے کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔“ اس نے سوچا۔
 گیٹ شوکت بابا نے کھولا تھا۔ وہ لاؤنج کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ قدرے بلند آواز سے ردا کو پکارنے لگا۔
 ”یہ تو روحیل کی آواز ہے۔“ خدیجہ بیگم اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی ہڑبڑائیں۔ روحیل نے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر جھانکا۔
 ”روحیل بیٹا..... آپ!“ خدیجہ بیگم نے جلدی سے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔
 ”ردا کہاں ہے؟ میں اسے لینے آیا ہوں۔“ روحیل نے روکھے سے لہجے میں کہا۔
 ”وہ تو اپنے بھائی، بھائی کے ساتھ باہر گئی ہوئی ہے۔ اتنے روز بعد آئی تھی تو وہ اسے گھمانے

رشتے کو گھسیٹنے کے بعد ہمارے درمیان طلاق ہو گئی۔ پھر تین سال بعد میری شادی تیرے ابا سے ہو گئی۔ تیرا ابا مجھ سے عمر میں اٹھارہ سال بڑا تھا اور اس کا جسم بیمار یوں کا گھر بنا ہوا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں، میں کم عمر تھی۔ تیری پیدائش کے بعد تیرا ابا مزید آٹھ سال زندہ رہا پھر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ہائے ہائے میرے نصیب۔ ”تیرا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔“ ایک غصے کا تیز ملا دوسرا عمر کا پکا۔“

”مگر اماں بھائی کو کس بات کی سزا دے رہی ہو؟“ نازوان تمام باتوں سے آگاہ تھی اس وجہ سے وہ صرف بھائی کے مسئلے کا حل چاہتی تھی۔

”نازوان یہ تو زندگی کے تجربات ہیں، اسی لیے تو میں رشتے دیکھ بھال کے کرنا چاہتی ہوں پہلے۔۔۔ عبدالستار کا اور پھر تیرا تا کہ تم لوگوں کا ہم سفر ایسا ہو جو مثالی ہو، ان کے ساتھ تم لوگ ہلکی خوشی زندگی بسر کرو کھینچ تان کے نہ گزارو۔“ نازوان اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ اب جو بات وہ کہنا چاہ رہی تھی اس پر اماں کا رد عمل کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

”اماں برا نہ ماننا تالی دونوں ہاتھوں سے بچتی ہے، میں نے سنا ہے کہ اپنی طلاق کی وجہ بھی تم خود تھیں کیونکہ آئے روز تم ناراض ہو کر معمولی معمولی باتوں پر مٹکے جا بیٹھتی تھیں اور میرے ابا کو تو۔۔۔ باقاعدہ مارا بھی کرتی تھیں، یہ تو مجھے بھی یاد ہے اور اب بھائی کے لیے بھی تمہیں اچھی بیوی نہیں چاہیے بلکہ اپنے لیے خادمہ بہو چاہیے“ تیرا بیٹی کی بات سن کر پھنکار کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نازوان بھاگ کر اندر چلی گئی۔

”شرم نہیں آتی اتنی لمبی زبان ہو گئی ہے اس مینا سے کتنے سبق سیکھ گئی ہے کہ ماں کو برا بھلا کہہ رہی ہے۔“ اس نے سبزی کی ٹوکری کو پھینکنے کے انداز سے رکھا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

آج اسے پتا چلا کہ مینا پڑوس میں میلاد پر گئی

”اماں ویسے مینا کچھ غلط بھی نہیں کہتی بھائی کی عمر چونتیس کی ہو گئی ہے اب ان کی شادی ہو جانی چاہیے پھر تھوڑی بہت خامیاں تو ہر انسان میں ہی ہوتی ہیں مکمل تو صرف اللہ کی ذات ہے۔“ بیٹی کے منہ سے پہلی مرتبہ یہ الفاظ سن کر تیرا کے سبزی کا مٹے ہاتھ ایک دم رک گئے۔

”تجھ پر اس بدروح کا اثر ہو گیا ہے کوئی بھوت ہی اسے بیاہ کر لے جاسکتا ہے۔ یہ بڑوں کے معاملات ہوتے ہیں، اس میں زیادہ پٹر پٹر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”مگر اماں یہ بھی تو اچھی بات نہیں کہ آپ لوگوں کی بیٹیوں میں کوئی نہ کوئی خامی نکال کر انہیں رد کر آتی ہیں آخر کوئی لڑکی اچھی بھی تو ہوگی ناں۔“ نازوان کی بات سن کر اس نے سبزی والی ٹوکری ایک طرف رکھ دی۔

”دیکھ اگر کوئی لڑکی ہر لحاظ سے اچھی مل جاتی تو کیا میرے سر پر سنگ نکل آئے ہیں کہ میں اسے اپنی بہو نہ بننے دیتی، نازوان یہ میری ذاتی زندگی کے تجربات ہیں جو میں رشتے دیکھ پرکھ کے کرنا چاہتی ہوں۔“

”وہ کیسے اماں؟“ نازوان دوپٹے سے گیلے ہاتھ صاف کرتی اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”آہ اب کیا بتاؤں تجھے۔! اماں کے اندر سے دکھ کی ایک لہر اٹھی۔

”نازوان جو عبدالستار کا ابا تھا ناں شادی سے پہلے تو میرا رشتہ حاصل کرنے کے لیے بڑا معصوم، کم گو اور شریف بنا رہا مگر جب شادی ہو گئی تو کچھ ہی عرصے بعد اس نے اپنا اصل رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ بات بات پر بحث کرنا اور لڑنا شروع کر دیتا تھا۔ شادی کے سال بعد عبدالستار پیدا ہوا پر وہ تبدیل نہ ہوا تو میں نے خود ہی مزید بچے پیدا کرنے کا ارادہ ترک کر دیا کہ نہ جانے اس شادی کا انجام کیسا ہو پھر میں اسے بچوں کو کیسے پالوں گی، آخر کار نو سال تک اس

باتونی ہونے کی وجہ سے اکثر اوقات اس تو تکرار کا سامنا کرتی رہتی تھی۔

”خالہ رشیدہ کے علاوہ اور کون ہے میرا اس دنیا میں۔۔۔۔۔ اماں، ابا تو بچپن میں اللہ کو پیارے ہو گئے تو خالہ خالو نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ پالا پوسا ایف اے تک پڑھایا۔ اللہ بخشے خالو کو آج انہی کی پیشن کی وجہ سے میں اور خالہ گھر کا نظام چلا رہے ہیں۔ خالہ کا علاج ہو رہا ہے ہر وقت اور ہر لمحہ مجھے خالہ کا ہی خیال رہتا ہے۔“

”بس کر مینا خدا کے لیے بس کر جا۔۔۔۔۔ میں پہلے سے بہت پریشان ہوں، اپنی پریشانی مجھ پر تھوپنے کی کوشش نہ کر۔“ اس کی دس بار کی سنی داستان سے اکٹا کر وہ بولی اور وہیں تخت پر لیٹ گئی۔

”ویسے خالہ جو تو نے اپنا معیار بنا رکھا ہے ناں شاید ہی کوئی لڑکی اس پر پوری اترے۔ مجھے لگتا ہے عبدالستار تیرے اس معیار کی بھیٹی میں پس کر بوڑھا ہو جائے گا۔ کوئی سیدھی سادی لڑکی دیکھ کر اس کی شادی کر دے۔“

”دیکھ مینا دیکھ۔“ تیرا نے فوراً اٹھ کر جوتا ہاتھ میں لے لیا۔ ”اپنی زبان کو ذرا قابو میں رکھا کرو ورنہ جس دن میرا ہاتھ بے قابو ہو گیا تو پھر تو مجھ سے زیادہ دور نہیں ہے، اتنے جوتے آ کر لگاؤں گی کہ کوئی چھڑوانے والا بھی نہ ہوگا، سمجھی تو۔“ تیرا نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

”دیکھ خالہ جس دن تجھے کوئی رشتہ پسند آ گیا اور تو نے رشتہ ڈھونڈنے کی جدوجہد ترک کر دی تو پھر دیکھنا جو میں کبھی اس پر بات کروں۔ تیرا بیٹا بے چارہ شریف، سیدھا سادہ ہے کیوں اسے خوار۔۔۔۔۔“ ابھی اس کی بات ادھوری ہی تھی کہ تیرا نے جوتا ہوا میں لہرا کر اس کی طرف پھینکا تو وہ فوراً منظر سے غائب ہو گئی اور تیرا کا جوتا مینا کے صحن میں جا گرا۔

☆☆☆

آیا ہے کہ نہیں؟“ تیرا نے چائے کے دو گھونٹ بھر کر حیرت سے بیٹی کو دیکھا۔

”اماں پچھلے دس سال سے تجھے اسی کام میں مجتاد دیکھ رہی ہوں، مہینے بھر میں بھائی کے لیے سات آٹھ رشتے تو دیکھنے تو جاتی ہی ہے پر ہر لڑکی میں کوئی نہ کوئی خرابی تیری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے، مجھے یقین ہے اب بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔“ نازوان کی بات میں وزن تھا۔

”ہاں، بات تو تیری غلط نہیں۔۔۔۔۔ میں اس آنگن میں ایسی دلہن لانا چاہتی ہوں جو خوب صورت اور خوب سیرت ہو، سکھڑ اور کفایت شعار ہو، صفائی پسند اور کم گو، پڑھی لکھی ہو اور کڑھائی سلائی میں بھی ماہر ہو۔ یہ لڑکی بھی باقی تو ہر لحاظ سے بہتر تھی مگر مجھے اس کے بننے کا انداز بالکل اچھا نہیں لگا۔ خوب صورت تھی مگر چڑیلوں کی طرح ہنستی تھی بھلا ایسی لڑکی کو بہو بنا کر میں نے لوگوں کے سامنے تماشا بنانا ہے اور۔۔۔۔۔“

”واہ خالہ واہ!“ ساتھ والے گھر کے چوبارے پر یاسمین عرف مینا نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ خالہ نے ایک کھا جانے والی نظر سے اسے دیکھا اور پھر بیٹی سے سرگوشی کے انداز میں بولی۔

”اس کی ہنسی اسی منحوس مینا سے کافی ملتی جلتی تھی۔“ ”ارے خالہ یہ نازو سے کھسر پھسر کس بات پر کرنے لگ گئی۔ بتاناں کیا یہ رشتہ بھی پسند نہیں آیا تجھے؟“ مینا نے ہاتھ لہرا کر سوال کیا تو جیسے تیرا جل بھن گئی۔

”ہاں نہیں پسند آیا۔۔۔۔۔ کیوں تجھے کوئی تکلیف ہے یا تیری لڑکی والوں سے کوئی رشتہ داری ہے۔۔۔ جو تجھے اتنی تکلیف ہو رہی ہے اور تجھے دنیا میں کوئی اور کام کرنے کو نہیں ہے میری جاسوسی کے علاوہ۔ کم سے کم اپنی اس فاج زدہ خالہ پر ہی کچھ توجہ دے دیا کر۔“ تیرا کو اپنے ذاتی معاملات میں مینا کی مداخلت بالکل پسند نہیں تھی اور مینا حد سے زیادہ

جوڑوں کے درد سے نجات پائیے!

ہزاروں لوگوں کی طرح اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کے مسائل سے نجات حاصل کیجئے

JOINTA

HERBAL ANALGESIC CREAM

جوڑوں پر روزانہ جوائنٹا لگائیے
درد سے جان چھڑائیے

- بے حد موثر ہر بل فارمولا = Rs.300/-
- PCSIR سے تصدیق شدہ
- ہر بل ہونے کی بدولت کوئی سائنڈ ایفلکٹ نہیں
- ماہرین کی نگرانی میں تیار کردہ

جوائنٹا کریم

جوڑوں کے درد سے نجات کا پیغام
آپ کے نام!

کراچی میں جوائنٹا کریم حاصل کرنے کیلئے

مراد میڈیکو اسٹیڈیم روڈ، نزد آغا خان ہسپتال
786 میڈیکل اسٹور بلاک 17، گلستان جوہر نزد جوہر چورنگی

www.facebook.com/castlegate.com.pk

واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ باہر ٹیکسی رکنے کی آواز آئی تو ثریا اور نازو گھر کے اندر داخل ہو گئیں جبکہ عبدالستار باہر جاوید سے حال احوال پوچھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اندر آیا تو دونوں میں تو... تکار جاری تھی عبدالستار کا بھی منہ بنا ہوا تھا۔ بھائی کو اتنا دیکھ کر نازو پاؤں پیختے ہوئے اندر چلی گئی اور دروازہ زور سے بند کر لیا۔ ثریا کا اگلا سامنا عبدالستار سے تھا۔

”بیٹا سچ بتاؤں تو مجھے لڑکی کچھ خاص پسند نہیں آئی... اس کی آنکھیں بالکل چھوٹی چھوٹی تھیں جیسے چین سے درآمد کر کے لگائی ہوں۔“ ثریا نے نظریں جراتے ہوئے کہا تو عبدالستار چیخ اٹھا۔

”اماں خدا کے لیے کسی کو تو معاف کر دیا کریں جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ وہ جیسی بھی ہے مجھے منظور ہے، میرے لیے کسی لڑکی کا شریف اور باکردار ہونا ہی کافی ہے تو کیوں آپ اپنے معیار کے پیمانے سے ہر ایک کو مارتی ہیں۔“ عبدالستار کی آواز سن کر نازو بھی کمرے سے باہر آ گئی۔

”بھائی وہاں میں اماں کو مسلسل اشارے کرتی رہی کہ اصل بات کی طرف آئیں لیکن اماں نے توجہ ہی نہیں دی اور ان کے گھر سے نکلتے ہی بھائی جاوید کے سامنے مجھے ڈانٹ دیا کہ میں کیا تمہیں اشارے بازی کے لیے ساتھ لے کر آئی تھی۔“ ثریا چار پائی پر بیٹھ کر دوپٹے کے پلو سے آنکھوں میں آنے والی نمی صاف کرنے لگی۔ عبدالستار نے ہاتھ کے اشارے سے بہن کو مزید کچھ بولنے سے روک دیا اور خود گھر سے باہر چلا گیا۔ اس دن ثریا اندر سے بہت ٹوٹ گئی وہ سمجھتی تھی کہ عبدالستار جیسی فرماں بردار اولاد کے ساتھ وہ پوری دنیا کا مقابلہ کر سکتی ہے ان لوگوں کا بھی جوا سے اپنی طلاق کا خود ذمے دار قرار دیتے تھے اور ان کا بھی جو بیوہ ہونے پر اس کی طرف انگلیاں اٹھاتے تھے مگر آج تو سارے بھرم ہی ٹوٹ گئے جب عبدالستار ہی بدل گیا تھا اس کے منہ کو بھی اپنے حقوق:

بیزار رہنے لگا تھا۔ اس کے ہم عمر اب تک کئی بچوں کے ابا بن چکے تھے۔ وہ اس سلسلے میں لوگوں کے سوالات سن سن کر اور کوئی نہ کوئی بہانے ان کے سامنے بنا، بنا کر تھک چکا تھا کیونکہ بظاہر اس کی مالی حالت بھی اچھی تھی۔ شکل صورت بھی کوئی بری نہیں تھی ملنسار اور خوش اخلاق بھی تھا ایسے حالات میں ابھی تک گھر نہ بسنا لوگوں کے لیے حیران کن ضرور تھا۔ ایک روز وہ گھر آیا تو اس کے ہاتھوں میں مٹھائی اور فروٹ کی خوب صورت ٹوکری تھی اگرچہ وہ پہلے بھی یہ لایا تھا مگر چمک دمک والے کور اور آرائشی باسکٹ میں دیکھ کر ثریا کو حیرت ضرور ہوئی اس سے پہلے کہ ثریا کچھ پوچھتی وہ خود ہی بول پڑا۔

”اماں تیاری کریں باہر میرا دوست جاوید موجود ہے، وہ اپنی کزن کی تعریف کر رہا تھا کہ میرے لیے ہر لحاظ سے بہتر ہے، آپ اس کے ساتھ جا کر میرے لیے بات کر آئیں۔“ بیٹے کی زبان سے پہلی مرتبہ دو ٹوک الفاظ سن کر وہ حیران رہ گئی ورنہ عبدالستار نے تو کبھی عام بات بھی اس سے کھل کر نہیں کی تھی۔

”عبدالستار وہ تو ٹھیک ہے میں چلی جاؤں گی پر انہوں نے انکار کر دیا تو.....؟“

”اماں یہ نوبت نہیں آئے گی۔“ عبدالستار کے لہجے میں کوئی پک نہیں تھی۔ جاوید نے انہیں میرے بارے میں سب بتا دیا ہے وہ غریب اور شریف سے لوگ ہیں وہ بھلا انکار کیوں کریں گے۔“ ثریا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا یعنی اب تو عبدالستار نے ان کی طرف سے اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی پھر اس نے ایک اور چوٹ اس وقت لگائی۔ جب یہ کہا کہ وہ گل ناز کو بھی ساتھ لے جائیں۔ وہ تو پہلے ہی بھائی کی فوری شادی کے لیے بے چین تھی ثریا نے فوراً دل میں موجود بے شمار دوسووں کے ہمراہ تیاری کی۔ بھائی کے کہنے پر گل ناز بھی خوشی خوشی تیار ہو گئی۔ عبدالستار گھر پر ہی ان کے

ہوئی ہے تو وہ رشیدہ کے گھر چلی گئی کہ اس کا حال بھی پوچھ لے گی اور اپنا اس دن کا پھینکا ہوا جوتا بھی لے آئے۔ رشیدہ کے پڑوس میں انہیں آئے ہوئے سات سال ہو گئے تھے مگر ان سات سالوں میں اسے مینا سوائے ایک مرتبہ کے کبھی اچھی نہیں لگی تھی کہ جب اس کے بیمار ہونے پر مینا تین دن لگا تار گھر کا سارا کام کرتی رہی تھی لیکن اس دوران بھی اس کی باتونی زبان نے صبر کا دامن نہیں پکڑا تھا۔ وہ مینا پر تیز طرار، باتونی، اکھڑ مزاج اور چلا کو ماسی ہونے کے الزامات عائد کرتی تھی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ مینا سے اس کا سامنا کم ہی ہو۔ اس دن بھی اس نے اسی موقع سے فائدہ اٹھایا اتنے عرصے بعد رشیدہ، ثریا کو دیکھ کر بہت خوش ہو گئی اور ساتھ دھک کا اظہار کیا۔

”میں تو بغیر سہارے کے چل پھر نہیں سکتی تم بھی مجھے بالکل بھول گئی ہو۔“ یہ کہتے ہوئے رشیدہ جذباتی ہو گئی۔

”دیکھو آج تو تمہاری محبت میں آگئی ہوں ناں۔“ یہ کہتے ہوئے ثریا نے پیار سے رشیدہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس خیال سے اپنے جوتے کے حصول کا تقاضا ترک کر دیا کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ صرف جوتا لینے کی غرض سے آئی تھی۔

رشیدہ نے جب باتوں باتوں میں اظہار کیا کہ وہ کہیں دیکھ بھال کر مینا کا رشتہ کروادوے، لڑکا زیادہ دولت مند اور خوب صورت نہ ہو صرف شریف اور برسر روزگار ہو تو ثریا کا تو جیسے منہ بن گیا کہ بھلا مینا جیسی لڑکی کے لیے ایسا رشتہ کہاں سے مل سکتا ہے۔ اس نے دبے لفظوں میں تقریباً انکار ہی کر دیا اور منہ بنا کر گھر واپس آ گئی۔

☆☆☆

ثریا نے خاندان کے اندر اور باہر اب تک... بے شمار رشتے دیکھے تھے لیکن کوئی اسے اپنے معیار کا نہیں لگا تھا اب تو عبدالستار بھی ماں کی تلاش سے

رشیدہ کو خدا حافظ کہے بغیر تیزی سے باہر چلی گئی اور رشیدہ اس کی حالت پر مغموم ہو گئی۔

اگلے دو تین دن عبدالستار جب بھی گھر آتا خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ اس نے نازو کو بھی منع کر دیا کہ وہ اماں سے کوئی سخت بات نہ کرے۔ ایک دن نازو چھت پر گئی تو مینا نے اسے خالہ رشیدہ کا پیغام دیا کہ وہ کسی وقت بھائی عبدالستار کو ان کے پاس بھیجے انہوں نے ایک ضروری بات کرنی ہے لیکن اماں کو اس بات کی بھنگ بھی نہیں پڑنی چاہیے اس نے فوراً بھائی کو جا کر پیغام دیا کہ شاید اس عجیب و غریب مسئلے کا کوئی حل نکل آئے۔ عبدالستار شام کو نماز مغرب کے لیے نکلا تو واپسی پر وہ خالہ رشیدہ کے گھر چلا گیا۔

☆☆☆

”تیرا بھائی ابھی تک نہیں آیا پہلے تو وہ کبھی اتنی دیر نہیں لگاتا تھا۔“ ثریا کے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے کہ آج صبح اس نے بیٹے کے فیس جانے کے بعد اس کے تکیے کے غلاف میں جو تعویذ چھپایا تھا کہیں اس کا کوئی الٹا اثر تو نہیں ہو گیا۔

”اماں انہوں نے ایک دوست کے گھر جانا تھا مجھے بتا کر گئے تھے کچھ لیٹ ہو جائیں گے۔“ نازو سمجھ گئی تھی کہ وہ ابھی تک کیوں نہیں آئے۔ تھوڑی دیر بعد عبدالستار آیا تو سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا، ثریا نے نازو کو اشارہ کیا کہ وہ جا کر بھائی کو کھانا دے آئے۔ نازو وڑے میں کھانا لے کر اندر داخل ہونے ہی والی تھی کہ عبدالستار کمرے سے باہر آ گیا۔ ثریا نے حیرت سے بیٹے کو باہر آتے دیکھا۔

”نازو دو دن اپنی اماں سے الگ بیٹھ کر کھانا کھایا ذرا مزہ نہیں آیا، آج تو میں کھانا اماں کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔“ ثریا حیرت زدہ آنکھوں سے بیٹے کو دیکھ کر مسکرانے لگی کہ اس کا تعویذ اپنا اثر دکھا رہا ہے۔ نازو کے چہرے پر بھی ماں اور بھائی کو مسکراتا دیکھ کر

نے مجھے جھنجھوڑا کہ میں اپنی سب سے قیمتی متاع اپنے ہاتھوں لٹانے جا رہی ہوں مگر..... مگر اب حالات بدل گئے ہیں پر میرے لیے خود کو بدلنا مشکل ہے۔ میں کافی عرصے بعد آج ٹوٹ گئی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رشیدہ کو وہ پہلے سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔ اسے ثریا کی اس حالت کا شدید دکھ تھا رشیدہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”اب میں کیا کہوں ثریا مگر تمہیں خود کو بدلنے کی کوشش تو ضرور کرنی ہوگی، میں جانتی ہوں تمہارا بیٹا بہت نیک اور تابعدار ہے وہ تم سے بغاوت تو ہرگز نہیں کرے گا مگر تمہاری یہ سوچ اسے پریشان تو رکھے گی ناں اور جب تمہیں اپنی سوچ پر نظر ثانی کرنی پڑ جائے گی تو ہو سکتا ہے پھر بہت دیر ہو جائے۔“

”تو پھر میں کیا کروں رشیدہ بہن؟ میں نے زندگی میں جو کچھ حالات دیکھے عبدالستار ان کے لیے مرہم کا کردار ادا کرتا آیا۔ اب تو میری دنیا عبدالستار سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی ہے۔ نازو کا کیا ہے وہ تو پرایا مال ہے۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”اب تمہارے سامنے دل کی بھڑاس نکال کر کافی پرسکون ہو گئی ہوں۔“ بالوں کو اچھے طریقے سے ماتھے سے ہٹاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے باتوں میں خیال ہی نہیں آیا چائے تو پی لو۔“

”بس دل نہیں کر رہا رشیدہ بہن لیکن ابھی میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔ تم مجھے بے شک خود غرض کہو یا ذہنی مریضہ مگر میں اپنے بیٹے کی محبت کا بنوار اتنی آسانی سے نہیں ہونے دوں گی، میں ابھی گھر جا کر اپنی ماموں زاد ساجدہ کو ساری صورت حال فون پر بتاتی ہوں، وہ ملتان میں رہتی ہے وہاں ایک عامل حیر بابا بہت مشہور ہے۔ کل ساجدہ کا بھائی کسی کام سے یہاں آ رہا ہے وہ ان سے تعویذ لے کر آئے گی۔ بس میں ابھی جا کر کہتی ہوں۔“ وہ

مجھے مایوس نہیں کیا میں نے جو کہا اس نے مانا میری خوشی پر وہ خوش ہوا میرے دکھوں پر وہ رویا..... پکلی تنخواہ سے لے کر آج تک جو کمایا میرے ہاتھ پر لا کر رکھا، میں نے جہاں پر بھی خرچ کیا اس نے کبھی نہ پوچھا۔ میرے سارے رشتے سمٹ کر اس کی ذات میں سمو گئے میری انا، بھرم، ناز اس کے دم سے قائم ہے مگر یہ سب پا کر جب اس کی زندگی کے اہم فیصلے کرنے کا وقت آیا تو اس کی محبت کو بانٹنے، توجہ کو تقسیم کرنے کے لمحات آئے تو میں خود غرض بن گئی میری مامتا اپنے سب سے اہم اور قیمتی رشتے کی تقسیم پر تیار نہ ہوئی۔ میں خود غرض بن گئی رشیدہ میں.....“

دروازے پر قدموں کی آواز سن کر وہ آنسو صاف کرتے ہوئے خاموش ہو گئی۔ مینا ٹرے میں دو کپ چائے لے کر اندر آ گئی۔ وہ ٹرے میز پر رکھا جو بھی واپس پٹی تو ثریا نے ایک نظر اس کے گیلے پانچوں پردوڑائی۔ شاید وہ کپڑوں کی دھلائی ادھوری چھوڑ کر چائے بنالائی تھی وہ باہر چلی گئی تو رشیدہ نے ثریا کو چائے اٹھانے کا اشارہ کیا تو ثریا سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

”ہاں بولو ثریا تم کیا کہہ رہی تھیں؟“

”رشیدہ بہن میں خود چاہتی ہوں کہ میرے آنگن میں پوتے پوتیاں کھیلیں، عبدالستار کی نسل بڑھے لیکن جب بھی مجھے یہ خیال آیا کہ شادی کے بعد میرا بیٹا کسی اور کا ہو جائے گا میرے جینے کی اکلوتی آس بھی تقسیم ہو جائے گی تو پھر مجھے صرف اپنا آپ ہی اہم لگتا..... اپنے مفادات ہی ضروری لگتے۔ میں نے خود کو بدلنے کی کوشش کی لیکن نہ بدل سکی۔ میں نے بے شمار رشتے دیکھے صرف عبدالستار کو مطمئن کرنے کے لیے، کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ مجھے اس کی پروا نہیں لیکن جب میں نے صرف عبدالستار کی ماں کی آنکھ سے اس لڑکی کو دیکھا تو میرے دل میں اس کے لیے نفرت جاگ گئی، میرے اندر کی خود غرض عورت

کی زبان مل گئی تھی تو بھلا وہ کیسے مضبوط رہ سکتی تھی۔ اس نے چادر سر پر درست طریقے سے لی اور اٹھ کر باہر کی... طرف چل پڑی۔ نازو پریشان ہو کر پیچھے بھاگی کہ نہ جانے وہ کہاں جا رہی ہے مگر جب خالہ رشیدہ کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو مطمئن ہو کر واپس آ گئی۔

گھر کے صحن میں مینا کپڑے دھو رہی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے فوراً اندر رشیدہ کے کمرے میں چلی گئی۔ مینا نے بھی اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

وہ رشیدہ کے پاس بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دل پر ایک بڑا بوجھ تھا اپنی اولاد کے بدل جانے کا..... اس نے تمام زندگی اپنی مرضی اور آزادی سے گزاری تھی کبھی کسی کی رائے پر نہ چلی تھی ہمیشہ ہر فیصلہ خود کیا تھا مگر اب حالات اس سے متصادم ہو گئے تھے۔ اس نے ساری بات رشیدہ کو بتائی رشیدہ نے تحمل سے ساری بات سن کر کہا۔

”ثریا وقت ہمیشہ ایک سانہیں رہتا لیکن...“

عبدالستار کا مطالبہ بھی تو غلط نہیں ہے۔ ہر کام کی طرح شادی کا بھی ایک وقت ہوتا ہے اور وہ وقت پر ہی اچھی لگتی ہے تمہارے پاس اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ تم عبدالستار کا رشتہ فوراً کہیں کر دو۔“ وہ رشیدہ کا ہاتھ پکڑ کر نیچے قالین پر اس کے بیڈ کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

”رشیدہ بہن، میں آج تمہارے سامنے ہر بات کا اعتراف کرنا چاہتی ہوں چاہے پھر تم مجھے لاکھ بے حس اور خود غرض کہو عبدالستار میری کل دنیا..... کل کائنات ہے نہ جانے میری کون سی نیکی کام آئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عبدالستار جیسا باکردار، نیک، فرماں بردار سلجھا ہوا بیٹا عطا کیا اس کے بچپن سے لے کر اب تک زندگی میں کیسے کیسے حالات اور مشکلات آئیں لیکن کبھی عبدالستار نے

اور سبز رنگ سے آراستہ لباس پہنے گھر کے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ چوڑیوں کی کھن کھن اور مہندی کی خوشبو سے فضا مہکی ہوئی تھی۔

”عبدالستار یہ سب کیا ہے؟“ عبدالستار نے ایک طرف گاڑی روکی تو اس نے اندر بیٹھے بیٹھے نہایت حیرت سے پوچھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے گاڑی سے اتر کر بیگ اور اسٹینجی نکال کر گھسیٹا ہوا گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ پیچھے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اندر آگئی۔ اندر کا منظر باہر سے بھی زیادہ مہربان تھا۔ کہیں مہندی کے تھال سجائے جا رہے تھے تو کہیں پرزرق برق ملبوسات کو سلیقے سے رکھا جا رہا تھا، گھر کے ایک کونے میں چھوٹا سا اسٹینج لگایا جا رہا تھا۔ لڑکیاں ہاتھوں میں پھولوں کی لڑیاں لیے اسے سجانے میں مصروف تھیں دوسری طرف کچھ خواتین روزمرہ کے معمولات پر گفت و شنید میں لگی ہوئی تھیں بڑی لائٹ کے نیچے لڑکیاں مہندی لگانے اور چوڑیاں پہننے میں مصروف تھیں پھر سب کی توجہ اس کی طرف ہو گئی۔

”نازو..... نازو بچہ امی آئیں۔“ بچھلی گلی میں رہنے والی باجی نسرین نے اسے دیکھتے ہی نازو کو آواز دی تو نازو جی سبائی آکر ماں سے لپٹ گئی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے بیٹی کو دیکھا اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی پیچھے سے سلمیٰ کی آواز آئی۔

”ماشاء اللہ آنٹی آپ نے تو واقعی کمال کر دیا، اتنی بڑی نیکی اور اتنے چپکے چپکے حاصل کر لی۔“ اس نے الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ سلمیٰ کو دیکھا جو ایک ہاتھ سے بیٹے کا بازو پکڑے اور دوسرے پر مہندی لگوائے کھڑی تھی۔

”بس کرو سلمیٰ، ثریا کو سانس تو لینے دو دیکھو تو ملتان سے بری کا سامان لے کر آئی ہے اور اتنا سفر کیا ہے اس نے۔“ سلمیٰ کی والدہ کے بعد سامنے والے گھر کی بتول نے لقمہ دیا۔

”ماؤں کی تیاریاں اور خرید و فروخت تو شادی

عمر و اقارب سے مل سکتی۔ عبدالستار نے ماں کو کافی رقم دی کہ نازو کے لیے اور اس کی دوست کی فیملی کے لیے ملتان کی کڑھائی والے سوٹ لے آئے۔ ملتان پہنچ کر وہ سب سے ملی ملائی لیکن جب تعویذ لے کر اس نے اپنے ہاتھ میں تھامے تو ایک دم اس کا دل دکھی ہو گیا کہ اگر خدا نخواستہ ان تعویذوں نے عبدالستار کی صحت اور دماغ پر الٹا اثر کر دیا یا اسے کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچایا تو وہ خود کو تمام زندگی معاف نہ کر سکے گی..... اس کے پاس کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا اپنا مقصد پورا کر لینے کے لیے پھر اس نے واپسی کا ارادہ کیا۔ جب وہ بھاری بھر کم سامان کے ہمراہ بس اسٹاپ پر اتری تو وہاں عبدالستار بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سامان کو گاڑی میں رکھا اور ماں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ثریا نی چمکتی گاڑی دیکھ کر حیران تھی کہ جاوید نے کتنی اچھی گاڑی خرید لی ہے کیونکہ جب کبھی وہ دوسرے شہر جانے کے بعد واپس پلٹتی تھی تو عبدالستار اپنے جگری دوست جاوید کی گاڑی پر ہی لینے آتا تھا پوچھنے پر عبدالستار نے بتایا کہ اس کی اپنی گاڑی ہے تو یہ ثریا کے چہرے پر خوشی کی اک لہر آگئی۔ اس نے قابل تحسین نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

ڈھلتی ہوئی شام کو گاڑی جب ان کے گھر والی گلی میں داخل ہوئی تو گلی میں خلاف معمول ایک گہما گہما تھی۔ بچے بچیاں گلی میں کھیل رہے تھے۔ کھانے پینے کی مختلف اشیاء بیچنے والے گلی میں کھڑے آوازیں لگا رہے تھے۔ محلے کے من چلے لڑکے ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے قہقہے لگا رہے تھے اس نے اندازہ لگا لیا کہ آج اس گلی کے کسی گھر میں مہندی کی تقریب ہونے والی ہے لیکن جب اس کے اپنے گھر کے سامنے گاڑی رکی تو ثریا کی آنکھیں حیرت سے کھلی کھلی رہ گئیں..... گھر کو برقی قہقہوں سے بڑی خوب سورتی سے آراستہ کیا گیا تھا کئی خواتین پیلے

چھین لے، تم اسے میری خود غرضی سمجھو یا ذہنی خرابی یا پھر میری ممتا کی بے حسی۔ میں جب اس آنگن میں تمہیں ایک نئے وجود ایک نئے بندھن کے ساتھ چلتا پھرتا محسوس کرتی ہوں تو مجھے اپنا آپ اکیلا ہی نظر آتا ہے میں تمہاری ماں ہوں مگر کیا کروں.....“ یہ کہہ وہ رونے لگی۔ آنسو موتیوں کی طرح اس کی آنکھوں سے جھڑتے جا رہے تھے پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے۔

”اے میرے اللہ میں لاکھ گناہ گار سہی مگر تجھے میرے بیٹے کی نیکیوں، اچھائیوں اور ان مہربانیوں کا واسطہ ہے جو اس نے مجھ پر کی ہیں، مجھے اس الجھن سے نکال دے۔ مجھے ہمت اور طاقت دے میرے ذہن کو سکون دے، مجھے درست فیصلے پر پہنچنے کی جرأت دے اور میرے دل سے دوسروں اور خدشات کو نکال دے۔ اے میرے مالک میری غیبی مدد فرما۔“ وہ دونوں ہاتھوں کو منہ پر اچھی طرح سے پھیرنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ بہ مشکل پاؤں زمین پر گھسیٹتی ہوئی اندر چلی گئی۔ جب سے عبدالستار کی خواہش پر رشتہ دیکھ کر آئی تھی اس دن سے آج تک وہ کافی بدل گئی تھی اور خود کو کافی بے بس کمزور اور بوڑھا محسوس کرنے لگی تھی۔

”مجھے ملتان کل ہی جانا پڑے گا کیونکہ ساجدہ نے جو تعویذ بھیجے تھے وہ ایک قمری ماہ کے تھے یعنی آج سولہواں دن ہے اور باقی دن ہی کتنے رہ جائیں گے پھر قریب، قریب ملتان سے یہاں آنے والا بھی کوئی نہیں جو تعویذ لے آئے مجھے خود ہی جانا چاہیے۔ آٹھ دس دن تو وہاں ملنے ملانے میں لگ جائیں گے یوں اگلے قمری ماہ کے آغاز پر عبدالستار کے سر ہانے نئے تعویذ آجانے چاہیے۔“ اس نے اگلے دن ہی جانے کی ٹھانی۔ ثریا کا سارا انتہیال ملتان سے تعلق رکھتا تھا اس لیے اسے وہاں رہنے کے لیے ایک ماہ درکار تھا کہ وہ جی بھر کے اپنے

خوشی کی لہر پھیل گئی۔ نازو نے بھائی سے یہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ خالدہ رشیدہ نے کیا کہا کیونکہ اس کے لیے یہی بڑی بات تھی کہ گھر کا ماحول خوشگوار ہو گیا تھا البتہ اسے کچھ اندازہ تھا کہ خالدہ رشیدہ اور بھائی کے درمیان کوئی نہ کوئی کچھڑی ضرور... پک رہی ہے، مینا سے پوچھا تو اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کر دیا کہ خالدہ نے اسے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

☆ ☆ ☆

ثریا کے لیے بظاہر حالات نارمل ہو گئے لیکن اس کا دل پورے طور پر مطمئن نہ ہوا ایک کرب کی کیفیت اس کے اندر پیدا ہو گئی۔ ایک انجان سا دکھ سمو گیا عبدالستار اس کے بعد ماں کے ساتھ اسی خوش اخلاقی سے پیش آیا جس کا مظاہرہ سوائے ان دونوں کے اس نے تمام زندگی کیا تھا۔ بھائی کے سمجھانے پر نازو نے بھی کوئی ایسی بات نہ کی کہ ثریا کا دل جس پر دکھے لیکن سکون..... سکون نام کی چیز ثریا کے پاس برائے نام ہی رہ گئی۔ نہ جانے دل میں کیسا دھواں سا اٹھتا تھا کہ وہ راتوں کو گہری نیند سے اچانک اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی، اچانک گھر میں چلتے پھرتے اسے اپنا دماغ شل اور جسم بے جان سا ہوتا محسوس ہونے لگتا۔ ایک روز وہ گھر میں اکیلی تھی نازو، مینا کے ہمراہ خالدہ رشیدہ کی دوا لینے ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھی واپسی پر بازار سے کچھ خریداری بھی کر لی تھی۔ اس اکیلے پن میں اس نے اپنے اندر اٹھنے والے کرب کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی تو ہر جگہ عبدالستار اسے اپنے سامنے کھڑا محسوس ہوا وہ تہی دامن تھا اور حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”عبدالستار میرے بیٹے میں کیا کروں۔“ وہ بڑبڑائی اور آنسو گالوں سے پھسل کر دامن پر گرنے لگے۔ ”ہر نیا رشتہ جو مجھ سے منسوب ہوا، وہ مجھے توڑ گیا پھر تم تو میرا معمول اثاثہ ہو میرے بچے..... مجھ میں ہمت نہیں ایسا نیا رشتہ بنانے کی جو تمہیں مجھ سے

غزل

دل و جاں کی تمناؤں کو میرے نام رہنے دو
محبت کی گھنٹی چھاؤں کو میرے نام رہنے دو
سنو تم! میں نے اس دل کے لیے دنیا بھلا ڈالی
سو اس کی دھڑکنوں، آہوں کو میرے نام رہنے دو
چمکتی شوخ آنکھوں کو نہ یوں موڑو کبھی مجھ سے
خدارا دل کی آشاؤں کو میرے نام رہنے دو
اگر تم بے وفا نکلے تو مرجاؤں گی میں اس پل
وفا کی تم سبھی راہوں کو میرے نام رہنے دو
یہی مانو کہ میری آخری پہلی یہ خواہش ہے
محبت کی پناہ گاہوں کو میرے نام رہنے دو
کرو وعدہ کہ خانم کو کبھی تنہا نہ چھوڑو گے
تم اپنی ان کڑی بانہوں کو میرے نام رہنے دو
فریدہ خانم، لاہور

تکلیف اس کیفیت سے کم ہو کہ جس سے آپ گزر رہی تھیں جس نے آپ کو الجھن میں ڈالا ہوا تھا۔
”عبدالستار۔“ ثریا کی آنکھوں کے کٹورے اچانک بھر گئے۔ ”عبدالستار کیا تم سمجھتے ہو کہ میں دماغی مریض ہوں، میرا ذہن نارمل نہیں ہے؟“ یہ کہتے ہوئے آنسو آنکھوں سے نکل کر گالوں پر گرنا شروع ہو گئے تھے۔

”نہیں..... نہیں اماں یہ آپ نے سوچا بھی کیسے میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میری ماں مجھ سے بے انتہا محبت کرتی ہے اور میں بھی اپنی ماں کو دل کی گہرائیوں سے پیار کرتا ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔ اگر آپ کو اس رشتے سے دکھ پہنچا ہے تو خالہ رشیدہ کے پاؤں میں گر کر معافی مانگ لوں گا کہ وہ بات کو یہیں ختم کر دیں۔ میں مینا کی ذمے داری لیتا ہوں کہ اس کا رشتہ کسی بہت اچھی جگہ اور اچھے لوگوں میں کروادوں گا کیونکہ

اندر چپکے چپکے اتنا کچھ کر لیا کہ سارے محلے کو پتا ہے اور صرف میں ہی بے خبر رہی۔ عبدالستار تم تو ایسے نہ تھے۔“ اس نے پہلی مرتبہ دیوار سے نگاہیں ہٹا کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس کام سے روکنے کے لیے وہ اس کے لیے نئے تعویذ لا رہی تھی وہ یوں اچانک اچھوتے انداز سے ہو جائے گا۔ عبدالستار ماں کا گلہ سن کر اٹھ کر صوفے پر ان کے پاس آ بیٹھا۔

”اماں پتا نہیں یہ سب کیسے ہوتا چلا گیا جب آپ ملتان روانہ ہوئیں تو اسی روز مجھے بتائے بغیر جاوید اور نازو، خالہ رشیدہ سے میرا رشتہ مانگنے چلے گئے۔ خالہ رشیدہ آپ کی غیر موجودگی کی وجہ سے مان نہیں رہی تھیں لیکن ان دونوں نے انہیں سر توڑ کوشش کر کے دو دن کے اندر قائل کر کے شادی کی تاریخ بھی طے کر دی۔ یہ بات جب محلے میں پھیلی تو نہ جانے لوگ اس رشتے سے کیوں بے انتہا خوش ہوئے..... خواتین مبارک باد دینے کے لیے آنے لگیں۔ نازو نے آپ کی غیر موجودگی کی وجہ یہ بتائی کہ آپ شادی کی خرید و فروخت کے لیے ملتان گئی ہوئی ہیں۔ یہاں کی ساری تیاریاں نازو نے جاوید کی بیوی بھابی شائلہ کے ساتھ مل کر مکمل کر لیں، اماں جب میں نے اطراف نظر دوڑائی تو اپنے گھر کے حالات اور مینا کے کردار و عادات کو دیکھا تو مجھے لگا کہ شاید اس دنیا میں اس سے زیادہ کوئی اور لڑکی آپ کے ساتھ..... بہتر طریقے سے گزارہ نہیں کر سکتی کیونکہ وہ آپ کی کڑوی کسی باتوں کو بھی ہنس کر سن جاتی ہے پھر اس کا تعلق بھی کسی بڑے گھرانے سے نہیں کہ جہاں سے لڑکیاں غرور، انا، ضد اور نخرے جیسے منفی اوصاف لے کر آتی ہیں۔ اماں جاوید کا خیال تھا کہ آپ کی ہر پریشانی اور الجھن کا یہی فوری اور بروقت حل ہے۔ اچانک واقع ہونے والا کام آپ کو ذہنی سکون دے سکتا ہے اور شاید اس فیصلے کی

کی تہی بچھ گئی۔

”اماں آپ کہتی تھیں ناں کہ آپ اپنے اس نالائق اور احمق عبدالستار کی محبت کی تقسیم برداشت نہیں کر سکتیں، آپ اپنے بیٹے کو کھونا نہیں چاہتیں تو سمجھ لیں کہ آپ کا عبدالستار ہمیشہ کے لیے آپ کا ہی رہے گا اماں.....“ ساتھ ہی عبدالستار نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر بوسہ لیا۔

”ہمارے پاس آپ کی تمام تر الجھنیں ختم کرنے کے لیے یہ واحد راستہ تھا، آپ خود سوچیں آپ تو کسی بھی حال میں خوش نہ تھیں آپ یقین کریں کہ جب میں نے اپنی پوری زندگی آپ کے حکم کے تابع ہونے کا فیصلہ کیا تو میری یہ سوچ بھی آپ کو حقیقی اطمینان نہ دے سکی، نازو نے مجھے بتایا کہ آپ آدھی رات کو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہیں، بے چینی محسوس کرتی ہیں۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی آپ کی... یہ احساس آپ کو اس لیے ہوتا تھا کہ آپ اپنے فیصلے پر مطمئن نہ تھیں سو مینا سے شادی بروقت اور فوری فیصلہ تھا۔“ وہ ماں کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار سے دبانے لگا ثریا نے دونوں ہاتھ جھٹکے سے الگ کیے۔

”تو میرے ساتھ اس دھوکے بازی میں رشیدہ برابر کی شریک ہے؟“

”نہیں اماں..... بالکل نہیں ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ انہوں نے آپ کی کیفیات سے مجھے آگاہ کیا، انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ اپنی ممتا کے ہاتھوں بے بس اور مجبور ہیں اور مینا کا رشتہ دینے پر بھی جاوید اور نازو نے انہیں بڑی مشکل سے منایا۔ انہوں نے تو ہمیشہ آپ کی خوشی کی بات کی۔“ یہ کہہ کر وہ بغور اپنی ماں کی طرف دیکھ کر ان کے تاثرات سمیٹنے لگا۔

”چلو مجھے یہ تو پتا چلا کہ اپنی جس اولاد کو میں بڑا فرمانبردار سمجھتی تھی وہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر کسی بھی حال میں مجھے دھوکا دے سکتی ہے، چند دن کے

کے روز تک بھی مکمل نہیں ہوتیں۔“ وہ بتول کو کوئی جواب دیے بغیر آہستہ سے چلتی ہوئی ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

”ثریا بہن تو نے تو اپنی دنیا اور آخرت دونوں سنواری ہیں اس نیکی کا اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔“ محلے میں میلاد پڑھنے والی خدیجہ بی بی بھی تسبیح ہاتھ میں اٹھائے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

”میں نے کون سا ایسا نیکی کا کام کر دیا؟“ وہ منہ میں بڑبڑائی۔

”ارے ثریا، کسی یتیم اور بے سہارا کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھنے سے بڑی نیکی کیا ہوگی۔ مینا کا کون ہے خالہ کے علاوہ اس دنیا میں..... بڑی نیکی، پاک باز اور باسلیقہ بچی ہے۔“

”مینا..... مینا..... مینا۔“ اس کی سوئی مینا کے نام پر اٹک گئی۔

”اماں اندر آئیں بھائی آپ کو بلارہے ہیں۔“ نازو کانوں میں جھمکا پہننے پاس آ کھڑی ہوئی۔

”ہوں..... مجھے؟“ اس نے نازو کی طرف ایسے دیکھا جیسے ان پندرہ دنوں کے دوران ان کے درمیان اجنبیت کی کوئی وسیع دیوار حال ہو گئی ہو۔

”جی آپ کو۔“ اس نے پھٹی آنکھوں سے اپنے اطراف بیٹھی عورتوں کو دیکھا جو ملتان

میں گزرے دنوں کا حال پوچھنے کے لیے جمع تھیں، وہ اٹھ کھڑی ہوئی کہ یہاں پر تو ایک نئی اور انوکھی کہانی اس کے سامنے شروع تھی۔ وہ اندر داخل ہوئی تو عبدالستار سر جھکائے بیٹھا تھا جب وہ سامنے صوفے پر بیٹھ چکی تو عبدالستار نے اٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے پاؤں پر رکھ دیے لیکن وہ ساکت بیٹھی دیوار کی سمت دیکھتی رہی۔

”اماں مجھے معاف کر دیں، اسے میری آخری اور شاید پہلی غلطی سمجھ کر معاف کر دیں۔“ اس کی نگاہیں بدستور دیوار پر لگی رہیں البتہ ان میں ایک نئی

باری کا بخار

غزالہ فرخ

”سنیں بہو بیگم، چھوٹے ملک صاحب آج رات گھر نہیں آئیں گے۔“ اماں بی نے یہ عجیب سی بات سنائی تو میں پل بھر کے لیے سشدر رہ گئی۔ میں نے آج مسٹر ڈکٹر کی ساڑی باندھی تھی، بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنایا تھا جس پر سنہرے رنگ کا پھول بھی سجایا تھا۔ اصل میں ملک صاحب نے ہی مجھے اپنی پسند کے بارے میں بتایا تھا اور میں نے خود کو اسی کے مطابق ڈھالا تھا۔ اماں بی مجھے خاموش اور حیران سا

مسکراتی نگاہیں مینا کے چہرے پر بٹھہر گئیں۔ وہ سرخ رنگ کے لباس میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ ”ماشاء اللہ مینا آج کتنی خوب صورت لگ رہی ہے، اس سے پہلے آج کل کی لڑکیوں کی طرح اس نے کبھی بناؤ سنگا رکھا ہی نہ تھا کہ حسن نکھر کر سامنے آتا۔“ وہ بڑی محبت سے اسے دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ ”یہ بڑی بڑی آنکھیں، گول چہرہ، گلابی رنگت اور روئی کے گالوں کی طرح نرم ہاتھ..... کیا یہ وہی مینا ہے جسے میں ایک نظر نہیں دیکھ سکتی تھی پتا نہیں کیوں زیادہ باتونی، صاف گو، ہر بات کھلم کھلا متیہ پر کہنے کی وجہ سے یا پھر بلاوجہ ہی مجھے اس سے جڑ تھی مگر آج جب وہ میرے عبدالستار کی زندگی میں داخل ہو گئی ہے تو میرے دل کی طرف جانے والے تمام راستے بھی کھلتے چلے جا رہے ہیں اس کے لیے۔ اب وہ صرف مینا نہیں رہی جو رشیدہ کی بھانجی ہے بلکہ اب وہ میری بہو اور عبدالستار کی دلہن بن چکی ہے۔“ اس نے مینا کی پیشانی پر بھرپور بوسہ دیا۔ مینا نے ایک نظر اٹھا کر ساس کی طرف دیکھا اور شرما کر مسکرانے لگی۔

”اس کی باتوں کا برانہ منانا، دکھوں نے اندر سے اسے کھوکھلا کر دیا ہے اسی لیے صرف زبان کا چکا لیتی رہتی ہے پر دل کی بری نہیں ہے۔“ خالہ رشیدہ نے ثریا سے آہستہ سے کہا۔

”بہن یہ واقعی دل کی بری نہیں تبھی تو ہمارے دلوں میں اتنی بڑی جگہ بنائی اس نے۔“

”ہاں بہن ثریا مجھے معاف کر دینا..... میں نے تو تمہارے اور تمہارے ہی گھر کے لیے اچھا سوچا۔ اگر تمہارا دل دکھا ہو تو مجھے معاف کر دینا۔“

اس بات پر ثریا نے رشیدہ کو بڑھ کر گلے سے لگالیا اور بولی۔ ”جب اللہ تعالیٰ ایسا چاہتا تھا تو میری کیا مجال..... میں سچے دل سے راضی ہوں۔“

میرے لیے میری ماں کی خوشی اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور نگاہیں جھکا لیں۔ ثریا گہری نظروں سے بیٹے کو دیکھنے لگی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جدے میں سر رکھ کر دھاڑیں مار کر روئے اور اس خدا کا بے شمار شکر ادا کرے کہ جس نے عبدالستار جیسا ہیرا اسے دیا تھا جو اپنی زندگی کی ایک اہم خوشی بھی اپنی ماں کی خواہش پر قربان کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

”اے نازو کہاں چلی گئی۔“ ثریا نے آنسو صاف کرتے ہوئے پرانے جوش سے بیٹی کو پکارا تو باہر موجود فیصلے کے انتظار میں کھڑے جاوید اور اس کی بیوی بھی نازو کے ساتھ اندر آ گئے۔ نازو ماں کے فیصلے سے گھبرائی ہوئی تھی۔

”جی..... جی اماں!“

”نازو جلدی سے جو ایک بیگ ہے سبز رنگ والا بھائی جاوید کے حوالے کر انہوں نے جو سوٹ منگوائے تھے وہ اسی میں ہیں اور دوسرے کالے بڑے بیگ سے میرا ہلکا گلابی سوٹ نکال دے تاکہ میں جلدی سے نہا کر پہن لوں۔“ ثریا کی اس بات سے سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

”خالہ جان وہ سوٹ میری طرف سے بری کے کپڑوں میں شامل کر دیں، اپنی فیملی کا تو میں نے بہانہ کیا تھا بھی آخر کو میرے دل اور جگر کی شادی ہے۔“ جاوید مسکرایا۔

”اماں دراصل آپ کے لیے بہت خوب صورت سوٹ خالہ رشیدہ نے بھیجا ہے، اگر آپ وہ پہن لیتیں تو۔“ نازو نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

”ہاں تو دے ناں آخر کو میرے بیٹے کی شادی ہے، میں بے موقع لباس تو نہ پہنوں ناں۔“ یہ سن کر سب نے چر زور قہقہہ لگایا۔ مہندی کی تقریب رات گئے تک جاری رہی۔ بارات کے روز جب نکاح کے بعد مینا کو اسٹج پر عبدالستار کے ہمراہ بٹھایا گیا تو ثریا کی



بھائیوں کی جگہ سمجھ وہ دونوں دے دے قدر کران کی۔ امی ایسی ہی تھیں۔ صابر اور شکر مگر میں ایسی کیوں نہ تھی۔ چھوٹی آپا پڑھائی میں اتنی اچھی نہ تھیں مگر کڑھائی، سلائی میں ایک نمبر کی ماہر۔ تار کشی تو اتنی مہارت سے کرتیں کہ دیکھنے والا حیران ہو جاتا۔ ننھے بچوں کے فراک پر اسموکنگ اور لہریے دار دھاگوں سے پھول غبارے کاڑھتیں۔ امی مجھے ان کی مثال دیتیں مگر ہوا کیا عین جوانی میں ہی اتنے موٹے شیشوں والا چشمہ آنکھوں پر آن رہا۔

مجھ سے بڑی نینا البتہ کچھ چونچال طبیعت کی تھی۔ ہم دونوں میں بہت ہنسی تھی۔ ہم ابامی سے اٹھتے ہوئے پیسے ملا کر اکثر برف کا گولا اور قلفیاں کھایا کرتے تھے۔ محلے کی لڑکیوں سے دوستی بھی گانٹھی اپنے طور ان تنگ حالات میں زندگی کو کچھ حسین کرنے کے حربے آزمایا کرتے۔ بڑی آپا امید سے ہو گئی تھیں۔ امی کے خیال میں وہ اپنے گھر میں خوش اور مطمئن تھیں مگر مجھے تو ان پر ترس آنے لگا تھا۔ رنگ پہلے ہی ذرا دیتا تھا اب تو اچھا خاصا گندمی ہو گیا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور عین جوانی میں ہی ہاتھوں کی رگیں پھول رہی تھیں۔ ایک روز بڑی آپا پھٹ ہی پڑیں۔

کریم تو بہت اچھا اور بیمار کرنے والا خاوند تھا مگر بھرا پڑا خاندان اور وسائل کم..... بڑی آپا تک پہنچتے، پہنچتے ہر شے اینڈ پراچکی ہوتی۔

اگر بڑی آپا امی کی باری پر آتیں تو امی ان کے لیے الگ ہی کچھ بنا لیتیں۔ روٹی پر گھی چیر دیتیں جانے کیسے بجٹ میں مزید کٹوتی کر کے۔ ایک سیب دو کیلے منگو لیتیں مگر یہ سب شاید بڑی آپا کی آنے والی اولاد کے لیے ناکافی تھا۔ بڑی آپا میں آئرن اور کیلشیم کی شدید کمی تھی اور مزید پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ بڑی آپا نے تین پونڈ کی مڑدہ پنکی کو جنم دیا۔ امی مزید خاموش ہو گئی تھیں، میں اور نینا بھی انہیں

بھی امی کی طرح اپنی باری کو بڑی پھرتی اور مہارت کے ساتھ بھائی رہتیں۔

ابا کا اپنے بھائیوں کے ساتھ عمر کا کوئی زیادہ فرق نہ تھا مگر میرے دادا ان دونوں بیٹوں کو بہت جلد بے سہارا چھوڑ کر ملک عدم سدھار گئے تھے۔ دادی اماں تو چھوٹے چچا کی پیدائش پر ہی چل بسی تھیں گھر میں عورت کی کمی..... ابا کو جلد ہی اپنی یتیم خالہ زاد کے ساتھ بیاہ دیا گیا تھا۔ امی نے گھر کا نظام سنبھالا اور پھر ہم چاروں چلی آئی تھیں۔ امی کو کمزور کرنے اور پھر ڈھیروں کاموں میں پھنسانے کو۔ میری یادوں کی چلمن سے وقت تھوڑا سا اور سر کا تھا۔

بڑی آپا کا رشتہ آیا تھا لڑکا درزی کی دکان پر ملازم تھا ابھی مکمل سلائی نہیں کرتا تھا ابھی ترپائی اور کاج بن کے کاموں میں لگایا ہوا تھا کہ ان کی اماں کو شادی کا شوق چرایا۔ امی اور ابانے یہ رشتہ بڑی خوش دلی سے قبول کیا تھا۔ لڑکا نیک اور شریف تھا اور گھرانا دیکھا بھالا اور آمدن کا حساب کتاب کیا رکھتا۔ بڑی آپا کون سے محل سے گئی تھیں۔ بڑی ہی سادگی سے یہ شادی ہو گئی اور وہ اپنے گھر سدھار گئیں۔ امی کے اعصاب کمزور پڑ رہے تھے۔ چھوٹی چچی کی بیماری طول پکڑ گئی تھی دونوں بچوں کی عمریں بڑھ رہی تھیں اور مطالبات بھی۔

”امی آپ ملازم ہیں کیا؟“ اس وقت مجھے غصہ آتا۔

”نہ بچے ایسا نہیں کہتے، وہ بیماریاں بیمار ہے۔“

”ان کی بیماری میں ہمارا کیا قصور؟“

”اللہ سے ڈر بچی، یہ اونچ نیچ سب کے ساتھ ہو سکتی ہے۔“

”ایک دن کی بات تو نہیں ہے امی۔ چلیں آپ کے اس بیماری کے سسٹم میں تین لوگ تو ہوں ایک روز اپنے کام کریں اور پھر ایک روز آرام۔“

”چل بس کر اپنی چونچ بند رکھ۔ اللہ نے

سے چھینٹ پرنٹ کا کپڑا ابھی جاتا تو پہلی دھلائی میں سب پھولوں کے رنگ مل جل جاتے۔

چھوٹے چچا کے دو بیٹے تھے اور بیگم بہت بیمار، گھر کا کام سنبھالنے کے بالکل بھی قابل نہ تھیں بلکہ جن دنوں بیماری کا زور ہوتا تو ان کے بچوں کو بھی امی کو ہی دیکھنا پڑتا۔ ہاں البتہ بھلی چچی بہت محنتی اور مستعد تھیں۔ نینوں بہو میں ایک ہی چو لھے پر تھیں۔ آمدن کم تھی اور اخراجات زیادہ۔ تنگی سے وقت گزرتا۔ نو کر ملازم کا تو سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اب امی اور بھلی چچی نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ دونوں ایک، ایک روز گھر کا کام سمیٹ لیں گی تاکہ ایک دن مکمل کچن کا کام کر کے اگلے روز اتنا وقت بچ سکے کہ اپنے ذاتی کام پھنسا سکیں۔

میں ان کے اس سسٹم کو باری کا بخار کہا کرتی تھی جس روز امی کی باری ہوتی تو واقعی انہیں محاورنا نہیں بلکہ حقیقتاً سر کھانے کی فرصت نہیں ہوتی۔ آپا شوگر اور بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ ان کا کھانا بھیکا اور گھی کے بنا بنا چھوٹی چچی بھی وہی کھانا کھا لیتیں اور دونوں چچا سدا کے چٹورے ان کے لیے سوچا جاتا کہ کم لاگت لگا کر کھانا کیسے چٹارے دار بنایا جائے۔ دکان پر چھوٹے کاموں کے لیے ایک لڑکا رکھا گیا تھا۔ اس کے لیے بھی روٹی سالن ادھر سے جاتا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی دوپہر کے کھانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا گھر میں نہ بلینڈر تھے نہ کوئی اور سہولت..... سب کام ہاتھوں سے کرنے پڑتے۔ اتنے لوگوں کی روٹی پکاتے پکاتے جسم اکڑ جاتا۔ کھانے کے بعد اگلے سلسلے شروع ہو جاتے۔

گوشت مرغی تو افورڈ کر ہی نہیں پاتے تھے۔ سبزی، دال پر زور ہوتا۔ اتنے لوگوں کی سبزی بنانا الامان۔ میرا دل امی کے لیے بے چین ہوتا۔ بھلی چچی کے تین بیٹے تھے اوپر تلے پیدا ہونے والی اولاد ماں کی عدم توجہی سے ریں ریں کرتے رہتے مگر وہ

دیکھ کر میرے قریب آ گئیں۔

”سینس بہو بیگم۔“ ان کی آواز آہستہ تھی مگر الفاظ دل کاٹ دینے والے۔ ہر لفظ ایک نوکیلا نشتر بن کر میرے وجود کو لہو لہان کر رہا تھا۔ وہ جانے کیا کہہ رہی تھیں، میں چاہتی تھی کہ یہ سب سن نہ پاؤں اگر قوت سماعت تحمل نہ ہو۔ تو کم از کم دماغ اس حقیقت کو سمجھنے سے عاری ہو جائے مگر ایسا نہیں ہوا، میں کچھ دیر جانے کس طرح اپنے وجود کا بوجھ برداشت کر کے وہاں کھڑی رہی اور پھر بے جان قدموں اور ہارے دل کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

☆☆☆

”امی..... امی جی..... پلیز امی جی، حلوا بنا دیں ناں بہت جی چاہ رہا ہے۔“ ہاں وہ میں ہی تھی اپنے باضی کے جھروکوں میں اپنی یادوں کی چلمن اٹھائے ننھی سی جیا۔ امی بڑی خاموش اور سنجیدہ سی طبیعت کی تھیں مگر میرا نٹ کھٹ سا مزاج..... میں یونہی لاڈ کرتی، امی کے ساتھ چمٹ جاتی۔

”بیچھے ہو جیاد دیکھ رہی ہوتاں میں کتنی مصروف ہوں۔“

”مگر امی..... میری بیماری امی جی حلوا۔“

”تمہیں آج ہی یہ چونچلے سوچئے تھے، جانتی ہو آج میری کچن میں کام کرنے کی باری ہے اور آج ہی.....“ امی کے پاس بات مکمل کرنے کا وقت بھی نہ تھا۔ اپنے کندھے سے بیچھے دھکیلے وہ پرات میں آٹا ڈالنے لگیں۔ ابھی ابا کی دکان سے لڑکا کھانا لینے آنے والا تھا۔ ابا اپنے دو بھائیوں کے ساتھ سوتی کپڑے کی دکان پر بیٹھتے تھے۔ ویسے تو نام کی کپڑے کی دکان تھی ہم چاروں بہنوں کو تو کبھی ڈھنگ کا کپڑا پہننا نصیب نہیں ہوا تھا۔ مکمل، کاٹن کی دکان تھی دونوں چچا کے بیٹے تھے وہ تو دکان سے کاٹن لے کر اپنی ماؤں سے سلوا کر پہنتے اور اکڑتے مگر ہمارے لیے کبھی دکان

اور اس کا وزن۔“ واقعی ہر وقت بیٹھ کر کام کرنے سے چھوٹی آپا کے جسم میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔
”کیا امید کروں کہ اس کے لیے اس سے اچھا رشتہ آئے گا؟“ پتا نہیں یہ سوال مجھ سے کیا گیا تھا یا پھر اپنے آپ سے۔ جواب کسی نے بھی نہیں دیا اور بہت سادگی سے اسے گھر سے سدھار دیا گیا۔
چھوٹے چچا نے کھانے کا ذمہ خود لیا تھا اس دفعہ بارانیوں کی تواضع چھوٹے گوشت اور چینی والے چاولوں سے کی گئی تھی۔

امی نے دو بیٹیاں بیاہ دی تھیں منجھلی چچی اپنی گھر داری الگ کیے بیٹھی تھیں پھر بھی امی بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ ایک روز چھوٹی چچی چلی آئیں وہ مکمل۔۔۔ رو بصحت تو نہ تھیں مگر اب ان کی صحت کافی بہتر ہو گئی تھی۔ امی کو یوں دیکھا تو گلے سے لگایا۔

”بڑی بھابی، چلیں میرے ساتھ آپ کو کسی ڈھنگ کے ڈاکٹر کو دکھا کر لاؤں۔“ امی نہ نہ کرتی رہ گئیں مگر چھوٹی چچی ٹلی ہی نہیں۔ امی کے تمام ضروری ٹیسٹ کروائے گئے۔ رپورٹس گھر آئیں، میں نے میٹرک تو کیا تھا مگر ابھی اتنی عقل کہاں تھی کہ ان ڈاکٹری معروضات کو سمجھ پاتی ہاں البتہ ٹیسٹ رپورٹ کے ساتھ جو نارمل رینج لکھی گئی تھی امی کی رپورٹ ان سے بالکل میل نہ کھاتی تقریباً سب میں ہی جو شے کم ہونی چاہیے وہ زیادہ تھی اور جہاں شرح زیادہ ہونی چاہیے تھی وہ خطرناک حد تک کم۔

چھوٹی چچی، امی کو ڈاکٹر کو دکھا کر دوائیوں کا پکٹ ہمیں تھما گئی تھیں اور سب سے بڑی بات کہ ڈاکٹر صاحب نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ ہم دو بیٹیاں تو امی کے پاس تھیں ہی مگر دونوں ہی چلی سی میں رسالوں میں سر دیے خود کو گھر سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتی اور نینا کو سہیلیوں سے فرصت نہ تھی۔

پہلے ہی روزامی نے مسور کی وال مٹی کی ہانڈی میں چڑھائی۔ ڈاکٹر کی دوائی میں شاید نیند کا عنصر تھا

گر بیٹ تھیں مگر یہ سلسلہ.....!

اگلے ہی روز گھر میں عجیب سی تبدیلی واقع ہوئی۔ امی اور منجھلی چچی کا پکن الگ کر دیا گیا اور یہ فیصلہ ابا اور چچا دکان سے ہی کر آئے تھے۔ چھوٹی چچی بیماری کے باعث اپنی ڈیوٹی نہیں کر پاتی تھیں۔ اس مشترکہ نظام سے وہ کسی پر بوجھ نہ بنیں دونوں جیٹھانیاں مل کر گھر داری سنبھال لیتیں۔ اب ان دونوں کو اپنی فیملی کی ذمے داریوں کے لیے آزاد کر دیا گیا تھا۔

شاید چھوٹے چچا کی کچھ امداد آئی تھی کہ دکان پر اب لٹھے، کاشن کے علاوہ مسین اور آئرش بھی نظر آنے لگی تھی اور گھر میں بھی منجھلی چچی کے پکن کے نام پر چھوٹا سا چھپر بنا دیا گیا تھا۔

ہمارے گھر سے یہ باری کا بخار نکل گیا تھا، میں تو خوش تھی۔ اب اپنے وقت اور حساب کے مطابق پکن کا کام ہوتا۔ منجھلی چچی کے بچوں کی ریں ریں سے بھی نجات ملی اور ہم جو امی کی باری کا خیال کر کے اپنی یک دم اٹھنے والی خواہش کو دل میں ہی دبالتی تھیں اب مکمل آزاد تھیں۔

کچھ ماہ یہی سلسلہ چلا بڑی آپا اس دفعہ رہنے کے لیے آئیں تو اپنے دیور کا رشتہ بھی مانگ گئیں۔ امی کے سوتے ہوئے چہرے سے میں جان نہ پائی کہ وہ خوش ہیں یا ناراض۔ ان کے چہرے پر مکمل سکوت تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ان کے نقوش پتھر کو تراش کر بنائے گئے ہیں۔ ان کے چہرے کا جمود اس وقت بھی نہیں ٹوٹا جب انہوں نے اس رشتے کے لیے ہاں کر دی۔

بڑی آپا کا کریم ابھی تک درزی کے پاس کارج بن اور تر پائی پر ہی مامور تھا مگر اس کا یہ ٹیلنٹڈ بھائی کنگ بھی کرنے لگ گیا تھا۔ بڑی آپا کے گال پچک گئے تھے اور جھیز، بری کے سوٹ ڈھیلے پڑ گئے تھے تب بھی یہ فیصلہ..... میں امی سے بھڑ گئی۔

جانتی ہو مینا کے چشمے کا نمبر اور بڑھ گیا ہے

چچی کی محبت کی شادی تھی۔ چچا ہینڈسم تو ضرور تھے مگر مالی لحاظ سے کنگھے۔ چچی کے ماں باپ بہت رئیس تھے۔ اس شادی پر کیسے رضامند ہوتے۔ اتنا عرصہ برہم ہی رہے بیٹی سے رابطہ نہیں کیا۔ اب چچی کے والد تو جہان فانی میں نہ رہے تھے۔ بھائی دونوں امریکا جا بے اور ان حالات میں چچی کا وجود ان کی فیملی، ان کی ماما کے لیے بہت اہم ہو گیا۔

چچی کا ان حالات میں سربراہ اپنی ماما سے ملنا چچی کی زندگی کو بدل گیا تھا۔ بچے کھلکھلا رہے تھے۔ اتنے برس کا ساتھ سب بھول بھال گئے تھے۔ مجھے تو چچا کے انداز میں بھی تھوڑا سا تفاخر جھلکتا نظر آ رہا تھا مگر بظاہر وہ اداس تھے۔ ہاں چھوٹی چچی کی آنکھیں گنگا جمنہ کے بہاؤ کا منظر پیش کر رہی..... تھیں۔ شاید اپنی اس بے وقوفی پر نیر بہا رہی تھیں کہ سب کچھ ہوتے ہوئے پہلے غلط فیصلہ کیا اور پھر اسی ساتھ کو نبھانے میں اتنی عسرت کی زندگی گزار دی۔

رات دل اداس تھا۔ چچی کا کمر چھوٹی آپا کو دے دیا گیا تھا۔ جہاں وہ آسانی سے اپنی سلائی کڑھائی کر پاتیں۔ میں باہر صحن میں پڑے تخت..... پر لیٹ گئی تو امی چلی آئیں۔

”اداس ہو چچی کے لیے۔ اتنے برس کا ساتھ تھا جیہا، عادت ہوتے وقت لگے گاناں۔“

”ارے نہیں امی۔“ میں نے رینار کے دل کی بات کہہ دی۔ ”میں تو سوچ رہی ہوں امی کہ چچی کی ماما کی گاڑی ایسی ہے تو ان کا گھر کیسا شاہانہ ہوگا نا؟“ میری بات پر امی کی آنکھیں جھللا گئیں۔

”میں اور تیرے ابا تم لوگوں کو تمہاری من چاہی زندگی نہیں دے پائے ناں جیا۔“ مجھے چاہیے تھا کہ میں امی کے سنگ لگ جاتی چاہے دل نہ چاہتا مگر یہی کہتی..... ”یہ آپ کی بھول ہے آپ دنیا کی سب سے اچھی امی ہیں۔ میں اس روکھی پھسکی میں بھی خوش ہوں۔“ مگر میں یہ نہیں کہہ پائی۔ امی تو واقعی

ہسانے میں نا کام رہیں۔

انہی دنوں چھوٹی چچی کی طبیعت کافی بگڑ گئی۔ چچا تو ابا کے ساتھ دکان پر چل دیے۔ منجھلی چچی کا منجھلا صاحبزادہ ہمیشہ کی طرح الٹیوں کی زد میں تھا۔ اب امی کو ہی انہیں سرکاری اسپتال لے کر جانا تھا۔

چھوٹی آپا اپنی موٹے شیشوں کی عینک لگائے اپنی فنکاری ہمسائیوں کے کپڑوں پر آزمایا ہی تھیں اور نینا آج اپنی سہیلی کی طرف گئی تھی۔ تبھی تو امی کو تختہ مشق میں ہی نظر آئی۔

”ان دونوں بچوں کا خیال رکھنا میں تیری چچی کو دوائی دلوادوں۔“

”ان شیطانوں کو..... اللہ میری توبہ! نہ امی۔“ ”چل پھر چچی کے ساتھ چل دے گھر اور بچے میں دیکھ لوں گی۔“ بات تو یہ بھی مشکل ہی تھی مگر مجھے یہ بہتر لگا۔ چچی نے اپنا عبا یا پہنا اور میں انہیں تھامے باہر لے آئی۔

بلکے براؤن رنگے بال اور کسی ڈیزائنر لان کا خوب صورت سوٹ پہنے وہ ادھیڑ عمر سی عورت تھی۔ گاڑی بھی شاندار تھی اور ڈرائیور بھی باوردی تھا۔ ہمیں دیکھ کر ایک لخت چوکی اور بازو ڈاکر کے آگے بڑھی، لازماً یہ سواگت میرا تو ہرگز نہ تھا میں نے چچی کے چہرے پر دیکھا وہاں تو جیسے آتش فشاں پھٹ رہا تھا۔ گھنٹوں لائن میں کھڑے ہو کر ڈاکٹر کو دکھایا اور مفت دوا حاصل کی تھی مگر اب چہرہ زرد ہونے کے بجائے سرخ انگارہ بنا تھا۔ جسم کانپ رہا تھا۔ وہ خاتون اگلے ہی لمحے چچی کا ڈولتا وجود اپنے حصار میں لے چکی تھیں۔ گھر تک واپسی کا سفر ہم نے اس لمبی ٹھنڈی گاڑی میں کیا تھا۔

آج چھوٹی چچی اسی گریس فل خاتون کے ساتھ یہ گھر چھوڑ کر جا رہی تھیں۔ وہ خاتون ان کی والدہ تھیں اور اپنی بیٹی کی پسند کی شادی سے ناراض تھیں۔ یہ بات تو اس روز امی نے بتائی کہ چچا اور

کیا ہم شاعری کرتے

کیا ہم شاعری کرتے
تمہاری گفتگو کرتے
تمہاری آرزو کرتے
تمہاری جستجو کرتے
جو تم سے پیار نہ کرتے
کیا ہم شاعری کرتے
تمہارے رنگ میں ڈھلتے
تمہاری یاد میں جلتے
تمہارے وصل کو ترستے
جو تم سے پیار نہ کرتے
کیا ہم شاعری کرتے
تمہاری آنکھ کا آنسو
ہماری آنکھ سے نکلا
تمہارے درد کی بارش میں
جسم و جاں کو دھوتے
جو تم سے پیار نہ کرتے
تو کیا ہم شاعری کرتے

شاعرہ: راحت و فاریا چھوٹ لاہور

”امی پیسے میں بہت طاقت ہے ناں؟“ امی نے میری یہ بات ان سنی کر دی۔

”امی چچی کتنی بہتر ہو گئی ہیں اور بچے کتنے با اعتماد اور..... اور.....“

”امی اس کی تو چچی کے اس ڈرائیور کے ساتھ

امی قریب ہی تھیں صرف وہ سُن پائیں بل بھر کو چہرے نے رنگ بدلا مگر میں نے محسوس کیا جلد ہی انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔

آج میری باری تھی بڑی آپا بھی ادھر تھیں اور چھوٹی آپا بھی اور اس پر طرہ یہ کہ چھوٹی چچی بھی اپنے بیٹوں کے ساتھ آ گئیں۔ میں ابھی دن بھر کے کام کے بارے میں سوچ رہی تھی اور گھبرا رہی تھی مزید مہمان دیکھ کر دل اور ہول کھانے لگا۔

”بھئی چچی کو بھی مدعو کر لیں وہی رہ جائیں گی۔“ صبح چڑ کر کہہ بیٹھی تھی۔

”ارے ہاں، اچھا یاد کرو ایادہ کیا اکیلی بیٹھ کر کھائے گی اسے بھی کہہ دو کہ آج کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائے۔“ امی اس آئیڈیا سے خوش ہوئیں۔

”ہاں، کہہ دیتی ہوں ہمارے ابا کا ولیمہ ہے سب آئیں ہمارے گھر۔“ میری ہلکی سی بڑ بڑاہٹ بھی امی سن لیتیں اور کبھی مجھے سرزنش کر دیتیں اور کبھی بس ایک دم زردی ہو جاتیں۔

چھوٹی چچی نے اپنی ماما کی طرح خوب صورت سوٹ پہنا تھا۔ عبائے کی جگہ سر پر بندھے خوب صورت اسکارف نے لے لی تھی۔ طبیعت بہتر تھی اور چہرے کا رنگ روپ واپس آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر پیار سے آگے بڑھیں مگر میں جھجکی گئیں۔ لہسن، پاز کی خوشبو میں بسا ہوا میرا وجود ان کے ساتھ چھوٹنے بغلیگر ہونے کے لیے بالکل اُن فٹ تھا۔ میں تھوڑا سا پیچھے ہٹ گئی۔ خوشی اس وقت ہوئی جب چھوٹی چچی کی آمد کے بعد ان کا باوردی ڈرائیور کافی زیادہ ڈبے لے کر چلا آیا۔ ان میں امی اور منجھلی چچی کے لیے دو سوٹ اور بیڑا اور برگر کے کتنے ڈبے تھے۔ بڑی آپا کے ننھے درزی اوہ..... ننھے بیٹے کے لیے کپڑے اور فیڈر۔

امی چھوٹی چچی پر ناراض ہونے لگیں مگر میں بہت خوش تھی۔ کام کا جو پہاڑ نظر آ رہا تھا ایک دم سے سر ہو گیا۔

اس دفعہ اللہ کی رحیم ذات نے بڑی آیا کو زندہ سلامت بیٹے سے نوازا تھا۔ بچہ گو کمرور تھا مگر بڑا چست اور ہوشیار اپنی گول گول آنکھوں سے سب کو دیکھتا اور ہاتھ بھی مارتا۔ امی نہال ہوئی جارہی تھیں۔

”اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے دیکھو تو اللہ نے کچھ لیا تو اس کا کتنا حسین نعم البدل دیا۔“

”ہاں، ایک اور ناٹری درزی کا اضافہ۔“ میں نے صرف سوچا نہیں ہلکی سی آواز میں کہہ بھی ڈالا۔

”ہے۔“ میں نے اسے ڈالنا۔ رات امی نے ابا کے ہمارے کارنامے سنائے تو ابا خوشی سے مسکرائے مگر ساتھ ہی سنجیدہ ہو گئے۔

”تم نے دیکھا بیگم بچیاں ہماری بھی اچھی ہیں بس احساس ذتے داری نہیں۔ جب کام کرنے آئیں تو دونوں اکٹھی جت گئیں اور بے پروائی بھی مل کر کرتی ہیں۔ ان میں احساس ذتے داری جگا دی جا چاہیے یہاں بھی کام آئے گا اور اگلے گھر میں بھی۔“ اور اگلے روز نینا اور میری باری لگا دی گئی۔ وہ باری جس کے ساتھ ہی امی کا بہتا پسینہ اور..... منجھلی چچی کے بچوں کی دن بھر ریں ریں اور اب ہم خود.....

ابھی پہلا ہی روز تھا میں مزے سے ہاتھی گھوڑے بچ کر سو رہی تھی یک دم نیند میں یہی لگا کہ جیسے ہلا کو خان میری کمر پر کوڑے برس رہا ہے۔ ارے میں ہر وقت افسانوی اور تخیلاتی ماحول میں رہنے والی نازک سی لڑکی اور یہ سلوک۔ چارونا چار آنکھیں کھولیں امی اور ابا دونوں ہی میرے پاس کھڑے تھے۔ ابا زبان سے اور ابا اپنے ہاتھوں سے دھموکا لگا رہی ہیں۔

”کیا ہوا امی؟“ میں یک دم گھبرا کر اٹھی۔

”بھول گئیں آج تمہاری باری ہے۔“

”اوہ.....!“ میں جس سرعت سے اٹھی تھی اس سے بھی تیزی سے ڈھس گئی۔

☆ ☆ ☆

اس دفعہ اللہ کی رحیم ذات نے بڑی آیا کو زندہ سلامت بیٹے سے نوازا تھا۔ بچہ گو کمرور تھا مگر بڑا چست اور ہوشیار اپنی گول گول آنکھوں سے سب کو دیکھتا اور ہاتھ بھی مارتا۔ امی نہال ہوئی جارہی تھیں۔

”اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے دیکھو تو اللہ نے کچھ لیا تو اس کا کتنا حسین نعم البدل دیا۔“

”ہاں، ایک اور ناٹری درزی کا اضافہ۔“ میں نے صرف سوچا نہیں ہلکی سی آواز میں کہہ بھی ڈالا۔

تبھی ہم دونوں کو دال کو بگھار لگانے اور دو گلاس چاول بھگونے کا کہہ کر اندرونی کمرے میں لیٹ گئیں۔ نتیجہ وہی ہوا دال چولھے پر پڑی جل گئی اور چاول بھگونے نہ گئے ابا دکان سے آئے تو بہت برہم تھے۔ دونوں کو ہی خوب ڈانٹ پڑی۔ امی نے بچ بچاؤ کیا۔

”بچیاں ہیں، رفتہ رفتہ سمجھ جائیں گی۔ ویسے بھی انہیں عیش و عشرت کی زندگی نہیں دے پائے اب گھر کا بھی سارا وزن ان پر ڈال دوں۔“ ابا چپ ہو گئے۔ اگلے روز امی نے کڑھی کے لیے بسن بھگو دیا۔ فرائی پان میں تیل ڈالا اور رات کے لیے آٹا گوندھنے لگیں۔ میرے رسالے میں مزید ارقط وار ناول چل رہا تھا اصل میں نینا ہی اپنی دوست نفیسہ سے مجھے یہ ڈائجسٹ لادیا کرتی تھی۔ اس مہینے کا تازہ شمارہ تو نہ ملتا مگر پھر بھی میں اپنا شوق پورا کر لیتی۔

نینا، نفیسہ کی طرف گئی ہوئی تھی اور میں افسانوں کی خوب صورت دنیا میں گم۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلا اور امی کی طبیعت بگڑ گئی۔ ابا دکان سے آگئے تو کھانا مکمل تیار نہ تھا۔ ابا کو پھر غصہ آ گیا۔ بھوک زوروں پر تھی اور کھانا تیار نہ تھا۔

اس گڑے وقت میں منجھلی چچی کام آ گئیں۔ آج انہوں نے مکس سبزی بنائی تھی جو ابا کی پسندیدہ ڈش تھی تبھی معاملہ ٹل گیا۔ اس روز امی نے سوچا کہ وہ ابا کو نہیں بتائیں گی اور رات کا کھانا بھی صبح ہی بنالیں گی۔ امی نے ابا کے جوڑے کو کلف لگا کر لگنی پر ڈالا تو رات کے لیے موگرے بنائے لگیں۔ مجھے اور نینا کو شرم آ گئی۔

”چھوڑیں امی، ہم خود بنالیں گے۔“ ہم دونوں نے مل کر سبزی بنائی اور کپڑے بھی مل کر دھو ڈالے۔ نینا بہت مہرجوش ہو رہی تھی۔

”جیا امی کے کمرے میں پروے اتار کر جھاڑ لیں اور.....“

”بس بس، اتنی جذباتی نہ ہو اتنا ہی کافی

رو پڑا تھا۔ امی اُدھر پلٹیں اور میں وہاں سے بھاگی۔
”اور کیا چاہیے تھا پُر سکون سا گھر نہ دیور
دیورانی کے مسئلے نہ باریوں کے جھنجٹ اور کیا چاہیے
تھا امی تو بس.....!“

اسی بیڈ پر نیم دراز جیسے میری عمر کے کتنے ہی
برس گزر گئے تھے۔ میں اب اپنے حال میں تھی۔
جہاں اماں بی کے الفاظ میرا دل چیر رہے تھے۔

”چھوٹے ملک صاحب پہلے سے شادی شدہ
ہیں۔ بہو بیگم اور اس حقیقت سے آپ کے گھر والوں
کو مطلع کر دیا گیا تھا۔ بڑی بہو بیگم چھوٹے ملک
صاحب کی پسند نہیں اس لیے وہ اس گھر میں قدم نہیں
رکھ سکتیں۔ یوں بھی اتنے برس گزر جانے کے بعد وہ
ماں نہیں بن سکیں اور نہ ہی وہ بن پائیں گی۔ تبھی
میرے اصرار پر چھوٹے ملک صاحب آپ کو بیاہ کر
اس گھر میں لے آئے ہیں۔ آپ کو یہاں کوئی تکلیف
کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اللہ کا دیا یہاں سب کچھ
ہے اور آپ اس کی مالک ہیں۔ چھوٹے ملک صاحب
آپ کی آمد سے بہت خوش ہیں اور آپ کے لیے ان
کے پیار میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوگی۔“ یہ سبھی سی تقریر
مجھے تو ڈر کر رکھ گئی تھی۔ مجھے میرا من چاہا ماحول ملا تھا۔
ہر شے میری مرضی اور منشا کے مطابق ایک ہفتے کی
رفاقت سے میں جان پائی تھی کہ ملک صاحب پیار
کرنے والے شوہر ثابت ہوں گے مگر..... ارے
ہاں میں آپ کو اماں بی کی اس گفتگو کی یہ سطر میں تو بتانا
بھول گئی کہ۔

”بہو بیگم ملک صاحب نے دوسری شادی کی
ہے تو وہ اسلام کے حکم کے مطابق دونوں بیویوں میں
توازن اور برابری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ
ایک رات آپ کے پاس رہیں گے اور ایک رات
اپنی بڑی بیگم کے پاس یوں جان لیجیے کہ ایک
روز آپ کی باری ہوگی اور ایک.....!“

☆ ☆ ☆
اور میں یہاں اس خوب صورت آبنوی لکڑی
کے عالیشان بیڈ پر تھی۔ مسٹرڈ کلر کی ساڑی اور
جوڑے میں سنہرے پھول کے ساتھ اس خوابوں سے
بھی حسین خواب گاہ میں جہاں ایک ہفتے سے میں
اپنے خیال سے بھی حسین وقت گزار رہی تھی۔

جہاں میں تھی اور چھوٹے ملک صاحب۔ اماں بی
..... اپنے گھر میں اپنی راجدھانی میں مست اپنی ذاتی
خدمت گار کے ساتھ وہ انہی کے ہاتھ سے چائے،
کھانا، دوا سب کچھ لینا پسند کرتیں۔ بڑا سا خوب
صورت گھر تھا۔ امی یونہی گھبرا گئی تھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ
نے میرا مزاج عام لڑکیوں سے مختلف بنایا تھا تو
میرے لیے یہ بھی تو ایسا ہی بنایا تھا مگر امی جانے
کیوں خوش نہیں تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تو نہ
تھے مگر جیسے وہ سارے اشک پلکوں کی فصیل میں مقید
ہو گئے تھے۔ رخصتی کے سبب بھی امی بہت دلگرفتہ سی
تھیں۔ امی نے پہلے دو بیٹیاں بڑے ہی معمولی سے
گھر میں روانہ کی تھیں مگر امی تب مجھے کچھ زیادہ دکھی
نہیں لگی تھیں مگر اب.....!

”سنو جیاء اللہ تعالیٰ نے ہر شے سو فی صد مکمل
نہیں بنائی ہوئی اگر ہر شے مکمل اور بنا کسی کمی کے
ہو جائے تو اس سوہنے رب کو یاد کون کرے۔“
”جی امی۔“ میں ملک صاحب کے گھر سے
آئے پہلے قیمتی جوڑے میں اتر رہی تھی، میں بھلا
کیا سنتی کیا سمجھتی۔

”میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے
بیٹا، ہر شے ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی بیٹا۔ ہم
سب کچھ نہیں پا سکتے اس پانے کے لیے کچھ
کھونا.....“ بڑی آپا کا ننھا درزی اوہ..... ننھا فرحان

ہیر پن سے سلجھا لیا جاتا۔ بھڑا گھر تھا بڑی آیا تو ہر
وقت سر جھکائے جی حضور میں لگی رہتیں۔ چھوٹی آپا
ذرا کسی بات پر آنا کافی کرتیں یا کسی دیور مند سے ذرا
منہ ماری ہوتی تو میاں آتے ہی پنا کچھ سنے ایک جڑ
دیتے۔ چھوٹی آپا کی داستانیں بھی مجھے خوفزدہ
کر دیتیں۔ بچوں، بڑوں سے بھرا ہوا گھر اور ہر
رشتے کو خوب صورتی اور محنت سے نبھانے والی ایک
جفاکش کم از کم میں تو ایسا نہیں کر پاتی جب ذہن مزید
الچھنے لگتا تو میں اپنی پناہ اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ کے
افسانوں میں ڈھونڈھتی جہاں زندگی مکمل طور پر
پھولوں کا ہار تھی بس۔

اس نغیہ کے فرسٹ کزن کا معاملہ ختم کر دیا گیا
تھا مگر امی اب متفکر نظر آنے لگی تھیں۔ ہم دونوں
بہنوں کی عمریں ڈھل تو نہیں گئی تھیں مگر اب کوئی
نوجوانی والا وقت بھی نہ تھا۔ ہمارے برابر کی لڑکیاں
بیاہی جا چکی تھیں بلکہ محلے میں جب آمد ہوتی تو
آبادی میں اضافہ ہو چکا ہوتا۔

نینا مست ملنگ سی لڑکی تھی ہر حال میں خوش مگر
امی میری طرف سے متفکر تھیں۔ میری عادات ان
کے خیال سے ہماری کلاس کی لڑکیوں سے مختلف تھیں
اور پھر ایک روز جیسے دھماکا سا ہو گیا۔ چھوٹی چچی اپنے
ساتھ ایک بڑی ہی معزز خاتون کو لے کر آئیں۔ وہ
خاتون چچی کی ماما سے بھی زیادہ گریس فل تھیں اور
ان کی گاڑی چچی سے بھی لمبی اور نئے ماڈل کی تھی اور
چائے کی ٹرے بیٹھک میں لے جاتے میں نے سنا وہ
کہہ رہی تھیں۔

”چھوٹے ملک صاحب میری اکلوتی اولاد
ہیں، میرے گھر میں تو جیسے خاموشی اور اداسی کا راج
ہے۔ عقیقے پر آپ کی بچی کو دیکھا تو وہ.....“
چھوٹی چچی کے بچوں کے عقیقے کا فنکشن تھا اور میں
وہاں خوب بن ٹھن کر گئی تھی۔ شکل و قامت تو اللہ نے
اچھا ہی دیا تھا اس پر وہ اسٹائش سا انداز۔ دل میں

ہی شادی کر دیں۔ سارا دن اس کے ساتھ گاڑی میں
گھومے گی تو اس کی حسرت پوری ہو جائے گی۔“ نینا
چڑ کر بولی۔
”کیوں باری تو تمہاری ہے اب؟“
”دونوں میں فرق ہی کتنا ہے، گیارہ ماہ کا جس
کے نصیب کے پھول پہلے کھل گئے یہ تو سوہنا رب
جانتا ہے۔“
اور سوہنے رب نے واقعی پہلے میرے لیے
ایک امیدوار بھیج دیا۔ نینا کی پیاری دوست نغیہ کا
فرسٹ کزن۔ کہیں ہمسایوں میں کسی موقع پر اس کی
اماں نے مجھے دیکھ لیا اور رشتہ بھی بھیج ڈالا۔ لڑکے کا
ذاتی کاروبار تھا۔ جی ہاں اپنے محلے کے ہائی اسکول
میں بوتلوں، سموسوں کی کینٹین تھی اس کی۔ امی نے
تصویر دکھائی شکل صورت بھی ٹھیک تھی مگر ابا حیات نہ
تھے چار بہنوں اور دو بھائیوں کے خاندان کے کفیل
تھے صاحب بہادر۔
”نہیں امی۔“ یک دم میرے منہ سے نکلا۔
”اتنا بڑا خاندان۔“
”آمدنی کافی ہے پگلی۔“
”نہیں امی پلیز۔ اس نینا کا کر دیں یہ رش میں
بہت خوش رہتی ہے۔ اس مینا بازار میں اس کا دل لگا
رہے گا۔“
”مگر وہ تجھے مانگ رہے ہیں ناں۔“ امی زنج
ہور ہی تھیں۔ ابھی معاملہ ابا کی عدالت میں نہیں گیا
تھا۔ میں اس سے پہلے ہی رفع کر دینا چاہتی تھی۔ امی
تو میری بات مان لیتیں مگر ابا تو اپنی ویٹو پاور استعمال
کرنے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔
رات چھوٹی آپا آئیں روتی منہ بسورتی ان
کے کامل میاں ذرا سے ہتھ چھٹ واقع ہوئے تھے۔
بات بے بات غصہ آجاتا اور دھڑ سے ایک آدھ
جمادیتے۔ ہاں البتہ جلد ہی اپنی غلطی کا احساس
ہو جاتا اور معاملہ گجروں کی ایک جوڑی یا کسی چپکلیے

ماہنامہ پاکیزہ 106 جولائی 2013

WWW.PAKSOCIETY.COM



زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے... خیر و شر، نیکی اور بدی... زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت... ہر برائی پر حاوی ہو جاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سید نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اکائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

عنوان ہیں جن پر تمہیں مضمون لکھنے ہیں، انگریزی میں بھی اور اردو میں بھی۔“ وہ اُسے ملنے والے کام کی تفصیل پڑھتے ہوئے بولی۔

”ہو جائے گا کام۔“ وہ اسی سنجیدگی سے قلم چلاتے ہوئے جواب دیتا۔

”اچھا لاؤ، کچھ مضمون میں لکھ دوں تمہیں، دیکھو تو میں کیسا لکھتی ہوں۔“ اس نے کھلے دل سے پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

”آپ تو ظاہر ہے بہت اچھا لکھتی ہوں گی۔“ اس نے اسی متانت سے جواب دیا۔

”ہونہہ..... آپ۔“ اس نے دل میں برا مناتے ہوئے کہا۔ ”ایسے تھوڑی۔ جب میں لکھوں جب بتانا۔“ اسے اپنی ذہانت اور قابلیت پر اعتماد تھا۔ اس نے اسی دوپہر بیٹھ کر ایک انگریزی اور اردو کا مضمون اس کے لیے لکھا۔

”یہ بہت اچھا ہے، آپ کا ذخیرہ الفاظ بہت وسیع ہے۔ بہت شکریہ۔“ جواب میں اس نے فقط تین جملوں میں بات ختم کر دی۔

”افوہ.....“ وہ جھنجھلا اٹھی۔ ”کتنا بد دماغ اور بد تمیز ہے، تھینکس بس۔“ اس شام وہ دل ہی دل میں اس سے سخت ناراض رہی۔

”ہے تو یہ بھی میری طرح ہی ناں بے چارہ، اس کے بھی ماں باپ مر گئے ہوں گے جب ہی بی اماں کے پاس رہتا ہے۔ ارے اس میں تو اعتماد ہی نہیں ہے، جب ہی اتنا کم گو اور سنجیدہ بنتا ہے، بات کر سکے تو کرے ناں۔“ وہ اپنے دل میں قیافے لگاتی رہی۔

”اس کے سامنے نہ کہہ دینا ایسی فضول بات۔“ بواجی کو اس کی سوچ کا علم ہوا تو انہوں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”اس کے ماں باپ زندہ ہیں اور اچھی خاصی زندگی گزار رہے ہیں، یہ تو اس کی نانی نے اسے گود لے رکھا ہے اور یہ اپنی نانی کا اتنا لاڈلا ہے کہ وہ اسے خود سے جدا نہیں کرتیں ورنہ اس کو اپنے ماں باپ کے گھر کس چیز کی کمی ہے۔“

”چلو جی قصہ ختم۔“ وہ سخت مایوس ہوئی۔ ”یہ بھی باقی لوگوں کی طرح ہی ہے۔ ایک صرف میں ہی الگ ہوں بے چاری، جس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ جب ہی تو یہ اتنا مغرور اور خود پسند سا ہے۔“

”یہ ماں باپ کی محرومی کا رونا کب تک رویا جائے گا۔“ آخر بواجی کو غصہ آ گیا۔ ”ذرا اپنے ارد گرد نظر دوڑاؤ، تم نے کبھی اسے دیکھا ہے ڈاکٹر نادیا کی بیٹی کو کتنی چھوٹی سی ہے، اس کے والد کا بھی تو انتقال ہو چکا ہے اور اس کی ماں سارا سارا دن بے چاری محنت مزدوری کرتی رہتی ہے، وہ چھوٹی سی بچی اکیلی رہتی ہے سارا دن، وہ بھی تو جیتی ہے، اب تمہارے ہی گلے نہیں ختم ہوتے۔“

”آپ کو ساری عمر اس محرومی میں گزارنی پڑے تو جانوں..... جو جس کیفیت سے نہیں گزرا ہوتا، وہی ایسی بڑی، بڑی باتیں کرتا ہے۔ ٹھیک ہے مت رکھیے میرے ساتھ ہمدردی مگر یہ مت بھولیے گا کبھی کہ میرے دل سے اس محرومی کا اثر کبھی نہیں جائے گا۔“ وہ پہلی مرتبہ بواجی کے ساتھ بخ ہو کر بولی تھی۔ اپنی بات کہہ کر وہ جیسے ہی کمرے سے باہر نکلنے کے لیے مڑی اسے دروازے میں کھڑی بی اماں اور حمزہ نظر آئے۔ یقیناً انہوں نے اس کی پہنچ اور گستاخانہ لہجے میں کبھی بات سن لی ہوگی۔ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئی۔ سب کی نظروں میں اس کی شخصیت کا تاثر بہت اچھا تھا۔ اسے دلی قلق ہوا کہ بی اماں اور حمزہ کے ذہن میں اس کا تاثر خراب

”تمہیں اردو اور انگریزی زبان دونوں پر عبور حاصل ہے۔ تم ایک اچھی قلم کاہن بن سکتی ہو، تمہیں کوشش کرنی چاہیے اس سلسلے میں چھوٹے چھوٹے پیرا گراف لکھا کرو، مختلف موضوعات پر اور پھر مجھے دکھایا کرو۔“ اس کی انگلی کی ٹیچر نے اسے کہا تھا اور اس بات نے اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی، اس نے اسکول میگزین کے لیے چھوٹے چھوٹے مضمون لکھنے شروع کر دیے۔

”تم اکیٹھوا اور کھیل کی تکنیک کو سمجھتی ہو، تمہیں کھیلنا چاہیے۔“ اسکول کے لان ٹینس کوچ نے اسے ایک دوبار کھیلتے دیکھ کر کہا۔ اس نے روزانہ فارغ وقت میں ٹینس کی پریکٹس کرنا شروع کر دی۔

”تمہارا لہجہ اور تلفظ خوب صورت ہے، میں اگلے تقریری مقابلے کے لیے تمہارا نام دے رہی ہوں، تمہیں ابھی سے تیاری کرنا شروع کر دینی چاہیے۔“ اردو کی ٹیچر نے اسے کہا تھا۔ وہ ارادہ کر کے کسی کام کو شروع نہیں کرتی تھی۔ اس کی قسمت اس پر مہربان تھی۔ وہ اسکول کی چند ان لڑکیوں میں شمار ہونے لگی تھی جن کو غیر معمولی کہا جاتا تھا۔

”نماز پڑھا کرو، دعا مانگا کرو، اللہ سے فلاح مانگا کرو۔“ اس کی کامیابیوں کی خبر سن کر بواجی کہا کرتیں مگر وہ ناشکری تھی۔ اس کے شکوے ختم نہیں ہوتے تھے، اپنی کامیابیوں میں بھی اسے کجیاں نظر آتی تھیں، اسے ہمیشہ دوسروں کی شخصیتوں، کاموں اور چیزوں میں کشش نظر آتی تھی، وہ نہ صرف اسکول میں بلکہ اپنی کالونی میں بھی رول ماڈل کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ لوگ اپنی بچیوں کو اس کی مثالیں دیتے تھے اور سمجھاتے تھے کہ ان کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ وہ ایسی باتیں سن کر بظاہر بہت بے نیاز اور عاجزی پسند نظر آنے کی کوشش کرتی تھی مگر دل ہی دل میں ایسی باتوں پر بھی اسے شکوہ کرنا نہ بھولتا۔

”میرا اور ان لڑکیوں کا کیا مقابلہ۔“ وہ سوچتی۔ ”ان کے سروں پر ان کے والدین سلامت ہیں، ان کے بہن بھائی ہیں، عزیز رشتے دار ہیں، ان کو جو رونقیں اور سرپرستی میسر ہے وہ میرا مقدر کہاں۔“

عزیز رشتے دار کے نام پر بواجی کی ایک دوست نما کزن البتہ کبھی کبھار ان کے یہاں آ جاتی تھیں جو سیالکوٹ میں رہتی تھیں، بہت ہی کم کبھی بواجی بھی اس کو ساتھ لے کر ان سے ملنے سیالکوٹ جایا کرتی تھیں اور ایبٹ آباد سے سیالکوٹ کے اس سفر میں وہ بہت خوش رہا کرتی تھی۔ وہ بھی کہیں جا رہی تھی، اسے بھی کسی سے ملنا تھا، ماحول کی تبدیلی میسر آنے والی تھی، وہ اس شہر کو فیسٹیوٹ کر تی جہاں وہ کبھی کبھار جا سکتی تھی۔ بواجی کی دوست نما کزن کو سیالکوٹ میں بی اماں کے نام سے بلایا جاتا تھا۔ بی اماں کا ایک نواسا ان کے پاس رہتا تھا جو کچھ کم گو، حساس اور لیے دیے رہنے والا لڑکا تھا۔ بی اماں کے نام کی نسبت سے وہ اسے محمد علی جوہر کہا کرتی تھی، وہ نہ تو اس بات پر ہنستا تھا نہ ہی برا مناتا تھا۔ عجیب بے حس سا لڑکا تھا، اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ اسے وہ چھٹیاں اکثر یاد آئیں جب بی اماں اور ان کا نواسا ان کے پاس چند دن رہنے کے لیے آئے تھے۔ پنجاب میں ان دنوں سخت گرمی پڑ رہی تھی اور ایبٹ آباد میں موسم اچھا تھا۔ یہاں آ کر دونوں کے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے تھے۔ حمزہ اپنے ساتھ اسکول کی کتابیں بھی لایا تھا۔ اسے چھٹیوں میں ملنے والا کام کرنا تھا۔

”کتنے بورنگ اسکول میں پڑھتے ہو تم جہاں تمہیں اتنا زیادہ ہوم ورک مل جاتا ہے چھٹیوں میں۔“ وہ اسے کہا کرتی تھی۔

”بس ایسے ہی ہے۔“ وہ نیچی سی آواز میں کہتا۔

”ارے کیا ایسے ہی ہے، اپنے ٹیچرز سے کہا کرو ناں کہ اتنا زیادہ ہوم ورک نہ دیا کریں۔ اتنے زیادہ

کہانی ایک ہی تھی۔ ”منٹو صاحب، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم۔“ زرنگار کے کانوں میں جیسے عرصے بعد کچھ مانوس سے نام پڑے تھے جنہیں وہ عرصہ ہوا بھول ہی گئی تھی۔ ”کبھی میں بھی پڑھا کرتی تھی ان نامور لکھاریوں کی مشہور کہانیاں۔“ اس نے سوچا۔ ”اور وہاں سے چل کر میں بھی انہی کہانیوں کا ایک کردار بن گئی۔“ پھر اس نے اپنے ارد گرد کے منظر پر نظر ڈالی۔ ”زندہ کہانی کا جیتا جاگتا کردار۔“ اس نے خود کو ٹائٹل دیا۔ ”خود کو محمد ود نہ کر ڈالو میری بچی۔ میری بات مان جاؤ۔“ پھر امراؤ بیگم اپنی اصل بات پر آ گئی۔ ”کیا بات مان جاؤں اماں؟“ اس نے نرمی سے کہا۔

”صرف ایک مہر زاد خان ہی نہیں یہاں اور بھی بہت ہیں تمہارے حسن کے پرستار جو تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے تنہائی میں تمہارے ساتھ ایک لمحہ گزارنے کے لیے اپنی آدھی، آدھی دو لتیں لٹانے کو تیار ہیں۔“ امراؤ بیگم بہت میٹھا بول رہی تھی اور زرنگار اس مٹھاس میں گھلی تھی کے ذائقے کو اپنی زبان اور اپنے حلق میں اترتا محسوس کر رہی تھی۔

”تم جانتی ہو اماں، مہر زاد خان کی ایک ہی شرط ہے۔“ اس نے کسی لگی لپٹی کے بغیر صاف جواب دینے کا فیصلہ کیا۔

”جانتی ہوں۔“ امراؤ بیگم نے سر ہلایا۔ ”مگر اس کی ایک ہزار راتیں نہ جانے کب ختم ہوں گی اور وہ کون سا ایک ہزار راتیں تو اترے گزرے گا یہاں۔ دس، دس دن کا وقفہ ڈالنے کے بعد ایک رات وہ یہاں آتا ہے یوں تو میری عمر ختم ہو جائے اس کی ہزار راتیں نہ ختم ہوں گی۔“ ”کیا وہ دس دن خالی جانے دیتا ہے اماں، کیا وہ تمہیں اتنا نہیں دیتا جو دس ہزار دنوں کے معاوضے کے مطابق ہوتا ہے۔“ زرنگار نے پوچھا۔

”مگر میری جان خود کو محمد ود مت کر، اپنے حسن کی لو کو بڑھا کر چہار سو پھیلا دے تاکہ اس شہر کیا، اس علاقے کا ذرہ ذرہ روشن ہو جائے تیرے حسن کی لو سے۔ میری بچی! اپنی جوانی کو اپنے حسن کو عمر بھر کا روگ نہ بنا۔ طوائف کا کوئی محبوب نہیں ہوتا، وہ کسی کی معشوق نہیں ہوتی۔ طوائف کا محبوب پیسہ ہوتا ہے اور اس کا حسن اور اس کا جسم اس کا اے ٹی ایم کارڈ ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ جب چاہے جہاں سے چاہے کیش نکلا سکتی ہے۔“ زرنگار کو اس قسم کی گفتگوں کر ہمیشہ متلی سی محسوس ہوتی تھی مگر اسے ایسی باتیں سننے کی عادت ہو چکی تھی اس لیے اب وہ اپنا رد عمل ظاہر نہیں کرتی تھی۔

”آپ مہر زاد خان کو اپنی رضا مندی دے چکی ہیں اماں، اب مگر میں کیسے؟“ اس نے امراؤ بیگم کو یاد دلایا۔ ”طوائف کی کوئی زبان بھی نہیں ہوتی، کوئی وعدہ، کوئی قسم نہیں ہوتی۔ وہ اپنی سوئی بدلتے حالات اور نئی نئی پیشکش دیکھ کر پھیر لیتی ہے۔ میری چند ایسے چند سہرے اصول ہیں اس کا روبرو کہ ان کو سیکھ لو، تم نازک پھول ہو، تم پر کوئی زور زبردستی نہیں کرنا چاہتی مگر یہ روز روز کا نقصان بھی برداشت نہیں۔ سوچ لو..... یہ سلسلہ کب تک چل سکتا ہے۔“ امراؤ بیگم کو دراصل جو بات اسے بتانا تھی وہ بین السطور سے بتا چکی تھی۔ زرنگار نے اس کی اس بات کا جواب نہیں دیا۔

”میرے سر میں درد ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر منہ پھیر کر لیٹ گئی۔

☆☆☆

”آپ کو جو کام اسکول سے ملتا ہے، مجھے بھی دکھایا کیجیے۔ آپ کے اسکول کا معیار بہت اچھا ہے، مجھے بھی اندازہ ہوتا چاہیے کہ ایسے اسکول میں پڑھائی کیسے ہوتی ہے۔“ اگلے روز اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب حمزہ نے پہلی مرتبہ اس سے اتنی تفصیلی بات کی۔

”میں جو نیر برن ہال میں پڑھتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”آؤ میں تمہیں اپنی کتابیں دکھاؤں۔“ ”آپ کی لکھائی ماشاء اللہ بہت اچھی ہے اور لکھنے کا انداز بھی خوب ہے۔ آپ خاصی ذہین ہیں۔“ حمزہ نے تعریف کی۔ اس قسم کی تعریفوں کی وہ عادی تھی۔

”آج میری ٹیچر نے مجھے ہیومن رائٹس پر مضمون لکھنے کے لیے کہا ہے۔“ وہ بتانے لگی۔ ”کیا میں بھی اس موضوع پر مضمون لکھ سکتا ہوں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”کیوں نہیں، تم بھی لکھو پھر دیکھتے ہیں کہ ہمارے کتنے پوائنٹس ملتے جلتے ہیں۔“ اس نے خوش ہوئے کہا۔

اس نے ایک اچھا مضمون لکھا تھا مگر حمزہ کا مضمون پڑھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ اس نے حمزہ کا لکھا مضمون اپنی کاپی میں رکھ کر بیگ میں رکھ لیا اور اگلے روز اپنی ٹیچر کو دکھایا۔

”یہ مضمون کسی بڑے سے لکھوایا آپ نے؟“ ٹیچر نے سوال کیا۔ ”ہینڈ رائٹنگ آپ کی نہیں ہے۔“ ”یہ مضمون ہمارے گھر آئے ایک مہمان نے لکھا ہے۔“ اس نے صاف بتایا۔ ”کسی سینئر کلاس کے اسٹوڈنٹ نے لکھا ہے مضمون؟“ ٹیچر نے غالباً بارہ وہ مضمون پڑھنے کے بعد پوچھا۔ ”وہ بھی اسی کلاس میں پڑھتا ہے ٹیچر۔“ اس نے کہا۔

”he is a real genius then“ ٹیچر نے بے اختیار کہا۔ ”ونڈرفل، زبردست!“ ”شکل سے تو اتنا مسکین سا لگتا ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”چنانچہ اتنا اچھا مضمون کسے لکھ لیا۔“ اس نے

رشک اور حسد کے ملے جلے احساس کے تحت واپسی پر حمزہ سے ٹیچر کی تعریف کا ذکر نہیں کیا مگر وہ اپنے دل میں ہر دم اس سے مقابلہ کرنے کی دھن میں رہنے لگی۔ لیکن ان احساسات کے باوجود حمزہ کی وہ چھٹیاں اس کے لیے یادگار ثابت ہوئی تھیں۔ اس بار بی اماں پہلے سے زیادہ دن ٹھہریں اور وہ لوگ برنو، شملہ پہاڑی، سرہن اور الیاس کی سیر کرنے کے بعد ٹھنڈیانی اور نتھیا گلی تک ہو آئے۔ اس سفر میں حمزہ اور اس نے خوب لطف اٹھایا۔ وہ ایک دوسرے سے بے تکلف بھی ہوئے اور مختلف کھیل بھی کھیلتے رہے۔ جاتے ہوئے حمزہ اس سے سردی کی طویل چھٹیوں میں سیالکوٹ آنے کا وعدہ لے کر گیا تھا۔

☆☆☆

”ہماری داستانیں چراغ جلانے سے شروع ہو کر چراغ بجھانے پر ختم ہو جاتی ہیں۔“ امراؤ بیگم نے حمزہ کی مرتبہ کی سنائی بات دہراتے ہوئے کہا تھا۔ ”ہمارے پیشے کی تمام کہانیاں کم و بیش انہی اوقات کے گرد گھومتی ہیں۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”دنیا کی کوئی زبان ایسی نہ ہوگی جس میں طوائف کا قصہ نہ لکھا گیا ہوگا۔ ادھر ہمارے ہاں بڑے، بڑے نامور لکھاری مشہور ہی بازار حسن کی کہانیاں لکھ کر ہوئے۔ یہ اپنے منٹو صاحب، ادھر عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم کیا بڑے، بڑے نام ہیں، سب نے طوائفوں کی کہانیاں لکھیں اور مشہور ہوئے۔ کسی طوائف، رنڈی لگی کسی کو طوائف کے کوٹھے پر روحانیت مل گئی۔ سب اپنے، اپنے انداز سے۔۔۔ کہتے رہے۔“

”ہیلو آپ کیسی ہیں؟“ بینش اپنے دھیان میں بیٹھی کام کر رہی تھی جب اس کی سماعت سے آواز مگر اس نے چونک کر دیکھا اس کے سامنے دانیال بیٹھا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”میں آپ سے مخاطب ہوں مس۔“ اس نے دوبارہ کہا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ بینش نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اسے خود پر غصہ بھی آیا

تک اس نے اعتماد کے اس فقدان پر خاصی حد تک قابو پالیا تھا جو یہاں آنے کے بعد شروع کے دنوں میں پر حملہ آور ہوا تھا مگر آج کی صورت حال مختلف تھی آج وہ شخص پہلی مرتبہ براہ راست اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”میں نے سنا ہے کہ آپ اپنی کلاس میں خاصا بہتر جا رہی ہیں، آپ کا نام بینش ہی ہے ناں؟“ وہ اسے حیران کر دینے کے موڈ میں تھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے سر ہلایا۔

”آپ کا یہ جی ہاں میری پہلی بات کے جواب میں ہے یا دوسری بات کے؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”جی کیا مطلب؟“ بینش اس کی بات بالکل سمجھ نہیں پائی۔

”مطلب یہ کہ آپ اپنی کلاس میں خاصی بہتر جا رہی ہیں یا آپ کا نام بینش ہے، دونوں میں کس بات

جواب جی ہاں ہے۔“ بینش نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اگر وہ بھی ان دوسرے لوگوں کی طرح اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہا تھا جو اسے پس ماندہ علاقے کی مکین سمجھ کر اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتے تھے تو اسے بے حد مایوسی ہوئی تھی مگر اس نے دیکھا دانیال کا چہرہ سنجیدہ تھا اور وہ بالکل بھی محکمہ ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”میرا نام بینش ہے۔“ اس نے اب کے ذرا اعتماد کے ساتھ بات کی۔

”اور آپ کا کام؟“ وہ پہلی مرتبہ ذرا سا مسکرایا۔

”ابھی کام کرنے کا مارجن ہی بہت کم ہے۔ ابھی تو تھیوری زیادہ پڑھ رہے ہیں۔“ بینش کو اپنے اندر

لاہور کے لوگوں والے مخصوص لہجے پر قابو پانے میں اب بھی دشواری پیش آتی تھی۔

”ہوں.....“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”اگر مشکل پیش آئے کچھ سمجھنے میں تو آپ مجھ سے پوچھ سکتے

ہیں۔ مجھے دانیال کہتے ہیں اور میں کیونکہ آپ سے سینئر ہوں اس لیے آپ کو سمجھا سکتا ہوں۔“ بینش حیرت کے

سمندر میں تیرنے لگی۔

”یہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے یا کوئی خواب؟“ اس نے خود سے پوچھا۔

”ہمارا ایک گروپ ہے جو آرٹ کی پروموشن کے لیے کام کر رہا ہے۔ یہ جو ہم سیکھ رہے ہیں جو پڑھ رہے

ہیں یہ ایک محدود دائرہ ہے، آرٹ اس سے باہر اس سے آگے بہت وسیع اور بہت پھیلا ہوا ہے۔ ہم چاہتے ہیں

کہ وہ آرٹ جو ہمارے اس خطے اور اس ملک کے مخصوص پس منظر اور تاریخ کی عکاسی کرتا ہے اسے پروموٹ

کیا جائے، سامنے لایا جائے۔ ہمارے جو نامور مصور ہیں ان کے اسکول آف تھاٹ کو پروموٹ کیا جائے

اگرچہ مختلف سطحوں پر اس سلسلے میں پہلے سے ہی کام ہو رہا ہے مگر ہمارا طریقہ ذرا مختلف ہے۔ ہم فٹ پاتھوں پر

گلیوں اور بازاروں میں، ہجوم اور سکون میں ہر جگہ فنکار ہاتھوں کو تلاش کرتے ہیں وہ جو خداداد صلاحیتوں سے

مالا مال ہیں مگر وسائل کی کمی اور محدود شعور کی وجہ سے اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کو اجاگر کرنے

سے محروم ہیں۔ ہم ان کو سامنے لانے، ان کو اپنے ٹیلنٹ کو پالش کرنے اور ان کی سرپرستی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ ہمیں جو اُن کرنا پسند کریں گی؟“ وہ کہہ رہا تھا اور بینش حیران تھی، آج کا دن کیسا تھا، وہ کس کا چہرہ دیکھ کر گھر سے نکلی تھی۔ اس نے فجر کی نماز کے بعد کیا دعا مانگی تھی۔ صبح سے اب تک اس نے کون سی ایسی نیکی کی تھی وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

دانیال سے بات کرنا اس کی ایک ایسی خواہش تھی جس کی کوئی وجہ بتانے سے وہ قاصر تھی۔ اسے یہ شخص انریکٹ کرنا تھا، وہ اپنے اس احساس کو کوئی نام دینے سے یا اسے ڈیفائن کرنے سے بھی قاصر تھی۔ اسی طرح وہ اپنی اس خواہش اور اس احساس پر قابو پانے سے بھی قاصر تھی مگر وہ اتنا ریزرو اور سنجیدہ رہتا تھا کہ اسے یقین تھا کہ اس نے کبھی ارادہ کر کے اس پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی ہوگی۔ وہ اس کا حلقہ احباب دیکھتی جن کا تعلق ایک مختلف طبقے اور ثقافت سے تھا تو بالکل مایوس ہو جاتی تھی۔

”ایسے لوگ مجھ ایسیوں کو قابلِ توجہ کہاں سمجھتے ہیں۔“ وہ احساس کمتری کے مارے نہیں بلکہ اپنی حقیقت پسندی کی وجہ سے ایسا سوچتی تھی مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ انسان کسی کے بارے میں سوچنے کا انداز ہی بدل لے پھر وہ سوچتی۔ ”وہ مغرور نہیں لگتا، خود پسند بھی نہیں ہے، ہاں مگر بے نیاز اور بے پروا ہے۔ اس نے کبھی میرا مذاق اڑایا نہ ہی کوئی طنز کیا۔ اس لیے وہ دوسروں سے بہتر ہے۔“ اور اسی سوچ کی وجہ سے وہ دانیال کا احترام بھی کرتی تھی اور اس سے بات کرنے کی خواہش بھی رکھتی تھی اور اپنی حقیقت پسندانہ طبیعت کی وجہ سے اسے اپنی اس خواہش کے پورا ہونے کی ایک فیصد بھی توقع نہ تھی۔

مگر وہ ایک مختلف انسان تھا۔ دانیال نے اسے اچانک نہ صرف مخاطب کیا تھا بلکہ وہ اسے اپنا حلقہ جوائن کرنے کی دعوت بھی دے رہا تھا۔ اسے فوری طور پر اس پیشکش کا بھی کوئی جواب نہیں سوچا تھا۔

”آپ خاموش ہیں، مس آئی ایم سوری میں شاید کچھ زیادہ بول گیا۔“ اس کی خاموشی کو دیکھ کر دانیال کو نہ جانے کیا احساس ہوا تھا جو اس نے یہ بات کہی تھی۔

”نہیں.....“ بینش نے سر ہلایا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔“

”مجھے خود بھی نہیں پتا کہ میں آپ سے ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”مگر یقین جانیں میرا دل چاہتا ہے کہ آپ ہمارے حلقے کو جوائن کر لیں۔“

”میں بالکل نئی ہوں اس میدان میں۔“ بینش نے اپنا گلا ذرا سا کھنکھارنے کے بعد کہا۔ اسے اپنی آواز بیٹھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ”اور مجھے بہت سی باتیں سمجھ میں بھی نہیں آئیں ابھی۔ مجھے زبان کا بھی مسئلہ ہے، میں نے شروع سے اردو میڈیم اسکول میں پڑھا ہے، بنیادی تعلیم انسان کے کیریئر پر کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے یہ مجھے بھی اب پتا چلا ہے، میں اتفاق سے اس میدان میں اس لیے آگئی ہوں کہ میرا خیال تھا کہ فائن آرٹس صرف تصویریں بنانے، مٹی کے برتن بنانے اور جسے بنانے کا نام ہے۔ یہ کتنا وسیع شعبہ ہے اور اس میں کیا کچھ ہو رہا ہے، یہ بھی مجھے یہاں آنے کے بعد ہی پتا چلا ہے بلکہ شاید مکمل طور پر تو اب بھی نہ پتا چلا ہو۔ میں اس میدان کی وسعت دیکھ کر دنگ رہ گئی ہوں۔ میری ڈرائنگ اچھی تھی اور مجھے تصویروں میں رنگ بھرنے کا ڈھنگ آتا تھا، اسی لیے ایف ایس سی پری میڈیکل میں بہت اچھے نمبر نہ لے سکے پر میری ایک ٹیچر نے مجھے یہاں داخلہ لینے کا مشورہ دیا تھا مگر یہ کتنی مختلف دنیا ہے اور میرے لیے کتنی ناقابلِ حصول ہے۔ میں ابھی تک اسی سوچ کے دائرے میں گھوم رہی ہوں۔ تعلیم کے میدان میں مجھے محنت کرنے کی عادت ہے، شاید اسی لیے

چورہوں ورنہ میری جو عمر ہے اس میں مجھے یہاں سے پڑھ پڑھا کر کسی عملی میدان میں گئے بھی ایک دو سال گزر چکے ہونے چاہیے تھے۔ میں نے اس جگہ کو لیٹ جوائن کیا۔ اچھا چلو دوستی نہ کرو، اپنے پر اہل ضرور شیر کر لیا کرتا۔ پھر وہ سنجیدگی سے بولا۔

”میں آپ سے دوستی کروں گی۔“ اُس نے حناوہ کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

”تم نے میرے لیے کوئی لڑکا نہیں دیکھا۔“ زوئی نے ایک ہفتے کے دوران تیسری مرتبہ نادر سے پوچھا۔

”ارے بھئی میں کیا تمہیں رشتے کرانے والی مائی لگتا ہوں جو اتنی جلدی تمہارے لیے لڑکا دیکھ لوں گا۔ یہ کام اتنی جلدی تھوڑی ہو جاتے ہیں اور تمہارے سلسلے میں تو مسئلہ ہی بڑا ہے۔“

”کیوں، کیا مسئلہ ہے میرے سلسلے میں؟“ وہ ناراض سی شکل بنا کر بولی تو نادر کھلکھلا کر ہنس دیا۔

”کیوں، ہنس کیوں رہے ہو؟“ وہ مزید ناراض ہوئی۔

”بتا ہے کیا۔“ وہ بہ مشکل اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”جب تم ناراض ہوتی ہو تو تمہاری چھوٹی، چھوٹی آنکھیں اور بھی چھوٹی ہو جاتی ہیں سکر کر اور تمہاری ناک اور بھی چھٹی ہو جاتی ہے۔“

”نادر.....“ وہ چیخنی۔ ”میں سنجیدہ ہوں۔“

”اوہ ہاں.....“ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”مگر تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے یار، ابھی دیکھو ناں ایک لڑکا جو تمہاری طرح کم عمر ہو جو برسر روزگار بھی ہو، شادی بھی کرنا چاہتا ہوں اور کسی چائینز سے شادی کرنے پر اسے اعتراض بھی نہ ہو اتنی جلدی کہاں سے دستیاب ہوگا۔“

”میری عمر بہت کم نہیں ہے۔“ زوئی نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”ارے یہی تو مسئلہ ہے، تم چائینز جتنے مرضی بڑے ہو جاؤ، تمہاری شکلوں پر کچھ اتنی معصومیت چھائی ہوئی ہوتی ہے کہ اپنی عمر کے لگتے ہی نہیں ہو۔ کچھ تم لوگ اتنے سفید بگے جیسے ہوتے ہو خواہ مخواہ ہی پیارے لگتے ہو۔ یار تمہیں قدرتی طور پر بہت سے ایڈوائس حاصل ہیں۔“

”نادر.....“ وہ چیخنی۔ ”میں بہت سیریس ہوں اور تمہیں ہر وقت مذاق کی سوچھی رہتی ہے۔“

”کیا کروں ڈیئر فرینڈ میں ادھر ادھر کی اس لیے ہانک رہا ہوں کہ تمہاری بات کافی الحال کوئی جواب ہی نہیں ہے میرے پاس۔“ نادر کو اس کی سنجیدگی پر ترس آ گیا۔

”افوہ..... میرے پاس وقت اتنا کم رہ گیا ہے۔ یہ ریسرچ ختم ہو گئی تو سمجھو میرا بوریا بستر گول..... پھر بتاؤ میں کیا کروں گی؟“ اس نے بے چارگی سے نادر کی طرف دیکھا۔ ”کوئی ایسا بھی نہیں جو صرف نکاح کر لے مجھ سے بے شک مجھ سے پیسے لے لے۔“

”ارے، پیسے دے کر نکاح کرو گی۔ لڑکا خریدو گی۔“ نادر ایک بار پھر بے اختیار ہنس پڑا۔

”تم پھر ہنسے۔“ زوئی غصے سے بولی۔

”کیا کروں..... تم باتیں ہی ایسی کرتی ہو۔“ نادر نے کہا۔ ”میری سمجھ میں تو یہ ہی نہیں آتا کہ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ یار ریسرچ ختم ہوتی ہے تو تمہیں چاہیے کہ سیدھی، سیدھی اپنے وطن سدھار جاؤ، وہاں کسی چیانگ کائی ٹیک سے شادی کر لینا اور مزے سے زندگی گزارنا، یہاں کیا رکھا ہے جس کے لیے مری جا رہی ہو۔“

”تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔“ وہ منہ پھلا کر بولی۔ ”جیسے یہ حل مجھے آتا ہی نہیں۔ مجھے واپس جانا

آپ کو کسی نے بتا دیا ہو کہ میں اپنی کلاس میں بہتر جا رہی ہوں مگر سچ بات تو یہ ہے کہ میں ابھی خود کو یہاں خاصے بے جگہ محسوس کرتی ہوں۔“ بینش کو خود بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنی تفصیلی بات اتنے صاف گوانداز میں کیے کر رہی تھی۔ بس اسے ایسا لگا تھا کہ چند لمحوں کے لیے اس کے اور دانیال کے درمیان ایسی کمیونیکیشن فریکوئنسی قائم ہو گئی تھی جس کے ہوتے ہوئے اسے یقین تھا کہ وہ اپنی بات کہہ سکتی ہے اور سننے والا اس کی بات سن سکتا ہے۔ اتنے واضح انداز میں تو اس نے ابھی تک یہاں کسی اور سے بات نہیں کی تھی شاید آمنہ سے بھی نہیں۔

”ہوں.....“ وہ جو اپنے دونوں ہاتھ جوڑے ہاتھوں کے انگوٹھے دانتوں میں دبائے بیٹھا تھا اس کی بات کو بہت دھیان سے سن رہا تھا بولا۔

”یہ کوئی ایسی مشکل صورت حال نہیں ہے۔“ اس نے گہری سانس لینے کے بعد سیدھے ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے سب مسائل کا بہت آسان حل ہے میرے پاس، یہ ہم لوگوں کی بدقسمتی ہے جو ہم اگر کسی کو مشکل میں پھنسے دیکھتے ہیں یا اپنی محدود سوچ کی وجہ سے کسی کو خود سے کم پاتے ہیں تو اس کی مشکلات میں اضافے کا سبب بننے لگتے ہیں مگر تم فکر نہ کرو۔“ اس نے ایک دم آپ سے تم پر آتے ہوئے بینش کے چہرے پر ایک نظر ڈالی شاید وہ اس کے چہرے کے تاثر کو سمجھنے کے کوشش کر رہا تھا اسے اس کی یہ بے تکلفی پسند بھی آئی تھی یا نہیں۔

”تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔“ بینش کے چہرے پر اسے نہ جانے کیا نظر آیا تھا جو وہ مزید بے تکلف ہوا۔ بینش نے اس کی جانب دیکھا۔

”کوئی بھی مشکل پیش آئے، کیسا بھی مسئلہ ہو تم مجھے بتانے سے، مجھ سے ڈسکس کرنے سے نہیں جھگو گی۔“

بینش کی نظروں میں بے یقینی اور تذبذب تھا۔

”ڈرومٹ۔“ وہ مسکرایا۔ ”میں ایکسپلاٹ کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھ پر اعتماد کر کے دیکھو شاید میں تمہارے کام آ سکوں۔“

بینش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تمہیں ڈیزائننگ جوائن کرنے کا خیال کیوں آیا۔ کیا تم اسے آسان پاتی ہو؟“ پھر اس نے سوال کیا۔

بینش اس کا کیا جواب دیتی کہ اس نے یہ میدان اس لیے منتخب کیا کہ دانیال بھی یہ ہی پڑھ رہا تھا۔ اس نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ”اگر تم فائن آرٹس کو پینٹنگ، پوٹری اور مجسمہ سازی سمجھ کر ادھر آئی تھیں تو تمہیں بی ایف اے پینٹنگ کی کلاسز جوائن کرنا چاہیے تھیں۔“ پھر وہ بولا۔ ”کتنے کریڈٹ آؤر مکمل ہوئے ہیں تمہارے؟“ بینش نے اس بات کا بھی جواب نہیں دیا۔

”چلو وہ میں خود پتا کر لوں گا۔“ وہ بولا۔ ”فیلڈ بدلتی ہے بے اس نے نرمی سے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ بینش اسے کیا بتاتی کہ وہ ایک ایسے گرداب میں پھنس گئی تھی جہاں نہ جائے رفتن نہ پائے

ماندن والا حساب ہو رہا تھا۔

”میں تمہاری مدد کروں گا۔“ وہ بولا۔ ”میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ مجھ سے دوستی کرو گی؟“ اس نے

اچانک سوال کیا۔ بینش کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا جس ماحول سے وہ آئی تھی وہاں لڑکے اور لڑکی کی دوستی کو کیا سمجھا جاتا تھا اسے اچھی طرح معلوم تھا۔

”کم آن.....“ وہ ہنسا۔ ”میں ان کم عمر لڑکوں میں سے نہیں ہوں جن کی دوستی سے ڈرا جائے، میں ذرا عمر

”بریک اوور..... چلو واپس کام پر چلتے ہیں۔“ زوئی نے مسکراتے ہوئے کہا مگر نادر جانتا تھا کہ وہ کس دل سے مسکرائی تھی۔

☆☆☆

مہر زاد خان کو اپنی اس نئی زندگی میں مختلف چیلنجز درپیش تھے اور اسے اپنے لیے ایک مکمل لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ جب وہ اپنے علاقے میں جاتا تھا اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے ارد گرد تلوے چائے والوں، تالیاں بجانے والوں اور سدا بھاگ لگے رہیں کہنے والے، بھانڈوں اور میراثیوں کا جھگھا لگا رہتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہمہ دم اس بات کا جائزہ لیتے رہتے تھے کہ رس پیدا کرنے والی ان مشینوں کو جن کو وہ اپنے لیڈر، اپنے آقا اور اپنے سردار قرار دیتے تھے کس طرح آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کا اہل بنایا جاسکتا تھا۔ وہ اپنے علاقے کی روایات اور انداز سیاست و رہنمائی سے خوب اچھی طرح واقف تھا، اس کے مرحوم والد نے اسے دوران تعلیم ”ساؤتھ ایشین اسٹڈیز“ کا مضمون بطور خاص پڑھوایا تھا اگرچہ وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ اس مضمون کے پڑھ لینے سے اسے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔ کتابوں میں لکھے الفاظ اگر محض پڑھ لینے کی حد تک ہی پڑھے جائیں اور ان کو عملی شکل نہ دی جاسکے تو پھر ان کا کتابوں میں بند رہنا ہی ٹھیک ہوتا ہے، پڑھنے نہ پڑھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ سوچا کرتا تھا۔

اپنے والد کی وفات جسے بڑے پیمانے پر شہادت قرار دے کر خوب ایکسپلاٹ کیا گیا تھا کے بعد جب سرداری کا کلاہ اس کے سر پر رکھا گیا تھا۔ اس نے اپنے مستقبل کا ایک کچا سا نقشہ تو اسی وقت اپنے ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ علاقے کی روایات کے گرداب میں پھنسنے سے ہر ممکن بچنے کی کوشش کرے گا مگر

ہوتا تو مسئلہ ہی کیا تھا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ مجھے یہاں رہنا ہے پاکستان میں۔“

”پھر کیا کریں، فوری طور پر کہاں سے لڑکا ڈھونڈیں؟“ نادر کو اس کے احساس پر دکھ سا ہونے لگا۔
”تم میری مدد کرنا چاہتے ہو، میری مدد کر سکتے ہو یا نہیں؟“ وہ غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
”میں بالکل تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے اس عجیب و غریب مسئلے کا حل کیسے ہو۔ میں اس کا حل کہاں سے تلاش کروں؟“
”تم اس کو حل کر سکتے ہو تم خود ہی حل کر سکتے ہو۔“ زوئی نے کہا۔
”وہ کیسے؟“ نادر نے اس کی طرف دیکھا۔
”مجھ سے تم شادی کر لو۔“ زوئی نے آسانی سے وہ بات کہہ دی۔
”ارے..... رے.....“ نادر گڑ بڑا سا گیا۔

”ہاں تو اس میں کیا مشکل ہے، میں صرف نکاح کے لیے ہی تو کہہ رہی ہوں۔ میرے پیپر ز بن جائیں، مجھے یہاں رہنے کی اجازت مل جائے تو تمہارا کیا جاتا ہے صرف نکاح کر لیتے ہیں۔ میں تمہیں کوئی پوری شادی کرنے یا اپنی ذمے داری اٹھانے کا تھوڑی کہہ رہی ہوں۔ باہر کے ملکوں میں جا کر بھی تو پیپر میرج کرتے ہو ناں وہاں کی لڑکیوں سے تم لوگ نیشنلٹی کے لیے، سمجھو یہاں تم کسی کے کام آسکتے ہو اسی مقصد کے لیے۔“ وہ کہہ رہی تھی اور نادر دنگ بیٹھا تھا۔

”ارے سوچ کیا رہے ہو؟“ زوئی نے اس کی نظروں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ ”مجھ سے پیسے لے لینا تم اس نکاح کے۔“ وہ مسکرائی۔

”ارے تم مجھے اتنا گھٹیا سمجھتی ہو۔“ نادر نے سخت لہجے میں کہا۔

”تو پھر کس سوچ میں پڑ گئے؟“ نادر نے اس کی طرف دیکھا۔ زوئی کے چہرے پر ایک آس تھی، اس کی آنکھوں میں امید تھی جیسے اسے یقین تھا کہ نادر اسے منع نہیں کرے گا۔

”ڈر گئے ناں۔“ وہ بے بسی سے ہنس دی۔ ”کوئی زبردستی تھوڑی ہے انکار کر دو۔“

”بات یہ نہیں ہے زوئی۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”میرے نزدیک یہ اتنا اہم فریضہ ہے کہ اس کو مذاق میں لیا ہی نہیں جاسکتا۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو پیپر میرج کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ میں اسٹرونگ کمینٹ کو ماننے والوں میں سے ہوں۔ میرے نزدیک نکاح کا بھی وہی مفہوم ہے جو شادی کا ہے۔ جب یہ ہو جاتا ہے تو دو انسان ایک دوسرے کی ذمے داری بن جاتے ہیں اور یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔“

”میں صرف مدد کرنے کی بات کر رہی تھی۔“ زوئی کے چہرے کے زاویے اس کی بات سن کر اور بھی مضحکہ خیز ہو گئے۔ ”چلو کوئی بات نہیں نادر۔ مجھے افسوس ہے میں نے تمہیں پریشان کر دیا، مجھے معاف کر دو۔“
”کوئی بات نہیں یار، تم اتنی بے بس ہو رہی ہو، ایسے میں ایسی بات کہہ دینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔“ نادر نے اپنے لہجے کی سنجیدگی ختم کرتے ہوئے کہا۔

”میں چلی جاؤں گی واپس۔“ پھر وہ بولی۔ ”شاید میرے لیے یہاں جگہ ہی نہیں ہے۔ میرا واپس جانا ہی میرا مقدر ہے۔“

”تمہاری خواہش اتنی شدید ہے کہ دیکھو خدا کوئی صورت نکال ہی دے۔“ اب نادر کو پہلی بار اس کی بات کا مذاق اڑانے پر افسوس ہوا تھا۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

بدلتے موسم کی تغیر انگیزیوں
جولائی 2013ء کے شمارے کی فہرست انگیزیوں

● **ابتدائی سوغات** ● عقل کی فراوانی میں وحشت کی انتہاؤں کو چھوتی کہانی کے
اسرار و رموز... **سمیرا یعقوب** کے قلم کی جولانیاں

● **گرداب** ● واقعات کے گزرباغ میں گرفتار کرداروں کا آغاز و انجام **اسما قادری** کا سلسلہ

● **جواری** ● **احمد اقبال** کے شریں قلم سے ایک نفاہل فراموش تہلکہ خیز سلسلے کا آغاز

● **مغرب کے نرالی انداز** ● مغربی دنیا کی تہذیبی ماحول کی عکاسی اور محبت کی پوزہ ناقابل فراموش کہانیاں
سرور ق کی کہانیاں

● **بقی کہانی** ● مغرب ہو یا مشرق ہر مسلم ہی گرداب میں پھنسنے نظر آتے ہیں۔ ایسی ہی منظر موعالی
پیلانے کی کئی حدشوں کے انکشافات **کاشف زبیر** کے انداز بیان میں

● **دوسری کہانی** ● محبت کے جنبش کے ساتھ بہت ضرور ہیں۔ مگر ختم نہیں ہوتے۔ محبت کے
اسرار و رموزوں کے علاوہ دینی داستانیں... **احمد اقبال** کی تحریر



آپ کے تہرے...
مشوے... بچتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

میری بیٹی کی شادی



میری چھوٹی لاڈلی بیٹی گھومنے پھرنے اور کورس کرنے کیلئے گئی ہوئی تھی۔ اچانک مقدر نے یادری کی اور اس کے خوابوں کا شہزادہ ہماری دہلیز تک پہنچا۔ افراتفری میں اپنی دوست کو فون کیا کہ واپسی کی ٹکٹ کرواؤ اور صوفیہ کو واپس بھجواؤ کہ دولہا میاں دیکھنے کو بے چین ہیں کہ دیکھ کر اور مل کر فیصلہ کرنا تھا۔ صوفیہ واپس آئی ہونے والے سسرال کو بمعہ نوشہ میاں بلوایا گیا۔ میرا داماد ماشاء اللہ بہت لائق، شرارتی اور خیال رکھنے والا ہے۔ دونوں کی رضامندی سے بات طے ہو گئی۔ مہندی سادگی سے اپنے اپنے گھر ہوئی اور بارات بینڈ باجے کے ساتھ دھوم دھام سے آئی۔ بارات والے دن بھی دولہا میاں کی شوخیاں، شرارتیں عروج پر تھیں۔ رخصتی گھر سے ہوئی اور سب سے دلچسپ بات صوفیہ جو نہی سسرال پہنچی۔ بینڈ باجے والے استقبال کے لیے گیٹ پر موجود اور وہ بھی رات کے ایک بجے اور بے پناہ ہوائی فائرنگ اور پٹاخوں کی گونج میں دلہن کو سسرال لایا گیا۔ دو دن بعد دونوں دو ہفتے کے لیے تھائی لینڈ ہنی مون پر چلے گئے۔ ماشاء اللہ خوش ہیں اللہ سدا خوش رکھے، آمین۔

از: فرزانہ مسعود، راول پنڈی

”میرا نام نیشل رئیس، پیشہ صحافت، تعلیم ایم فل ماس کمیونیکیشن۔“ وہ اس کے فیجر کے سوال پر بتا رہی تھی۔
”ادہ.....“ مہر زاد کے ذہن میں جھماکا ہوا اور ساتھ ہی اس نے اس لڑکی کو اپنی میڈیا فیجر کے طور پر منتخب کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔

☆☆☆

انہوں نے ایک نظر بیڈ پر چت پڑے مختلف نالیوں اور ڈرپوں میں جکڑے وجود پر ڈالی اور دوسری نظر اپنے ہاتھ میں پکڑے چھوٹے آئینے پر ڈالی۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ دنوں میں بوڑھی ہو گئی تھیں۔ ان کے بالوں میں سفیدی جھانکنے لگی تھی اور چہرے پر اتج لائنز ابھر آئی تھیں۔ یہ وہ سفید بال تھے جن کے کہیں کہیں سرنگانے سے پہلے ہی وہ انہیں بہترین ہیئر ڈائی کے فیشن کٹر میں چھپا لیتی تھیں۔ اتج لائنز باقاعدگی سے فیشل کروانے اور اسکن ٹائٹنگ ٹریٹمنٹ کی وجہ سے کبھی نظر نہ آسکی تھیں مگر اب انہیں کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ ان کا جوان بیٹا موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ سارا سارا دن اور ساری ساری رات اس کے سر ہانے بیٹھی رہتی تھیں۔ ان کو ہر قسمی رشتے کا اصرار بھی وہاں سے اٹھا نہیں سکا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ ایک، ایک لمحہ انہیں امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا کیے رکھتا تھا۔ انہیں یاد نہیں آتا تھا کہ انہوں نے زندگی میں آخری بار نماز کب پڑھی تھی۔ قرآن پاک کی تلاوت کب کی تھی، خدا کے حضور حاضر ہو کر دعا کب مانگی تھی لیکن بیٹے کے حادثے کے بعد انہیں اچانک بھولی ہوئی نمازیں اور چھوڑی ہوئی تلاوت یاد آ گئی تھی۔ نہ جانے کہاں، کہاں اور کس، کس کی سکھائی دعائیں یاد آتی گئی تھیں۔ وہ ایک فیشن ایبل جدید عورت جو ذہن تھی اور دنیا جہان کی معلومات رکھتی تھی سے پلٹا کھا کر محض ایک ماں بن کر رہ گئی تھیں۔ انہیں اپنے اس بیٹے کی زندگی کا ایک، ایک لمحہ کسی فلمی تصویر کی

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ علاقے کی روایات ایسا آکٹوپس تھیں جن کے شکنجے سے بچنے کے لیے بار بار پہلو بدلنا بہت حد تک ناممکن تھا۔ یہاں کی دشمنیاں بھی پرانی اور مخصوص تھیں اور دوستیاں بھی۔ وہ اپنے ارد گرد نظر دوڑاتا۔ اس کے ہم عمر کزنز اور رشتے دار دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسی طرح کی زندگی گزار رہے تھے جیسی ان کے آباؤ اجداد نے گزاری تھی۔ ان کی زندگیوں کے دہرے معیار تھے، علاقے میں وہ روایتی کردار نبھاتے اور یہاں سے باہر جدید انسانوں کا روپ دھار لیتے۔ لائٹ، گولی، دھونس، دھاندلی، ظلم اور جبر وہ اپنی حاکمیت قائم رکھنے کے لیے کسی بھی چیز سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس کے باپ کا قتل بھی ایسے ہی کسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ وہ گولی کسی ایسی سمت سے ہی آئی تھی جو دوستی کی سرزمین سمجھی جاتی تھی مگر جہاں کے دوستوں کو اس کے والد سے کوئی خاص خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ ایسے چہروں کو منظر عام سے ہٹا کر قبر تک پہنچا کر ان کی لاشوں پر سیاست کرنا بھی یہاں کا ایک ایسا اصول تھا جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ چند ماہ کے اندر ہی مہر زاد خان کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایسا کچھ کرنے سے فی الحال قاصر تھا جو مختلف ہوتا اور جو روایات کی اس مٹھ کو توڑ سکتا۔

”ٹیل کی زمینوں تک پانی پہنچانا۔“

”مزارعوں، کاشتکاروں اور کسانوں کو ان کے جائز حقوق دینا۔“

”تعلیم کو عام کر کے پڑھے لکھے جنوب کا نعرہ لگانا۔“

”این جی اوز کے درست ہونے اور ان کو دی جانے والی گرانٹ کے درست استعمال کا جائزہ لینا۔“

”پینے کے صاف پانی کی فراہمی۔“

یہ وہ ایٹوز تھے جو علاقے سے باہر نکلنے پر آزاد میڈیا کی طرف سے بار بار اس سے پوچھے جاتے تھے اور وہ ان کے جواب دیتے دیتے تھکنے لگا تھا۔ اس کے والد کی وفات کے بعد خالی ہو جانے والی سیٹ پر ضمنی انتخابات قریب تھے۔ اس بار آزاد میڈیا اس انتخاب کو ایٹوز کا انتخاب بنا ڈالنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس مقابل سیاسی جماعت نے کسی با اثر شخص کے بجائے طبقے کے ایک بڑھے لکھے نوجوان کو ٹکٹ دیا تھا۔ برعکس مقابل سیاسی جماعت اپنے تمام جماعتی وسائل اس انتخاب میں جھونک رہی تھی۔ مہر زاد خان کے حق میں سب سے مضبوط عنصر اس کے باپ کی سو کا لڈ شہادت تھی، وہ علاقے کے ایک شہید کا بیٹا تھا، یہ قربانی عوام کے حقوق کی جنگ لڑتے ہوئے دی گئی تھی اس لیے اس سیٹ پر جانشینی کے علاوہ بھی شہید کے بیٹے کا حق تھا۔ اس کی پارٹی، اس کے عزیز رشتے دار، اس کے کارکن سب سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے مگر مہر زاد کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس سلسلے میں کی جانے والی کوششوں میں کسی چیز کی کمی تھی۔

”تمہیں ایک مضبوط اعصاب کے مالک، ہوشیار، چست، حاضر دماغ، ذہین، میڈیا فیجر کی ضرورت ہے، ایک ایسا ترجمان جو تم سے بھی زیادہ تمہارے حق میں بات کرنے کا اہل ہو۔ فوراً سے پیشتر ایسا شخص تلاش کرو۔“ اس کے ایک قریبی دوست نے اسے وہ مشورہ دیا تھا جو اس کے دل کو لگا تھا۔ اس نے لیڈنگ اخبارات میں بغیر اپنا نام دیے اشتہار دیا اور اسے ملک کے مختلف کونوں سے بے شمار پروفائلز مع درخواستوں کے وصول ہوئی تھیں۔ شارٹ لسٹ امیدواروں کے انٹرویو کے لیے وہ اپنے اسلام آباد آفس میں خود بیٹھا تھا۔ دو چار انٹرویوز کے بعد ہی وہ تھک بھی گیا تھا اور مایوس بھی ہو چکا تھا۔ پانچویں امیدوار ایک لڑکی تھی جسے دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔ اس نے اس لڑکی کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

کتنی مصروف اور کم عمر نظر آ رہی ہیں، آئیں آج میں ایسی ہی ایک چائیز حسینہ سے آپ کو ملواؤں۔“
”ارے، میں کب حسینہ ہوں؟“ زوئی نروس ہو گئی۔

”اپنے ملک میں تو تم لوگ ایک جیسی شکلوں کی وجہ سے شاید گریڈ نہ کی جاسکتی ہو مگر ہمارے ملک میں تمہیں حسینہ کہلانے کا پورا حق ہے۔“ نادر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”خیر میں آج اپنی آپا کو تم سے ملوانے لایا ہوں، مجھے امید ہے کہ تمہیں برا نہیں لگا ہوگا۔“

”مجھے برا کیوں لگے گا، مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ آپ لوگ بیٹھو، میں ذرا پیچ کر کے آتی ہوں۔“
زوئی کو اپنے گرد سے اٹے کپڑوں سے وحشت ہو رہی تھی اس لیے اس نے ان سے کچھ دیر کے لیے معذرت کر لی۔ نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے کے دوران بھی وہ نادر کی اپنی آپا کے ساتھ اس غیر متوقع آمد کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

اس روز ہی اس نے چھوٹے آئینج کیک بیک کیے تھے اور قیمہ نوڈلز بنایا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ اس کے گھر میں مہمانوں کی تواضع کے لیے کچھ چیزیں موجود تھیں اور اسے قریبی بیکری کی طرف نہیں دوڑنا پڑے گا۔
”تم بہت اجنبی سی بہت مختلف لگ رہی ہو، اس طرح میزبان کے روپ میں۔“ نادر نے چائے کے ساتھ آئینج کیک کھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا ایچ خاص پروفیشنل لڑکیوں کا سا ہے، کام میں مصروف، سفید کوٹ میں ملبوس دواؤں کی بوتلیں ہوتی مگر یہ ایک مختلف لگ ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”تم نے وہاں سے باہر مجھے دیکھا ہی کب ہے۔“ زوئی مسکرائی۔ ”مجھے تو خود بھی ایسا لگتا ہے کہ میں ہر وقت اسی جلیے میں رہتی ہوں، گھر میں ٹھہرنے کا دورانیہ تو کم ہوتا ہے اور تمہارا اپنا بھی تو یہی حال ہے، آج تم بھی مختلف نظر آ رہے ہو، گوتم ایڈمن میں کام کرتے ہو۔“

”نادر ہم چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔“ نادر کی آپا نے بتایا۔ ”یہ ہمیں بہت عزیز ہے، یہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا مگر ہمارے مالی حالات اچھے نہیں تھے اس لیے میرٹ پر نام آنے کے باوجود یہ ڈاکٹر نہیں بن سکا۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو اللہ کی رضا میں راضی رہتے ہیں اور بہت خوشی سے راضی رہتے ہیں۔ اب یہ اچھا کمار رہا ہے، اللہ کا بہت شکر ہے، ہم چاروں بہنوں کی تو شادی ہو گئی، اب ہم چاہتے ہیں کہ اس کا گھر بھی بس جائے۔“
”تو جلدی کیجیے ناں، میں بھی نادر کی شادی میں شریک ہونا چاہوں گی۔“ زوئی بچوں کی سی مسرت کے ساتھ بولی۔ ”لیکن اگر اس کی شادی اگلے سال تک نہ ہو سکی تو پھر میں شاید کیا یقیناً اس کی شادی میں شرکت نہیں کر سکوں گی۔“ دوسرے ہی لمحے اسے کچھ یاد آ گیا اور اس کے چہرے پر مایوسی سی چھا گئی۔

”ارے، کیوں نہیں کر سکو گی شرکت؟“ آپا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔
”اگلے سال کیا چند ماہ کے بعد ہی مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔“ زوئی کے لہجے میں اداسی اور دکھ تھا۔
”میرا یہاں قیام کا عرصہ ختم ہونے والا ہے کیونکہ میری ریسرچ ختم ہونے والی ہے۔“

”تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟“ نادر کی آپا نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بھی اداسی تھی، اس کے شانوں تک کٹے سیاہ بال بھیگ کر مزید سیاہ نظر آ رہے تھے۔ اس کی رنگت سفید تھی اور ناک چپٹی۔ ”یہ کتنی مختلف نظر آتی ہوگی، یہاں کے لوگوں میں۔“ انہوں نے سوچا تھا۔

”چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔“ زوئی نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ”میں یہاں رہ نہیں سکتی کیونکہ مجھے یہاں کی شہریت نہیں مل رہی۔ مجھے واپس جانا ہوگا کیونکہ یہ میرا ملک نہیں ہے۔“

طرح یاد آ رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اپنے اس بیٹے سے سب سے زیادہ قریب تھیں، اس کی زندگی کے ہر موڑ پر، ہر اہم موقع پر، ہر خوشی، ہر پریشانی میں وہ اس کے ساتھ ساتھ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کے بہت بچپن میں اس کے اندر ایک آرٹسٹ کو پہچان لیا تھا۔ انہوں نے ہر ایسا اہتمام کیا تھا جس کے ذریعے اس کے اندر موجود اس پیدائشی فن کو پنپنے کا موقع مل سکتا تھا۔ وہ خود اس کو آرٹ کے مقابلوں میں لے کر جاتی رہی تھیں اور انہوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ ایک عظیم آرٹسٹ بن سکتا تھا۔ وہ اپنے اسی راستے پر گامزن تھا جب اچانک اس پر ایک نئے شوق، ایک نئے جنون نے حملہ کیا تھا۔ وہ فلائنگ سیکھنے کے جنون میں مبتلا ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسے منع کرنے کی پوری کوشش کی مگر اس کے منع نہ ہونے پر اس کو وقتی جنون قرار دے کر نظر انداز کر دیا تھا اور یہ ہی ان کی غلطی تھی، ان سے بھول ہو گئی تھی، بہت بڑی بھول جس کے نتیجے میں وہ ایک مصنوعی سانس لیتے اس لمبے چوڑے وجود کے سرہانے بیٹھے، بیٹھے دن رات گے پھیر کو بھی فراموش کر چکی تھیں۔

☆☆☆

وہ ہفتہ واری تعطیل کا دن تھا، زوئی کا ارادہ اپنے چھوٹے سے فلیٹ کی مکمل صفائی کا تھا۔ اسی لیے وہ اس دن بھی روزانہ کی طرح صبح سویرے ہی جاگ گئی تھی۔ وہ خوش تھی کہ اس روز اس نے نسلی کے ساتھ نماز بھی پڑھ لی تھی۔ اس نے ٹوسٹ سینکے اور مزیدار آلیٹ بھی بنایا تھا۔ اسے فرصت اور اطمینان کے ساتھ ناشتا کرنے میں بھی اس روز خوب لطف آیا تھا۔ ناشتے کے بعد اس نے جھاڑ پونچھ کا کپڑا اور جالے اتارنے والا برش اٹھایا اور صفائی میں جُت گئی۔ دوپہر کے تقریباً بارہ بجے تک اس کا فلیٹ صاف ستھرا ہو کر چمک رہا تھا اور وہ خود گرد آلود ہو چکی تھی۔ وہ نہا کر کپڑے بدلنے کا ارادہ کر رہی تھی جب بیرونی گھنٹی بجی۔

”ارے، اس وقت کون آ گیا؟“ اس نے سوچا اور ہاتھ میں پکڑی چیزیں بچکن میں رکھ دیں۔ اس کا خیال تھا کہ قریب کے کسی فلیٹ میں رہنے والا کوئی بچہ شرارت سے گھنٹی بجلا کر جھاگ گیا ہوگا مگر دروازہ کھولنے پر غیر متوقع طور پر اسے نادر باہر کھڑا نظر آیا۔ وہ اس غیر متوقع آمد پر سخت حیران تھی۔ نادر کے ساتھ ایک تیس پینٹینس سالہ خاتون بھی تھیں۔

”مجھے افسوس ہے میں آمد سے پہلے تمہیں اطلاع نہیں دے سکا۔“ نادر نے اس کی حیرت پر محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا سیل فون یا تو بند ہے یا سائلنٹ پر ہے، کچھ مسئلہ ہے اس کے ساتھ۔“

”ارے، وہ تو میرے بیک ہی میں پڑا رہ گیا کل سے۔“ اس نے کہا اور سوالیہ نظروں سے اس کے ساتھ آئی خاتون کی طرف دیکھا۔

”اپنے دولت کدے کے اندر قدم رنج نہیں فرمانے دو گی کیا؟“ نادر نے پوچھا۔ زوئی کو اس کی بات قطعی پلے نہیں پڑی۔ نادر بے اختیار ہنس دیا۔ ”اندر آنے کو نہیں کہو گی، ویسے تم تو دعویٰ کرتی ہو کہ تمہیں تین زبانیں آتی ہیں۔“

”ارے آؤ، آؤ۔“ زوئی کو اپنی بے خیالی پر شرم محسوس ہوئی۔ ”پلیز آؤ ناں۔“ وہ ایک طرف ہنستے ہوئے بولی۔

وہ دونوں اندر آ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا لاؤنج تھا جس کو زوئی نے سادگی سے سجا رکھا تھا۔

”یہ میری آپا ہیں۔“ نادر آ کر بیٹھنے کے بعد نادر نے اس کا تعارف اپنے ساتھ آنے والی خاتون سے کرواتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک پرائیویٹ کالج میں ہسٹری کی لیکچرار ہیں، شادی شدہ ہیں اور ان کے تین بچے ہیں۔ آج میں نے انہیں پیشکش کی کہ آپ جو ہمیشہ ٹی وی پر چھوٹی آنکھوں اور سفید رنگت والی چائیز لڑکیوں کو دیکھ کر ہتی ہیں کہ یہ

کرتے ہوئے اس لفافے کو پھر سے بند کر دیا، اس کی طبیعت بھاری ہو رہی تھی، اس کے مزاج پر اداسی چھائی ہوئی تھی، اسے بی اماں کے گھر کی تنگسگی، وحشت اور ویرانی بھلائے نہیں بھول رہی تھی۔ وہ گھر جہاں صبح شام بی اماں سے قرآن پاک پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں کی تلاوت کی آوازیں آیا کرتی تھیں، وہاں اب چڑیوں کی چوں چوں کے علاوہ کوئی آواز نہیں آتی تھی۔

”جب ہم اس چار دیواری میں رہ رہے تھے تب بھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ یہ وقت گزر جانے کے بعد اس کی ویرانی کا عالم یہ ہوگا۔“ یہ بات اس نے کئی مرتبہ سوچی تھی اور ہر مرتبہ یہ بات سوچنے پر اس کا دل جیسے ڈوب، ڈوب جاتا تھا۔ اس کی اداسی میں مزید اضافہ ان خطوط، اس پرانے انداز تحریر، رکھ رکھاؤ اور محبت کے اظہار نے کیا تھا۔ وہ لوگ خواب ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ ہی ایسے رویے بھی خواب ہو چکے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا اور اپنا بچپن اور اس سے وابستہ لوگ فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے آ رہے تھے۔ جب ہی اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس کا ذرا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ یہ کال انینڈ کرے مگر پھر اس نے فون اٹھا لیا، یہ ٹکین کا فون تھا۔ اس نے بہت دن بعد اسے یاد کیا تھا۔ وہ دل میں ٹکین سے خفا تھا، اس نے ایک دو مرتبہ اس کے ساتھ بہت سرد رویہ برتا تھا، وہ اس کے گریز کی وجہ جاننے سے قاصر تھا مگر اس نے ٹکین سے رابطے اور ملاقات کم کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا، اسے شک گزرا تھا کہ شاید ٹکین اپنے سسرال والوں کی وجہ سے اس سے اجتناب برتنا چاہتی تھی جب ہی اس نے خود کوئی دن سے اس کے ساتھ رابطہ نہیں رکھا مگر اس وقت ٹکین نے خود اسے کال کی تھی۔

”تم کہاں غائب ہو گئے لاٹ صاحب، ہمیں بالکل ہی بھلا دیا۔“ اس کے فون آن کرنے پر وہ ہشاش بشاش آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”میں تو اشعر سے کہہ رہی تھی کہ اخبار میں تلاش گمشدہ کا اشتہار دے دیں، حمزہ خود آتا ہے نہ فون کرتا ہے، میں کروں تو اس کا فون بند ملتا ہے، لگتا ہے میرا کو تلاش کرتے کرتے خود بھی گم ہو گیا ہے۔“ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ ہمیشہ کی طرح خود ہی بولے چلے جا رہی تھی۔ ”کہاں گم تھے یہ بتاؤ؟“ پھر وہ ذرا رکتے ہوئے بولی۔

”میں نے کہاں جانا ہے یار، میں یہیں تھا فون بند تھا تو تم آفس کے نمبر پر فون کر لیتیں، دن کے وقت تو میں وہیں ہوتا ہوں۔“ اس نے نرمی سے جواب دیا تھا۔

”مگر تم نے خود کیوں فون نہیں کیا اتنے دن سے اور آئے بھی نہیں ہماری طرف۔“

”میں مصروف رہا بہت پچھلے دنوں شاید اس لیے۔“ اسے فوری طور پر یہی بہانہ سوچا تھا۔ ٹکین بال کی کھال اتارنے والوں میں سے تھی وہ اس کے سوالات سے ڈرتا تھا۔

”ابا کا فون آیا تھا وہ بھی تمہارا پوچھ رہے تھے۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ تم سیالکوٹ گئے یا نہیں، حمزہ تم کو سیالکوٹ جانا تھا؟“ اس کی توقع کے برعکس اس نے اس کے بہانے پر جرح نہیں کی۔

”ہاں.....“ وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

”ارے پاگل مجھے بھی ساتھ لے لینا تھا، میں بھی ہو آتی، ایک بار اپنے محلے اور پرانے گھر کو دیکھ آتی۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”تمہارا گھر تو اس محلے کے نقشے سے غائب ہی ہو گیا ٹکین۔“ حمزہ نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ”اس کی جگہ تو تمہارے گھر کے خریدار نے ایک شاندار تین منزلہ محل کھرا کر لیا ہے۔ اب تو گمان بھی نہیں گزرتا کہ یہاں وہ مختصر سا گھر بھی تھا جس میں ہم کھیلا کرتے تھے۔“

”تم یہاں کیوں رہنا چاہتی ہو، کیا تمہیں یہ جگہ اجنبی اور نامانوس نہیں لگتی؟“ آپا نے سوال کیا۔

”مجھے وہ جگہ اجنبی اور نامانوس لگتی ہے مگر اس سے بھی کیا ہوتا ہے، مجھے یہاں سے جانا ہی ہے اور میں نے اپنے ذہن اور دل کو اس کے لیے منا بھی لیا ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”تم جا کر پھر واپس آ جانا، کسی نئے پروجیکٹ کو جوائن کر لینا، یہ کچھ ایسا مشکل کام تو نہیں۔“ آپا نے کہا تھا اور زوئی کو ایسا لگا جیسے اپنی بہن کی اس بات پر نادر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”جب واپس آ کر تم شہریت کے لیے درخواست دو گی تو ممکن ہے وہ قبول ہو جائے شاید ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آ جائے کہ یہ لڑکی بار بار یہاں ہی آتی ہے۔ اس کو اس ملک سے پیار ہو گیا ہے اس لیے یہ یہاں رہنا چاہتی ہے۔“ نادر کے چہرے کی حیرت اپنی بہن کی باتیں سن کر بڑھتی جا رہی تھی۔

”اچھا زوئی، اب ہم چلتے ہیں، تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“ پھر اس کی آپا ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں زوئی اس اچانک آمد اور اچانک واپسی پر بہت حیران تھی۔

☆☆☆

”وقت بہت بڑا امتحان لیتا ہے انسان کا، فاطمہ بڑھاپے کا یہ زمانہ ہے اور مجھے نئے سرے سے ایک ذمے داری اٹھانا پڑ گئی ہے۔ میرے لیے خصوصی دعا کرنا، خدا مجھے اس ذمے داری کو پورا کرنے کی توفیق دے، بچیوں کی تربیت مشکل کام ہے اور اس سلسلے میں میرا تجربہ ہے ہی نہیں۔ اس لیے یہ کام زیادہ مشکل نظر آتا ہے۔ میرے لیے دعا کرو، میرے لیے دعا کرو۔“ حمزہ نے اس پیلے شکستہ کاغذ پر لکھے ہوئے مٹے الفاظ پڑھے۔ یہ خط رابعہ کلثوم نے بی اماں کے نام لکھا تھا۔ تاریخ اور القاب و آداب کے علاوہ خط کے بہت سے مندرجات پھٹ چکے تھے اور درمیان کا ایک ٹکڑا رہ گیا تھا، یہ ٹکڑا حمزہ کو ان کا مذاکرات میں سے ملا تھا جو اس نے اس مرتبہ سیالکوٹ والے گھر سے اٹھائے تھے۔

”انسان کا بڑھاپا کیسا ہوتا ہے، یہ مجھے اب سمجھ میں آیا ہے۔“ ایک اور شکستہ کاغذ پر لکھا تھا۔ ”قویٰ کمزور اور حواس پر قابو رکھنا مشکل ہونے لگتا ہے مگر میں خود کو یقین دلانے میں مصروف رہتی ہوں کہ میں ابھی بوڑھی نہیں ہو رہی کیونکہ مجھے زندگی میں ابھی بہت سے کام کرنے ہیں، میرا ال کی زندگی اور اس کا مستقبل بنانا ہے، یہ کام مضبوط اعصاب اور جوانوں کی سی ہمت کے ساتھ ہی ہوگا۔ میرے لیے دعا کرنا۔“

حمزہ نے ایک پرانے لفافے میں موجود تیسرا خط نکالا۔

”بعد سلام کے عرض ہے کہ پچھلی مرتبہ میری سیالکوٹ آمد پر جو وعدے وعید بچوں کے متعلق ہوئے تھے ان کو گرہ سے باندھ کر رکھنا۔ تمہارے لیے تو وقت آنے پر بہت لوگ ہوں گے جن میں سے انتخاب کر سکو گی مگر میں تنہا ہوں اور ڈری ہوئی ہوں، خدا کے بعد میرا صرف سہمی آسرا ہو، میں امید کے ساتھ آنکھ اٹھاتی ہوں تو صرف تم پر ہی جا پڑتی ہے اور تم سے آگے کہیں اور نہیں۔ دیکھو میرا دل آس باندھ کر آیا ہے، حمزہ کی ماں شاید اس بات کو پسند نہ کرے کیا ہی اچھا ہو جو تم کسی کے کان میں ڈال دو تا کہ سندور ہے اگر تم ایسا کر سکو تو مجھ سے بڑھ کر خوش کوئی نہ ہوگا۔“

اس خط میں اپنا تذکرہ بڑھ کر حمزہ چویک گیا تھا۔ یہ ذکر کیوں اور کس سلسلے میں تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بی اماں نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو رابعہ آنٹی سے کسی وعدے وعید کی طرف اشارہ کرتی۔ ایسا کون سا وعدہ تھا جو امی کو ناپسند ہو سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگا اور پھر اس نے باقی کے کاغذات پھر کبھی دیکھنے کا ارادہ

ایسا بھی ہوتا ہے



26 جون 2009ء کو ہماری شادی ہوئی۔ شادی کے شروع کے دن بڑے یادگار ہوتے ہیں۔ ہر شے محبت کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے اور بات بے بات لبوں پر سکان آجاتی ہے۔ رومانس کا ذکر ہو اور ساون کا موسم نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ ہماری شادی کے ایک مہینے بعد برسات کا آغاز ہوا۔ شادی کے بعد جب پہلے دن آفس میں ری جوائننگ دی (واضح رہے کہ شادی سے پہلے ہم کو کنگ میگزین میں سب ایڈیٹر تھے) تو خوب تیار ہو کر میاں کا من پسند جوڑا پہن کر سہانے موسم کو انجوائے کرنے کے خیال سے بائیک پر سوار ہو کر گنگنا تے ہوئے، شوخ ہواؤں کے سنگ سفر کا آغاز کیا تو راستے میں بوند باندی ہو گئی۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ واہ، واہ کیا رومینک سین ہے ساون اور ساجن سنگ سنگ..... مگر پھر یوں ہوا کہ آفس تک پہنچتے پہنچتے برسات تیز ہو گئی۔ آفس پہنچتے تو پتا چلا کہ موسم کے خطرناک تیوروں کے باعث خواتین اسٹاف کو چھٹی دے دی گئی۔ اب جو واپسی کا سفر شروع ہوا تو مت پوچھیے..... وہ ساون جسے خوب صورت یاد کا نام دینے والے تھے۔ اب یاد کر کے جھر جھری بھی لیتے ہیں اور ہنستے بھی ہیں کیونکہ کراچی کی سڑکوں پر جمع ہونے والے پانی نے آدھے گھنٹے کا سفر تین گھنٹے میں مکمل کروایا اور جو اپنے نئے سوٹ کی طرف دیکھا تو آنکھیں چھلک آئیں کچڑ اور گندے پانی کی چھینٹوں سے سارا سوٹ داغدار ہو کر رنگ بھی چھوڑ چکا تھا اور میاں جی، جن کے سنگ ہم نے ڈوٹ گاتے ہوئے، گرم گرم کچوریاں کھانے کا پروگرام بنایا تھا، منہ پھلا کر بولے۔ ”اور نکلو۔ بارش میں، سہانے موسم کے مزے لینے۔“ سو ایسا بھی ہوتا ہے۔

مرسلہ..... سویرا فلک، کراچی

پوچھ رہے تھے۔

”مگر صوفی صاحب میرا بیٹا موت اور زندگی کی کشمکش میں پڑا ہے، میں اس زندہ لاش کو دیکھتی ہوں تو خود بھی دن میں ہزار مرتبہ مرنے ہوں۔ خدا را کچھ ایسی دعا فرمائیں کہ میرا بیٹا جی اٹھے، میں اسے چلتا پھرتا، ہنستا مسکراتا دیکھ سکوں، صوفی صاحب مجھ سے یہ مزید برداشت نہیں ہوتا۔“ وہ ان کی بات سمجھ کر بھی نہیں سمجھ پارہی تھیں اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے وہی بات دوبارہ کر رہی تھیں جس سے انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

”میں تمہارے دکھ کو سمجھتا ہوں بیٹی، میں دانیال کے لیے دعا کرتا ہوں۔ بہت زیادہ کرتا ہوں مگر جو بات تمہاری اپنی دعا میں ہے وہ کسی اور کی دعا میں نہیں۔“ صوفی صاحب نکل سے بات کر رہے تھے۔

”اگر مجھ گناہ گار کی دعائیں قبول ہو سکتی ہوتیں تو اب تک میرا بیٹا اٹھ کر کھڑا ہو چکا ہوتا، صوفی صاحب، میں جانتی ہوں کہ مجھ گناہ گار کی دعا عرش تک پہنچتے پہنچتے ایک لمبا عرصہ لگائے گی اور پھر بھی اسے قبولیت کا شرف ملے نہ ملے، کون جانتا ہے۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔

”غلط بات مت کرو بیٹی، اپنے جذبات کو قابو میں رکھو۔“ صوفی صاحب نے اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم سب ایک خدا کے بندے ہیں، گناہ گار اور بے گناہ دعا کی قبولیت کسی کے ساتھ مشروط نہیں۔ یہ سب انسان کی پکار پر، اس کے خدا پر یقین پر، اس کے دل کی تڑپ پر منحصر ہے، تم جتنی رقت اور عاجزی کے ساتھ اسے پکارو گی اتنی ہی جلدی وہ تمہاری پکار کی طرف متوجہ ہوگا۔ توبہ اور استغفار کا در ہر وقت کھلا ہے ہم سب کو اپنے احتساب کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے، ہمیں چاہیے کہ اپنے عمل پر ضمیر کا پھرے دار بٹھائے رکھیں جو بھول چوک کی نشاندہی کرتا رہے لیکن میری بچی انسان کی فطرت میں ہے بھول چوک اور غفلت سوا اگر تمہیں

”اوہ.....“ نگین کو بھی یقیناً ایک فطری دھکا لگا تھا۔ ”اور بی اماں کا گھر؟“ اس نے غوری سوال کیا۔

”وہ موجود ہے، بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن بنا۔“

”اس کے متعلق کوئی فیصلہ کر کیوں نہیں لیا جاتا حمزہ، یوں تو ایک دن وہ گر جائے گا۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”گر جانے دو، ہمارا اس پر کیا بس، یہ تو ماموؤں کی صوابدید پر ہے، اس کے متعلق کیا فیصلہ کرتے ہیں، ممکن ہے وہ اس کا ملبہ بیچنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہوں۔“

”تم اب اسے بات کرو، انہیں بتاؤ کہ وہاں کیا حال ہے، وہ اور چھوٹے چچا اس کا کچھ کر لیں، بی اماں کی روح کس قدر تڑپتی ہوگی ناں حمزہ اس گھر کی ویرانی اور زبوں حالی پر۔“

”میں انہیں بتا بھی دوں گا نگین تو وہ کچھ نہیں کریں گے، وہ دینی اور امریکا میں مزے کر رہے ہیں ایک پرانی، شکستہ اور قریب الحاق تہ عمارت میں انہیں کوئی دلچسپی ہو نہیں سکتی۔ انہیں چاہیے کہ اسے بھی بیچ دیں۔ انہوں نے تو کبھی وہاں جانا ہے نہ اس کا حال سنوارنا ہے، انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کے ماں باپ کی قبروں کا کیا حال ہے۔ نانا جی کی قبر تو بی اماں نے پختہ کروائی تھی مگر بی اماں کی قبر اسی طرح بیچی ہے اور خراب ہو رہی ہے۔ خیر وہ تو میری ذمے داری رہی، اس کو میں ٹھیک کروالوں گا، ہاں گھر کے سلسلے میں میرا کوئی اختیار نہیں، صرف ماموں ہی اس کا کچھ کر سکتے ہیں۔“ حمزہ کو احساس ہو رہا تھا کہ اس کا لہجہ تلخ تھا مگر وہ اس نئی پر قابو نہیں کر پا رہا تھا۔

”تم اب اسے بات کرو آج ہی۔“ نگین کے لہجے میں دکھ تھا اور غصہ بھی۔ ”انہیں یہ کام فوراً کرنا چاہیے ورنہ بی اماں کی ناراضی ہم سب کے لیے عتاب بن جائے گی۔“

”میں تو انہیں بتا دوں گا مگر کرنا انہوں نے وہی ہے جو ان کا من چاہے گا، اتنے سالوں میں اس بات کا پتا نہ جانے انہوں نے کتنی مرتبہ لگوا یا ہے کہ گھر کا کیا حال ہے اور اس کی مرمت پر کتنا پیسہ لگے گا مگر آج تک کوئی عملی کام ہوا نہیں۔“ حمزہ نے نئی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ ایسا بھی وہ غلط کر رہا تھا مگر اس نے سوچا تھا کہ وہ نگین سے معذرت کر لے گا۔

☆☆☆

”دعا دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے، اس کے آگے سب دوائیں، سب ڈاکٹر، سب تدبیریں ہیچ ہیں اور ماں کے دل سے نکلی دعا واہ کیا کہنے۔ ماں کے دل سے نکلی دعا تو سینے سے نکل کر سیدھی عرش پر جا پہنچتی ہے۔ اس کی باری لگتی ہے نہ نمبر لگتا ہے، بس ادھر نکلی ادھر پہنچی۔ یوں جیسے قطار میں اپنی باری کے انتظار میں کھڑے لوگوں کو کوئی دھکا دے کر آگے نکل جائے۔ سو میری بیٹی یاد رکھنا، سب تدبیریں اپنی جگہ جو دعا تمہارے دل سے نکلتی ہے بیٹے کے لیے اس کی برابری کوئی چیز نہیں کر سکتی۔“ صوفی محمد عنایت صاحب نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”میں ان لوگوں میں سے ہوں صوفی صاحب جو غفلت میں پڑے رہتے ہیں، جن کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھنا بھول جاتے ہیں، میں بہت گناہ گار ہوں۔ کیا گناہ گاروں کی دعائیں قبول ہو جاتی ہیں؟“ ان کی آنکھوں میں آنسو اور آواز میں لرزش تھی۔

”تم خوش قسمت ہو بیٹی جو غفلت سے اٹھالی گئی ہو۔ کبھی ان کا تصور کیا جو تمام عمر غفلت میں پڑے رہتے ہیں جنہیں کوئی دھکا لگتا ہے نہ ٹھوکر اور پھر وہ یونہی اس دنیا سے چلے جاتے ہیں، تم بتاؤ وہ اچھے ہیں یا پھر تم! وہ

”یہ خدا کے بندوں کا وصف ہے بیٹی، اسے فیض کہتے ہیں، ہمارے جیسی خلق خدا کو یہ خود بخود پہنچتا ہے، اس خوشبو کو سونگھتے سونگھتے ہم جیسے خود بخود مرکز تک پہنچ جاتے ہیں، صوفی صاحب کے بہت سے معتقد آزاد کشمیر میں رہتے ہیں، صوفی صاحب یہاں سے اپنے پیاروں کے پاس جاتے رہتے ہیں، اس مرتبہ مجھے خود صوفی صاحب سے بہت سی باتیں کرنی تھیں اس لیے میں ان کی وہاں آمد کا انتظار کیے بغیر خود یہاں پہنچ گئی، تم بتاؤ تمہیں صوفی صاحب کے بارے میں کس نے بتایا، تم کیسے ان تک پہنچیں؟“

”مجھے اسپتال میں موجود ایک صاحب نے ان کے بارے میں بتایا، میں پیروں فقیروں کے پاس جانے کو ضعیف الاعتقادی کہا کرتی تھی مگر ان صاحب نے کہا کہ جیسے ذہنی بیماریوں کے مریضوں کی کونسلنگ کے لیے لوگ سائیکاٹرسٹ کے پاس جاتے ہیں ویسے ہی روحانی بیماریوں میں مبتلا لوگ اپنی کونسلنگ کے لیے صوفی صاحب جیسے لوگوں کے پاس جاتے ہیں۔ یہ کوئی روایتی پیر نہیں جو معجزے کر دکھانے کے دعوے کرتے ہیں۔“ انہوں نے کہا۔

”پھر تم نے صوفی صاحب کو کیسا پایا؟“ خاتون نے پوچھا۔

”میں کونسلنگ کے عمل سے گزر رہی ہوں، شاید مجھے سکون مل جائے۔“

”ضرور ملے گا، میری بیٹی اور یہ جو دانیال کے لیے صوفی صاحب بتا رہے ہیں کہ تمہاری اپنی دعا، تمہاری اپنی پکار سب سے بڑی تدبیر ہے تو اسے آزما کر دیکھ لو، صوفی صاحب کبھی غیر حقیقی بات نہیں کرتے۔“ خاتون کے کچھ میں اتنی اپنائیت تھی کہ وہ ان سے دل کی بات کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں جھجکتی، وہ بہت انا پسند مشہور تھیں۔ کسی اجنبی سے زیادہ بات نہیں کرتی تھیں مگر اس روز ان کا دل چاہ رہا تھا کہ ان خاتون سے باتیں کرتی ہی چلی جائیں، وہ جو واپسی کے لیے بے چین تھیں ان سے یوں مچو گفتگو ہوئیں کہ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اس شام صوفی صاحب کے پاس سے واپسی پر ہر نماز کے بعد پڑھنے کے لیے ورد اور آزاد کشمیر سے آئی خاتون کا نام پتا اور ٹیلی فون نمبر ان کے پرس میں موجود تھے۔

☆☆☆

”ہماری قومی تاریخ کا ہمیشہ سے یہ السہ رہا ہے کہ جب کوئی شخص روایتی سیاست سے ہٹ کر حقیقت پسندانہ سوچ اختیار کرے اور اپنے لوگوں کے لیے واقعی کچھ کرنا چاہے اسے کبھی قبول نہیں کیا جاتا۔ وہ انجیل شمسٹ کا معتب بن جاتا ہے اس کے گرد ایسا گھیرا نگ کر دیا جاتا ہے کہ اس کا حقہ پانی ہی بند ہو جائے۔ وہ منظر سے جب تک بالکل غائب نہ ہو جائے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا جاتا مگر آج کے آزاد میڈیا سے ہم یہ امید کرتے ہیں کہ اب کی بار ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا۔ جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ ہی پیش کیا جائے گا۔ حلقے کے دوئرز کی رہنمائی کی جائے گی کہ ان کے لیے کیا بہتر ہے، فیصلہ کرنے کی صلاحیت بہتر بنانے میں ان کی مدد کی جائے گی۔“ نیشنل رئیس ایک مختصر پریس کانفرنس میں بول رہی تھی۔ ضمنی انتخابات میں صرف دو ہفتے رہ گئے تھے اور انتخابی مہم اپنے عروج پر تھی۔ نیشنل رئیس کے انتخاب کے بعد مہر زاد خان کی میڈیا مہم بہت بہتر اور میچور ہو چکی تھی۔ اس کے پاس پہلے سے ہی دو مثبت پوائنٹ موجود تھے۔ ایک تو یہ اس کی آبائی سیٹ تھی دوسرا وہ ایک شہید کا بیٹا تھا۔ مخالف پارٹی نے اگرچہ اس بار اپنی سیاست کا انداز بدل لیا تھا مگر مہر زاد خان کے یہ دو مثبت پوائنٹ اس مرتبہ کسی حد تک اسے انتخاب جتوانے کے لیے کافی تھے۔

”تم اتنی پُرکشش تنخواہ لے رہی ہو یا۔ تم نے بہت عظیمندی کا ثبوت دیا۔“ تابندہ نے اسی روز نیشنل سے

ٹھوکر لگی ہے تو جاگ جاؤ، استغفار اور توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اسے پکارو، دل سے پکارو، تڑپ اور عاجزی کے ساتھ پکارو، وہ تمہاری سنے گا، ضرور سنے گا۔“

”صوفی صاحب ٹھیک کہتے ہیں بیٹی۔“ وہ بے آواز شک بہائے چلی جا رہی تھیں جب اسی کمرے میں موجود ایک اور خاتون نے ان کو مخاطب کیا۔ انہوں نے چونک کر اپنے ارد گرد دیکھا۔ وہی کمر تھا، وہی سیٹنگ تھی مگر صوفی صاحب اپنی مخصوص جگہ پر موجود نہیں تھے۔ وہ نہ جانے کتنی دیر سے وہاں بیٹھی تھیں، چونکنے کے بعد انہیں پہلا خیال دانیال کا آیا۔ وہ اتنی دیر تک ان کے بغیر رہا ہوگا وہ تو بار بار اس کا ماتھا چومتیں اور اس کے بال ٹھیک کرتی تھیں، اس کے چہرے کو چھو کر اس کے لمس کو محسوس کرتی تھیں، آج وہ اتنی دیر ان کے لمس کے بغیر رہا ہوگا، اس کا وقت کیسا گزرا ہوگا، کہیں خدا نخواستہ اس کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہوگئی ہو، وہ مزید چونک گئیں۔ وہ فوراً وہاں سے نکل جانا چاہتی تھیں مگر خاتون نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بٹھالیا۔

”صوفی صاحب نماز پڑھنے کے لیے گئے ہیں بیٹی، وہ کہہ کر گئے ہیں کہ ان کے واپس آنے تک تم یہیں بیٹھو گی۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔

”مجھے دیر ہوگئی، میرا بیٹا میرا انتظار کر رہا ہوگا۔“ وہ ہاتھ چھڑا کر انہیں۔

”بیٹھ جاؤ بیٹی۔“ انہوں نے دوبارہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔ ”کوئی دعا، کوئی ورد، کوئی وظیفہ تمہیں ایسا ضرور مل جائے گا جو تمہارے دل کو سکون پہنچائے گا، تمہیں چین اور سکون ملے گا، باقی جو تقدیر میں لکھا ہے وہ تو لکھا جا چکا ہے، یہ سب جو ہم کرتے پھرتے ہیں یہ تو صرف ہمارے جینے کے بہانے ہیں، خود کو تسلی دینے کے ذریعے ہیں، تمہارے ساتھ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بڑا حادثہ ہو چکا ہے مگر بیٹی یہ حادثے اور سانحے ہی تو خدا کی خدائی کے عکاس ہیں۔ یہ نہ ہوں تو ہم تو خدا کو بالکل ہی بھول جائیں۔“

”ہم خدا کو بالکل ہی بھول جاتے ہیں۔“ انہوں نے روتے ہوئے کہا۔ خاتون نے کسی ماں کی طرح انہیں سنے سے لگایا۔ اپنے ساتھ بیٹھی بچی کو ان کے لیے پانی لانے کو کہا اور دھیرے دھیرے ان کی پشت سہلانے لگیں۔

”مجھے بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟“ وہ پوچھ رہی تھیں۔ انہوں نے ہچکیوں کے درمیان اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔

”اولاد کی چوٹ بہت سخت لگتی ہے۔“ ان کی بات سن کر خاتون نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں خود بھی یہ چوٹ کھائے ہوئے ہوں۔ میرا جوان بیٹا بھی ایک حادثے میں مر گیا تھا۔“

”میرا بیٹا زندہ ہے۔“ انہوں نے فوراً کہا۔

”خدا اسے زندگی اور صحت عطا فرمائے، میں تم کو اولاد کی چوٹ کے بارے میں بتا رہی تھی، میں بھی ایسے ہی دکھی ہوگئی تھی مگر پھر صوفی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ صبر کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں، مجھے ہمت اور حوصلے سے کام لینا ہوگا، صوفی صاحب کی زبان میں ان کی بات میں بہت اثر ہے۔ میں نے ان کی بات پلے سے پاندھ لی اور اب تک اسی ہمت کے بل پر جی رہی ہوں جو صوفی صاحب کے کہنے پر باندھی تھی۔“ خاتون بتا رہی تھیں۔ ”میں آزاد کشمیر سے یہاں آئی ہوں، صوفی صاحب سے ملنے کے لیے۔“

”اتنی دور سے۔“ وہ ذرا سنبھلتے ہوئے بولیں۔ ”کیا صوفی صاحب کی شہرت اتنی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے؟“

کا اپنے محلے اور طبقے کی دوسری لڑکیوں سے انتہائی مختلف ہونا کچھ زیادہ پسند نہیں تھا اور اب تو وہ دیکھ رہی تھیں کہ بینش روز بروز بہت پالٹی جا رہی تھی۔ انہیں اس بات پر بھی تشویش تھی کہ وہ اسکول کالج کے روایتی وقت کی نسبت دیر سے گھر آتی تھی۔ اس تشویش کا اظہار انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں سے بھی کیا تھا اور ان کو اس وقت سخت مایوسی ہوئی جب دونوں نے ہی ان کی بات کو ہنسی میں ٹال دیا۔

”چھوڑا ماں، یہ بھی کوئی مسئلہ ہے جس پر پریشان ہوا جائے۔ بینش کوئی عام سابی اے، ایف اے نہیں کر رہی، وہ اعلیٰ ڈگری کے لیے پڑھائی کر رہی ہے اور اس میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔ ہم سارا دن اپنی دکان پر بیٹھے اعلیٰ پڑھائی کرنے والی لڑکیوں کی آنیاں جانیں دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ ساری ہی دیر سے آتی ہیں، تھکی ہاری، لنگی ہوئی، ماہی کو دیکھیں تو یہ بھی ایسی ہی تھکی ہاری معلوم ہوتی ہے۔ تو نے ساری عمر ماں گھر سنبھالتے اور کھائے پکاتے کھاتے گزار دی۔ تجھے کیا پتا، کتنی محنت والی پڑھائی ہوتی ہے یہ۔“

”کیا فائدہ ایسی پڑھائی کا، پیچھے سے گھر سنبھالنا اور پکانے کھانے ہی ہیں ناں۔“ اماں نے کمزور سا احتجاج کیا۔

”اس کا شوق ہے اماں، اس کا ہر شوق پورا کریں گے۔“ بڑے بیٹے نے پیار سے کہا۔ ”پہلے تو ہمیں توفیق نہیں تھی مگر اب تو ہم اس کے سارے شوق پورے کر سکتے ہیں ناں۔“ اماں کو بھائیوں کے بہن سے اس پیار پر فخر محسوس ہوا مگر وہ دل میں اس بات سے خوفزدہ تھیں کہ بینش کی عادتیں اور شوق اپنی ان ہم عمر لڑکیوں سے جو اسی محلے میں رہتی تھیں بہت زیادہ بدل چکے تھے۔

”آج میں نے سری پائے پکائے ہیں، بڑے مزیدار، ماہی آ کھالے گرم گرم۔“ وہ کبھی کبھی بہت پیار سے کہتیں تو بینش انکار کر دیتی۔

”اماں سری پاپوں میں بہت زیادہ کیلوریز ہوتی ہیں، کولیسترول لیول بھی بڑھا دیتے ہیں یہ، مجھے دوپہر والا سالن دے دیں گو بھی آلوکا۔“

”ہاہائے، نہ تو نے اس روز ہر لیے کو ہاتھ لگایا تھا نہ چنوں، پوری حلوے کو، تیرے بھائی اتنے شوق سے لائے تھے اس دن بھی سوکھے مارے تو س کھا کر ناشتا کیا تھا، تیرا دماغ تو نہیں پھر گیا ماہی۔“ وہ اپنے پسندیدہ دسترخوان پر کھانا رہ جانے پر بھڑک اٹھتیں۔

”اماں، ہلکی اور جلد ہضم ہو جانے والی خوراک کھانے کی عادت ڈالیں آپ بھی۔ یہ خالص کشمیریوں والے کھائے کھا کھا کر اپنی ہی صحت سے دشمنی کر رہی ہیں ہاں!“ بینش نرمی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتی مگر یہ تبدیلی اور یہ گریز انہیں ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔ ان کا یہ خیال روز بروز مضبوط ہوتا جا رہا تھا کہ پڑھنے کے لیے اجازت دے کر انہوں نے اچھی بھلی لڑکی ہاتھ سے گنوا لی تھی۔

☆☆☆

شہباز صاحب کی بیوی ناصرہ اپنے مہیاں کے چہرے سے عیاں پریشانی کے آثار کو بھانپ رہی تھی مگر اس کی کچھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ اس پریشانی کے پیچھے کیا راز تھا۔

”میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں شہباز صاحب اور میری سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آتیں مگر پھر بھی کچھ تو بتائیں، دفتر میں پریشانی ہو گئی ہے کیا، حساب کتاب تو ٹھیک ہے ناں دفتر کا؟“ ناصرہ نے کوئی تیسری مرتبہ شہباز صاحب سے پوچھنے کی کوشش کی تھی۔

کہا تھا۔

”یہ وقت پیسہ بنانے کا ہے ڈارلنگ۔“یشل نے اپنے بکھرے بال سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔ ”اپنی تعلیم، اپنے ہنر، اپنے پیشے کو پیسہ بنانے کی مشین بنانے کا وقت ہے۔ جب ان لوگوں کو ہماری ضرورت ہے تو کیوں نہ ہم اس ضرورت کو پوری کرنے کے دام کھرے کریں۔ تم میڈیا کی طاقت کا اندازہ کرو کہ یہ لوگ میڈیا اینڈ وائزر کو پریس سیکریٹریز کو منہ مانگے پیسے دے رہے ہیں، جب ایسا ہے تو ہم کیوں نہیں، ہم اپنے ہنر کا اپنی محنت کا معاوضہ لیتے ہیں۔ دن رات جان کھپانی پڑتی ہے، پریس کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان لوگوں کے تھکے، کھٹے، میٹھے کٹیلے ہر طرح کے سوالوں کا جواب دینا پڑتا ہے۔ پرنٹ میڈیا میں ان کے حق میں مضمون لکھنے پڑتے ہیں اور جو شخص اتنا کام کرے اسے منہ مانگا معاوضہ مانگنے کا حق بھی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ لفظوں سے بُت گری کرتے ہو، امیج بلڈنگ دراصل بت گری کا دوسرا نام ہی تو ہے۔“ تابندہ ہنسی تھی۔ ”مگر یار بندہ بہت ڈشنگ ہے اور اسے معلوم ہے کہ ڈشنگ نظر کیسے آیا جاسکتا ہے۔ اسے دوسروں کو متاثر کرنے کا فن آتا ہے، میں تو سمجھو مسیمر انرز ہو گئی ہوں جس دن پہلی مرتبہ اسے قریب سے دیکھا۔“

”ہاں یہ مختلف ہے۔“یشل نے اعتراف کیا۔ ”پہلے پہل میرا یہ خیال تھا کہ یہ بھی یہاں کے ان سرداروں میں سے ہوگا جو ڈھری شخصیتوں کے حامل ہوتے ہیں، مہذب دنیا کے سامنے اوڑا اپنے علاقے میں اور مگر میں نے اسے یہاں بھی دیکھا ہے اور وہاں بھی، یہ ایک جیسا رہتا ہے، نرم گفتار، سنجیدہ اور نرسکون۔ میں نے پہلی مرتبہ کسی سردار کو اپنے لوگوں کے ساتھ یوں کھلتے ملتے دیکھا ہے جیسے وہ انہی میں سے ہو۔ میں نے پہلی مرتبہ لوگوں کے مسائل کو سنجیدگی سے سنے جاتے اور حل ہوتے دیکھا ہے اور یہ کام کرنے کے لیے اسے کسی وقت، کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا مگر تابندہ مجھے ڈر ہے کہ ایسے شخص کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہاں منظر میں رہنے کے لیے تاوان ادا کرنے کی روایت پڑ چکی ہے اور یہ شخص ایسا کوئی تاوان بھرنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا۔ ایسے مست اور بے نیاز لوگوں کو ماضی کا قصہ بنا دیا جاتا ہے۔ مجھے اس کا مستقبل روشن نظر نہیں آتا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا، کیا یہ الیکشن ہار جائے گا؟“ تابندہ نے چونک کر پوچھا تھا۔

”نہیں۔“یشل نے سر ہلایا۔ ”الیکشن میں یہ آسانی سے جیت جائے گا لیکن اگر یہ یونہی بے نیازی برتا رہا، چوگے کھانے والوں کو چوگانہ دیتا رہا اور اپنے کام سے کام رکھنے کی پالیسی پر قائم رہا تو یہ اس کا پہلا اور آخری الیکشن ثابت ہوگا۔ اس مرتبہ کے بعد یہ منظر سے ہٹا دیا جائے گا۔“

”میری عقل میں تو اتنی بڑی، بڑی باتیں نہیں آتیں۔“ تابندہ نے سر ہلایا۔ ”مگر میں اس کے لیے ہمیشہ نیک خواہش اور اچھی دعا ہی کروں گی، مجھے اس نے خاصا متاثر کیا ہے۔“

یشل کی ذاتی رائے یہ تھی کہ یہ الیکشن مہر زاد خان کے لیے بہت آسان ثابت ہوگا۔ وہ کیا سب اخبار چینل اور تجزیہ نگاروں کی یہی رائے تھی اور یہ رائے اس وقت تک مکمل طور پر قائم تھی جب تک بولڈ اینڈ سیرین سردار مہر زاد خان کے متعلق وہ اسکیڈل سامنے نہیں آ گیا جس کو سن کر یشل رئیس کو بہت دیر تک اپنے کانوں، یقین نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

بینش کی اماں لوئر میڈل کلاس طبقے کی روایتی ماں تھیں۔ وہ خود پڑھی لکھی نہیں تھیں مگر انہیں اپنی بیٹی پر فخر تھا کہ وہ نہ صرف پڑھ رہی تھی بلکہ ایسی پڑھائی کر رہی تھی جو عام قسم کی تعلیم سے مختلف تھی مگر حقیقت میں انہیں بینش

اور وہ اس کے اس گروپ میں بھی شامل تھی جو ان لوگوں کو پروموٹ کرتا تھا جو بہت اچھے آرٹسٹ تھے مگر وسائل نہ ہونے کی وجہ سے پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے سے قاصر تھے۔ دانیال کی کمپنی میں ٹرین بہت خوش رہتی تھی، اسے وہ منفرد اور اچھا لگتا تھا اور اسے اس بات پر فخر بھی محسوس ہوتا تھا لیکن کچھ دنوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ دانیال پر پولیس کی بینش کو کمپنی دینے لگا تھا اسے یہ تبدیلی قطعی اچھی نہیں لگی۔ بینش جیسی لڑکی کو اتنی اہمیت دینا اسے اپنی ہنگامہ محسوس ہو رہی تھی اور اس روز اس نے اپنی خلش کا اظہار دانیال کے سامنے کر بھی دیا تھا۔

”تم غلط سوچ رہی ہو ٹرین، بینش جیسی لڑکیاں عام اور غیر اہم نہیں ہوتیں۔ وہ بہت کم کم نظر آتی ہیں اور بہت کچھ کر دکھانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ میں نے صرف اسے Spot کیا ہے۔ باقی اس کی رہنمائی اور مدد میرا خیال ہے کہ ہم سب کا فرض ہے۔“ دانیال نے بہت سکون کے ساتھ جواب دیا۔

”یہاں اور بھی بہت سے باصلاحیت اور محنتی لوگ ہیں جن کی ہم مدد کر رہے ہیں پھر یہ خصوصی عنایت بینش پر ہی کیوں؟“ ٹرین کے دل نے سخت جلن محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”تم ٹیکل ویمینش جیسی کاشکار ہو رہی ہو ٹرین!“ دانیال نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں کون سا ایسا راجا اندر ہوں جس کی دوستی پر کسی کو چھین محسوس ہو، میں تو سب کا دوست ہوں، میری نیچر سے سب سے زیادہ تم ہی واقف ہو لیکن تمہارے اس رد عمل سے مجھے حقیقی معنوں میں دکھ سا محسوس ہو رہا ہے۔“

”تم جو بھی سمجھو۔“ اس نے پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک اتنی جونیئر اسٹوڈنٹ سے تمہارا یہ التفات، مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی۔“

”تم یہ سمجھو کہ وہ مختلف لگتی ہے اور یقیناً اچھی بھی لگتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے شعبے میں نام بھی کمائے اور عزت بھی۔ میں اس کی ہر ممکن مدد کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں اور یقیناً کروں گا بھی، اس سے میری اور تمہاری دوستی میں میرا خیال ہے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ دانیال نے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”مجھے دوستی کے معاملے میں تمہاری چوائس پر حیرت ہے اور افسوس بھی۔“ ٹرین نے غصے سے کہا۔

”میں نہیں سمجھتی کہ اس بے چارے سے بیک گراؤنڈ کی لڑکی تمہاری کسی مدد کے ساتھ کہیں جا پہنچے گی۔“

”چلو تم کچھ بھی کہو، میں اپنی سی کوشش ضرور کروں گا بلکہ چاہوں گا کہ تم بھی میرے ساتھ مل کر اس کی رہنمائی کرو، اس کی مدد کرو، یہ نیکی کا کام ہے۔“ دانیال نے اسی سکون کے ساتھ کہا۔

”مجھے اس قسم کی نیکیاں کرنے کا کوئی شوق نہیں۔“ ٹرین نے اپنے چہرے سے ناراضی کا تاثر چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

”لیکن تم ہمارے گروپ کی ایکٹوئیز میں شامل رہتی ہو، وہ بھی تو نیکی کے کام ہیں۔“ دانیال نے پوچھا۔

”وہ اور بات ہے، وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اخراجات کے متحمل نہیں ہوتے، یہ لڑکی انورڈ کرتی ہے، مہرٹ پر آتی ہے اور بہترین اساتذہ سے تعلیم حاصل کر رہی ہے اس کی رہنمائی کی کیا ضرورت ہے ہمیں۔“

”چلو میں برا نہیں مناؤں گا تم اگر نہیں پسند کرتیں تو تم بے شک اس سلسلے میں میری مدد نہ کرو لیکن پلیز اپنا مؤثر ٹھیک رکھو تم ایک بڑی آرٹسٹ ہو، آرٹ کو سمجھتی ہو اور جو شخص آرٹ کو سمجھتا ہے وہ بہت حساس ہوتا ہے۔ اس بڑی خوبی کو اپنا اثاثہ سمجھو اور ایک بالکل بے ضروری بات کا برا متا کر اس اثاثے کو شک کا نشانہ نہ بناؤ۔“

”تم جو بھی سمجھو، مجھے تمہارے اسٹینڈرڈ اور چوائس پر حیرت ہے۔“ ٹرین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ دانیال ناموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اسے ٹرین کے اس رد عمل پر دکھ اور حیرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پچھلے تین سال

”دفتر کا حساب بالکل ٹھیک ہے ناصرہ بی بی، پر مسئلہ بہت بڑا آن پڑا ہے۔“ بالآخر شہباز صاحب کہہ بتانے پر آئی گئے۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ ناصرہ نے سر پرچی چادر کو مزید جمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے تو کبھی آنا نہ پائی ادھر سے ادھر کی۔ پوری پوری تنخواہ میں گزارہ کرتے ہیں۔ پانچ وقت آپ مسجد میں نماز پڑھتے ہیں علاقے کے سارے لوگ آپ کی ایمانداری کے گواہ ہیں پھر کیا پریشانی ہے۔ ہماری کسی سے لڑائی، نہ جھگڑا نہ ہماری کوئی زمین جائداد، بس ایک یہ مکان ہی مکان ہے پھر ہمارے ساتھ کیا مسئلہ ہوتا ہے؟ وہ اپنے تئیں قیافے لگانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”بس مسجد میں نماز پڑھنے اور وہاں صبح، صبح جھاڑو لگانے سے ہی تو مسئلہ ہو گیا ناصرہ بی بی۔“ شہباز صاحب نے بالآخر زبان کھولی۔ ”وہ جو لڑکی تھی تین سال پیچھے ادھر آئی جا پانی بی بی کے ساتھ، اس کا سارا قصہ ہے۔“

”ہاہائے، اس کا کیا قصہ ہے۔ وہ تو بے چاری خود مصیبت زدہ تھی، اس نے کیا مصیبت ڈالنی تھی کسی کو۔“ ناصرہ کو یک دم سب کچھ یاد آ گیا۔

”اوئے ایجنسیاں لگی ہوئی ہیں اس کے پیچھے۔ کتوں کی طرح سوگھتے پھر رہے ہیں وہ کہہاں گئی وہ لڑکی اور کس، کس نے اس کی مدد کی۔ او خدا سے کوئی خصوصی دعا مانگ ناصرہ بی بی یہ تو بندوں کی پشتیں کھنگال چھوڑتے ہیں۔“

”ہائے میں مر گئی۔“ ناصرہ نے بے تابی سے ہاتھ ملے۔ ”شہباز صاحب ہم تو نمائندے سے لوگ ہیں ہمارا کیا واسطہ اتنی بڑی، بڑی باتوں سے۔“

”بس خیر مانگ بھلیے لو کے، بڑا برا وقت آنے والا ہے۔ خیر مانگ خیر۔“ شہباز صاحب نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

”لو جی نیکی کا صلہ یہ ملتا ہے ادھر، اس طرح تو نیکی کرے ہی نہ بندہ کبھی عمر بھر۔“ ناصرہ نے ایک مرتبہ پھر ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”نیکی کرنے سے پہلے اس شخص کا آگاہی پھر دلنا پڑتا ہے اب، اس سے پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا، اب پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔“ شہباز نے انہیں بتایا۔

”معصوم سی بچی لگتی تھی وہ اور جا پانی بی بی تو بالکل ہی معصوم تھی، ہم کیا جانتے تھے کہ اتنی خطرناک نکلے گی۔“

”وہ خطرناک تھی یا نہیں یہ تو مجھے پتا نہیں مگر اس کے لیے جو لوگ ادھر ادھر پوچھتے پچھاتے پھر رہے ہیں وہ خطرناک ہیں، مجھے تو سب خبریں ہیں ان کے ہاتھ جو لوگ لگ جاتے ہیں ان کا گھرا نہیں ملتا پھر ان کے گھر والوں کو ساری ساری عمر، اسی لیے تو کہتا ہوں کہ خیر مانگ خدا سے خیر مانگ۔“ ان کی آواز نیچی ہو گئی۔

اس روز گھر میں چو لھا نہیں جلا اگرچہ چھٹی کا دن تھا۔ سارا دن گھر میں سوگ کی سی کیفیت رہی۔ ناصرہ کو رہ کر وہ معصوم شکلیں اور بے ضروری نیکی یاد آتی رہی۔ اس نے بہت محبت اور دل سے ان دونوں بیبیوں کی خدمت کی تھی اور ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ آئندہ بھی ان سے رابطے میں رہیں گی لیکن دونوں نے ہی دوبارہ شکل نہیں دکھائی تھی۔ ناصرہ سوچتی رہی کیا وہ کبھی سوچ سکتی تھی کہ یہ بے ضروری نیکی ان کے گلے پڑ جائے گی۔

☆☆☆

ٹرین، دانیال سے دوسروں کی نسبت بہت قریب تھی۔ وہ اس کے ساتھ بہت سی باتیں شیئر کر لیا کرتا تھا

سے ساتھ تھے اور ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کا معترف تھا اور اس کی خوبیوں کا بھی اعتراف کرتا تھا۔ شمرین کے گھرانے سے اس کے گھرانے کا بھی پرانا تعلق تھا۔ وہ اسے ایک اچھے دوست سمجھتا تھا مگر شمرین، بنیش سے اس کی دوستی پر اس طرح تلملائے گی یہ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

بی اماں اور حمزہ ہوا کے تازہ جھونکے کے مانند زندگی کی خاموش روانی میں آتے اور پھر کچھ دنوں بعد چلے جاتے تھے ان کے جانے کے کئی دن بعد تک وہ اداسی اور تنہائی محسوس کرتی اور پھر زندگی کے معمول کی عادی ہو جاتی، اسکول میں اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اعتراف بر ملا اور اکثر کیا جانے لگا۔ وہ انٹر اسکول کی ہم نصابی اور غیر نصابی مقابلوں میں ہمیشہ شرکت کرنے لگی اور اس کے پاس اعزازات اور سرٹیفکیٹس کے ڈھیر لگ گئے۔ گھریلو امور میں ماہر بنانے کے لیے بواجی گھر میں موجود تھیں۔ انہوں نے اپنا سارا سلیقہ اور ہنر اسے منتقل کر دیا۔ وہ سارا سارا دن مختلف کاموں میں مصروف رہتی مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اس کا دل اکثر ناراض، اداس اور ناخوش رہتا تھا۔ بواجی کا ضرورت سے زیادہ محتاط رویہ اس کے لوگوں سے میل ملاپ میں خاصی بڑی رکاوٹ تھا، اس کی سہیلیوں کی تعداد بھی کم تھی، اپنی کالونی کے تقریباً ہر گھر سے کوئی نہ کوئی بواجی کے ہنر کار مرکز میں سلائی کڑھائی سیکھنے کے لیے آتی تھی۔ ان سب سے اس کی اچھی کپ شپ رہتی تھی۔ وہ خود بھی ان لوگوں کی طرف جانا چاہتی تھی مگر بواجی اسے وہاں جانے کی اجازت صرف اس وقت دیتیں جب وہ خود کہیں جا رہی ہوتیں۔

”میرے پاس اچھے معلوماتی رسالوں کی جو جلدیں ہیں وہ کیوں نہیں پڑھتی تم؟“ بواجی اس کی بوریٹ دیکھ کر پوچھتی۔

”مجھے ان میں کچھ بھی قابل مطالعہ نظر نہیں آتے، آپ مجھے وہ کتابیں پڑھنے دیں جو میرے ابو کی الماری میں بند پڑی ہیں۔“ وہ کہتی۔

”وہ کتابیں تمہاری ذہنی سطح سے بلند ہیں، ابھی تم اپنی ذہنی سطح کے مطابق کتابیں اور رسالے پڑھو۔“ بواجی ہمیشہ یہی بات کہتیں۔

مگر اسے ابو کی الماری میں رکھی کتابیں اتنی پُرکشش معلوم ہوتیں کہ وہ ہر دم انہیں ہی پڑھنا چاہتی تھی اور بواجی کو پتا بھی نہیں چلا کہ کب اس نے اس الماری کے تالے کو ہیئر پن سے کھول بھی لیا، اس کی اولیول کے امتحان کے بعد کے دن تھے، بواجی دستکاری اسکول میں مصروف رہتیں اور وہ ابو کی الماری کی کتابیں پڑھتی رہتی۔ بواجی سے لاکھ اختلاف کے باوجود اس نے کبھی ان سے چھپ کر کوئی کام نہیں کیا تھا، یہ پہلی چوری تھی جو اس نے کی تھی۔ اسے کتابیں پڑھنے کی لت لگ چکی تھی۔ اسے ان میں سے بیشتر کتابوں کے متن کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر وہ ان کا ایک، ایک لفظ پڑھتی تھی۔ انہی دنوں اس نے اردو ادب کے مشہور ناول پڑھے اور ناول نگاروں سے متعارف ہوئی۔ انگریزی ادب وہ اسکول میں بھی پڑھ چکی تھی اور اس سے متعارف بھی تھی مگر ابو کے ذخیرے میں روسو، والٹیر، دوستووسکی، چین آسن، ہارڈی اور ڈکنز کی کتابیں تھیں۔ ہومر کی الیاد بھی اس نے جب ہی دیکھی تھی اور ہٹلر کی خودنوشت بھی، ایڈم اسمتھ کی اقتصادیات بھی اور ابن خلدون کا مقدمہ بھی۔ انہی دنوں اپنے باپ سے اس کا نیا تعارف بھی ہوا۔ وہ کتابیں یقیناً کئی بار پڑھی گئی ہوں گی مگر بہت قریبے اور سلیقے سے سنبھال کر رکھی گئی تھیں۔ کسی بھی کتاب کا کوئی بھی صفحہ کہیں سے مڑا ہوا یا خراب نظر نہیں آتا تھا۔ کسی کتاب کے کسی ورق پر کوئی لفظ نہیں لکھا تھا نہ ہی کسی جملے کو انڈر لائن کیا گیا تھا ماسوائے پہلے ورق کے جہاں بہت خوب صورت لکھائی میں صلاح الدین لکھا تھا جو اس کے والد کا نام تھا۔ (جاری ہے)

بیٹیاں بوجھ نہیں عقیدہ حق



رات بہت تاریک اور سرد تھی۔ نہ جانے کون سا پہر تھا۔ ٹھنڈی ہوا جب بھی کھلی کھڑکی کے کواڑوں سے ٹکراتی تو کھڑکی پر پڑے ہوئے پردے زور زور سے ہلتے اور بج ہوا، پردوں کو پیچھے دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہو جاتی پھر کمرے میں موجود ہر چیز سردی سے جیسے منجمد ہو جاتی۔ اپنے لرزتے، کپکپاتے وجود کو جیسے گھسیٹتے ہوئے وہ کھڑکی تک آئی اور چور نظروں سے باہر جھانکا تو آسمان پر ٹمٹماتے اکاؤ کا ستارے یا

کچھ چلا گیا۔ اس کے ساتھی نے سارا خسارہ دکھا کر، سارا کاروبار اپنی طرف کر لیا اور ایک رات ہم بڑھا بڑھی تمہیں گود میں لے کر خالی ہاتھ باہر نکل آئے، حالات بدلے، تعلقات بدلے، رشتے بدلے، شہر بدلا، جو ہاتھوں اور گلے میں زیور پہنا تھا آہستہ آہستہ وہ بکا اور پھر بیٹا بھیک تو مانگ نہیں سکتے تھے۔ جو ہاتھ ہمیشہ اوپر رہے وہ کیسے پھیل سکتے تھے، سو محنت مزدوری کر کے خود بھی کھایا اور تمہیں بھی کھلایا۔“ انہوں نے پھر وہی داستان سنائی۔

”بہت اچھا وقت دیکھا ہے اس لیے برے وقت کو عزت سے گزار رہے ہیں، اللہ سے اچھے کی امید ہے، جب رات گہری ہو جاتی ہے تو جانو صبح بہت ہی قریب ہے، یہ بات لوگ جانتے تو ہیں لیکن مانتے نہیں۔ اب اسے ہی دیکھ لو، وہ رشتہ کروانے والی ناصرہ ہے ناں؟“ دادی ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکیں۔ وہ اپنے پسندیدہ موضوع پر آچکی تھیں۔ کنول نے اک ٹھنڈی سانس بھری اور دیوار سے ٹیک لگالی کہ دادی اب نہ جانے کب تک اس موضوع پر بات کریں گی۔

”سن رہی ہو یا سو گئیں؟“

”جی دادی، سن رہی ہوں فرمائیں.....“ کنول کے ہونٹوں پر اک پھسکی سی مسکراہٹ آگئی۔ ”ہاں اس ناصرہ سے جب بھی میں نے کوئی معقول رشتہ لانے کے لیے کہا تو کہنے لگتی ہے کہ خالہ تمہارے پاس تو لینے دینے کو کچھ نہیں۔ کس سے ذکر کروں، تمہارے اس گھر میں تو کسی کو بٹھانے کے لیے مناسب جگہ تک نہیں..... لوگ اب پہلے محلہ اور علاقہ پوچھتے ہیں، باپ، بھائیوں کے عہدے پوچھتے ہیں اس کے بعد لڑکی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔“ ”تو دادی کیا ضرورت ہے، اس قدر پریشان ہونے کی..... نہیں کرنی مجھے شادی وادی، آپ اکیلی رہ جائیں گی، یہ کبھی سوچا آپ نے۔“ کنول نے

آنکھوں سے کنول کو دیکھا۔

”میری پیاری سی دادی آپ ہر وقت یہ کیوں کہتی رہتی ہیں کہ وقت بدل گیا، خاک میں مل گئے، روپیہ، پیسہ سب تھا اب.....“ وہ دادی کی طرف دیکھتے بولتی گئی۔ ”وقت کہاں بدلا دادی؟ ہم تو ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں، پہلے دادا اور آپ مل کر محنت کرتے تھے، اب دادا نہ رہے تو میں اور آپ یہ تھیلیاں بنا کر بیچتے ہیں، اب یہ مت کہا کریں کہ وقت بدل گیا ہے، بلکہ یہ کہیے کہ سا بھی بدل گیا ہے۔“ کنول نے ہلکے پھلکے انداز میں لٹی کاغذوں پر لگاتے ہوئے دادی کے افسردہ چہرے پر مسکراہٹ لانے کے لیے اپنے تئیں کوشش کی۔

”نہ بیٹی ایسا مت کہہ یہ ہمارا بڑا بڑا وقت ہے اور برا وقت ان ہی پر آتا ہے جن کا کبھی اچھا وقت رہا ہو اور وقت ہمارا کبھی بہت اچھا تھا۔ نوکر چاکر، اولاد، کاروبار، پیسہ، دولت، عزت، ناموری کیا تھا جو ہمارے پاس نہ تھا، اپنی فصلیں اپنا اناج اور اناج بھی اتنا کہ بانٹ بانٹ کر تھک جاؤ لیکن ختم نہ ہو۔ پتا نہیں کس، کس کا نصیب بڑا تھا ہمارے گھر سے، پتا نہیں وہ کون نصیب والا تھا جس کے طفیل ہم بھی کھا رہے تھے۔“ دادی نے اک آہ بھری۔

”اللہ بخشے تیری ماں بڑا چڑتی تھی رات دن کے سوالیوں سے، چڑ کر کہتی کہ اماں جی اس لنگر خانے کو بند کر دیں..... جو میں کہتی بیٹی سب اپنے، اپنے نصیب کا کھاتے ہیں تو تلملا کر کہتی بس ہمیں اللہ ہمارے نصیب کا دے اور سب کو ان کے نصیبوں کا..... کم از کم یہ ہر وقت کا میلا تو ختم ہو، اب دیکھ سب ہی کچھ ختم ہو گیا، نہ وہ مانگنے والے رہے اور نہ وہ جھنجھالنے والی رہی۔ بہشتن ایک ایکسٹنٹ میں خود بھی گئی اور میرے اکلوتے بیٹے شرجیل کو بھی ساتھ لے گئی۔ کاروبار سارا تیرے باپ نے سنبھالا ہوا تھا، ہمیں تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ وہ گیا تو سب ہی

نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کچھ نہیں دادی، ریشم الجھ گیا تھا وہ سلجھ رہی تھی۔“ ”جیسا کبھی الجھے دھاگے بھی سلجھتے ہیں؟“ دادی نے اخبار کا کٹھن بغل سے نکال کر صحن میں بچھے تخت پر رکھا، برقع کی ڈوریاں کھولیں اور اپنا بدرنگ پونڈرہ برقع کنول کو تھمایا۔ ”ایک پیالہ چائے مل جائے گی؟“ ان کا بوڑھا وجود تخت پر جیسے ڈھیر ہو گیا اور سوالیہ نظریں ایک پیالہ چائے کے لیے کنول پر جیسے ٹھہری گئیں محض یہ سوچتے ہوئے کہ ایک کپ چائے دستیاب سامان میں بن بھی سکتی ہے یا نہیں۔

”سفید و گلابی رنگ، دراز قد، کمر پر جھولتی ہوئی لمبی سیاہ چوٹی، کشادہ پیشانی، یا قوتی لب اور لبوں کے دائیں طرف جگمگاتا سیاہ تل، گھنیری پلکیں..... یا میرے مالک کیسا حسن لٹایا ہے تو نے اس نیک بچی پر، میرے مالک اس کا نصیب بھی کھول دے، لوگوں کی کالی پیلی لڑکیاں پار لگ جاتی ہیں، میرے مولا اس بدنصیب کا بھی نصیب کھول دے۔ میرے کندھے اب اس بوجھ کو نہیں اٹھا سکتے، میں کس کس کی میلی نظروں سے اسے بچاؤں، میں بوڑھی، کمزور اکیلی عورت میرے مالک میری آزمائش مت کر، میں آزمائش کے لائق نہیں، مجھ پر رحم کر، میری بچی پر رحم کر، اس کا نیک نصیب کھول دے۔“ دادی ڈبڈبانی آنکھوں سے اپنے مالک سے راز و نیاز میں مصروف تھیں اور دن میں نہ جانے کتنی دفعہ وہ خود فراموشی کی کیفیت میں اپنے مالک سے التجائیں کرتی رہتیں۔

”دادی چائے تیار ہے، باہر خنکی بڑھ رہی ہے۔ چلیے اندر چل کر چائے پیتے ہیں۔“ کنول کی آواز انہیں پھر حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔

”وقت کیسے بدل جاتا ہے، خدا کسی کی سنی نہ بگاڑے، ہائے کیسا وقت بدلا ہے۔“ دادی نے چائے کا پیالہ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے دن میں سو دفعہ دہرایا جانے والا جملہ پھر بولا اور تھکن سے چور

دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ایک عجیب سا سماں پیش کرتی محسوس ہوئیں پھر اس نے ذرا جھک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گلی میں نظر آتے اکا دکا راہ گیروں پر نظر ڈالی اور پھر اس کی نگاہ سامنے حلوائی کی دکان کے پاس بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے اس شخص پر جا ٹھہری تھیں جو اسی کو دیکھ رہا تھا اس سے نظریں ملتے ہی اس شدید سردی میں بھی اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا اور وہ گھبرا کر واپس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد اس کے موبائل کی گھنٹی بجنا شروع ہو گئی۔ اس نے لائن کاٹ دی اور پھر چند لمحے وہ پلنگ پر بیٹھی باہر صحن میں کھلنے والے دروازے پر نظریں جما کر کچھ سوچنے لگی۔ لاشعوری طور پر اس کی نگاہیں کلائی میں پڑی ان چار سونے کی چوڑیوں پر جم گئیں جو دادی نے صرف تین دن پہلے زبردستی اس کے ہاتھوں میں ڈالی تھیں پھر وہ گلے میں پڑی سونے کی چین کو انگلیوں سے گھماتے ہوئے کبھی چھت کو اور کبھی پلستر اکھڑتی دیواروں کو تنکے لگی اور پھر خود بخود اس کی آنکھوں کے کناروں پر آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے جمع ہونے لگے۔ موبائل فون پر دوبارہ کال آرہی تھی اس نے دیوار پر لگی کلاک پر نظر ڈالی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی دروازے کے قریب پہنچی اور اس کی جھری سے اس نے برابر والے کمرے میں جھانکا۔ بوڑھا وجود خاموشی سے پلنگ پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ فون مسلسل بج رہا تھا۔ آخر کار اس نے فون کان سے لگالیا۔ ادھر اس نے فون پر بات شروع کی ادھر بوڑھے وجود نے جائے نماز بچھا کر نماز کی نیت باندھ لی اس نے خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر قدم رکھ دیا اور اسی لمحے بوڑھے وجود نے خود کو سجدے میں گرالیا۔

☆☆☆

”ارے بیٹا اتنی دیر سے دروازہ کھولا۔ کہاں تھیں؟“ دادی نے دروازہ کھلتے ہی کنول کو ٹوٹتی

سرگزشت

ماہنامہ

شمارہ جولائی 2013ء

کی جھلکیاں

استاد ادب

سرگودھا کی سرزمین سے ادب کا پرچم بلند رکھنے والی ایک اہم شخصیت کا زندگی نامہ

شکار

کراچی کے اس مصور کا تذکرہ جو بیوی کو پالنے کی جستجو میں جرمی جاپہنچا

ہمت مردان

زندگی کی آس کی خاطر کیا کیا جتن کیے

محسنہ

ایک عجب انداز کی سچ بیانی

اس کے علاوہ

دلچسپ سفر کہانی ”ترکی فی دامن“، لہورنگ سرگزشت ”سراب“ فلم نگری کی ان کہی روداد ”فلمی الفلیلہ“ اور بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں!

بس ایک بار پڑھنے کی دیر ہے آپ خود سرگزشت کے گردیدہ ہو جائیں گے

آج ہی نزدیکی بک لٹل پراپنا شمارہ مختص کرا لیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ، خاص شمارہ

ہے رکھنے کے لیے تجوری نہ ہو اور ہر شخص نقب لگانے کے لیے تیار ہو تو اس وقت مالک پر کیا گزرتی ہے، بس وہی حالت دادی کی بھی تھی پھر کنول کی خوشی کے لیے اس کے بے حد اصرار پر وہ صاحبین صاحب کی بیٹی کی بارات میں جانے کے لیے تیار ہو گئیں کہ سارے مسئلے ایک طرف دنیا داری بھی تو نبھانی پڑتی ہے وہاں جا کر ہی انہیں پتا چلا کہ یہ شادی سو فیصد محبت کی شادی ہے، لڑکا، لڑکی یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتے ہیں۔ لڑکے کے گھر والے قطعی راضی نہیں تھے مگر لڑکا چند رشتے داروں اور دوستوں کے ساتھ بارات لے کر آ گیا تھا کہ بعد میں وہ حالات سنبھال لے گا اور اسی لمحے دادی کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ انہیں اپنا مسئلہ حل ہوتا نظر آیا اور انہوں نے ہر زاویے سے سوچنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

”کنول بیٹا تمہیں پڑھنے کا شوق ہے ناں، تم دوبارہ سے پڑھائی شروع کر دو۔“ کنول جو گیلے کپڑے نچوڑ نچوڑ کر لگتی پر پھیلا رہی تھی دادی کی بات پر جیسے سن سی ہو گئی۔ چند لمحوں بعد جب اس کے اوسان بحال ہوئے تو وہ کپڑے چھوڑ چھاڑ دادی کے پاس آ بیٹھی۔

”جی دادی، پروہ تو بہت پرانی بات ہو گئی۔“ وہ افسردگی سے مسکرائی۔

”پہلے تو فرخندہ باجی تھیں، وہ بغیر فیس کے بھی پڑھانے کے لیے تیار تھیں اب تو عرصہ ہوا ان کی بھی شادی ہو گئی، اب کیسے پڑھ سکتی ہوں، چھوڑیں گھر میں اور مسائل کیا تم ہیں جو ایک اور مسئلہ کھڑا کر لیں۔“ اس کی آنکھیں افسردگی میں ڈوب گئیں کہ پڑھنا تو اس کا جنون تھا لیکن بنیادی طور پر وہ ایک مصلحت پسند لڑکی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی دادی اس کا باہر نکلتا، باہر کسی سے اس کا ملنا جلنا پسند نہیں کرتی تھیں کیونکہ وہ حد سے زیادہ محتاط

ملک معلوم نہیں تھے، پتا نہیں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے اور خبریں پوری رکھتی ہے، میری اماں تو بڑی شرمندہ ہوئیں، میں نے بھی ٹھان لی ہے، میرے بچوں کی اماں بنے گی تو اس کی یہی پوتی اور اگر زیادہ چوں چرا کی تو.....“ محلے کے ایک اوباش لڑکے نے اپنی گندی زبان سے نہ جانے کیا، کیا کہہ ڈالا کہ جس وقت دادی سبزی لینے ٹکڑی دکان پر گئی تھیں۔

”یار ذرا ہولا ہاتھ رکھو، بڑے خاندانی لوگ ہیں، بس وقت کی مارنے کمر توڑ دی ہے۔“ دوسرے لڑکے میں تھوڑے سے شرافت کے جراثیم تھے۔

”تو ہم کون سے ذات کے جولا ہے ہیں، بڑا نام ہے اپنے خاندان کا وہ الگ بات ہے کہ کس میں نام ہے۔“ دونوں اوباش ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قبضہ مار کر ہنس رہے تھے اور دادی کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ پیر رکھ نہیں رہی تھیں اور پڑ نہیں رہا تھا ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔

دادی کو کوئی راہ نہیں سوچ رہی تھی، بڑھاپا اور اکیلے پن نے انہیں ادھ موا کر دیا تھا، دعائیں، نمازیں، وظیفے، سب جاری تھا لیکن کنول کے نصیب پر لگا قفل ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا۔ رشتہ کرانے والیوں کی ہر شرط پر وہ تیار تھیں لیکن اب غربت کے ساتھ ساتھ کنول کی بڑھتی عمر بھی رکاوٹ بن گئی تھی اور یہ معاشرہ جو مردوں کا معاشرہ ہے اس میں 45 سال کا مرد بھی جوان اور 28 سالہ لڑکی، بڑھاپا کہلاتی ہے، دادی کو اس بات کا ادراک بھی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

گلی میں دیگوں کی لائن لگی ہوئی تھی سامنے والے گھر میں شہنائیاں گونج رہی تھیں، ڈھول پٹ رہے تھے، تہنہنوں کی آوازیں دادی کو سخت ناگوار گزر رہی تھیں اور وہ منہ سر لپیٹے اپنے جھنگا سے پلنگ پر لیٹی آنسو بہا رہی تھیں۔

جب کسی کے پاس قیمتی جواہر ہوں اور حفاظت

محبت سے ان کے گرد بازو پھیلا کر ان کے سینے میں سر دے کر آہستہ سے کہا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا، بیٹیاں تو اللہ کے رسولؐ نے بھی بیان ہی ہیں اور تم نے بھی یہ سوچا اگر میری آنکھیں بند ہو گئیں تو تمہارا کیا ہوگا، کیا انھیال اور کیا دھھیال آج بیس سال ہو گئے کسی نے پلٹ کر بھی دیکھا ہو، بیٹی اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہے اور تم چاہتی ہو کہ بوڑھی دادی اس خوشی سے بھی محروم رہے۔ خیر میں نے اس کم بخت کو زیادہ پیسوں کا بھی لالچ دیا اور ساتھ ساتھ تمہاری تمام خوبیاں بھی بتائیں تو کہنے لگی کہ میں کب کہتی ہوں کہ آپ کی پوتی میں کچھ کمی ہے لیکن اب ماحول بدل گیا ہے مگر ایک رشتہ ہے میری نظر میں، پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے لیکن وہ صاحب پہلے لڑکی سے ملنا چاہتے ہیں، ذرا دیکھو حد ہو گئی بے حیائی کی، میں نے تو صاف منع کر دیا کہ یہ شریفوں کا گھر ہے، ہمارے گھر کی عورتیں پرندوں کے بھی سامنے نہیں آتیں کجا کہ میں ایک غیر مرد کے سامنے اپنی پوتی کر دوں اور وہ بھی پسند کرنے والے کو، نہ بی بی ابھی اتنا برا وقت نہیں آیا کہ رشتوں کے لیے میں دیواروں میں سوراخ کر دوں، گھر کو کوٹھا بنادوں، میں نے اس کے وہ لٹے لیے کہ یاد رکھے گی۔“ کچھ دیر وہ رکیں، کنول، دادی کی شکل دیکھے گی لیکن شاید اس لمحے دادی یہ بھول گئی تھیں کہ بعض اوقات مجبوریاں بہت کچھ کرواتا ہیں..... اور اگر کوئی مجبوری ان کے سامنے آ گئی تو.....؟ یہ سب بول دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

☆☆☆

”ابے نعیم تجھے معلوم ہے، بڑھاپا نے گدڑی میں لال چھپا رکھا ہے۔ کیا چیز ہے، سوچ کر ہی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ اماں کو بھیجا تھا میں نے کہ چل شریف لوگ ہیں شرافت سے گھر لے آتا ہوں لیکن بڑھاپا کے خرے، ابے میرے وہ، وہ عیب کھولے اس نے جو مجھے

عورت تھیں سو اس نے ہمیشہ ان کا مان رکھا اور اس نے ایف اے کے بعد آگے پڑھنے کے شوق کو محسوس میں بنی کیاری میں دبا دیا جو وہاں گیلی مٹی میں سسکتا رہتا لیکن جو کبھی اس پر چند بوندیں آنسوؤں کی گر جاتیں تو اس شوق میں سے کونپلیں پھوٹیں اور سبز پتے لہرانے لگتے۔ جنہیں وہ خاموشی سے مسل دیتی کچھ اس طرح کے ہاتھوں پر نشان نہ رہے کہ وہ کوئی ایسا کام کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی جس پر اس کی پیاری دادی کو ذرا سی بھی پریشانی ہو۔

جب اس نے آگے پڑھنے کے شوق کا اظہار کیا تھا تو دادی نے کہا تھا۔ ”بیٹا ہم دو اکیلی عورتیں گھر میں باپ نہ بیٹا..... اکیلی عورت پر سب دانت گاڑنے کے لیے تیار رہتے ہیں، باہر کی دنیا بہت ظالم ہے میں زمانے کی ستائی ہوئی عورت ہوں اگر کسی نے تمہارے متعلق کوئی بات کر دی تو میں کیا کروں گی، لوگ پیٹھ پیچھے باتیں کرتے ہیں اگر کوئی میرے منہ پر کہے تو میں اسے جواب دوں کہ میری بچی یا عصمت اور نیک ہے لیکن دنیا تو باہر زہرا لگتی پھرتی ہے اور بیٹی کی عزت تو کانچ کی چوڑی ہوتی ہے، ثابت ہے تو ہاتھوں میں سچی ہے اور جو ٹوٹی تو کوڑے کے ڈھیر پر بھی کوئی نہیں دیکھتا، سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا ہے، میں عزت ہی بچا پائی ہوں اور اپنی عزت کے لیے میں کچھ بھی قربان کر سکتی ہوں کہ تمہاری یہ معصوم سی خواہش بھی۔“ اور وہ خاموش بیٹھی سنتی رہی کہ اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں تھا لیکن آج دادی کو کیا ہو گیا تھا؟ اس نے حیرانی سے باریک باریک چھند کرکرتی دادی کو دیکھا۔

”خیریت.....؟“

”سب خیریت ہے، میں نے بات کر لی ہے، آگے یا سمین رہتی ہے ناں ان کے جو کرایے دار ہیں ان کا بیٹا یونٹن پڑھاتا ہے اچھے شریف، سفید پوش لوگ ہیں، میں نے بات کر لی ہے، کل شام کو وہ آئے

گا تمہیں پڑھانے۔“

نہ جانے کیوں دادی اس سے نظریں چرا رہی تھیں یا اسے ایسا لگ رہا تھا۔ دادی کے لفظ تھے یا پھر..... وہ حیرانی سے ان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”میں کسی مرد یونٹن سے پڑھوں گی، وہ ہمارے گھر آئیں گے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے دادی؟“ اس نے گھبرا کر ہتھیلی کی پشت سے دادی کی پیشانی کو چھوا۔

”اے ہٹو.....! باؤلی ہو، کچھ نہیں ہوا، بس کل سے پڑھائی شروع اور ذرا ڈھنگ سے رہا کرو، یہ کیا اول جلول حلیے میں رہتی ہو۔“

آج شاید اس کے لیے حیرتوں کا دن تھا اور دادی کے اس نئے روپ پر وہ تقریباً بے ہوش ہونے کو تھی، آج دس سال بعد اس کی پڑھائی کی بات وہ بھی اس انداز سے..... اسے واقعی چکرا رہے تھے لیکن وہ کیا جانے، بعض اوقات مجبوریاں کیا کچھ نہیں کرواتیں، یہ کوئی دادی کے قطرہ قطرہ پگھلتے وجود سے پوچھتا۔

☆☆☆

روز شام کو اعجاز احمد جو خود انجینئر تھے کنول کو پڑھانے آنے لگے۔ دادی کے مزاج میں نمایاں فرق آچکا تھا۔ وہ اعجاز احمد کی شرافت اور رکھ رکھاؤ سے بہت متاثر تھیں۔ ان کے لیے خود چائے لائیں، کنول بڑے سے دوٹے میں لپٹی کبھی حیرت سے دادی کو دیکھتی اور کبھی انگریزی کے لفظوں میں الجھ جاتی لیکن یہ وہ ضرور سمجھ رہی تھی کہ کوئی معما ہے؟ جو اس کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ کبھی اسے لگتا شطرنج کی بساط کبھی ہے جس پر مہرے آہستہ آہستہ سرک رہے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شطرنج کی بساط بچھائی کیوں گئی.....؟ یہ وہ کیسے سمجھ سکتی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

محلے کے چند اوباش لڑکوں نے ایک وتیرہ سا بنا

بیٹیاں بوجھ نہیں

کے کاندھوں پر دو بڑی اور ایک چھوٹی بہن کی ڈتے داری تھی سو فی الحال اس کی شادی کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس کے ماں، باپ اس کی ممکنہ تک کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ وہ اللہ کے بعد ان کا آخری سہارا تھا اور کنول سے دوری اعجاز احمد کے لیے ناقابل برداشت تھی، اس دوری کو ختم کرنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا، کوئی انتہائی قدم تو اٹھانا ہی تھا، اس لمحے جب وہ کنول کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے کنول کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے ساتھ اس واحد حل کے لیے تیار کر رہا تھا، اس کے نزدیک یہی حل ان کے ملن کا ذریعہ تھا اور وہ حل گھر کی دہلیز خاموشی سے پار کرنا تھا۔ اسی لمحے ساکت بیٹھی کنول نے اک سایہ دروازے کے پیچھے لرزتا دیکھا۔

☆☆☆

”کنول ادھر آؤ بیٹا.....“ کنول جب نہا کر گیلے بال پشت پر پھیلائے دالان میں آئی تو دادی نے اس کو آواز دی۔

”یہ لو یہ چوڑیاں پہن لو اور گلے میں یہ چین بھی ڈال لو۔“

”یہ تو سونے کی ہیں، یہ آپ کے پاس کہاں سے آئیں؟“ وہ حیران تھی۔

”کوئی چوری تھوڑی کی ہیں تمہاری مرحومہ ماں کی ہیں، بیہشتن مرتے وقت پہنے ہوئی تھی میں نے تمہاری شادی کے لیے رکھ چھوڑی تھیں۔ کیا کیا وقت آیا فاقے تک کیے لیکن میں نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا۔ لو سنبھالو یہ تمہاری امانت ہیں۔“ دادی کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔ آج دادی بہت تروتازہ لگ رہی تھیں اور ویسے بھی آج کل ہر صبح ان کی شخصیت کا نیاروپ سامنے آ رہا تھا۔

”لیکن میری کون سی شادی ہو رہی ہے جو آپ یہ سب مجھے دے رہی ہیں۔“ کنول بدستور حیران تھی۔

”بس بیٹا اللہ جلد ہی وہ نیک گھڑی لائے گا اور

لیا تھا جب کبھی دادی کے گھر کے آگے سے گزرتے کبھی کھنکھارتے، کبھی اونچی آواز میں فحش گانے گانے لگتے اور بعض اوقات کوئی کنکر محسن میں اچھال دیتے اور جو کوئی ٹوکتا تو دھڑلے سے کہتے جہاں پیری ہو وہاں کنکر تو آتے ہی ہیں۔

دادی کے لیے کنول کو میلی نظروں سے بچانا دو بھر ہو گیا۔ بعض اوقات حسن بھی وبال بن جاتا ہے، کبھی کبھی وہ سوچتیں کاش یہ بد صورت ہوتی کم از کم میلی نظریں تو کم پڑتیں لیکن اکیلی عورت تو... بد صورت بھی بھلی لگتی ہے نہ جانے خدا کی کوئی آزمائش تھی یا ان کے صبر کا امتحان کہ ان کا بوجھ ہلکا ہونے پر نہیں آ رہا تھا۔ اب تو ان کے کندھے اس حسین جوان لڑکی کے بوجھ سے ٹوٹے جا رہے تھے۔ بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں لیکن ڈتے داری ضرور ہوتی ہیں، اس بات کا دادی کو ادراک ہو چکا تھا مگر اب.... جب وہ اٹھائیس سال کی ہو گئی۔

کنول اکثر محسوس کرتی کہ اعجاز احمد کے آنے سے پہلے دادی خاص کر اس کے کپڑے بدلواتیں اور آنکھوں میں کا جل لگانے کی ہدایت کرتیں۔

جب وہ پڑھ رہی ہوتی تو اکثر دادی دبے قدموں آئیں اور واپسی پر دروازہ ہلکا سا بھیڑ جاتیں اور پھر اعجاز احمد کے جانے کے بعد کھوجتی نظروں سے اس کی طرف دیکھتیں۔ وہ گھبرا کر نظریں جھکا لیتی اور وہ خاموشی سے تسبیح کے دانے گرانے لگتیں۔

☆☆☆

بنیادی طور پر اعجاز احمد ڈتے داریوں میں گھرا ایک مناسب خدو خال رکھنے والا، شریف لڑکا تھا۔ پھر وہ بھی بچھائی گئی بساط کا مہرہ بن گیا اور پورے کنول کی محبت میں ڈوبتا چلا گیا..... اور محبت تو ایک ایسا جذبہ ہے اگر ایک طرف آگ لگی ہو تو پیش دوسری طرف ضرور پھپکتی ہے اور اعجاز احمد کی محبت کی پیش کنول کے رخساروں کو دھکے لگاتی تھی۔ اعجاز احمد

اعجاز احمد، جو اس بھیگی رات میں پچھلے کئی گھنٹوں سے حلوائی کی دکان کے پاس کھڑا کنول کا انتظار کر رہا تھا۔ بالآخر خاموشی سے چلتا ہوا اس کے دروازے تک آ گیا تھا اور دروازہ کھلا پا کر کراندر چلا آیا اور دادی اور پوتی کی ساری باتیں سن لی تھیں۔

”اوہ میرے خدا! یہ میں کیا کرنے جا رہا تھا، ایک مجبور بوڑھی عورت کی مجبور یوں کا سودا..... لعنت ہو مجھ پر..... میری مردانگی پر.....“ اور وہ پلٹ گیا، اس یقین کامل کے ساتھ کہ اللہ کی مدد سے وہ اس کام کو باعزت طریقے سے کرے گا۔

”ہم اللہ پر ایمان تو رکھتے ہیں یقین نہیں رکھتے، جی تو زندگی میں چور راستے ڈھونڈتے ہیں جس کام کو میں نے بہت مشکل جانا وہ میرے کامل یقین نے دنوں میں حل کر دیا۔ میرے گھر والے خوشی خوشی راضی ہو گئے، صرف ایک ہفتے کے بعد بہت دھوم دھام سے بارات لے کر آپ کے دروازے پر آؤں گا اور کنول کو باعزت طور پر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ جس عزت کی وہ حقدار ہے۔“ اعجاز احمد چند دن بعد دادی کو یہ خوش خبری سنا رہا تھا اور دادی اور کمرے میں بیٹھی کنول کی حالت ناقابل بیان تھی۔

اللہ کے دربار میں دادی کی توبہ اور دعائیں قبول ہو گئی تھیں اور جب وہ رحمن معاف کرتا ہے تو اپنی شان کے مطابق برسات کر کے نوازتا ہے۔

ہم نہ تو یقین کامل سے اپنے گناہوں پر توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی سچے دل سے دعا مانگتے ہیں..... کفرانِ نعمت کیے جاتے ہیں۔ ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں بیٹیاں اللہ کی جانب سے تحفہ ہیں۔ یہ اللہ کی رحمت ہوتی ہیں، ہماری ذمہ داری ہوتی ہیں لیکن بیٹیاں بوجھ ہرگز نہیں ہوتیں۔

ہوتی، میری پوتی کو آنے والی آزمائشوں کے لیے مضبوط کر دے، ہمارے گناہوں کا بوجھ اس پر سے اٹھالے، یا اللہ میری کنول تیرے حوالے، یا اللہ اس کی حفاظت فرما، اسے خوشیاں نصیب کر، اس کی زندگی سے دکھ دور کر دے، اس کی عزت و آبرو کی حفاظت فرما، اس پر اپنی رحمت کا سایہ رکھنا۔“ دادی آنکھیں بند کیے، ہاتھ پھیلائے رورو کر اللہ سے فریاد کر رہی تھیں، اس لمحے جب دادی اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے اللہ کے آگے گڑ گڑا رہی تھیں وہ پلٹ کر دروازہ بند کرنے آئی تھی۔ موبائل فون اب بھی بج رہا تھا۔ اس نے بیل بند کر دی تھی۔ دادی کے لفظوں میں کیا جادو تھا کہ وہ کوشش کے باوجود اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔

”آف میرے خدا..... وہ جو میرے لیے اس طرح فریاد کر رہی ہیں جنہیں میری عزت و آبرو کا اتنا خیال ہے، میں بد نصیب ان کی عزت روندنے جا رہی ہوں، ملتا تو وہی ہے جو نصیب میں لکھا ہو لیکن مجھ بد نصیب نے غلط راستہ کیوں چنا۔ میں کیوں اعجاز احمد کی باتوں میں آ گئی، میں نے دادی کی طرح تجھ سے فریاد کیوں نہیں کی، سیدھے راستے پر چلتے ہوئے کامیابی کیوں نہ مانگی۔ میرے مالک مجھے معاف کر دے۔“ رات بیت رہی تھی مگر اس کی تقدیر کی صبح طلوع ہونے کو تھی۔ وہ دہلیز سے پلٹ آئی تھی۔

”دادی! میری پیاری دادی، مجھے معاف کر دیں، مجھے اللہ پر یقین ہے وہ ہماری حفاظت فرمائے گا، میں کہیں نہیں جا رہی۔“ وہ ان کے دعا کے لیے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں منہ چھپا کر رودی اور دادی اس بات سے بے خبر کہ ان کی دعا قبول کر لی گئی، ان کا تکبر معاف کر دیا گیا، اللہ نے ان کی اور ان کی پوتی کی حفاظت فرمائی ہے، دعا میں منہمک تھیں چونکہ انکس اور چند لمحے خاموشی سے کنول کو روتا دیکھتی رہیں پھر خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

اچھی کی ہے، انشاء اللہ وہ اپنی خدمت گزاری سے سب کے دل جیت لے گی۔“ نصیبین ہاتھ جوڑے رو رہی تھی۔

”تو نے تو بیٹی بکے پھل کی طرح کسی کی گود میں ڈال دی۔ ذرا شرم نہ آئی اتنا گر کے بیٹی جیسی چڑ کسی کو دیتے ہیں..... ہمارے شادی نہیں ہو رہی تھی تو نہ ہو، کم از کم بیٹیوں کو چوک پر تو نہ بٹھاؤ، اس طرح حقیر تو نہ کرو۔“

”بیٹیاں کس کو بری لگتی ہیں یہ تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں، بس جب تک ہی پیاری ہوتی ہیں جب تک مٹی کے گھر بندے بنا کر گڑیا سے کھیلتی ہیں، جیسے جیسے بڑی ہوتی جاتی ہیں بوجھ میں تبدیل ہوتی جاتی ہیں اور اگر باپ نہ ہو، بھائی نہ ہو تو یہ بوجھ بوڑھی ماں کے کندھوں کو توڑ دیتا ہے، بڑی بیگم صاحبہ میرے کندھے کی ہڈیاں چنٹنے لگی تھیں، میرے کندھے ٹوٹ رہے تھے میں کیا کرتی۔“ نصیبین رو کر صفائی پیش کر رہی تھی۔

”لعنت ہو تم لوگوں کی جہالت پر، کیسے مسلمان ہو خدا پر یقین نہیں کیا، بس نام کے مسلمان.....؟“ بڑی بیگم نے حقارت سے نصیبین کو دیکھا اور جھوٹے میں لیٹی اپنی حسین پوتی کنول کو گود میں اٹھا لیا اور اپنا غرارہ سنبھالتی اندر چلی گئیں۔ یہ سوچے بغیر اللہ کسی کو بھی آزما سکتا ہے، تکبر کا حق صرف اللہ کو ہے، یہ اللہ کا وصف ہے اور جو مخلوق تکبر کرے، وہ کسی بھی سزا کی مستحق ہو سکتی ہے۔

”اے میرے مالک، میرے آقا، خالق کائنات، یار رحمن، یار رحیم، ہمیں معاف فرما، ہماری آزمائش کو ختم کر، میرے مالک تجھ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ ہم عرش سے فرش پر کیسے آ گئے، ہم کیا تھے کیا ہو گئے، میرے مالک تو جانتا ہے، میں بوڑھی اور کمزور ہوں، مجھ سے اس امانت کی حفاظت نہیں

جب وہ وقت آئے تو صرف اپنے بارے میں سوچنا کچھ اور نہ سوچنا۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے اس دروازے کے باہر بھوکے بھیڑیے اپنے نوکیلے دانتوں کو تیز کر رہے ہیں، اپنے مرد کا سہارا بڑی نعمت ہوتا ہے، عورت بڑی معتبر ہو جاتی ہے، میں یہ نہیں کہہ رہی کہ اکیلی عورت معتبر نہیں ہوتی لیکن ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں مرد کا سہارا ضروری ہے، خدا تمہاری عزت و آبرو کی حفاظت کرے اور ہر آزمائش میں تمہیں ثابت قدم رکھے۔ کچھ لوگوں کے لیے زندگی امتحان ہوتی ہے انہیں کچھ بھی آسانی سے نہیں ملتا اور شاید ہمارا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔“ دادی کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ چونک گئی۔

”اری نصیبین، یہ میں کیا سن رہی ہوں کہ تو نے اپنی بہو کے بھائی سے زبردستی اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟“ بڑی بیگم نے دالان میں پوچھا لگائی نصیبین سے گرج کر پوچھا۔

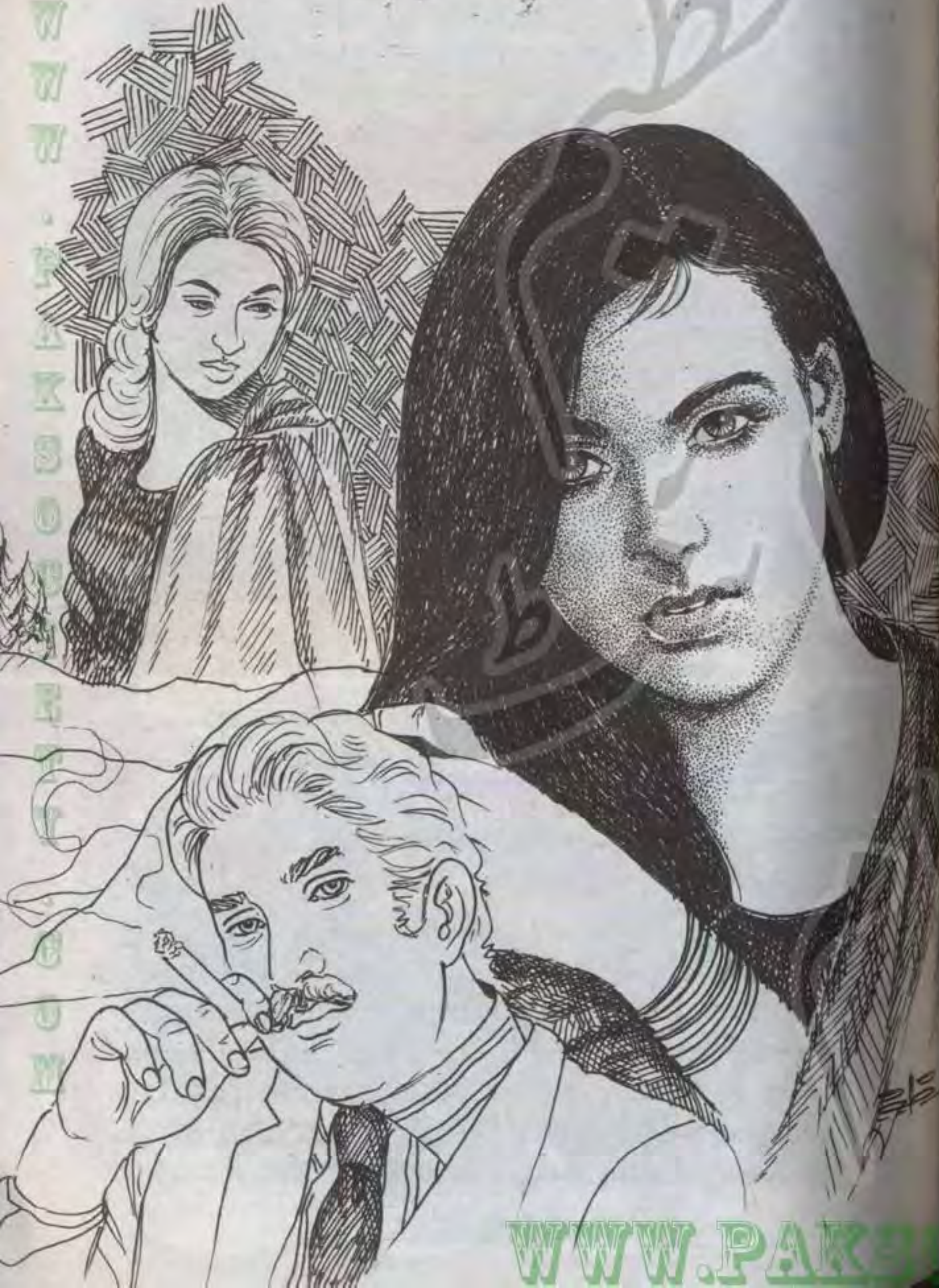
”جی بڑی بیگم یہ سچ ہے، کیا کروں بڑی مجبوری تھی۔ بیٹی کی عمر گزر رہی تھی، نہ باپ، نہ چچا، تایا، کوئی رشتہ دار نہیں کسی نے اس بد نصیب پر سوال نہ ڈالا۔ میں نے بہو سے اس کے بھائی کے لیے بات کی تو وہ نہ مانی تو میں نے بیٹے سے طلاق کی دھمکی دلوائی، بہو ڈر گئی، اس کا بھائی بھی ڈر گیا۔ بہو کے گھر والے نہ مانتے تھے سب مان گئے۔“

”تو، تو بڑی چالاک نکلی، تو اپنی بیٹی کی صورت تو دیکھ، تیری بہو کا بھائی تو بڑا اکبر و جوان ہے۔“ بڑی بیگم نخوت سے بولیں۔

”ہاں بیگم، درست فرمایا، بڑی کم صورت ہے میری بیٹی، پر بیگم بیٹیاں صورتوں سے نہیں پار لگتیں، بیٹیاں نصیبوں سے پار لگتی ہیں، بس میری بیٹی کے نصیب ہی میں ختی ختی لیکن میں نے اس کی تربیت

منتظر بہار

سکینہ سترخ



موسم یکلخت تبدیل ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے کی بات تھی کہ کھڑکیوں سے دھوپ چھن چھن کر اندر آرہی تھی اور آسمان بالکل صاف تھا۔ چھٹی کا دن تھا فاخر گھر پر ہی تھا، وہ بچوں کو اور فاخر کو ناشتا کروا کے خالی الدہنی کی کیفیت میں پچن میں آ کے کھڑی ہو گئی۔ اس کا ذہن انتشار کا شکار ہو رہا تھا اور ہاتھ پاؤں بے جان..... چند منٹ وہاں ساکت و جامد اکیلی کھڑی اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش میں لگی رہی..... دفعتاً اس نے محسوس

کیا جیسے ارد گرد اندھیرا سا چھا رہا ہو۔

”کیا میری بینائی جواب دے رہی ہے؟“

اس نے ہوش میں آتے ہوئے سوچا۔ کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی تو دھوپ غائب تھی اور آسمان اودے اودے بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔

”یہ ایک دم کیا ہوا.....؟“ وہ چونکی اور بے تاب ہو کے کچن سے ملحقہ اس چھوٹے سے ٹیرس میں آ کے کھڑی ہو گئی جو اس کا پسندیدہ مقام تھا۔ اس کے باہر آنے کی دیر تھی ایک دم بارش شروع ہو گئی..... ایک بوچھاڑ اس کے چہرے پر آ کے پڑی، اس نے گہری سانس لی..... عرصہ ہوا اس نے بارش کی بوندوں سے کھیلنا چھوڑ دیا تھا مگر آج اس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور ان بوندوں کو اپنی ہتھیلی پر جمع کرنے لگی..... اس نے ہتھیلی اپنے چہرے کے قریب کی اور ان جمع شدہ بوندوں کو غور سے دیکھنے لگی..... دفعتاً اس کی آنکھوں سے دو قطرے ٹپکے اور ہتھیلی میں موجود پانی میں مدغم ہو گئے۔ کیا فرق تھا ان دونوں پانیوں میں.....؟ دونوں ہی برسنے کے بعد بے اماں ہو چکے تھے۔

”نیہا..... کہاں ہو بھئی تم.....؟“ اس کے کانوں میں فاخر کی آواز گونجی..... وہ اسے پکار رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی اس کی پکاریں قریب آتی گئیں اور اگلے ہی لمحے وہ ٹیرس پر موجود تھا۔

”تم یہاں ہو..... کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔“ وہ چڑ کے بولا۔

”کہیے، کوئی کام تھا؟“ اس نے بے تاثر لہجے میں پوچھا۔ وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔

”میں ذرا اسد کی طرف جا رہا ہوں، واپسی پر رات ہو جائے گی۔“ وہ کہہ کر مڑنے لگا پھر اچانک ہی اسے کوئی خیال آیا وہ رکا اور اس سے مخاطب ہوا۔ ”مامی کا فون آیا تھا صبح میں؟“

”جی.....“ اس کے حلق سے بے مشکل نکلا۔

”خیریت ہے سب؟“ اس نے دوبارہ سوال کیا۔

”کسی کی ڈیٹھ کی خبر دینی تھی.....“ اس نے

آہستہ سے جواب دیا۔

”اوہ..... کون؟“ وہ ایک دم سیدھا ہو گیا۔

”اماں کے کزن تھے۔“ اس نے ٹھٹھکی

سانس لی۔

”اوہو..... تمہارے تو ماموں ہوئے۔“

نے سر ہلایا۔ نیہا نے اس جملے کے جواب میں کچھ مناسب نہیں سمجھا، وہ خاموش رہی۔

”پھر جانا نہیں ہے کیا ان کی طرف.....؟“

کی خاموشی یہ فاخر نے پھر پوچھا۔

”نہیں..... وہ یہاں نہیں رہتے تھے۔“

امریکا میں مقیم تھے۔“ نیہا نے جواب دیا۔

”پھر ان کی فیملی سے فون پر ہی تعزیت کر لو۔“

فاخر بولا۔

”ان کی کوئی فیملی نہیں ہے.....“ نیہا کی آواز

کنویں سے برآمد ہوئی۔

”مطلب.....؟“ فاخر نے حیرانی سے پوچھا۔

”انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔“ نیہا نے سینے

میں گھٹی سانس باہر نکالی۔

”اوہ..... سوئیڈ..... ٹھیک ہے میں چلتا ہوں

ایک تو یہ بارش.....“ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر

منہ بنایا۔ فاخر کو بارش کا موسم سخت ناپسند تھا۔ اس کے

نکلتے ہی بارش تیز ہو گئی۔ اس نے بھی فاخر کی موجودگی

میں اپنی آنکھوں پہ جو بند باندھا تھا اسے آہستہ سے

کھول دیا..... اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے

قطروں کی رفتار بارش سے بھی زیادہ تیز تھی۔ وہ کھل

کے رو رہی تھی..... مرنا ایک افسوس ناک حقیقت تھی

مگر بغیر جیسے مرجانا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے..... اس

نے آنسو پونچھتے ہوئے سوچا۔ ضروری نہیں کہ ہر بار

مقتل سے کیا ہوا فیصلہ ہی درست ہو، کچھ معاملات

خالصتا دل کے ہوتے ہیں ان کے لیے سارے فیصلے

تھیں نے اگلے دن پہلی فلائٹ سے پہنچنے کا وعدہ کر لیا..... بابا کے چہرے پر قدرے اطمینان نظر آیا۔
”بابا، آپ نے صفیہ خالہ کو بتایا.....؟“ نیہا کو ایک دم کچھ یاد آیا۔

”صفیہ خالہ..... اوہ، انہیں تو میں بھول ہی گیا..... لیکن بھئی وہ تمہاری خالہ کب ہیں، خالہ تو وہ تمہاری اماں کی ہیں..... اکلوتی، سگی خالہ، تمہاری تو وہ ثانی ہوئیں رشتے میں۔“ بابا نے کہا۔

”جی..... چلیں ثانی ہی سہی، انہیں بھی تو بتادیں۔“ نیہا جلدی سے بولی۔

”ابھی تو کافی رات ہو گئی ہے، صبح بتادوں گا۔“

بابا کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ صفیہ خالہ کے تصور سے نیہا کی بڑی اچھی یادیں وابستہ تھیں۔ اسے ثانی، نانا تو یاد ہی نہیں تھے، وہ اس کے بہت بچپن میں گزر چکے تھے، ایک ہی خالہ تھیں وہ بھی دور..... دودھیال بھی ادھر ادھر بکھرا ہوا..... بس ایک صفیہ خالہ تھیں جو اکثر آیا کرتی تھیں اور نیہا پر محبتوں کے خزانے لٹایا کرتی تھیں..... ان کے بہت ہی شاندار اور خوب صورت گھر میں نیہا بھی اپنے بچپن میں کئی بار گئی تھی..... پھر ان کا آنا رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے دوسرے نمبر والے بیٹے امریکا جا بے تھے اور وہ انہیں اپنے پاس اکثر و بیشتر بلا لیتے پھر پاکستان کئی مہینوں تک واپس نہیں آنے دیتے پھر کچھ بڑھتی ہوئی عمر کے مسائل نے بھی خالہ کا گھومنا پھرنا محدود کر دیا تھا..... ابھی اچانک ان کا نام ذہن میں آیا تو ان سے ملنے کی خواہش بھی جاگ اٹھی..... کئی سالوں سے اماں اور خالہ کا رابطہ فقط فون پر ہی تھا۔

”خیر، پاکستان میں ہوں گی تو ضرور آئیں گی۔“ اس نے سوچا۔

اگلی صبح اماں کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا..... ایڈمٹ تو وہ ایک دن پہلے سے ہی تھیں۔ وہ بابا اور آزر تینوں ہی پریشان صورت کے ساتھ بیٹھے

دل پر چھوڑنا ہی اچھا ہوتا ہے..... رو کر اس کی بھڑاس کافی حد تک نکل چکی تھی اور دل ہلکا ہو گیا تھا لیکن کب تک.....؟ وہ جانتی تھی کہ یہ ملال ساری زندگی اس کے دل سے نکلنے والا نہیں۔

پچھلے بیس سالوں سے وہ یہ کاٹنا اپنے دل سے کاٹنے میں ناکام رہی تھی اور اب اگر کاٹنا نکل بھی جاتا تو کیا ہوتا.....؟ اس کاٹنے کی وجہ سے جو زخم اطراف میں پھیل گیا تھا اس کا علاج اتنا آسان نہیں تھا۔

اماں کے پیٹ کی تکلیف کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی..... دواؤں سے وقتی طور پر آرام تو آ جاتا مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر درد سے تڑپنا شروع ہو جاتیں۔ بابا انہیں ہنگامی طور پر اسپتال لے گئے، جہاں انہیں فوری طور پر ایڈمٹ کر لیا گیا..... تشخیص پتے میں پتھری کی ہوئی تھی اور ڈاکٹر نے فوراً آپریشن کروانے کا مشورہ دیا تھا..... وہ اور آزر، بابا کے ساتھ ہی اماں کو اسپتال لے کر آئے تھے..... سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”گھبرانے کی بات نہیں، یہ کوئی اتنا سیریس مسئلہ نہیں ہے لیکن اگر دیر ہو گئی تو مسئلہ ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر نے گویا تسلی دی..... اس نے بابا کی طرف اور بابا نے اس کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب جیسے آپ کہیں ہم تیار ہیں۔“ پھر بابا نے آہستہ سے کہا۔ ”اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔“ اگلے دن آپریشن کی فیسٹ فائل کر دی گئی۔

بابا کی دونوں بہنیں لاہور میں مقیم تھیں اور ان کے بڑے بھائی سعودیہ میں..... دوسری طرف اماں کی اکلوتی بہن کئی سالوں سے یو کے میں تھیں ان میں سے کسی کا بھی فوری طور پر کراچی پہنچنا ناممکن تھا پھر بھی بابا نے سب کو اطلاع کر دی۔

بہن پچھو جو بابا کی سب سے بڑی..... بہن

جاتی ہوں، تم سکون سے پڑھ لیتا۔“ ان کی آواز بے خیالی میں قدرے بلند ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، اماں کی آواز آئی۔

”صفیہ خالہ صبح کہہ رہی ہیں نیہا، ابھی نہ جانے مجھے کتنے دن اور رہنا پڑے تم ان کے گھر جا کے اطمینان سے پڑھ لو۔“ اماں کی ماتا کو اس حال میں بھی اسی کی فکر تھی۔ وہ جاگ چکی تھیں۔

”بالکل چند گھنٹوں کی تو بات ہے، اچھا ہے ہم خالہ بھانجی کو بھی وقت مل جائے گا، پرانی باتوں کو یاد کرنے کا.....“ صفیہ خالہ مجر جوش ہو کے بولیں۔ اس نے غور سے ماں کی طرف دیکھا۔

اماں نے اس کی آنکھوں کا سوال پڑھ لیا۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹا..... تم بے فکر ہو کے جاؤ۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

نانو کا گھر بہت بڑا تھا..... وسیع و عریض باغیچہ اور وسط میں کمر و فر سے کھڑی ہوئی ٹر شکوہ عمارت..... اس گھر میں بچپن میں دو تین بار آچکی تھی اور ہر بار ہی مرعوب ہوئی تھی..... پھر وقت کے ساتھ ساتھ آنا جانا کم ہو گیا اور یہ گھر اس کے ذہن سے نکل گیا۔ یہاں قدم رکھتے ہی بچپن کی مرعوبیت ایک بار پھر عود کر آتی۔ اس نے جھجکتے ہوئے عمارت کے اندر قدم رکھا۔

اندر داخل ہوتے ہی نجمہ خاتون سے آگے سامنا ہو گیا۔ نجمہ خاتون نانو کی بہت پرانی ملازمہ تھیں..... گھر کا سارا انتظام و انصرام ان کے ہاتھ میں تھا۔ گھر والے ان کی بہت عزت کرتے تھے اور وہ بھی گھر پر اپنی جان نچھاور کرتی تھیں..... اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ قدرے چونک گئیں۔

”آداب.....“ وہ فوراً بولی۔

”جیسی رہو.....“ ان کی آنکھوں میں حیرت بدستور تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔

”میں نیہا ہوں..... عزیزہ کی بیٹی.....“ اس

”اچھا تو ہم آپ کے پاؤں کی بیڑیاں ہیں؟“

اس کی بات سن کر بابا نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔

”ارے نہیں بھئی..... تم سب لوگ تو میری زندگی ہو..... اپنی ٹیلی کے بغیر تو میں ادھورا ہوں۔“

اس نے مسکرا کر باپ کی طرف دیکھا۔ اماں کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اماں تیزی سے رو بصحت تھیں مگر ڈاکٹر ز کا خیال تھا کہ ابھی کچھ دن انہیں اسپتال میں رہنا ضروری تھا..... نیہا صبح میں بابا کے ساتھ اسپتال آ جاتی..... بابا اسے وہاں چھوڑتے ہوئے خود آفس چلے جاتے..... شام میں واپسی پر اسے لیتے ہوئے کچھ دیر بیٹھ کے گھر چلے آتے، رات کے وقت تہینہ پچھو جو اماں کی تیمارداری کے لیے خاص لاہور سے آئی تھیں، وہ رکنے کے لیے آ جاتی تھیں..... بابا اپنی بڑی بہن کے بہت مشکور تھے، جن کے آجانے سے مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

تیسرے روز صفیہ خالہ اسپتال اماں کو دیکھنے آئیں تو نیہا اپنی بائیولوجی کی کتاب کھولے بیٹھی تھی۔ اماں کو ڈرپ لگی ہوئی تھی اور وہ سکون سے سو رہی تھیں اس نے موقع غنیمت جانا۔

”اسپتال میں کتاب کا کیا کام.....؟“ صفیہ خالہ نے سرگوشی میں پوچھا۔

”میرے سالانہ امتحان ہونے والے ہیں۔“

اس کی تیاری کر رہی ہوں.....“ اس نے بھی اسی سرگوشی میں جواب دیا۔

”کون سی کلاس میں ہو؟“ صفیہ خالہ متاثر نظر آئیں۔

”سیکنڈ ایئر کا امتحان دوں گی۔“ اس نے مسکرا کے جواب دیا۔

”اچھا، اچھا تو بھئی ایسا کرو تم میرے گھر چلی جاؤ..... پانچ منٹ کی ڈرائیو پہ تو ہے..... نیچے گاڑی کھڑی ہے اس میں ڈرائیور ہے..... میں یہاں بیٹھ

”بس بیٹا نہ جانے کیسا افراتفری کا دور ہے.....“

یہی شہر میں رہتے ہوئے بھی مہینوں ملاقات نہیں ہوئی ہے..... پاکستان میں میرا قیام بھی اب کم ہی ہوتا ہے، یہاں رہ کر کروں بھی کیا..... بھائیں بھائی گھر دیکھ کر میرا تو وحشت سے برا حال ہو جاتا ہے..... لیے جیسے ہی اسفندیار بلاتا ہے سامان سمیٹ کے گھر ہو جاتی ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

”اب شہر یار کی شادی کر ہی دیں خالہ اور انتظار کریں گی۔“ اماں نے نحیف آواز میں کہا۔

”ہاں..... جیسے بڑا آسان ہے تاں یہ کام سیکڑوں لڑکیاں تو دکھائی ہیں صاحبزادے کو.....“

پسند بھی تو آئے، اب تو غصے میں کئی سالوں سے خاموش بیٹھی ہوں کہ کرو اپنی مرضی اور کنوارے۔“ خالہ جل بھن کے بولیں۔

”شہر یار سے کہیں خود ہی اپنی پسند سے نکالیں۔“ اماں نے کہا۔

”یہ بھی نہیں کر پائیں گے..... ساتھ بڑے والیاں تو اب اپنی بیٹیوں کے رشتے ڈھونڈ رہی ہیں گی..... اوپر سے بزنس اتنا پھیلا لیا ہے انہوں نے کہ ایک قدم ان کا شہر میں تو دوسرا شہر سے باہر، وقت کہاں ہے ان کے پاس..... بس دعا ہی ہے کہ کوئی بچہ ہو جائے۔“ انہوں نے افسردگی سے جواب دیا۔

”نانو اتنے کمال کے ہیں آپ کے بیٹے..... میں نے ابھی تک ان کو دیکھا کیوں نہیں، کبھی آئے نہیں وہ ہمارے گھر.....“ نیہا کے لہجے میں جھجکاہٹ تھی۔

”وہ تو اپنے ہی گھر آ جائیں تو ان کی مہربانی خالہ کلس کے بولیں۔“ جب مرد کے پاؤں میں بچوں کے نام کی بیڑیاں نہیں ہوتیں تو وہ ایسے ہی آواز اور بے فکر رہتا ہے.....“ بابا مسکرائے۔

اماں نے حالت بیماری کے باوجود بابا کو گھورا..... اور وہ مصنوعی ناراضی سے بابا کے قریب آ کر بولی۔

تھے۔ آزر تیرہ چودہ سالہ بچہ تھا اور ٹھیک ٹھاک گھبرایا ہوا تھا۔

”دعا کرو، کچھ نہیں ہوگا ہماری اماں کو.....“

اس نے بھائی کے ہاتھوں پر پھکی دی۔ وہ خود کون سا بہت بڑی تھی..... انیسویں میں لگی تھی، سیکنڈ ایئر میں تھی اور دو ہفتوں کے بعد اس کے سالانہ امتحان شروع ہونے والے تھے لیکن اس وقت وہ سب کچھ بھول چکی تھی، اسے صرف اتنا یاد تھا کہ وہ اماں اور بابا کی سب سے بڑی بیٹی ہے اور اس وقت اس کے شانوں پر بہت بڑی ذمے داری کا بوجھ پڑ چکا ہے جو اسے بخوبی نبھانا ہوگا۔

صفیہ خالہ لپک جھپک اسپتال پہنچ چکی تھیں..... ان کا گھر اسپتال سے بہت قریب تھا۔ سب کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے تھیر سے باہر آ کر خوش خبری سنائی۔

”مبارک ہو، آپریشن کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گیا ہے۔“ سب کے چہروں پر خوشی اور اطمینان کے رنگ بکھر گئے۔

اماں کو ہوش آ گیا تو انہیں کمرے میں شفٹ کر دیا گیا..... ان کے چہرے پر کمزوری تو تھی مگر ساتھ ساتھ ایک مرسکون مسکراہٹ بھی تھی..... ایک بڑے مرحلے سے بخوبی گزرنے کی خوشی کا انداز اور ہی ہوتا ہے۔ انہیں مطمئن دیکھ کر سارا خاندان مطمئن نظر آنے لگا..... آن کی آن میں کمرے کا ماحول ہی بدل گیا۔

یہ مانا کہ تم لوگ بہت مصروف ہو گئے ہو مگر اب ایسا بھی کیا کہ بیماری آزادی کی خبر بھی نہ ملے۔“

خالہ اپنی ضعیفی کے باوجود بڑی چاق و چوبند نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے موقع غنیمت دیکھ کر گلہ کر دیا۔

”ارے نہیں خالہ جان، ایسی کوئی بات نہیں، عزیزہ کی طبیعت بالکل اچانک ہی خراب ہوئی اور جیسے ہی ہم اسپتال آئے آپ کو بتایا۔“ بابا نے انہیں تسلی دی۔

نے تعارف کروایا۔

نجمہ خاتون کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

”اچھا اچھا..... ماشاء اللہ بڑی ہو گئی ہو۔“ جواباً اس نے مسکراتے پر اکتفا کیا..... دفعتاً فون کی گھنٹی بجی..... انہوں نے فون اٹھایا اور سر ہلا ہلا کے کچھ کہتی رہیں..... پھر فون بند کر کے اس کے پاس آئیں۔

”بیگم صاحبہ کا فون تھا۔ تمہارا ہی ذکر تھا..... آؤ، اندر آؤ، آرام سے بیٹھو..... میں تمہارے لیے کچھ پینے کو لاتی ہوں۔“ وہ مسکراتی ہوئی اندرونی سمت بڑھ گئیں اور وہ چاروں طرف دیکھتی ہوئی لاؤنج میں پڑے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ گھر میں خاموشی کا راج تھا۔

”واقعی یہاں تو بڑی تنہائی ہے، سناٹا ہے، بے چاری نانوں..... کیسے رہتی ہوں گی.....؟“ اس نے سوچا۔ نجمہ خاتون جوس لے کر آئی تھیں جو اس نے فوراً ہی پکڑ لیا۔

”بیٹا تم آرام سے بیٹھ کے پڑھو..... کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بتا دینا..... تھوڑی دیر میں کھانا لگ جائے گا کچھ کھانے کا دل چاہ رہا ہے تو بتاؤ..... بنوادوں گی۔“ انہوں نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

”نہیں..... شکریہ..... کوئی چیز نہیں چاہیے..... جو پکا ہے کھالوں گی۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے دوبارہ اندرونی سمت چلی گئیں اور نیہانے کتاب کھول لی مگر عجیب بات تھی..... اب اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگ رہا تھا۔ نظریں بار بار بھٹک کے کبھی پڑتیش لاؤنج کے ساز و سامان میں اٹکنے لگتیں تو کبھی قد آدم کشادہ کھڑکیوں کے راستے باہر نکل کے سرسبز باغیچے کے اونچے اونچے درختوں میں الجھ جاتیں..... وہ ٹھوڑی پہ ہتھیلی نکائے درختوں سے بھی اوپر نیلے آسمان پر تیرتے ہوئے سفید بادلوں کے رقص کو دیکھنے میں محو ہو گئی..... ہرے بھرے درختوں کے

پیچھے سے آسمان کتنا نیلا نظر آتا ہے..... یا پھر یہاں آسمان زیادہ نیلا ہے..... وہ اپنے گھر کی کھڑکی سے گھمبوں اور تاروں میں الجھے ہوئے آسمان کا موازنہ اس آسمان سے کرنے لگی۔

پانچ گھنٹے کیسے گزرے پتا بھی نہیں چلا..... اور بات کہ ان پانچ گھنٹوں میں اس نے پڑھائی کے علاوہ ہر کام کیا تھا..... نیچے کا سارا پورشن گھوم گیار کے دیکھ لیا..... باہر باغیچے کا چکر لگایا..... نجمہ خاتون کے ہاتھوں کی بنی ہوئی مزیدار بریانی اور کباب نوش جان کیے اور ذہن میں اٹھنے والی سرخوشی کی انوکھی لم کے تحت دو عدد خوب صورت نظمیں بھی کہہ ڈالیں۔ شاعری کے شوق کے ساتھ ساتھ اس کے اندر یہ وصف بھی موجود تھا۔ شام میں بابا کے ساتھ گھر واپس جاتے ہوئے وہ بہت خوش تھی۔

”خوب پڑھائی ہوئی آج.....؟“ بابا نے پوچھا۔ ”جی بابا.....“ اس نے ہونٹوں کا گوشہ دانتوں تلے دبایا۔

”چلو اچھا ہو گیا..... بے چاری صفیہ خالہ ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئی ہیں۔“ ”جی بابا.....“ اس بار اس نے بہت زور سے سر ہلایا۔ بابا ڈرائیونگ کی طرف متوجہ تھے اور اگلے دن کا سوچ سوچ کے مڑ جوش ہونے لگی۔ ٹین اٹیج کا جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔

اگلے دن وہ پورے اہتمام سے تیار ہوئے ”نواب ہاؤس“ پہنچی۔ نجمہ خاتون اس قدر خوش ہو کے ملیں کہ وہ ان کی محبت پر شرمندہ ہو گئی۔ ”بیٹا اب آپ اپنی پڑھائی کریں میں ذرا کچن دیکھ لوں۔“ خوب مزیدار مالٹے کا جوس پلانے کے بعد وہ اس سے بولیں۔

”آئی یہاں کوئی اسٹڈی ٹیبل نہیں ہے۔“

میرا مطلب ہے آج مجھے ذرا کچھ ڈایا گرامز کی پریکٹس کرنی ہے ٹیبل سے آسانی ہو جاتی۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

”ارے بیٹا ٹیبل کیا..... یہاں تو پورا کا پورا اسٹڈی روم موجود ہے۔ خوب بڑا سا..... ہزاروں کی تعداد میں تو کتابیں موجود ہیں۔“ انہوں نے فخریہ لہجہ میں کہا۔

”اسٹڈی روم..... کتابیں..... کہاں؟“ پڑھنے کی جنون کی حد تک شوقین نیہا کے منہ میں پانی بھرا آیا۔

”اوپر والی منزل پہ چلی جائیں..... پہلا کمرہ شہر یار میاں کا ہے..... اسی کے ساتھ اسٹڈی ہے..... یہ سب انہی کا تو شوق ہے جب گھر میں ہوتے ہیں تو وہ ہوتے ہیں اور ان کی کتابیں..... آپ چلی جائیں وہاں پر ٹیبل بھی مل جائے گی۔“ نجمہ خاتون ہاتھ سے زینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئیں اور وہ وفور اشتیاق سے کئی ٹیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر پہنچ گئی۔

بتایا ہوا کمرہ سامنے تھا دروازہ کھولا تو جیسے ونڈر لینڈ میں داخل ہو گئی۔ وسیع و عریض کمر اور مختلف شیلٹ میں کتابیں ہی کتابیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں..... وہ دیوانوں کی طرح لپک کر کتابیں نکال نکال کر دیکھنے لگی۔ ادب و شاعری کا ایک شاندار کیکشش اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ ان کا مالک انتہائی نفیس ذوق کا حامل ہے۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں ایک سرسری سا جائزہ لے لیا..... وہ ساری کتابیں جو وہ پڑھنا چاہتی تھی یہاں موجود تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے شروع کرے..... اس نے شہاب نامیہ سے آغاز کیا۔

یہ کتاب وہ پڑھنا چاہتی تھی..... اب نظر آئی تو مبرنہ ہو گیا..... پڑھتے پڑھتے اس وقت چونکی جب نجمہ خاتون کھانے کے لیے بلانے آئیں۔

منتظر بھار

”اوہ..... وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔“ کھانا کھانے کا اس کا قطعی دل نہیں چاہ رہا تھا مگر انہوں نے اس کے لیے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ پشتم کھانا کھا کر دوبارہ اوپر پہنچ گئی۔ بائیولوجی اور کیمسٹری کی کتابیں، اس کے بیگ میں ہی رہ گئی تھیں اور اس نے وہ ضخیم کتاب اگلے چند گھنٹوں میں مکمل پڑھ ڈالی..... ساڑھے چار ہو چکے تھے۔ پانچ بجے تک اسے اسپتال پہنچنا تھا۔ نانو واپس آ جاتیں اور وہ اماں کے ساتھ رہتی۔ ساڑھے سات بابا بھی آفس سے آ جاتے اور نو بجے تک تہینہ پھپھو کی آمد ہو جاتی تو وہ اور بابا واپس آ جاتے لیکن اس کا فائدہ کیا ہوا..... دو دن تو یونہی نکل گئے اسے شرمندگی سی محسوس ہوئی، پڑھائی تو نہ کل ہوئی نہ آج۔

اس کا ذہن شہاب نامہ کے اسرار و رموز میں الجھا ہوا تھا، اب کچھ اور پڑھنے کے قابل نہیں تھا..... سو اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور اسٹڈی سے باہر آ گئی۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا..... اس نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کے اندر جھانکا اور ساکت ہو گئی۔

پریوں کے دیس کی ایسی خوابگاہیں شاید اس نے خواب میں دیکھی ہوں گی..... اس کے پسندیدہ کمر لائٹ گرے اور سفید کے مینیشن والی دیواریں اور فرنیچر ایک دوسرے کی خوب صورتی بڑھا رہے تھے..... کھڑکی پہ لائٹ گرے دبیز پردے اطراف میں تھے اور خوب صورت سفید جالی کا پردہ کھڑکی کو ڈھانکے ہوئے تھا..... اور کھڑکی کے شفاف شیشوں سے وہی ہرے بھرے باغیچے کے اونچے گھنے درخت نظر آرہے تھے۔ اس نے بے اختیار ہو کے اندر قدم رکھ دیا۔ کمرے کی بائیں دیوار پہ ایک پورٹریٹ موجود تھا۔ ایک اسمارٹ سانو جوان ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا گویا کہہ رہا ہو..... ”ہوں..... کسی کے کمرے میں بغیر اجازت آنا بری

”آج اچانک ہی پہنچ گئے ہیں صاحبزادے.....
نجمہ نے مجھے فون کر کے بتایا۔ ابھی میری بات نہیں ہوئی
ہے اس سے..... اب گھر جا کے ملاقات ہی کروں
گی۔“ نانو مسکرائیں۔

”خالہ اب آپ جائیں..... بیٹے سے ملیں،
میں نے ٹھیک ٹھاک تنگ کیا آپ کو۔“ اماں نے ان
کا ہاتھ محبت سے تھام کے کہا جو وہ اماں کے بازو پہ
رکھے ان کے بیڈ کے ساتھ کھڑی تھیں۔

”ارے بیٹا تنگ کیا کرنا..... سگی خالہ ہوں
تمہاری..... یہ اور بات کہ آج کل کی نام نہاد
مصروفیت کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے مل نہیں
پاتے، ملاقات نہیں ہوتی تو کیا..... خون کا رشتہ تو
خون ہی کا ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں اپنے نہ کام
آئیں تو کون آئے گا۔“ صفیہ خالہ نے اماں کو محبت
سے گھر کا۔

”میں اب چلتی ہوں..... کل اپنے وقت پر
آؤں گی۔“ انہوں نے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے کہا۔
”ارے خالہ کل آپ شہر یار کے ساتھ وقت
گزاریں، نہ جانے کتنے دنوں کے لیے آیا ہے، یہ نہ
ہو کہ دوبارہ بیگ اٹھائے اور کہیں اور نکل لے۔“
اماں جلدی سے بولیں۔

”نہ بھئی نہ..... اب ڈیوٹی سنہالی ہے تو پوری
بھی کروں گی..... کل بھی آؤں گی اور پرسوں
بھی..... پھر تو انشاء اللہ چھٹی ہو جائے گی تمہاری۔“
انہوں نے اماں کا ماتھا چوما اور اسے گلے سے لگا کر پیار کیا۔

اماں بالکل انہی کی طرح تھیں..... شکل میں
بھی اور مزاجاً بھی..... دونوں بہنوں میں دو سال کا
فرق تھا۔ اللہ انہیں زندگی دے..... جب بھی انہیں
دیکھتی ہوں اماں بہت یاد آتی ہیں اللہ خاص طور پر.....
اس مشکل گھڑی میں ان کے باہر جانے کے بعد اماں
حسرت سے بولیں۔ وہ ماں کے قریب آ کے ان کا سر
سہلانے لگی۔

”بیٹا آپ یہاں ہیں..... نیچے ڈرائیور آپ کا
انتظار کر رہا ہے۔“
”جی آئی چلیں۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی.....
پھر شہر یار کی طرف دیکھ کر بولی۔
”اللہ حافظ.....“

”پورے دس دنوں کے بعد آئے ہیں شہر یار
میاں..... فیصل آباد گئے ہوئے تھے۔ فیکٹری لگا
رہے ہیں وہاں۔ ایک فیکٹری کراچی میں ہے، ایک
لاہور میں اب یہ ایک اور..... اتنی دولت..... اتنا بڑا
گھر..... کس کام کا شادی ہی نہیں کرتے..... آپ
نے دیکھا کتنے اچھے لگتے ہیں..... سو لڑکیاں، عورتیں
مرتی ہوں گی ان پر..... صحیح وقت پر شادی کر لیتے تو
آج آپ کی عمر سے تھوڑے چھوٹے ان کے بچے
ہوتے..... آپ کی اماں کے تو ہم عمر ہیں..... شاید
چھ آٹھ مہینہ چھوٹے ہوں گے..... اب دیکھیں ماشاء اللہ
..... عزیزہ بی بی کے بچے جوان ہیں۔“ جو اب شہر یار
نے بھی اللہ حافظ کہا۔ زینہ اترتے ہوئے نجمہ خاتون
اسے بتانے لگیں..... وہ بولتی رہیں اور یہ سنتی
رہیں..... ڈرائیور نے میں ڈرائیور گاڑی کے ساتھ
مستعدی سے کھڑا ہوا تھا۔

”اچھا آئی آپ کا بہت شکریہ..... اللہ
حافظ۔“ وہ مسکراتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔
”اچھا بیٹا اللہ حافظ..... کل ضرور آنا..... تمہارا
آنا اچھا لگتا ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔
اسپتال پہنچی تو اماں اور نانو نے مسکرا کر
استقبال کیا۔

”پڑھ آئی میری بیٹی.....؟“ اماں نے محبت
سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی اماں۔“ اس نے نگاہیں چرائیں۔
”شہر یار ماموں سے ملاقات ہوئی؟“ نانو کا
چہرہ کھلا ہوا تھا۔
”جی نانو.....“ وہ اپنی گھبراہٹ چھپا کے بولی۔

”امی کی خالہ..... خالہ..... خالہ..... اوہو، کہیں تم
عزیزہ کی بیٹی تو نہیں ہو؟“ اجنبی کا لہجہ ایک دم نرم
ہو گیا، وہ آپ سے تم پہ آ گیا۔

”جی بالکل..... وہ اسپتال میں ہیں ناں نانو
کے پاس ہیں اور میں ادھر..... پڑھنے کے لیے آئی
ہوں۔“ اس نے انک انک کے بتایا۔

”اسپتال میں..... خیریت کیا ہوا عزیزہ
کو.....؟“ انہوں نے اماں کا نام بے تکلفی سے
لیتے ہوئے دریافت کیا۔

”ان کا آپریشن ہوا ہے، اب ٹھیک ہیں شاید دو
تین دنوں تک چھٹی ہو جائے گی۔“ وہ جلدی سے بولی۔
”اچھا..... اچھا، ماما واپس آئیں گی تو میں بھی
اسے دیکھنے جاؤں گا۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”جی..... اب میں جاؤں۔“ اس نے ڈرتے
ڈرتے پوچھا۔ جواب میں انہوں نے قدرے حیرت
سے اسے دیکھا۔

”ہاں ہاں جاؤ، ویسے کوئی چیز چاہیے تھی
تمہیں؟“

”نہیں، میں تو اسٹڈی میں پڑھ رہی تھی.....
باہر نکلی تو آپ کا کمرہ نظر آیا..... یہ کلر میرا فیورٹ
ہے، آپ کا کمرہ بھی بہت خوب صورت ہے۔ میں
اسے دیکھنے رک گئی۔ آئی ایم سوری..... مجھے نہیں
معلوم تھا کہ آپ اندر ہیں۔“ اس کے اوسان اب
بحال ہو چکے تھے۔

”اس اوکے..... کوئی بات نہیں..... ہاں یہ
میرا بھی پسندیدہ رنگ ہے۔ تمہیں اچھا لگا میرا
کمرہ؟“ وہ پہلی بار مسکرائے۔

”جی بہت زیادہ..... آپ کا پورا گھر ہی بہت
خوب صورت ہے۔“ وہ بھی مسکرائی۔

”تھینک یو.....“ انہوں نے سر ہلایا۔
نجمہ خاتون اپنا بھاری بھر کم وجود سنہیالے زینہ
چڑھنے کے بعد ہانپتی کانپتی اس کے سامنے تھیں۔

بات ہے۔“ وہ ایک دم شرما گئی..... کس قدر خوب
صورت پورٹریٹ ہے..... جیسے رنگ بول رہے ہوں
کچھ کہتی ہوئی آنکھوں میں زندگی تھی..... یوں لگ رہا
تھا جیسے نوجوان ابھی بول پڑے گا..... وہ محویت سے
اس تصویر کو دیکھنے لگی۔ دفعتاً اس کی پشت پر کسی کے
کھنکھانے کی آواز آئی۔ اچھی بھلی مردانہ کھنکھار سن
کے اسے گویا چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگا ہوا، وہ
چونک کے مڑی اور ساکت رہ گئی۔ تصویر میں موجود
نوجوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔..... بس تھوڑا سا
فرق تھا۔ اس نوجوان کے بال کنپٹیوں پر گرے
ہو چکے تھے اور ہونٹ شرارت بھری مسکراہٹ سے
عاری تھے البتہ آنکھوں میں حیرت تھی۔ اس کی اوپر کی
سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

”جی فرما میں.....؟“ ان کے لہجے میں قدرے
بیزاری تھی۔

”میں وہ..... السلام علیکم.....“ نیہا کو لگ رہا تھا
جیسے اس کا دل پسلیاں توڑ کے باہر نکل جائے گا.....
زبان ایک دم اکڑی گئی تھی اور ذہن نے کام کرنا
چھوڑ دیا تھا۔

”وعلیکم السلام..... آپ کون ہیں؟“ اجنبی نے اس
کی غیر ہوئی ہوئی حالت دیکھ کر قدرے نرمی سے پوچھا۔
”نیہا زبیر اختر.....“ اس نے تھوک نلگتے
ہوئے جواب دیا۔

”بیٹھ جائیں۔“ انہوں نے پاس رکھی ہوئی
کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا دل کمرے سے
چھلانگ مار کے بھاگ جانے کا چاہ رہا تھا مگر اجنبی
کے لہجے میں حکم سا تھا۔ وہ ناچار بیٹھ گئی۔ ”میں شہر یار
ہوں..... کیا آپ ماما کی کوئی جاننے والی ہیں؟“ اس
نے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”جی وہ میری نانو ہیں..... میرا مطلب ہے کہ
وہ میری امی کی خالہ ہیں۔“ اس نے خود پہ قدرے
قابو پا کے جواب دیا۔

صرف ایک خاتون خانہ ہی کر سکتی ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف اس پر اماں کے اسپتال جانے کے بعد ہوا۔ گوکہ بے چاری تہینہ پھونے ذلت دار یوں کا بڑا حصہ سنبھال رکھا تھا مگر وہ گھر کی فردنہ تھیں سو چھوٹے موٹے بے شمار بکھیرے از خود اس کے حصے میں آگئے تھے۔

”اُف اماں۔۔۔ آپ کتنا کام کرتی ہیں، وہ بھی اس خاموشی سے کہ ہمیں پتا نہیں چلتا۔“ اس نے بابا اور آزر کے کپڑے پر لیس کر کے ہنگ کیے اور ناشتے کی تیاری کرتے ہوئے سوچا۔۔۔ ان دونوں کا ناشتا ٹیبل پر رکھ کے اسے جلدی جلدی تیار ہو کر ان کے ساتھ ہی روانہ ہونا تھا۔۔۔ بابا، آزر کو اسکول چھوڑتے ہوئے اسے اسپتال ڈراپ کرتے تھے۔ وہ وہاں پہنچ کر تہینہ پھونے کو گھر بھیج دیتی تھی۔ گیارہ بجے تک صفیہ خالہ آتی تھیں۔۔۔ آج ان کے گھر جانے کا خیال خواہ مخواہ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے کر رہا تھا۔ ”میں آج نہیں جاؤں گی۔“ اس نے از خود فیصلہ کیا لیکن صفیہ خالہ کے پہنچنے کے بعد اس کا فیصلہ ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ اماں کی حالت بہت اچھی تھی۔۔۔ اس نے محبت سے اماں کا ماتھا چوما۔ اسپتال میں کسی کے داخل ہونے اور بیمار ہونے کا خیال روح فرسا سہی مگر یہاں داخل ہونے کے بعد مرض سے نجات پا کے مریض جب روبہ صحت ہونے لگتا ہے اور اس کے چہرے کی سرخی اور آنکھوں کی چمک واپس آنے لگتی ہے تو یہی جگہ امیدوں اور خوشیوں کی آماجگاہ بھی بن جاتی ہے۔

وہ اماں کو گھر کی اور اماں اسے اسپتال کی روداد سناتی رہیں۔۔۔ یہاں تک کہ صفیہ خالہ لدی پھندی پہنچ گئیں۔۔۔ ڈرائیو سارا سامان کمرے میں رکھ کے باہر چلا گیا۔۔۔ اماں ایک دم شرمندہ ہو گئیں۔

”خالہ آپ روز اتنی ساری چیزیں لے آتی ہیں۔“ اماں کو قسقی اشیا کے استعمال کی اجازت مل

چھوڑ دینے سے ایسی ہی آفتیں نازل ہوتی ہیں۔۔۔ بے چاری صفیہ خالہ اب کتنی پریشان ہیں شہر یار کی طرف سے۔“ اماں نے افسوس کا اظہار کیا۔

دروازے پر دستک ہوئی اور بابا پھپھو کو لیے اندر داخل ہوئے۔۔۔ دعا سلام کے تبادلے کے بعد بابا اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”تیاری کیسی ہوئی آج؟“

”اچھی ہو گئی ہے بابا۔۔۔“ وہ ہونٹوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے بولی۔

”شکر ہے مالک کا۔۔۔ جس نے سارے مسائل حل کر دیے اور عزیزہ کو صحت بھی عطا کی۔“ بابا شکر گزاری سے بھرپور لہجے میں گویا ہوئے۔

”تہینہ آپ اپنا گھر چھوڑ کے آئیں اور ہمارے گھر کو سنبھال لیا۔۔۔ آپ کا یہ احسان تو میں کبھی اتار نہیں سکتی۔“ اماں مسکرائیں۔

”اپنوں میں احسان کی کیا بات۔۔۔ میرا کون سا دس پندرہ لوگوں کا خاندان ہے۔۔۔ ایک میاں اور ایک ہی بیٹا۔۔۔ اور بیٹے صاحب خود عنقریب کراچی سدھارنے والے ہیں۔۔۔ جاب ہو گئی ہے ان کی یہاں۔۔۔ مجھے تو اب اپنی گھرداری سے فارغ ہی سمجھو۔“ تہینہ پھپھو مسکرائیں۔

”پھر بھی آپا۔۔۔ آپ کی آمد سے ہم سب کو بہت حوصلہ ہوا ہے۔۔۔ خیر اب تو انشاء اللہ ایک دو دن میں چھٹی ہو جائے گی۔“ بابا بھی مسکرائے۔

”شکر ہے اسپتال سے جان چھوٹے گی۔“ اماں نے گہری سانس لی۔

”اسپتال سے جان چھوٹ جائے گی مطلب اب میں نواب ہاؤس کیسے آؤں گی؟“ یہاں سوچا۔

☆☆☆

گھر سنبھالنا کوئی اتنا آسان کام بھی نہیں ہے۔۔۔ بظاہر جیسے جمائے گھر کے کونوں کھدروں میں بے شمار کام چھپے ہوئے ہوتے ہیں جن کا ادراک

کہاں ہم۔۔۔ پھر تقسیم کے بعد نہ نوابی رہی نہ ہی ٹھاٹ۔۔۔ لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ ہاتھی مرے بھی تو سوا لاکھ کا۔۔۔ سب کچھ ہاتھ سے جانے کے بعد بھی بہت کچھ ہے۔۔۔ نواب خالو کے انتقال کے بعد سب شہر یار ہی سنبھالتے ہیں اور خوب سنبھالتے ہیں۔“ اماں نے تفصیل بتائی۔

”آپ کو پتا ہے انہیں کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔۔۔ اتنا بڑا سا تو ان کا اسٹڈی روم ہے اور اس میں بے شمار کتابیں ہیں۔۔۔ سچ اماں میرا دل چاہ رہا ہے کہ وہاں روز جاؤں اور ساری کتابیں پڑھ ڈالوں۔“ وہ بے صبری سے بولی۔

”ہاں، مجھے پتا ہے اسے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے، بچپن ہی سے کتابی کیزا رہا ہے وہ۔۔۔ تعلیم کے معاملے میں بھی خوش نصیب نکلا۔۔۔ پہلے پاکستان میں پھر باہر جا کے نہ جانے کون، کون سی ڈگریاں حاصل کی ہیں اس نے۔“ اماں نے تفصیل بتائی۔

”انہوں نے شادی کیوں نہیں کی۔ اتنے بڑے تو ہو گئے ہیں۔“ یہاں دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

”پتا نہیں کون سا آئیڈیل ہے جو ابھی تک مل نہیں پایا اسے۔“ اماں اپنی جھونک میں کہہ گئیں، پھر فوراً ہی سنبھل کے بولیں۔ ”لڑکی خیال رکھنا وہ میرا بھائی ہے، رشتے میں تمہارے ماموں ہوئے۔۔۔ یہ نہ ہو کہ کرید کرید کے معلومات حاصل کرو اور پھر اس بے چارے کو کزن سمجھ کے چھیڑنا شروع کر دو۔“

اماں کی تنبیہ پر وہ شرمندہ ہو گئی۔

”میں بھلا کیوں چھیڑنے لگی اماں۔۔۔ میری کون سی ان سے گپ شپ ہوئی ہے، میں تو بس ویسے ہی۔“ وہ گھبرا کر بولی۔

”لڑکے، لڑکیوں کی شادی کی ایک عمر ہوتی ہے۔۔۔ ماں باپ کو چاہیے کہ اس مناسب وقت پر بچے کے ان کے ہاتھ پیلے کر دیں۔ ورنہ ان کے حال؟

”بہت محبت کرتی ہیں آپ سے۔“

”ہاں اور آج عالیہ بھی آئی تھی مجھے دیکھنے۔“

اماں مسکرائیں۔

”عالیہ خالہ آپ کی عمر کی ہیں؟“ اس نے۔۔۔ سرسری انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ میری عمر کے تو شہر یار ہیں۔۔۔ میری امی کے ہاں نزہت باجی ہوئیں پھر ان کے دو سال بعد میں پیدا ہوئی۔ اس سے کچھ ماہ قبل صفیہ خالہ کی شادی ہوئی تھی اور میری پیدائش کے چند ماہ بعد شہر یار پیدا ہوئے پھر اسفند یار اور سب سے چھوٹی ہیں عالیہ۔“ اماں نے جلدی سے حساب کتاب لگا کے بتایا۔

”ہمارے ایک ماموں بھی تھے، سب سے چھوٹے، وہ بے چارے اپنے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔“ اماں اب ماضی میں پہنچ چکی تھیں۔۔۔ اور اس کا کام تھا اماں کی یادوں میں ان کا ساتھ دینا۔۔۔ وہ اماں کے بیڈ کے پاس ہی کرسی بچھنے کے بیٹھ گئی اور ان کے سر کے ساتھ اپنا سر بھی رکھ لیا۔

”تھک گئی ہو؟“ اماں نے محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

”نہیں تو۔۔۔ آپ مجھے بتائیں سب کے بارے میں۔۔۔ بہت مزہ آتا ہوگا جب آپ لوگ بچپن میں ایک ساتھ کھیلتے ہوں گے۔ آپ کی خالہ کا گھر تو بہت بڑا ہے۔۔۔ پورا محل ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”تو خالو ابانا نام کے نواب تھوڑی تھے۔ ارے وہ اصل میں نواب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ شان و شوکت والا خاندان تھا ان کا۔ تقسیم سے قبل تو ان کے باپ دادا کی جاگیریں تھیں، حویلیاں تھیں، نہ جانے کیا کیا کچھ تھا۔۔۔ ہماری اماں کی چھٹی بیاہ کے گئی تھیں اس خاندان میں۔۔۔ جھٹ اپنی بیٹی یعنی صفیہ خالہ کو بھی لے گئیں۔ ورنہ کہاں وہ،

154 جولائی 2013ء

ماہنامہ پاک سوسائٹی

155 جولائی 2013ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئے ہاتھوں کو تاپیں..... ایک کپ گرم ماگرم کافی کا پیئیں اور وہیں کرسی پر بیٹھ کر اپنی پسندیدہ کتاب کا مطالعہ کریں..... کتنا مزہ آتا ہے.....“ وہ بے پناہ ایکسائڈ ہو گئی۔ شہر یار کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، بادل خوب زور سے گرجے اور بارش تیز ہو گئی۔

”برف باری نہیں تو خیر ہے..... بارش بھی تو اچھی ہوتی ہے..... ہے ناں.....“ شہر یار کی آواز کے ساتھ ساتھ ان کا لہجہ بھی بہت خوب صورت تھا۔ ”بہت زیادہ.....“ اس نے ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال دیے، بارش کی بوندیں اس کی ہتھیلی کو بھگونے لگیں۔ بادل ایک بار پھر زور سے گرجے اور بجلی چلی گئی..... کمرے میں ایک خوابناک سا اندھیرا چھا گیا..... وہ جیسے ایک دم اپنے حواسوں میں آ گئی۔ بارش نے تو جیسے اسے ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔ اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھ اندر کھینچ لیے۔

”گھبراؤ نہیں..... ابھی جنرل آؤں ہو جائے گا۔“ شہر یار اس سے دو قدم پیچھے ہٹ گئے پھر ایک دم مڑے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ وہ خواہ مخواہ شرمندہ ہو گئی۔

نیچے سے جنرل آؤں ہونے کی آواز آئی اور پورا کمرہ دوبارہ روشن ہو گیا..... بارش میں شدت آ گئی تھی..... بجلی کی کڑک اور چمک نے سماں باندھا ہوا تھا..... وہ وہیں کھڑی بوندوں سے کھلتی رہی..... دل تو چاہ رہا تھا کہ نیچے لان میں دوڑ جائے اور اس بارش میں خوب نہائے..... مگر وہ اپنے گھر میں نہیں تھی۔ سو خود یہ بند باندھے وہیں کھڑی رہی۔

دروازہ کھلا..... اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا..... شہر یار ہاتھوں میں کافی کے دو مگڑے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

”میں نے سوچا تمہاری ایک خواہش تو میں بھی پوری کر سکتا ہوں.....“ انہوں نے نیبل پر رکھتے

انٹرک میں نے بڑی شاعری کی ہے۔“ وہ مسکرائے تو ان کے ہموار چمکیلے دانت نمایاں ہو گئے۔

”اچھا.....“ اسے حیرت ہوئی..... یہ کام تو وہ بھی ذوق شوق سے کیا کرتی تھی..... دفعتاً باہر بادلوں کے گرجنے کی آواز ابھری..... وہ دونوں چونک اٹھے۔

صبح جب نیہا یہاں آئی تھی تو چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ شہر یار نے اٹھ کر کھڑکیوں پہ سے بھاری پردے ہٹائے..... باہر کا منظر بدل چکا تھا۔ قدر آدم کھڑکیوں کے باہر دلکش نظارہ موجود تھا۔ آسمان پر اجالک گہرے بادل چھا چکے تھے۔ مست ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ بارش شروع ہو چکی تھی۔ وہ بے قرار ہو کے کھڑکی کے قریب آ گئی۔

”مجھے بارش بہت پسند ہے۔“ وہ خوشی سے۔

شہر یار کے بولی۔

”مجھے بھی۔“ شہر یار کی نگاہیں خلا کی وسعتوں میں بھٹک رہی تھیں۔

”مجھے تو برف باری بھی بہت پسند ہے..... مگر کراچی میں ہوتی ہی نہیں۔“ وہ منہ بسور کے بولی۔

”ایک دفعہ دو یا تین سال پہلے کی بات ہے ہم لوگ پھیو کے پاس لاہور گئے تھے پھر وہاں سے مری بھی گئے..... ہمارے جانے کے بعد وہاں برف باری شروع ہو گئی..... وہ دن میری زندگی کے یادگار دن تھے۔“

وہ ان دنوں کی یاد میں کھوسی گئی۔

”کتنا اچھا لگتا ہے ناں جب ہر چیز برف کی سفید چادر اوڑھ لیتی ہے، پہاڑ اور سارے درخت برف میں چھپ کے ایک رنگ کے ہو جاتے ہیں..... بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان ایک دم زمین پر اتر آتا ہے..... باہر برف سے کھیل کر جب گھر کے اندر داخل ہوں اور اپنے لانگ بوٹ اتاریں پھر مفلر اور ٹوپی اور اس کے بعد دستانے بھی اور پھر دھکتے ہوئے آتش دان کے پاس بیٹھ کر اپنے ٹھنڈے ہوتے

تھی..... وہ اٹھنے ہاتھ سے لکھتی تھی اور اس نے دیکھا کہ شہر یار بھی بائیں ہاتھ میں قلم تھامے کسی پیپر پر کوئی چیز نوٹ کر رہے تھے..... یہ مماثلت کیا محض اتفاق تھی؟ وہ سانس روکے کرسی پر بیٹھی تھی۔

”ہاں، اب کہو کیسی ہو؟“ شہر یار دفعتاً مڑے اور بولے۔ وہ شاید اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔

”ٹھیک ہوں وہ بولی۔“

”اور تمہاری اماں.....؟“

”وہ بھی ٹھیک ہیں۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

”کل رات میں انہیں دیکھنے گیا تھا، شاید پرسوں تک چھٹی ہو جائے گی۔“ انہوں نے اس کے نزدیک آ کے رکھی ہوئی چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”جی۔“ وہ قدرے زور سے ہو گئی۔

”تیار کیسی ہو رہی ہے تمہارے ایگزامز کی؟“ اس بار انہوں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”اچھی.....“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”جب میں انٹر کا امتحان دے رہا تھا تو مجھے لگا تھا کہ میں دنیا کا مشکل ترین کام کر رہا ہوں پھر جب میں نے MBA کیا..... وہ مجھے اتنا مشکل نہیں لگا۔“ انہوں نے اپنی یادوں کو تازہ کیا۔ ”تم کیا کرو گی انٹر کے بعد؟“ انہوں نے پوچھا۔

”مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔“ وہ پہلی بار مسکرائی۔

اسے محسوس ہوا جیسے شہر یار چونکے ہوں..... مگر فوراً ہی وہ سیریس ہو گئے۔

”اوہ، اچھا آئیڈیا ہے، میرا چھوٹا بھائی بھی ڈاکٹر ہے، امریکا میں ہوتا ہے، اسے بھی بچپن ہی سے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا اور مجھے بابا کا بزنس سنبھالنا پڑا..... ورنہ سچ پوچھو تو شاید مجھے بھی ڈاکٹر بننا اس کا

سے زیادہ اچھا لگتا۔“ انہوں نے راز دارانہ انداز میں بتایا۔ وہ پھر مسکرائی۔

”ویسے یہ بھی ممکن تھا کہ میں شاعر بن جاتا۔“

گئی تھی..... اور خالہ کو اس بہانے ڈھیروں سامان اٹھالانے کا موقع مل گیا۔

”کہاں اتنی چیزیں ہیں..... تھوڑی بہت ہی تو ہیں.....“ وہ مسکرائیں۔ ”اور چلو بھئی..... تم تو سنبھالو اپنی کتابیں اور روانہ ہو جاؤ۔“ اب انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس نے جتنے بہانے سوچ رکھے تھے وہ آنا فانا ذہن سے نکل گئے..... وہ خاموشی سے کتابیں اٹھا کر باہر نکل گئی..... شاید وہ لاشعوری طور پر وہاں جانا چاہتی تھی۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ گھر پہ نہ ہوں۔“ اس نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی..... ”آج تو کچھ پڑھنا ضروری ہے..... فقط بارہ دنوں کے بعد ہی پہلا پیپر ہے۔“ اس نے اس بار ذہن کو یکسو کرنے کی کوشش کی۔

اس نے اسٹڈی کا دروازہ کھولا اور اس کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ سامنے ہی شہر یار کھڑے بک شیلف سے کچھ کتابیں نکال رہے تھے..... اسے دیکھ کر قدرے چونکے پھر مسکرائے اور بولے۔

”آؤ، آؤ رک کیوں گئیں؟“ وہ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔

”السلام علیکم.....!“ اس کی آواز مری مری سی تھی۔

”وعلیکم السلام.....“ وہ جواب دے کر دوبارہ شیلف کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس نے چورنگا ہوں سے ان کا جائزہ لیا۔ وہ لائٹ گرے شلوار قمیص میں ملبوس تھے..... ان کا قد لمبا تھا اور جسم کسرتی.....

کنپٹیوں پہ ہلکے ہلکے سفید بال ان کی شخصیت کے وقار میں اور اضافہ کر رہے تھے..... انہوں نے رسٹ وائچ دائیں کلائی پر پہنی ہوئی تھی..... نیہا نے ایک نظر اپنے کپڑوں پہ ڈالی..... اس کا لباس بالکل اسی رنگ کا تھا اور یہ اس کا پسندیدہ رنگ تھا اور اتفاق ہی تھا کہ وہ بھی رسٹ وائچ سیدھی کلائی پر ہی باندھتی

تھی..... وہ بھی ممکن تھا کہ میں شاعر بن جاتا۔“

”وہ بھی ممکن تھا کہ میں شاعر بن جاتا۔“

”وہ بھی ممکن تھا کہ میں شاعر بن جاتا۔“

”وہ بھی ممکن تھا کہ میں شاعر بن جاتا۔“

”وہ بھی ممکن تھا کہ میں شاعر بن جاتا۔“

”وہ بھی ممکن تھا کہ میں شاعر بن جاتا۔“

”وہ بھی ممکن تھا کہ میں شاعر بن جاتا۔“

کام ہیں، شہر یار میاں بتا کے گئے ہیں تو اب میں افشاں کو لے کر یہ سارے کام نبھانے جا رہی ہوں..... دو تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے، میں نے سوچا آپ کو بتادوں کہیں میں بھول جاؤں اور آپ بھوکی پیاسی بیٹھی رہیں۔“ وہ کہتے ہوئے باہر نکلنے لگیں۔

ان کے نکلنے سے پہلے ہی افشاں وہاں موجود تھی۔ افشاں اوپر کے کام کرنے والی عورت تھی جو جھاڑ پونچھ اور صفائیوں پر مامور تھی۔

”باجی جی میرا خاوند آگیا ہے جی..... مجھے لینے واسطے.....“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”تمہارا خاوند آج اتنی جلدی کیوں آگیا بھی؟“ نجمہ خاتون حیرانی سے بولیں۔

”وہ جی میری ساس غسل خانے میں پھسل گئی ہے۔ ہڈی شڈی تڑوا بیٹھی ہے۔ مجھے جانا ہوگا۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”آج تو.....“ نجمہ خاتون کچھ کہتے کہتے رک گئیں پھر سر پہ ہاتھ مار کے بولیں۔ ”جاؤ بھئی جاؤ.....“

تم جاؤ۔ اکیلی ہی کرلوں گی میں۔“ وہ افشاں کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ نہا نے تھوڑی دیر سوچا..... پھر اگلے ہی منٹ میں وہ شہر یار کے کمرے میں گئی۔ نجمہ خاتون وسیع دُریض الماریوں کے پٹ کھولے کھڑی تھیں اسے دیکھ کے چونکیں۔

”میں نے سوچا آپ اکیلی ہوں گی شاید آپ کو میری مدد کی ضرورت ہو۔“ اس نے قریب آ کر کہا۔

”جیتتی رہو بیٹا..... واقعی مجھے کسی کی مدد کی ضرورت تو ہے..... مگر تمہاری پڑھائی؟“ انہوں نے تکلف برتا۔

”کوئی بات نہیں..... مجھے بتائیں اگر کوئی کام ہو تو؟“

”بس بیٹا الماری خالی کرنی ہے۔“ انہوں نے الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ الماری کھلی ہوئی تھی اور اس میں شہر یار کے متعدد سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ ”سب سے پہلے یہ دائیں طرف

آنکھیں ڈبڈبائے لگیں..... اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ باہر جائے اور شہر یار کو پکڑ کے واپس لے آئے اور اپنے سامنے لا کر بٹھا دے لیکن یہ ممکن کب تھا..... شہر یار کے جاتے ہی اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ مردہ دلی سے اٹھی اور دوبارہ کھڑکی پہ جا کے کھڑی ہو گئی۔ بارش کے بعد ہر چیز نکھر کے صاف ستھری ہو گئی تھی۔ نیلگوں آسمان پر سفید، سفید بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے اور سورج بادلوں کی اوٹ سے جھانکنے کو بے تاب تھا۔

ڈرائیو وے پہ گاڑی اور ڈرائیو مستعدی سے کھڑا تھا۔ اس نے شہر یار کو گاڑی کے پاس جاتے ہوئے دیکھا۔ اب وہ ڈارک گرے شرٹ اور بلیک

پینٹ میں ملبوس تھے..... غالباً کہیں جا رہے تھے۔ ڈرائیو نے کار کا دروازہ کھولا اور شہر یار اس میں بیٹھنے لگے۔ بیٹھنے سے پہلے انہوں نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا..... وہ اپنی جگہ سن ہو گئی..... انہوں نے ہاتھ

اٹھا کے اسے ویو کیا..... شاید مسکرائے بھی تھے..... وہ قدرے شرمندہ ہو گئی..... جواباً اس نے بھی ہاتھ ہلایا۔ ڈرائیو گاڑی باہر نکال لے گیا..... چوکیدار

نے دروازہ بند کر دیا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ نہا کے ہونٹوں پر دوڑ گئی۔

”بیٹا آپ پڑھ رہی ہیں؟“ دروازے پر دستک ہوئی اور نجمہ خاتون اندر داخل ہوئیں۔

”جی آئی.....“ اس نے گھبرا کے جلدی سے میز پر پڑی کتاب اٹھالی۔

”ٹھیک ہے بیٹا تھوڑی دیر کے بعد کھانا لگ جائے گا تو پیچھے جا کے کھا آنا۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”آپ کہیں جا رہی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، میں کہاں جاؤں گی..... اصل میں آج شہر یار میاں کے کمرے کی الماریوں کی صفائی کرنی ہے..... پرانے کپڑے الگ کرنے ہیں، کچھ سوٹ

لٹکا جو ڈرائی کلین کروانے ہیں..... اور بہت سارے

.....

.....

دم پوچھا۔

”ہاں، ظاہر ہے، میرے کاموں کی نوعیت ایسی ہے کہ مجھے شہروں، شہروں گھومنا پڑتا ہے..... بابا

کے بزنس امپائر کا ہیڈ آفس یہاں ہے..... لاہور اور فیصل آباد میں فیکٹریز ہیں..... بس آنا جانا لگا رہتا ہے۔“ انہوں نے کندھے اچکائے۔

”آپ اتنے مصروف رہتے ہیں..... آپ کی فیلڈ بھی اتنی بورنگ ہے..... پھر بھی آپ کو کتابیں

پڑھنے اور جمع کرنے کا اس قدر شوق ہے۔“ اس نے ذہن میں آئی حیرت کو زبان دے دی۔

”ساری مصروفیات اپنی جگہ..... اچھی کتابوں سے بہتر رفیق اور کوئی نہیں..... یہ ساتھ تو بہت پرانا ہے۔“ وہ مسکرائے۔

”کتابوں کو رفیق بنا کے آپ مطمئن ہو گئے اسی لیے آپ نے شادی نہیں کی۔“ غلط وقت پر یہ نامناسب سوال اور غلط جگہ پر..... اس نے گھبرا کر

دانتوں تلے زبان دبالی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس نے کن آنکھوں سے شہر یار کی طرف دیکھا۔

”تمہاری عمر کتنی ہے؟“ وہ مسکرا رہے تھے۔

”اٹھارہ سال.....“ اگست میں پورے انیس کی ہو جاؤں گی۔“ وہ حیران ہوئی۔

”میری عمر چالیس برس ہے، تمہاری اماں کی عمر کا ہوں تقریباً..... کیا یہ سوال تمہیں مجھ سے کرنا

چاہیے؟“ انہوں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

”سوری.....“ وہ جھینپ کے بولی۔

”اب تم اپنی اسٹڈیز پر دھیان دو..... میں چلا ہوں۔“ وہ کھڑے ہو کے بولے اور کمرے سے باہر

نکل گئے..... نہا کو لگا جیسے ان کے جاتے ہی ہر چیز بے جان ہو گئی ہو۔ وہ اپنی بدلتی ہوئی کیفیت پر ہراساں ہو گئی۔

باہر بارش رک گئی تھی..... اچانک شروع ہونے والی بارش..... اچانک ہی تھمی تھمی۔ اس کی

.....

ہوئے کہا۔

وہ حیران رہ گئی..... اس وقت اس کا دل شدت سے کافی پینے کو چاہ رہا تھا۔

”آؤ..... سوچ کیا رہی ہو۔“ انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آہستہ آہستہ

چلتی ہوئی ان کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تمہیں اس بارش کی خاصیت کا پتا ہے؟“ انہوں نے کافی کا پہلا سپ لیتے ہوئے سوال پوچھا۔

اس نے حیرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ بادل ابر عیساں کہلاتے ہیں..... موسم بہار خصوصاً اکیس مارچ کے دو تین ہفتوں بعد ہونے

والی اس بارش میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ جب اس کے قطرے سیپ کے پیٹ میں جاتے ہیں تو سچا موتی

بناتے ہیں..... پانی کے ہر قطرے میں یہ طاقت نہیں ہوتی..... صرف انہی دنوں کی بارش کی بوندوں میں

اللہ تعالیٰ نے یہ وصف رکھا ہے بہت خاص ہوتی ہے یہ بارش..... ویسے تو بارش اللہ کی رحمت ہے ہی اس کے علاوہ ان بوندوں میں کئی بیماریوں سے شفا بھی

ہوتی ہے۔“ وہ اسے معلومات دیتے ہوئے مسکرائے۔ جواباً وہ بھی مسکرائی۔

کافی بہت اچھی بنی تھی جیسی اس نے پوچھا۔ ”یہ کافی آپ نے خود بنائی ہے؟“

”کیسی ہے پہلے یہ بتاؤ۔“ ان کا لہجہ شوخ ہو گیا۔

”بہت اچھی.....“ اس نے اعتراف کیا۔

”مجھے صرف کافی بنانی آتی ہے اور گھر کے سارے کاموں سے نابلد ہوں۔“ انہوں نے

بتایا۔ ”جب اپنے گھر میں ہوتا ہوں تو دل بھر کے کتابیں پڑھتا ہوں اور پیٹ بھر کے کافی پیتا ہوں۔“ انہوں نے کافی ختم کر کے گنگنیل پر رکھا۔

”آپ پھر چلے جائیں گے؟“ اس نے ایک

گھر ہے..... تمہارے آنے سے کتنی رونق ہو گئی ہے یہاں۔“ وہ مسکرا کے بولیں۔

”یہاں نے اوپر جانے کے لیے زینے کی طرف قدم بڑھائے۔

”ہاں، کل شہر یار میاں اپنے کمرے کی نئی سیٹنگ سے بہت متاثر ہوئے تھے، تعریف کر رہے تھے..... میں نے بتایا کہ سب تم نے کیا ہے۔“ انہیں ایک دم کچھ یاد آیا۔ ”یہاں کا دل زور سے دھڑکا..... وہ رک گئی۔

”اچھا ہی ہوا جو ان کی موجودگی میں ہی ان کے کمرے کی صفائی ہو گئی، ورنہ وہ چلے جاتے اور ان کے جانے کے بعد یہ سب ہوتا تو واپس آ کر سو سوال پوچھتے، یہ کہاں ہے، وہ کہاں رکھ دیا۔“ نجمہ خاتون

آج تو چھٹی ہونے والی ہے۔“ سلام دعا سے فارغ ہو کے اماں نے مسکرا کر پوچھا۔

”اس میں زحمت کون سی بیٹا..... اب ماشا اللہ۔ تم کافی بہتر ہو، آج گھر بھی چلی جاؤ گی۔ پھر نہ جانے میں وہاں آسکوں کہ نہ آسکوں۔ دور بہت ہے ناں تمہارا گھر اور یہ جگہ مجھ سے بہت قریب ہے..... میں نے سوچا آج ایک دن اور اپنی بیٹی کے ساتھ گزار لوں۔“

”محبت ہے آپ کی خالہ.....“ اماں مشکور نظر آنے لگیں۔

”چلو بھئی، تم تو روانہ ہو..... اپنے کام سے لگو۔“ صفیہ خالہ اسے دیکھ کر بولیں۔

”آج ذرا جلدی آ جانا، تمہارے بابا ساڑھے تین تک آنے کا کہہ گئے ہیں۔“ اماں نے اسے کتابیں سمیٹ کے نکلتے دیکھ کر مخاطب کیا۔

”جی اماں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ راستہ تو صرف پانچ منٹ کا تھا..... فوراً ہی گزر گیا۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے گاڑی سے اترتے ہوئے سوچنے لگی۔

”آج کا دن کیا رنگ دکھائے گا؟“ اسے اب شہر یار کے تصور سے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے لاؤنج میں بیٹھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے سیدھے اسٹڈی کی طرف جانا بہتر سمجھا..... مگر اپنی آمد کا نجمہ خاتون کو بتانا بھی تھا..... اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ نجمہ خاتون اسے زینے کے پاس ہی نظر آ گئیں۔ وہ شاید اوپر سے نیچے اترنے کے بعد اپنا سانس برابر کر رہی تھیں۔

”السلام علیکم.....“ وہ نزدیک پہنچ کر مسکرائی۔ ”وعلیکم السلام، جیتی رہو بیٹا.....“ وہ خوش دلی سے بولیں۔

”میں اسٹڈی میں چلی جاؤں.....“ اس نے رسماً اجازت لی۔

”ارے بیٹا پوچھنے کی کیا بات ہے..... تمہارا

سارا سامان جو رہ گیا ہے، لیتی آنا۔“ پھپھو نے اسے دیکھ کر سمجھایا۔

”ٹھیک ہے پھپھو۔“ اس نے سر ہلایا۔

”اچھا بھئی میں تو چلی..... اب گھر جا کے تمہارے استقبال کی تیاریاں بھی تو کرنی ہیں۔“ پھپھو نے اماں کو گلے لگا کر انہیں پیار کرتے ہوئے کہا۔

”اس رشتے کے حوالے سے بہت ساری متفی باتیں تو بہت مشہور ہیں مگر کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ مثبت بھی تو ہوتا ہی ہے۔“ یہاں نے تند بھانج کی محبت کے مظاہرے کو دلچسپی سے دیکھا۔

اس نے اپنے ننھیال میں بہت کم لوگوں کو پایا تھا۔ نانا، نانی تھے نہیں، بس ایک ہی خالہ وہ بھی بہت دور..... دوھیال قدرے بڑا تھا..... اسے یاد تھا کہ بچپن میں ان کے گھر میں بڑی رونق جما کرتی تھی..... دادا، دادی ان کے ساتھ ہی رہتے تھے.....

تہینہ اور ازینہ پھپھو کی شادیاں ان کے خالہ زادوں کے ساتھ ایک ہی گھر میں ہوئی تھیں اور وہ دونوں لاہور چلی گئی تھیں..... وقار چچا تو پڑھائی کے بعد سعودیہ سدھار چکے تھے..... دادا، دادی کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اماں نے بابا کی بہنوں کا میکا اور بھائی کا گھر آباد رکھا تھا۔ سارے پیچھے اڑان بھرنے کے باوجود جب بھی کبھی لوٹ کے آتے اماں اور بابا انہیں پھیلانے سب کو خوش آمدید کہنے کو ہمیشہ تیار ملتے..... رشتے ہمیشہ قربانیوں اور ایثار ہی سے مستحکم ہوتے ہیں۔

”اماں آپ کو کچھ چاہیے؟“ اس نے پھپھو اور بابا کے جانے کے بعد اماں سے پوچھا۔

”میرے سر میں اچھی طرح تیل لگا کے مالش کرو..... آج سر کچھ بھاری ہو رہا ہے۔“ اماں نے جواب دیا۔ وہ اماں کے سر کی مالش کرنے لگی کہ صفیہ خالہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

”ارے خالہ آپ نے آج کیوں زحمت کی،

والے پانچ سوٹ نکال دینا اب یہ استعمال نہیں ہوں گے اور اس کے ساتھ والے ڈرائی کلین کے لیے لائڈری بھیجنے ہیں.....“ انہوں نے تفصیل سے کہا ”یہاں آگے بڑھ کے سوٹ الگ کرنے لگی، الماری میں شہر یار کے پرفیوم کی مہک پھیلی ہوئی تھی..... وہی خوشبو جو ان کے پاس سے آتی تھی۔ یہاں کو وہ خوشبو بہت اچھی لگتی تھی۔

الماری کا کام مکمل ہونے کے بعد درازوں کی باری آئی۔ نجمہ خاتون نے ملازم کو بلوا کر سارا فالتو سامان کمرے سے نکلوا دیا، بستر کی چادر تبدیل کی..... ”یہاں کو کوئی خیال آیا وہ باہر لان میں لٹکی..... بارش سے ہر چیز دھل کے نکھر گئی تھی۔ رنگ برنگے تروتازہ پھول کیاریوں میں رونق افروز تھے۔ اس نے ایک خوب صورت سا گلدستہ بنا کے کمرے میں رکھے ہوئے گلدان میں سجا دیا۔

”جیتی رہو بیٹا، تم نے آج میری بہت مدد کی۔“ نجمہ خاتون یہاں کی طرف دیکھ کر مسکرائیں..... وہ کمرے سے باہر نکلنے لگیں، یہاں ان کے پیچھے نکلتے ہوئے ایک نظر شہر یار کے پورٹریٹ کی طرف ڈالنا نہیں بھولی تھی۔ اسے لگا جیسے شہر یار مسکرا رہے ہوں..... ”یہاں کے دل میں اٹھنے والی یہ نئی لہر اسے آن دیکھی دنیا کی طرف سبک خرامی سے لیے جارہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ دوڑ گئی..... یہ نیا احساس اس کے لیے بہت خوب صورت تھا۔ آج کا دن بھی گزر چکا تھا اور اب اسے واپس جانا تھا۔

آج اماں کا اسپتال میں آخری دن تھا۔ ان کی تسلی بخش حالت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ صبح بابا کے ساتھ اسپتال پہنچی پھپھو سامان باندھے بیٹھی تھیں۔

”فالتو سامان میں ابھی اپنے ساتھ لے جاتی ہوں..... چار بجے تک چھٹی ہو جائے گی اس وقت وہ

WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT

WELCOME BOOK SHOP

P.O.Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae

Best Export From, Pakistan

WELCOME BOOK PORT

Publisher, Exporter, Distributor

All kinds of Magazines, General Books and Educational Books

Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

خالہ چلی گئیں اور ان کے ساتھ شہر یار بھی..... ایک نہ ختم ہونے والا انتظار اس کا نصیب بن گیا.....

اس کا رزلٹ خلافِ توقع اچھا آ گیا تھا..... وہ میڈیکل کالج کے میرٹ یہ آ گئی تھی..... اماں، بابا بے حد خوش تھے..... وہ میڈیکل کالج کے ایڈمیشن کی تیاریاں کر رہی تھی کہ تہینہ پھپھو آدھمکیں۔

وہ تھیں اور اماں، بابا..... نہ جانے کیا کیا کھسر پھسر چل رہی تھی۔ وہ کبھی حیران ہوتی تو کبھی اس کھسر پھسر سے بیزار جو اسے دیکھتے ہی ختم ہو جاتی۔ بالآخر ایک رات اماں اس کے کمرے میں آئیں..... وہ اس وقت پروین شاہ کی خوشبو ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی..... اماں کی بے وقت آمد اسے چونکا گئی۔

”جی اماں..... مجھے بلا لیتیں.....“ وہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ اماں اس کے ساتھ بیڈ پر آ بیٹھیں۔ ان کا چہرہ کافی سنجیدہ تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ اکٹھا کر رہی ہوں۔ وہ پریشان ہو گئی۔

”بات دراصل یہ ہے یہاں جب میں اسپتال میں تھی اور تہینہ آپامیری دیکھ بھال کے لیے آئی تھیں انہوں نے اس وقت تمہارے لیے فاخر کا رشتہ دیا تھا۔“ اماں نے اس کے سر پر گویا بم پھاڑ دیا۔ وہ سکتے کی کیفیت میں آ گئی۔

”تمہارے بابا کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا سو انہوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ فاخر میں کوئی برائی بھی تو نہیں ہے..... اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، خوش شکل ہے، اچھے عہدے پر فائز ہے، سب سے بڑھ کر اپنا خون ہے۔“ اماں باتوں، باتوں میں فاخر کے قصیدے پڑھنے لگیں اور وہ دم بخود بیٹھی رہی۔ ”اب تو خیر سے اس کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا ہے اور وہ ٹھہرا تہینہ آپا کا اکلوتا بیٹا سو وہ بھی بوریا بستر باندھ کے یہیں آ گئی ہیں۔ تم..... تم خوش ہونا؟“ اماں کو

اس کا دل کسی اور چیز میں اٹکا ہوا تھا۔

”کافی دنوں سے نانو کی خبر نہیں لی آپ نے.....“ ایک دن اس کی بے تابی حد سے سوا ہو گئی تو وہ اماں سے کہہ اٹھی۔

”صحیح کہہ رہی ہو..... اسپتال سے آنے کے بعد تو شروع شروع میں روزانہ ہی بات چیت ہو رہی تھی..... اب پھر اتنا لمبا وقفہ آ گیا۔ آج فون کروں گی، ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے۔“

اماں نے فون ملایا اور وہ کان لگائے اماں کے قریب گھسی رہی۔ اماں کافی دیر تک ان سے باتیں کرتی رہیں اور وہ اماں کی سائڈ کی ادھوری گفتگو سے نتیجہ اخذ کرتی رہی..... کبھی اس کا دل دھڑکتا تو کبھی رکتا۔

”کیسی ہیں نانو.....؟“ بات ختم ہوئی تو اس نے بے قراری سے پوچھا۔

”طبیعت خراب ہو گئی تھی ان کی، اب ٹھیک ہیں..... کل امریکا جا رہی ہیں اسفندیار کے پاس۔“ اماں نے بتایا۔

”اچھا!“ اس کا دل بیٹھ سا گیا۔

”شہر یار تو دینی سے پندرہ دنوں کے بعد آ گئے تھے اور اب خالہ کے ساتھ امریکا جا رہے ہیں خالہ کی ہارٹ سرجری ہوگی وہاں.....“ اماں نے افسردگی سے کہا۔

”اوہ..... کیا کوئی سیریس معاملہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بے چاری ہارٹ پیسٹٹ تو کافی عرصے سے ہیں، اب شاید پرابلم بڑھ گئی ہوگی..... میری بھی بے پروائی، میں نے ان کی خبر ہی نہیں لی۔ اب آج جاؤں گی ان سے ملنے۔“ اماں نے کہا نہیہا کا دل چاہا وہ کہے میں بھی چلوں آپ کے ساتھ..... لیکن ایک نامعلوم سی جھجک آڑے آ گئی۔ اسے شہر یار کی طرف سے پیش قدمی کا انتظار تھا مگر دوسری طرف خاموشی

گھوڑے کی طرح دوڑنا شروع ہو گئے..... اور وہ انہیں ترتیب دینے لگی..... تھوڑی دیر کے بعد ایک خوب صورت نظم اس کے رجسٹر کے صفحے پر موجود تھی۔ اس نے ایک بار اس نظم کو پڑھا..... صفحے کو رجسٹر سے الگ کیا اور جاناں جاناں کے اندر رکھ دیا۔ کتاب واپس میز پر رکھی۔ اس کی ہر دھڑکن..... شہر یار کے نام کی مالا جب رہی تھی۔ وہ ساڑھے تین بجے تک اس پوزیشن میں بیٹھی شہر یار کی منتظر رہی..... مگر وہ نہیں آئے۔ نجمہ خاتون وقت پر اسے کھانے کا کہنے آئی تھیں جو اس نے پڑھائی کا بہانہ کر کے منع کر دیا۔ وہ بے چاری اس کے لیے جوس لے آئیں۔ یہاں جوس کا گھونٹ بھرا..... اتنا کڑوا جوس اس نے اپنی زندگی میں نہیں پیا تھا۔ برائی جوس میں نہیں تھی..... اسے اس وقت ہر چیز کڑوی لگ رہی تھی، اپنی زندگی سمیت۔

اماں کے گھر آ جانے کے بعد رونقیں لوٹ آئیں۔ سب نے سکون کی سانس لی۔ تہینہ پھپھو واپس لاہور سدھاریں..... اس کے پیپر شروع بھی ہوئے اور ختم بھی ہو گئے..... نہ جانے کیا بات تھی وہ جب بھی پڑھائی کے لیے کتابیں اٹھاتی، اس کا ذہن شہر یار کی اسٹڈی میں پہنچ جاتا اور وہاں سے اس کی واپسی ناممکن ہو جاتی۔ اسے اس بار اچھے رزلٹ کی امید نہیں تھی۔

”آپ کی دعا سے اچھے نمبر آ گئے تو آ گئے مگر میرا اس میں کوئی کمال نہیں ہوگا۔“ اماں اس کے لیے بے تحاشا دعا میں کر رہی تھیں۔ وہ مسکرا کے کہتی۔

”میری بیٹی اس قدر ذہین ہے..... اس کے برے نمبر آئیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔“ اماں اس کا ہاتھ چوم کے کہتیں۔

اس دفعہ وہ اپنے رزلٹ کے بارے میں اس طرح سے منتظر نہ تھی جیسے پہلے ہوتی تھی۔ اس دفعہ تو

ماتھے پر ہلکا سا ہاتھ مار کے بولیں۔

”کیا مطلب.....؟“ یہاں کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

”ارے مسافر ہیں بیٹا وہ تو..... آج ادھر کل کہیں اور..... پورے تین دن گزار لیے گھر پر..... اب جا رہے ہیں کل دینی..... دیکھو کب آتے ہیں۔“ وہ افسردگی سے بولیں۔

”جی.....!“ یہاں نے مرے مرے انداز میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے بیٹا تم تو جاؤ اپنی پڑھائی کرو..... اب تو امتحان نزدیک آ گئے ہوں گے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی..... ایک ہفتے سے کم رہ گیا ہے امتحانات شروع ہونے میں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ نجمہ خاتون سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئیں اور وہ اوپر کی طرف..... اس بار اس کے قدم آہستہ ہو گئے تھے..... جیسے وہ ایک دم تھک سی گئی ہو..... اوپر پہنچ کر اس نے اسٹڈی کا دروازہ کھولا کمر خالی تھا۔

شہر یار کے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا۔ ”پتا نہیں گھر پر ہیں یا نہیں.....؟“ اس نے سوچا پڑھائی کے نام پر یہاں آنے کے باوجود اب تک اس نے ایک لفظ بھی کتاب سے نہیں پڑھا تھا..... اور آج تو بالکل بھی پڑھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے کتابیں میز پر رکھ دیں اور خود خالی الذہنی کی کیفیت میں کرسی پر بیٹھ گئی..... اس کا خیال تھا کہ آج شہر یار اس کے منتظر ہوں گے..... لیکن وہ نہ جانے کہاں تھے۔ سامنے ٹیبل پر احمد فراز کی جاناں جاناں ادھ کھلی رکھی ہوئی تھی..... شاید شہر یار اس کا مطالعہ کر رہے تھے..... وہ خواہ مخواہ اس کتاب کی ورق گردانی کرنے لگی۔ خوب صورت اشعار اس کی کمزوری تھے اور..... شہر یار کا ذوق بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ پڑھتے پڑھتے نہ جانے اس کے دل میں کیا آیا اس نے قلم اٹھایا..... الفاظ اس کے ذہن میں کسی تیز رفتار

سے طاری ہوئی تھی۔ دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف اماں تھیں۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے پاس عالیہ کا فون آیا تھا۔“ سلام اور خیریت سے فارغ ہونے کے بعد اماں نے اسے بتایا۔

”جی..... وہ پاکستان ہی میں تھیں؟“ وہ چونک اٹھی۔

”اس کے دونوں بیٹے تو امریکا گئے ہیں، ماموں کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے لیکن وہ نہیں جاسکی۔ آج شام اس کے پاس جانے کا میرا پروگرام تھا مگر صبح میں خود اسی کا فون آگیا۔“ اماں نے تفصیل بتائی۔

”کوئی خاص بات؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، خاص ہی سمجھو..... دراصل شہر یار کا وصیت نامہ کل رات کو کھولا تھا ان لوگوں نے.....“ اماں کہتے کہتے رکیں۔ اس کا دل ایک دم دھڑ سے ہوا..... شہر یار کے لیے لفظ ”وصیت“ کا سننا اس کے لیے یقیناً تکلیف دہ تھا۔

”اس نے اپنے اسٹڈی روم میں موجود تمام کتابیں تمہارے نام کر دی ہیں.....“ اماں نے کچھ ٹھہر کے بتایا۔

”میرا خیال ہے بیس برس پہلے، جب میرا آپریشن ہوا تھا، تم رکی تھیں ناں صنفیہ خالہ کے گھر پڑھنے کے لیے..... وہ بے چارہ سمجھا ہوگا کہ تم بہت پڑھا کو ہو۔“ اماں نے اندازہ لگایا۔

”آپ جاکیں گی ناں، وہاں..... تو لیتی آئیے گا.....“ اس نے بے خیالی کے عالم میں کہا..... دل و دماغ کا تعلق جیسے آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔

”ارے بیٹا کیا بات کرتی ہو..... کوئی آٹھ دس کتابیں تھوڑی ہیں جو میں اٹھا کر لاؤں.....“ ہزاروں کی تعداد میں کتابیں ہیں..... عالیہ بتا رہی تھی۔“ اماں نے دہائی دی۔

وہ خاموش رہی۔

”ایسا کرو..... کہ جانا تو تمہیں بھی ہے تعزیت

میں بڑک پسند تھا اور اسے دھیسے سُر اچھے لگتے تھے فاخر مجلسی آدمی تھا اور وہ تنہائی پسند، فاخر کو کتابوں اور شعر و شاعری سے اللہ واسطے کا پیر تھا اور یہ چیزیں نہیہا کے لیے آب حیات تھیں۔ فاخر اسے شوخ رنگوں میں ملبوس دیکھنا چاہتا تھا اور وہ ہلکے رنگوں کے کپڑے پہنتی..... ان دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی..... تنگ آ کے فاخر نے باہر دلچسپیاں تلاش کر لیں اور وہ اپنی ذات میں قید ہو کے رہ گئی۔ قصور نہ جانے کس کا تھا، اماں، بابا کا، تمہینہ پھپھو کا، فاخر یا اس کا..... اس نے خود کو کبھی بری الذمہ قرار نہیں دیا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ اس نے کبھی دل سے فاخر کی ہونے کی کوشش ہی نہیں کی تھی..... وہ جب بھی ایسا سوچتی اس کا ذہن بھٹک کے کہیں اور چلا جاتا..... رمیز اور معیز بھی ان کی زندگیوں میں شامل ہو چکے تھے..... اسے اپنے بچوں سے بہت پیار تھا..... زندگی گزرتی جا رہی تھی..... اس کے لیے بے رنگ، بے رونق اور شاید بے وجہ بھی..... وہ گھر کا خیال رکھتی، بچوں کا دل و جان سے خیال رکھتی، یہاں تک کہ فاخر کی ہر ضرورت کا اس کے کہے بغیر دھیان رکھتی۔ اس کا گھر خوب صورت تھا جس کا کونہ کونہ چمکتا تھا..... اس کے بچے ذہین تھے، لائق اور تمیز دار تھے، اس کا فاخر کے ساتھ بھی کوئی جھگڑا نہیں ہوتا تھا..... بس دونوں اپنی، اپنی زندگیوں میں گم تھے اور شاید یہی کمی ہر چیز پر حاوی آگئی تھی سب کچھ ہوتے ہوئے بس ایک دل خالی تھا..... بالکل خالی۔

جھرات کی جھڑی ہفتہ پورا کرتی ہے..... لوگ ایسا کہتے ہیں مگر یہ تو اتوار کی کی جھڑی تھی اور آج دوسرے دن بھی ہلکی، ہلکی بارش مسلسل لگی ہوئی تھی۔ فاخر کے آفس اور بچوں کے اسکول اور کالج جانے کے بعد وہ ٹیرس پہ آ کے کھڑی ہو گئی۔ آج اس کا دل اداسی کے اسی احاطے میں قید تھا جو اس پر کل

کر دیں گے۔“ اماں نے اصل بات کہہ دی۔

”اگر میں ایم بی بی ایس ہی کرنا چاہوں تو.....؟“ اس نے ماں کی آنکھوں میں دیکھ کر سوال پوچھا۔ اماں جزیرہ نظر آنے لگیں۔

”دیکھو بیٹا تمہینہ آپا کو خواہ مخواہ ناراض کرنے کا کیا فائدہ..... وہ واضح الفاظ میں اپنا مقصد بیان کر چکی ہیں۔“ وہ فوراً بولیں۔

”اور اگر میں فاخر سے شادی ہی نہیں کرنا چاہوں تو.....؟“ اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”کیا کہہ رہی ہو تم؟“ اماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسے اماں سے اس رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو شاید اپنے طور پر سب کچھ طے کیے بیٹھی تھیں اور اسے رسماً بتانے آئی تھیں۔

”لڑکیاں ایسے معاملات میں ماں، باپ کے فیصلوں پر سر جھکا دیتی ہیں..... سوال نہیں پوچھتیں.....“ وہ قدرے حقلمند سے بولیں۔ بیڈ سے اتریں اپنے پاؤں میں چپل پہنی اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی پروین شاکر کی خوشبو کو گھورتی رہی جس کے اوراق پٹکے کی ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس کے دکھ پر احتجاج کر رہے ہوں..... چیخ رہے ہوں..... رورہے ہوں..... اس نے گھٹنوں پر اپنا سر رکھا اور بے آواز رونے لگی۔ اپنے لیے وہ صرف اتنا ہی کر سکتی تھی۔

دن، ہفتوں، ہفتے، مہینوں اور مہینے، سالوں میں تبدیل ہوتے گئے..... ایسے کہ پتا بھی نہیں چلا..... وہ حسب پروگرام فاخر کی بنادی گئی تھی مگر کچھ ایسے کہ نہ تو وہ فاخر کی ہو سکی اور نہ فاخر اس کا..... ندی کے دو کناروں کی طرح ان دونوں نے زندگی کے اٹھارہ سال اکٹھا گزار دیے۔ اس کے اور فاخر کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا..... فاخر کو تیز

اس کا خیال آیا۔ اس کا دل و دماغ بیکار ہو رہا تھا..... وہ خاموش بیٹھی رہی۔ ”ظاہر ہے بیٹا ہم تمہارے ماں، باپ ہیں تمہارے لیے اچھا ہی سوچیں گے سب کچھ تمہارے جوڑ کا ہے..... ہمیں تو خوشی اس بات کی ہے کہ ہماری بچی میکے سے زیادہ سسرال میں سب کی آنکھوں کا تارہ بنی رہے گی۔“ اماں خود ہی بول رہی تھیں اور خود ہی خوش بھی ہو رہی تھیں..... اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ ان کی ان سب باتوں کا مقصد کیا تھا..... ابھی یہ ذکر انہوں نے کیوں چیخڑ دیا تھا۔

”اب فاخر ٹھہرا اکلوتا بیٹا..... اور تمہینہ آپا بے چاری بڑھاپے کی طرف مائل..... سوان کی خواہش ہے کہ بس ایک ڈیڑھ سال کے اندر، اندر اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔“ اماں آہستہ آہستہ مطلب پر آ رہی تھیں۔

آج کا دن شاید اس کا نہیں تھا..... اور شاید یہ آغاز تھا اس دور کا جسے وہ اپنی ہر خوشی سے محروم ہو کے گزارنے والی تھی۔

”اب دیکھو ناں اگر تم نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا تو پانچ چھ سال سے کم کیا لگیں گے ڈاکٹر بننے میں..... اور پھر ڈاکٹر بن بھی گئیں تو اس کے بعد بھی شادی تو ہونی ہی ہے، فاخر جاب تھوڑی... کروائے گا تم سے..... تم سمجھ رہی ہوں ناں..... میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔“ امی اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر بولیں۔

”اماں آپ کھل کے کہیں، کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔“ اس کی آواز کنویں سے برآمد ہوئی۔

”دیکھو بیٹا..... بیٹیوں کا فرض وقت پہ اور اچھی طرح ادا ہو جائے، ماں، باپ کی یہی آرزو ہوتی ہے..... اس لیے تمہارے بابا کا اور میرا یہی خیال ہے کہ تم ایم بی بی ایس کرنے کے بجائے سیدھا سادہ بی ایس سی کر لو..... اور پھر ہم تمہاری شادی

تو مکمل ہی سمجھیں۔“ اس نے انہیں تسلی دی۔
”کام مکمل سمجھوں تو پھر یہ بھی سمجھ لوں کہ اب
اگلے دو تین دنوں میں تم پھر کہیں کا قصد کر کے چل
پڑو گے۔“ وہ جھنجلا کے بولیں۔ ماما کی جھنجلاہٹ پہ
اسے ہنسی آگئی۔

”ہنسومت..... تمہیں میرا اور میری تنہائی کا
کوئی خیال نہیں ہے..... اکیلے رہتے، رہتے میں
ذہنی مریضہ بننے لگی ہوں شہر یار.....“ ماما اب غصے
میں آگئیں۔

”ماما پیاری ماما.....“ وہ اٹھ کے ان کے
قدموں میں آن بیٹھا۔

”اتنے دنوں کے بعد شکل دکھاتے ہو اور پھر
اسی طرح میٹھی میٹھی باتیں کر کے مجھے بے وقوف
بنالیتے ہو۔“ انہوں نے محبت سے اس کا سر ہلایا۔

”اچھا بتائیں آپ کو کیسی بہو چاہیے؟“ اس
نے بات کا آغاز کیا۔ ماما نہال ہو گئیں۔

”سچ کہو..... تم نے دل سے پوچھا ہے یہ
سوال یا مجھے بہلا رہے ہو؟“

”نہیں، واقعی پوچھ رہا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔
”بس بیٹا تمہارے جوڑ کی ہو..... تم ماشاء اللہ

خوش شکل ہو، اسما رٹ ہو، صاحب حیثیت ہو اور
سب سے بڑھ کر کو الیفانڈ ہو..... بس ایسی ہی ہو جو

ہر لحاظ سے تمہارے ساتھ نیچے..... مجھے تو ڈاکٹر اسما
بہت پسند تھی..... سچ پوچھو تو اس کی شادی پر میں بہت

روئی تھی۔“ ماما کو ان کی عزیز دوست کی بیٹی غلط وقت
پر یاد آگئی۔ دس برس پہلے وہ اس کی شادی ڈاکٹر اسما

سے کرنے پر بضد تھیں۔
”بس اسما کے ٹکڑ کی ہی کوئی لڑکی ہو.....“

انہوں نے تفصیل سے جواب دیا۔
”جی۔“ اس نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

”تم اب کافی میچور ہو چکے ہو بیٹا..... اب
کوئی کم عمر لڑکی تمہارے ذہنی سفر میں تمہارا ساتھ نہیں

”استغفار..... رشتے میں تو میری بھانجی ہوئی۔“
”سنگی بھانجی تو نہیں ہے۔“ دل نے کمزور سا
اجتاج کیا۔

”تو کیا ہوا..... رشتوں کا تقدس بھی تو کوئی چیز
ہوتا ہے۔“

پہلے دن وہ خود کو قائل کرنے میں تھوڑا بہت
کامیاب ہوا تھا..... مگر اگلے دن کی ملاقات میں اس

کے ارادے بھر بھری مٹی کی طرح ڈھسے گئے۔ نیہا
بارش کی بوندوں سے کھیلتی ہوئی سیدھے اس کے دل

میں اتر گئی۔ زندگی میں پہلی بار پڑاؤ ڈالنے اور مسکن
بنانے کی خواہش نے جنم لیا..... اس کا دل چاہا کہ وہ

ہر احتیاط بالائے طاق رکھ کے نیہا کا ہاتھ تھام لے
اور اس سے حالِ دل کہہ ڈالے لیکن فوراً ہی اپنے

رہنے کا خیال آگیا..... خود پر بہ مشکل کنٹرول کیا اور
کمرے سے باہر نکل گیا۔ چالیس برس کی عمر میں بیس

برس والا عشق کچھ مضحکہ خیز تھا۔ اس نے باہر نکلتے
ہوئے ایک لمحے کو سوچا۔

”اگر اس کے دل میں بھی میرے لیے کچھ ہوگا تو
وہ مجھے کھڑکی میں کھڑی ملے گی.....“ وہ مڑا اور اس نے

اوپر دیکھا..... نیہا وہیں کھڑی تھی..... شہر یار کا دل جھوم
اٹھا..... اس نے بے اختیار ہاتھ اٹھا کے ہلایا۔

”کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے؟“ اس نے خود سے
سوال کیا۔

”اگر وہ ایسا چاہتی ہے تب تو اس میں کوئی
ترجیح نہیں.....“ دل نے فیصلہ سنا دیا۔ شام میں وہ ماما

سے بات کرنے کے لیے جملے ترتیب دیتا ہوا نیچے
اترا۔ ماما لاؤنج ہی میں تھیں..... اسے دیکھ کر

مسکرائیں۔ وہ بھی مسکراتا ہوا نزدیک جا کر بیٹھ گیا۔
”شکر ہے تمہاری صورت تو نظر آئی..... ورنہ

صبح میں، میں اسپتال میں ہوتی ہوں اور شام میں تم نہ
جانے کہاں غائب ہوتے ہو۔“ انہوں نے گلہ کیا۔

”بس ماما کچھ ضروری کام نبھانے تھے..... اب

یہ جانتی ہوں، نہیں کہے گا
مگر کبھی تو یہ لب کھلیں گے
ہمارا آئے گی گل کھلیں گے
کبھی تو برسے گا ابر نیساں
کبھی تو بوندیں گہریں گیں

میں منتظر ہوں.....

میں منتظر ہوں.....

شہر یار نے اس نظم کو نہ جانے کتنی دفعہ پڑھا
تھا۔ بظاہر سادہ سی اس نظم میں کسی کے دل کا حال چھپا

تھا، وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔
”بہت دیر کر دی..... تم نے ملنے میں اور میں

نے فیصلہ کرنے میں..... میرے اور تمہارے
درمیان وقت کی خلیج آگئی ہے..... نہ دن، نہ ہفتے، نہ

مہینے..... بلکہ پورے اکیس سال..... عمروں کا یہ فرق
بہت زیادہ ہے.....“ وہ بے بسی سے ہنسا۔

اسے پہلی بار دیکھ کے وہ بری طرح چونکا
تھا..... وہ بے تکلفی سے اس کے بیڈ روم میں کھڑی

اسی کی تصویر کو بغور دیکھ رہی تھی اور اس کے بعد اگلے
تین دنوں تک وہ اسے چونکاتی رہی۔ اس کا ہر انداز،

اس کی سوچ، اس کی پسند ناپسند سب کچھ شہر یار کی
سوچ کے مطابق تھی..... وہ حیران رہ گیا..... اسے

یقین نہیں آیا کہ کیا ایسا ممکن ہے.....؟ ماما اسے بے
شمار لڑکیوں سے ملوا چکی تھیں..... عالیہ اور پھر اسفند

یار کی بیوی بھی اس مشن میں لگی رہیں، کزنز نے بھی
حسب توفیق اس کا رخیر میں اپنا حصہ ڈالا مگر شہر یار کو

وہ گوہر مقصود نہ مل سکا۔ تنگ آ کے سب نے اسے اس
کے حال پر چھوڑ دیا..... وہ سیلانیوں کی طرح آزادی

سے اپنی زندگی گزارنے لگا..... اور اب جبکہ ساری
امیدیں ٹوٹ چکی تھیں، نیہا چھم سے اس کے سامنے

چلی آئی..... اور اس کی بہنوں کی طرح عزیز خالہ زاد
کی بیٹی نکلی۔

کے لیے..... خود جا کے دیکھ لینا..... جو کام کی سمجھو لے
آنا باقی وہیں چھوڑ دینا..... تمہارے گھر جگہ کہاں ہوگی
ان کتابوں کی.....؟“ اماں نے مسئلے کا حل ڈھونڈا۔

اماں سچ ہی تو کہہ رہی تھیں..... اس کے گھر
میں اس فالٹو ”کباڑ“ کی بھلا کیا ضرورت تھی.....

فاخر اس کی کتابوں اور رسائل کو کباڑ کا نام دیتا
تھا..... شادی کے اوائل میں اس نے اپنے گھر کا

ایک گوشہ کتابوں کے لیے مخصوص کرنا چاہا تھا..... اس
کی خواہش تھی کہ اپنی جمع شدہ کتابیں وہاں

رکھے..... اسے امید تھی کہ آئندہ زندگی میں جب
اس کی کتابوں کا کلیکشن بھی بہت بڑا ہو جائے گا تو وہ

بھی شہر یار کی طرح ایک اسٹڈی روم بنائے گی مگر
فاخر نے اس کی اس خواہش کا گلا گھونٹ دیا..... گھر کا

وہ کونہ فاخر نے میوزک سسٹم کے لیے مخصوص کر دیا۔
نیہا کا لگایا ہوا خوب صورت ریک پہلے کیسٹس اور اس

کے بعد سی ڈیز کی آماجگاہ بن گیا اور نیہا کی کتابیں
گتے کے کارٹن میں رکھوا کے اسٹور میں جا پڑیں۔ نیہا

کی شاعری اس کی ڈائری سب اسٹور کی زینت بن
گئی۔ اس نے اماں کو خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میں اس کی آنکھوں کو دیکھتی ہوں
یہ سوچتی ہوں

کہ میرے چہرے پہ اس کی نظریں الجھ گئی ہیں
مرے خیالوں پہ اس کی سوچیں لپٹ گئی ہیں

وہ جیسے مجھ کو مرے تصور میں ڈھونڈتا ہے
وہ مجھ کو مجھ میں تلاشتا ہے، کھوجتا ہے

کیا سوچتا ہے.....؟
میں ان نگاہوں کو جانتی ہوں

مگر میں نظریں چرا رہی ہوں
میں اس کے ہونٹوں کو دیکھتی ہوں

یہ سوچتی ہوں
وہ کچھ کہے گا.....

دے سکی گی۔“ انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہا۔

”اور جو تمہارے ساتھ کی تھیں وہ تو اب اپنے بچوں کی شادیوں کا سوچ رہی ہوں گی۔“ ماما ایک دم خفگی سے بولیں۔ ”اچھی لڑکیاں ہیں بائیس کی ہوتے ہی اپنے گھروں کی ہو جاتی ہیں..... اب عزیزہ کو دیکھ لو..... تمہاری عمر کی ہے..... بیس کی تھی تو شادی ہو گئی..... اور اب خیر سے اپنی بیٹی کی شادی کا سوچ رہی ہے۔“ انہیں ایک دم کچھ یاد آیا۔ شہر یار ایک دم سیدھے ہو گئے۔

”اس کی نند..... ارے وہی جو اس کے پاس رکنے آئی ہے، لاہور سے، اسی نے اپنے بیٹے کا رشتہ دیا ہے نیہا کے لیے..... وہ دونوں میاں، بیوی تو راضی ہیں..... دیکھو کیا فائل ہوتا ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”مگر وہ تو ڈاکٹر بننا چاہتی ہے..... ابھی سے شادی؟“ انہوں نے مجھے مجھے انداز میں کہا۔ ”بھئی وہ ماں، باپ ہیں، اپنی بیٹی کا بہتر ہی سوچیں گے۔“ ماما نے اپنے گھٹنوں کو آہستہ آہستہ دباتے ہوئے جواب دیا۔

”تھک گئی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ ”ہاں بیٹا..... آدھے سے زیادہ دن اسپتال میں گزر جاتا ہے..... کرنا تو کچھ بھی نہیں پڑتا مگر بیٹھے بیٹھے ہی گھٹنے جواب دے جاتے ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”ایک آدھ دن مت جائیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”اب کل شام میں تو چھٹی ہو جائے گی۔ جہاں اتنا کیا، وہاں ایک دن اور سہی..... اللہ کا شکر، اس نے اس قابل بنایا کہ اپنوں کے کام آسکوں.....“ انہوں نے شفقت لہجے میں جواب دیا۔ ”اب آپ آرام کریں..... مجھے ذرا کام ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”تو پھر قد سید کو بتاؤں لڑکی دیکھنے کا؟“ انہوں نے جلدی سے پر شوق لہجے میں پوچھا۔ قد سید ان کی سہیلی تھیں اور رشتے لگانے کے کام میں ماہر تھیں۔ ”نہیں ابھی نہیں..... میں بتاؤں گا آپ کو۔“ شہر یار جلدی سے کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کا ذہن الجھ چکا تھا۔

”جانتی تھی میں..... پھر بے وقوف بنا گیا ہے مجھے..... میرے جذبات سے کھیلتا ہے۔“ صفیہ بیگم کو سخت غصہ آ گیا۔

اسے معلوم تھا کہ عزیزہ کی اسپتال سے چھٹی ہو رہی تھی۔ عزیزہ کی چھٹی کا مطلب اب نیہا کے اس گھر میں آکر اتنا وقت گزارنے کا جواز ختم ہو جاتا۔ عزیزہ اس کی خالہ زاد بہن، اس کی ہم عمر، اس کے ساتھ بچپن میں کھیل کود کر وقت گزارنے والی۔ اگر یہ جان جائے کہ اسے اسی کی بیٹی سے جو فقط انیس برس کی ہے، عشق ہو گیا ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اس پر کیا گزرے گی؟

زیر بھائی جو اپنی بیٹی کا رشتہ اسی کے ان گروپ کے اپنے بھانجے سے خوشی، خوشی ملے کر کے بیٹھے ہیں وہ کیا سوچیں گے؟ ان کی آنکھوں میں اس کی کیا عزت رہ جائے گی؟ اور اماں..... یہ سن کر خوشی سے پاگل ہو جائیں گی کہ ان کا بیٹا شادی کے لیے راضی ہو گیا ہے مگر کس سے؟ یہ سن کر شاید وہ بھی سکتے ہیں آجائیں ان کے خوبرو کو ایفانڈ اور ضرورت سے زیادہ بلند سوچ رکھنے والے بیٹے کو، جس نے ایک سے ایک طرح دار اور کو ایفانڈ لڑکیوں کو ٹھکرادیا..... پسند آئی تو کون.....؟ خود سے اکیس برس چھوٹی..... ایف ایس سی کی اسٹوڈنٹ..... جو رشتے میں اس کی بھانجی لگتی ہے۔ نہیں..... ایک دل کی سننے کے لیے وہ اتنے سارے لوگوں کی آنکھوں میں اپنے لیے تمسخر نہیں دیکھ سکتا..... یہ تو اپنے ہیں باہر

والے تو اور مذاق اڑائیں گے۔ یہی کہیں گے کہ بڑھے نے محسوم بیٹی سے شادی کر لی..... شہر یار نے کمرے میں بے قراری سے ٹپکتے ہوئے سوچا۔ شہر یار کا دل عجیب محسوس میں پھنس چکا تھا۔ آگے اسے ٹھپ اندھیرا نظر آ رہا تھا..... اس ٹھپ اندھیرے میں روشنی کی ہلکی سی لکیر نیہا کے نام کی ابھرتی اور غائب ہوتی رہی۔

مگر نیہا..... اس کے دل میں کیا ہے..... کیا میں ہوں؟ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ نیہا کے دل میں کہیں نہ کہیں اس کا نام ضرور ہے..... اگر ایسا ہوا تو.....؟ اس کے سوالوں کا جواب اسے نیہا کی نظم کی صورت مل چکا تھا۔ ایک طرف عقل..... ایک طرف دل..... سوچتے سوچتے بالآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

صفیہ بیگم تیار ہو کے ناشتا کرنے میز پر آئی ہی تھیں کہ شہر یار کو اوپر سے اترتے دیکھا..... نزدیک آنے پر شہر یار نے انہیں سلام کیا۔

”تم اتنے سویرے کہاں جا رہے ہو؟“ وہ سلام کا جواب دیتے ہوئے بولیں۔

”مجھے آج بہت سارے کام نبھانے ہیں اس لیے سویرے نکلتا ضروری ہے۔“ شہر یار کا چہرہ آج ہر روز سے زیادہ سنجیدہ تھا۔

”خیر تو ہے بیٹا، کچھ پریشان لگ رہے ہو؟“ اماں نے بیٹی کی کیفیت بھانپتے ہوئے پوچھا۔

”پریشان..... نہیں تو..... بس کچھ مصروفیت بڑھ گئی ہے۔“ وہ پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”مصروف تو خیر تم ہمیشہ ہی رہتے بلکہ ضرورت سے زیادہ ہی رہتے ہو.....“ انہوں نے قدرے چڑ کے کہا..... شہر یار نے ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”یہی مصروفیت تو زندگی ہے پیاری اماں..... جو زندگی میں یہ نہیں ہو تو انسان فراغت میں پاگل ہو

کے مر جائے۔“ اس نے بے جان قہقہہ لگایا۔

اپنی، اپنی سوچ ہے..... جو تمہاری زندگی کا کوئی حقیقی مقصد ہوتا..... اپنی اولاد پال کے جوان کر رہے ہوتے تو شاید ان فضول مصروفیات کو ڈھونڈتے..... نہ پھرتے اور نہ ہی ان کے پیچھے یوں ہلکان ہوتے..... میری تو سمجھ میں نہیں آتا مرد معاشی زندگی کی ہر بھاگ دوڑ اپنے بیوی بچوں کے لیے کرتا ہے مگر تم کیوں جگہ جگہ فیکٹریاں لگا کے اپنی جان ہلکان کر رہے ہو.....؟ تمہارے اور میرے لیے تو ٹھوڑا بھی بہت ہے..... سکون سے گھر تو بیٹھو.....“ انہوں نے تیز لہجے میں کہا غصے میں وہ تلخ ہو گئی تھیں۔

”میں کل دبی جا رہا ہوں۔“ شہر یار کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونک گئیں۔

”شاید ایک ہفتے تک واپسی ہوگی.....“ اس نے ان کا سوال نظر انداز کر دیا۔

”پھر جا رہے ہو؟“ وہ مایوسی سے بولیں۔

”اور وہ شادی؟“ انہیں ایک دم یاد آیا۔

”واپس آ کے آپ کو ایک خوشخبری سناؤں گا، ہو سکتا ہے شادی کر لوں۔“ اس کے لہجے میں خوشی کی رمت نہیں تھی۔

”کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟“ وہ جیسے ایک دم جی انہیں۔

”امید ہے؟“ وہ مسکرایا۔

”یقین نہیں ہے۔“ انہوں نے شکایتا کہا۔

”امید ٹوٹے تو افسوس ہوتا ہے، یقین ٹوٹ جائے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے..... اوکے ماما..... چلتا ہوں.....“ وہ جانے کے لیے مڑا۔

”اچھا ناشتا تو کر لو.....“ صفیہ بیگم سے اس کا اتنا ثقیل جملہ پوری طرح ہضم نہیں ہو سکا۔

”باہر کرلوں گا..... خدا حافظ.....“ وہ کہتا ہوا نکل گیا۔

”خدا حافظ.....“ وہ بے بسی سے بولیں۔

وقت گزر چکا تھا۔ وہ اپنے چچتاؤں سمیت واپس لوٹ گیا۔

اپنے خوابوں کی حقیقت میں بیس سالوں بعد قدم رکھنا اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔ خصوصاً اس احساس کے ساتھ کہ اس گھر میں اب وہ نہیں رہا جس کے ہوتے ہوئے ساری رونقیں وابستہ تھیں۔ اماں عالیہ خالہ کے گلے لگ کے رونے لگیں..... انہیں... شہریار کے ساتھ ساتھ صفیہ خالہ کا غم بھی یاد آ گیا تھا۔

گھر کا حلیہ اور انداز تبدیل ہو چکے تھے۔ بیس سال کسی انسان کو تبدیل کر دیتے ہیں یہ تو پھر گھر تھا۔ یہاں نے خود کو قد آدم آئینے میں دیکھتے ہوئے سوچا۔ جہاں بیس سالوں پہلے والی نازک سی گھبراہٹ شرمائی..... انیس سالہ نیہا زبیر کے بجائے انتالیس سالہ نیہا فاخر کھڑی تھی۔ جس کی آنکھیں اس کے دل کی طرح خالی مگر ہونٹوں پر دکھاوے کی مسکراہٹ تھی۔ چونکہ یہ موقع مسکرانے کا نہیں تھا اس لیے دکھاوے کی مسکراہٹ کے چہرے پر نہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں کا خالی پن اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ تعزیت کے لیے خواتین کی آمد و رفت جاری تھی..... عالیہ خالہ نے دوسروں کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے اس سے کہا۔

”نیہا بیٹا..... تمہیں عزیزہ آپا نے بتایا ہوگا..... شہریار بھائی نے اپنی ساری کتابیں تمہارے نام کر دی ہیں..... تم جب بھی چاہو انہیں لے جاسکتی ہو۔“

”جی.....“ وہ آہستہ سے بولی۔ وہ اس کا شانہ تھپک کے دوسری طرف متوجہ ہونے لگیں تو وہ جلدی سے بولی۔

”اگر آپ اجازت دیں تو میں اوپر اسٹڈی میں کچھ وقت گزار لوں؟“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ یہ وقت مناسب نہیں تھا اور پھر جب شہریار اپنی تمام کتابیں اس کے نام کر چکے تھے اور بھی برا لگتا تھا

”نہیں بس یہی کمر..... اور کچھ نہیں.....“ وہ چلا گیا۔ کچھ لوگ عجیب ہوتے ہیں..... ان کی زندگیاں بھی عجیب و غریب انداز میں گزرتی ہیں..... دنیا والے انہیں سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اور وہ خود اس دنیا کے لیے آن فٹ ہو جاتے ہیں..... لیکن زندگی ان کی بھی گزرتی جاتی ہے..... دوسرے ہارٹ اٹیک سے صحت یاب ہونے کے بعد شہریار نے پاکستان جانے کی خواہش کی۔ اسفندیار کا بڑا بیٹا علی اس کے ساتھ آیا..... پندرہ دنوں کے مختصر قیام کے دوران شہریار کا تمام وقت اس کے اسٹڈی روم میں گزرتا تھا۔

”میرے جانے کے بعد اگر مجھے کچھ ہو جائے تو یہ پڑھ لینا.....“ انہوں نے عالیہ کو ایک سر پہ مہر لافندہ دیتے ہوئے کہا۔

”ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں بھائی۔“ عالیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

”ایسی باتیں ہی تو اصل حقیقت ہوتی ہیں۔“ وہ پھمکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ عالیہ اس کے شوہر اس کے دونوں بیٹوں اور بہوؤں نے اس کا بے حد خیال رکھا..... وہ اس گھر کو خالی اور ویران چھوڑ کے گیا تھا..... آج یہاں بھرا پڑا خاندان موجود تھا..... عالیہ کے پوتوں، پوتیوں کی چہکار سے سارا گھر گونج رہا تھا۔

اسے یہاں کتنی بھی پزیرائی ملی ہو اسے واپس تو جانا ہی تھا..... وہ یہاں ماضی کے دھنوں میں سے کچھ تلاش کرنے آیا تھا..... اور نہ جانے اپنے ساتھ کیا لے کر جا رہا تھا۔ سوسب کے روکنے کے باوجود وہ روانہ ہو گیا..... وہ شاید جانتا تھا کہ یہ اس کا آخری دن تھا..... برسوں پہلے اس نے ایک فیصلہ کیا تھا اور پھر ساری زندگی پچھتاتے ہوئے گزرتی تھی..... ایک ذرا سی ہمت سے زندگی کی بے رنگ تصویر میں خوشیوں کے رنگ بھرے جاسکتے تھے..... لیکن اب

دیکھنا چاہتا تھا اور اس سے کم میں، میں راضی نہیں ہوں..... وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”تمہیں ایسی کوئی لڑکی نہیں ملی جو تمہارے اس معیار پر پوری اتر سکتی؟“ وہ حیران ہو کے بولیں۔

”چلتا ہوں ماما..... ٹائم ہو گیا ہے۔“ اس نے ان کا سوال سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے لیے دعا ضرورت کیجیے گا..... دعائیں تقدیر نہ بھی بدلیں مگر سکون ضرور دیتی ہیں۔“ شہریار کا لہجہ نرم تھا۔

”تمہارے لیے دعا نہیں کروں گی تو کس کے لیے کروں گی میرے بچے۔“ شہریار کے جاتے ہی صفیہ بیگم کی آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو ایک تو اتر سے بہنا شروع ہو گئے اس سے زیادہ وہ اور کیا کر سکتی تھیں۔

وقت تو گزرتا رہتا ہے، کسی کے لیے رکتا نہیں..... اگلے دو برس ماما کی بیماری اور ان کے بیرون ملک علاج میں یوں گزرے کہ اسے اور کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ ماما کا انتقال اور نیہا کی شادی کا واقعہ آگے پیچھے رونما ہوا۔ اس کے بعد اس کی دلچسپی ہر چیز سے ختم ہو گئی..... وہ ماں سے شرمندہ تھا کہ ان کی خواہش پوری نہیں کر سکا تھا۔ وہ نیہا سے بھی شرمندہ تھا کہ اس کے انتظار کو ختم نہیں کر پایا تھا۔ اتنی شرمندگیوں کے احساس کے ساتھ زندگی مشکل تو ہوتی ہی تھی..... وہ پاکستان سے سارا بزنس سمیٹ کر امریکا روانہ ہو گیا جہاں اسفندیار با نہیں پھیلائے اس کا منتظر تھا..... گھر اس نے عالیہ کو دے دیا تھا اور وہ وہاں شفٹ ہو گئی تھی..... بس ایک اسٹڈی روم کی چابی اس نے اپنے پاس رکھی۔

”اگر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو تو.....؟“ اس نے بہن کو مخاطب کیا۔

”کیا بات کرتے ہیں آپ بھائی..... سارا گھر آپ ہی کا تو ہے..... آپ جب آئیں، ہر چیز آپ کی ہی رہے گی۔“

اب ناشتا کرنے کو ان کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا..... مگر انہیں کچھ نہ کچھ کھانا تو تھا۔ آج ان کی اسپتال کی ڈیوٹی کا آخری دن تھا۔

”اب کب واپس آؤ گے؟“ صفیہ بیگم نے اس کی دبی روانگی سے قبل پوچھا۔

”کچھ دن لگ سکتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”شہریار تم جو اس دن کہہ رہے تھے؟“ انہوں نے امید بھری نگاہوں سے بیٹی کی جانب دیکھا۔

”اس پر ہم واپسی میں بات کر لیں گے۔“ وہ زبردستی مسکرایا۔

”بہت دیر ہو چکی ہے بیٹا اب اور دیر مت کرو۔“

میری زندگی کا کیا بھروسا ہے۔“ وہ اس بار بہت آزرده نظر آ رہی تھیں۔

”زندگی کا تو کسی کا بھی کوئی بھروسا نہیں ہے..... کیا پتا میں جو جا رہا ہوں واپس ہی نہیں آ پاؤں۔“ وہ تلخ ہو گیا۔

”شہریار.....“ انہوں نے دل تھام لیا۔

”بیٹا مجھے تو بتا دو تمہیں آخر کس بات کا دکھ ہے، کوئی وہم ہے یا کوئی اور مسئلہ.....؟“ انہوں نے بالا آخر پوچھ لیا۔

”کچھ بھی نہیں ہے ماما، بس شاید میرے ہاتھوں میں شادی کی لکیر ہی نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”میں کیا کروں شہریار میری تو سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔“ ان کے لہجے میں بے بسی تھی۔

”ماما، بات دراصل یہ ہے کہ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے نہ ہی کوئی اس سلسلے میں میری مدد کر سکتا ہے، مسئلہ یہ ہے کہ میری جیسی سوچ کے اور مزاج کے لوگ جس خیالی دنیا میں رہتے ہیں وہاں اپنے معیار سے کم یہ راضی نہیں ہو سکتے..... معیار سے مطلب کوئی بہت اونچی چیز نہیں ہے ماما..... بس وہ ایک خاص ذہنی سطح ہے جو میں اپنی شریک حیات میں

کہ وہ اس وقت اسٹڈی روم میں جائے۔ کوئی کچھ بھی سوچ سکتا تھا مگر اس کے لیے اپنا غم منانے کو اس سے بہتر اور کون سی جگہ تھی؟

”ہاں، ہاں ضرور۔“ وہ جلدی سے بولیں۔
وہ زینہ چڑھ کے اوپر پہنچی..... یوں لگ رہا تھا جیسے بیس سال درمیان میں آئے ہی نہیں ہوں..... وہ وہی نیہاز بیر ہو اور امتحان کی تیاری کرنے اسٹڈی کی طرف جارہی ہو..... اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ کمر اندھیرا تھا..... اس نے لائٹ آن کی..... سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا..... لگتا تھا کہ عالیہ خالہ اس کمرے کی صفائی کرواتی رہتی ہیں گرد و غبار کا نام و نشان تک نہیں تھا..... وہ کتابوں کے خلیف کی طرف بڑھی۔

کتابیں اسی ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرتے اور اس کے وجود میں جذب ہوتے رہے۔ فقط تین دنوں میں اس کے دل میں پیار کا پہلا احساس جاگا تھا۔ اسے شہر یار بالکل اپنی طرح کے لگے تھے۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے ان سے صدیوں پرانا قریبی تعلق ہو..... اس نے ان کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب بھی دیکھ لیے..... اس نے ان سے ایک لا حاصل انتظار کا رشتہ بھی بنالیا تھا..... مگر کیا ہوا.....؟ شاید وہ اس کے لیے ایسا نہیں سوچتے تھے..... ورنہ اس کی پکار پہ کوئی جواب تو دیتے.....

نیہا کو اپنی بے وقعتی کا احساس ہوا۔ اس کا دکھ دہرا تھا..... اس نے شہر یار کو دیکھا، سمجھا اور سوچا کہ ان سے بہتر اس پوری دنیا میں اس کا ہم مزاج اور کوئی نہیں ہوگا۔ عمروں کے تفاوت، اسٹینڈس کا فرق یا رشتوں کا گھماؤ پھراؤ نیہا کے راستے میں نہیں آیا..... وہ شہر یار کو تین گھنٹوں میں تین صدیوں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھ چکی تھی..... اسے یقین تھا کہ دونوں مل کے بہت اچھی زندگی گزار سکتے ہیں..... نہ جانے

کیوں اسے یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ شہر یار کے محسوسات بھی اس سے مختلف نہیں۔ اس نے تو ہمت کر کے ایک قدم آگے بڑھا دیا تھا مگر شہر یار.....؟ یہ اس کے لیے پہلا دکھ تھا پھر وقت نے مہلت ہی نہیں دی اور فاخر کو اس کی زندگی کا حصہ بنا دیا گیا..... اگر وہ شہر یار سے نہ ملتی تو شاید اپنے اور فاخر کے مزاجوں کے فرق کو اس شدت سے محسوس نہیں کرتی مگر براہو اس ملاقات کا کہ وہ بعد میں ہر بات پر شہر یار اور فاخر کا دل ہی دل میں موازنہ کرتی اور جلتی، کڑھتی رہی..... یہ دوسرا عذاب تھا۔ روگ کے کہتے ہیں وہ اچھی طرح جان چکی تھی۔

اس نے شاعری کے سیکشن کی طرف قدم بڑھائے۔ کتابوں پر نظر دوڑائی اور جاناں جاناں خلیف سے باہر نکال لی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ آخری دن اسٹڈی روم کی میز پر یہی کتاب ادھ لگی رکھی تھی اور شہر یار شاید اسی کا مطالعہ کر رہے تھے اس نے اپنا حال دل چپکے سے اسی کتاب میں کھول کے رکھ دیا تھا۔ اس نے کتاب کھولی..... اس کے اوراق پلٹے..... اسے اسی نظم کی تلاش تھی۔ اوراق کے درمیان تہ شدہ کاغذ رکھا ہوا مل گیا۔ کاغذ بوسیدہ ہو چکا تھا۔ شاید شہر یار نے اسے کھول کے دیکھا بھی نہیں ہوگا۔ اس نے وہ احتیاط سے اپنے پرس میں ڈال لیا۔

بچپنا، بے وقوفی، اور بزدلی..... اس کے دل نے دہائی دی۔ تمنا، تکلیف اور تنہائی..... اس نے نتیجے پہ غور کیا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ایک نگاہ غلط شہر یار کے بیڈ روم پر ڈالی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اسے شہر یار پر غصہ آنے لگا۔ اسے لگا جیسے اس کی زندگی کی ساری محرومیوں کے ذمے دار صرف اور صرف شہر یار ہیں۔

وہ آہستہ آہستہ بیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ عالیہ خالہ مہمان خواتین سے فارغ ہو کے اماں سے

باتوں میں مصروف تھیں۔ اسے دیکھتے ہی بولیں۔

”دیکھ لیں کتابیں؟“

”کتابیں تو میری دیکھی ہی ہوئی ہیں۔“ وہ ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں یاد آیا، اماں بتاتی تھیں جب تم یہاں پڑھنے آئی تھیں تو شہر یار کی اسٹڈی ہی میں بیٹھتی تھیں۔ تمہیں بھی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے ناں؟ چلو اچھا ہے شہر یار کی کتابیں کسی قدر دان کے پاس جارہی ہیں۔“

”میں تو آپ کے بھائی کی بھی بہت قدر دان تھی..... کیا ہی اچھا ہوتا جو.....“ اس نے تلخ ہو کے سوچا اور سنجیدگی سے بولی۔

”پڑھنے کا شوق تھا..... اب نہیں ہے۔“ اماں نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی..... پھر جلدی سے بات بناتے ہوئے بولیں۔

”اب تو ماشاء اللہ گھر اور بچوں کی ذمے داری ہی بہت ہے، وقت کہاں ملتا ہوگا۔“

”جی اماں..... ہر شوق، ہر خواہش اور ہر کام کی ایک عمر ہوتی ہے..... وقت ہوتا ہے جو گزر جاتا ہے اور چیزیں بدل جاتی ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

عالیہ خالہ نے کچھ سمجھنے اور نہ سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا۔

”یہ میرے لیے اعزاز ہے جو انہوں نے اپنا اتنا قیمتی اور اہم اثاثہ مجھے سوچنے کا سوچا..... لیکن میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتی۔“ اس نے رک رک کر جملہ مکمل کیا۔

”کیا مطلب.....؟“ عالیہ خالہ نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔

”ہو سکتا ہے میں ان نادر و نایاب کتابوں کی اس طرح دیکھ بھال نہ کر سکوں جیسا ان کا حق ہے۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ ان کی ذمے داری آپ ہی

منتظر بھار

اٹھائیں تو بہتر ہوگا۔ یہیں رہنے دیں یا پھر جسے مناسب سمجھیں دے دیں۔“ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”میرے لیے تو یہ کتابیں میرے بھائی کی نشانیاں ہیں..... کئی سالوں سے یہ جوں کی توں اپنی جگہ ویسے ہی رکھی ہوئی ہیں جیسے بھائی رکھ کے گئے تھے..... کبھی کبھار اپنی نگرانی میں صفائی کروا دیتی ہوں اور کسی کو بھی ان کتابوں کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی ہوں۔“ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

نیہا سر جھکائے ان کی باتیں خاموشی سے سنتی رہی۔

”اب دیکھو، چند ماہ قبل جب بھائی پاکستان آئے تھے تو اپنا زیادہ وقت اسی کمرے میں گزارتے تھے..... وہاں انہیں بہت سکون ملتا تھا..... پہلے امریکا جاتے ہوئے کچھ کتابیں وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے، اس بار آئے تو واپس لے آئے..... لا کر دوبارہ خلیف میں سجا دیں..... میرا دل اسی وقت کھٹک گیا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے.....“ انہوں نے آنکھوں کے گیلے گوشے خشک کیے۔

”صبر کرو عالیہ.....“ اماں بھی روہانسی ہو کے بولیں۔

”آخری دن احمد فراز کی کتاب..... کیا نام ہے، ہاں جاناں جاناں..... وہی پڑھ رہے تھے..... جب میں ان کے لیے کافی لے کر اسٹڈی روم میں گئی تھی..... مجھے دیکھا تو کہنے لگے۔ تم کافی لے کر آئی ہو..... کاش بارش بھی ہو جاتی تو کتنا اچھا ہوتا.....

میں اپنے وطن کی آخری بارش کافی پیتے ہوئے دیکھ جاتا۔“ عالیہ خالہ کے آنسو بند توڑ کے باہر نکل آئے..... اور نیہا سکتے کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی..... سانسیں تھم سی گئی تھیں۔

”خیر جیسی تمہاری مرضی..... ان کتابوں کی ذمے داری میں اٹھالوں گی جب تک زندہ ہوں۔“ وہ دلگیر انداز میں بولیں۔

نیہا کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پتھر کی بن گئی ہو..... اماں واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں.....

چنگاری میں دہی خواہش

شرح طاہر قریشی

”کیسا لگا نیا گھر.....؟“ سیکنہ کوئی دسویں مرتبہ یہ سوال پوچھ رہی تھیں۔ ان کی بیٹیوں کے چہرے پر بھی مسکراہٹ ہی ان کی حد درجہ خوشی... بیان کرنے کو کافی تھی۔

”امی یہ گھر بہت، بہت پیارا ہے بالکل ہمارے خوابوں کی طرح.....“ نگینہ ماں کا ہاتھ تھامے اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی جیسی سونیا پُر جوش آواز میں چبکی۔



”ذہنی مطابقت..... یا ذہنی ہم آہنگی..... اس بات کی اجازت تو مذہب بھی دیتا ہے کہ لڑکا، لڑکی شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ لیں، مل لیں..... اور پھر فیصلہ کریں..... ہم لوگ معاشرے کے فرسودہ نظام کے قیدی ہیں بہت ساری بیکار رسموں اور رواجوں کو کسی مقدس امانت کی طرح سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اور حقیقت سے نظریں جدا لیتے ہیں.....“ وہ خنکی سے ہنسی۔

اماں کچھ سمجھی اور کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت میں بیٹھی اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔

”شادی کا مطلب خوشی ہوتا ہے ناں..... میاں، بیوی اسی وقت خوش رہتے ہیں جب ان کی سوچ میں مماثلت ہو..... دونوں کی پسند و ناپسند مشترک ہو، دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے ہوں..... اماں یہ ہو جائے تو سب کچھ مل جاتا ہے ورنہ سب کچھ مزل جاتا ہے..... زندگی اگر سمجھوتوں کی بنیاد پر گزاری جائے تو بوجھ بن جاتی ہے۔“ اس نے اپنے آنسو پیٹے ہوئے کہا۔

بارش تیز ہونے لگی تھی۔ ابرعریساں کی شاید ان بوندوں کے نصیب میں زمین میں جذب ہو کے رائگاں ہونا ہی لکھا تھا۔ گہر بننا تو کسی کسی کی قسمت میں ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر گھر سب کی نگاہوں میں بھی آئے..... کچھ تو سیپ کے پیٹ میں چھپے سمندر کی تہ میں پڑے ہی رہ جاتے ہیں۔ نگاہوں اور دسترس سے اوجھل۔ اس نے آہستہ سے اپنی گیلی آنکھیں خشک کیں۔ وہ عمر کے اس دور میں آ کے شہر یار کی مجبوری سمجھ چکی تھی۔ اپنے دل کی عدالت سے اس نے شہر یار کو باعزت بری کر دیا تھا۔ اس کے اوپر سے ایک بوجھ ہٹ گیا تھا..... مگر دوسرا..... وہ اسے شاید ساری زندگی برداشت کرنا تھا۔



الوداعی کلمات کے بعد وہ دونوں باہر آ گئیں۔ سرسبز لان میں بہار پھر سے جو بن پر تھی..... اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے..... اماں گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں..... اس نے تروتازہ پھولوں سے نظر ہٹا کے اوپر کی طرف دیکھا..... بادل چھا رہے تھے اور ہلکی سی پھوار نے اس کا چہرہ بھگو دیا۔ اس کی نظر ٹیرس سے ہوتے ہوئے اسٹڈی روم کی کھڑکی پہ جا پڑی۔ کھڑکی بند تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے وہ سکتے کی کیفیت سے باہر آئی تو اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہنے لگا..... اس نے ساری عمر پھوٹ پھوٹ کے رونے کی خواہش کو ہر قدم پہ دبا کے زندگی کی گاڑی چلائی تھی تو اس گاڑی کو چلانا کون سا مشکل کام تھا؟

”اسما آرہی ہے اگلے مہینے پاکستان..... میرے پاس ہی ٹھہرے گی۔“ اماں نے اسے اپنی بھانجی کی آمد کی اطلاع دی۔

”اچھا.....“ اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔

”اس کی بیٹی کا رشتہ طے ہوا ہے ناں یہیں کراچی میں، اس کی تند کے گھر۔“ اماں نے مزید کہا۔

اس کی عدم دلچسپی کے باوجود اماں اسے آگاہ کرتی گئیں۔

”لڑکا ڈاکٹر ہے..... خاندان کا ہے..... شکل صورت عمر، اسٹینڈس میں ہم پلہ ہے اور شادی کے بعد وہ بھی انگلینڈ چلا جائے گا۔“

”ایک بات تو بتائیں اماں.....؟“ وہ ایک دم بول اٹھی۔

”کیا.....؟“ وہ چونکیں۔

”لوگ لڑکی اور لڑکے کا رشتہ طے کرتے ہوئے سارے جوڑ ملا لیتے ہیں، خاندان، اسٹینڈس، شکل صورت، قد و قامت اور عمر..... بھول جاتے ہیں تو بس ایک بات۔“ وہ رکی۔

”وہ کیا.....؟“ اماں جلدی سے بولیں۔

خوش، خوش گھر میں داخل ہوا۔
”کیا ہوا بیٹے بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو.....؟“ وہ بیٹے کو دیکھ کر بولیں۔
”جی امی بات ہی ایسی ہے.....“
”مجھے بھی بتاؤ کیا ہوا ہے.....؟“ وہ متحسسی اس کی طرف جھکیں۔

روحان قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔
”امی میں کوئی خفیہ بات تھوڑی نہ بتانے لگا ہوں جو آپ اتنا آگے جھک آئی ہیں۔“
”چلو اب بتا بھی دو کیا بات ہے۔“ سکینہ اپنی حرکت پر مسکراتی سیدھی ہوئی تھیں۔
”وہ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ مجھے ایک بڑی پارٹی اپنے لیے کام کرنے کی آفر کر رہی ہے۔“
بات درمیان میں ادھوری چھوڑتا وہ استفہامیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔
”ہاں تو کیا انہوں نے بات پکی کر دی؟“ سکینہ نے پوچھا۔

”بات پکی ہی نہیں امی یہ پورے ستر ہزار بھی دیے ہیں ایڈوائس معاوضہ.....“ جیب سے بھاری نوٹوں کی گڈی نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے اس نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔
”ستر ہزار.....“ سکینہ کی سانس ہی رک گئی۔
”ہاں امی پورے ستر ہزار..... ابھی تو یہ آدھی رقم دی ہے باقی ان کا آرڈر پورا ہو جائے تو وہ مکمل رقم دیں گے۔“

”یہ ہمارے ہیں ناں.....“ سکینہ نے پیسوں کو مٹھی میں دبوے اشتیاق و بے یقینی بھرے لہجے میں پوچھا۔
انہوں نے کبھی دس ہزار اپنے ہاتھ میں نہیں پکڑے تھے کہاں اب یہ ستر ہزار کی رقم ان کی اپنی تھی وہ جیسے چاہے خرچ کر سکتی تھیں۔ انہیں یقین آتا بھی تو کیسے.....؟
”ہاں امی یہ سارے ہمارے ہیں، آپ جیسے مرضی انہیں خرچ کریں۔“ اس نے ماں کے ہاتھ اپنے

جس مکر وسائل کی کمی کی وجہ سے وہ ابھی تک ان کی بات تک نہیں چلا پائی تھیں۔ مگر اب روحان کے ہاتھ کا روبرو نے ان کی دلی حسرتوں کو جگا دیا تھا۔
وہ اپنی بچیوں کی شادی جلدی کر دینا چاہتی تھیں.....
اپنی خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ اپنا ذاتی نہ صحیح کرائے کا کھلا اور بڑا مکان بیٹیوں کو رہنے کے لیے دے سکتی تھیں۔

غریب والدین کے لیے وہ پل خوشی کا ہوتا ہے جب وہ اپنی اولاد کے بغیر کہے ان کی کوئی حسرت پوری کر دیں..... بدلے میں ان کی اولاد کے چہرے پر خوشی کے جو رنگ بکھرے نظر آتے ہیں وہی والدین کے لیے تسکین کے باعث ہوتے ہیں۔

سکینہ اس وقت اسی بل میں جی رہی تھیں۔ وہ خوشی سے چمکتی اپنی اولاد کو دیکھ رہی تھیں۔
”کاش ان کا باپ زندہ ہوتا.....“ ایک ہوک ی ان کے دل میں اٹھی تھی۔ جس سے گھبرا کر انہوں نے خود کو ڈپٹا تھا۔

”باپ نہیں تو کیا ہوا، میں تو ہوں ان کے سر پر۔ میں نے ان کے لیے کوئی کسر تو نہیں اٹھا رکھی جو میں کر سکتی تھی کیا اور مسلسل اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ انہیں مکمل خوشی دے سکوں۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں میرے تمام بچے خوش رہیں۔ ایک ماں کا دل اس سے زیادہ کی خواہش کرنا بھی نہیں ہے۔“ سکینہ نے اپنے دماغ میں سہائی سوچوں کو جھٹکتے گہری سانس لی۔

”اب تم سب جلدی سے تمام کمروں کی صفائی کرو، سامان سیٹ کرو، ورنہ پوری رات اسی کام میں گزار جائے گی۔“ سکینہ نے بچیوں سے کہا۔

”جی امی.....“ وہ سب کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آپس میں کام کی تقسیم کر کے وہ اپنے حصے میں آئے کام کرنے میں جُت گئیں۔ سکینہ رات کے کھانے کے لیے سبزی بنارہی تھیں جب روحان

روحان پانچ جماعتیں پڑھ کر فیکٹری میں ملازم لگ گیا تھا۔ گھر کی چکی کسی نہ کسی طرح چل رہی تھی۔
چار بیٹیوں اور ایک بیٹے کی کمائی کے باوجود اس قابل نہیں ہو سکے کہ خود اپنا ذاتی گھر بناسکیں وہ شروع سے کرایے کے مکان میں رہائش پزیر رہے جو صرف ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل تھا اسی میں ایک طرف کونے نما باورچی خانہ تھا۔ بیٹیوں کی آئی کمائی سے سکینہ ان کے جہیز کی چیزیں خرید کر دیتیں۔ جوں جوں روحان بڑا ہوتا گیا۔ اس نے آتش بازی بنانے کا مکمل کام سیکھ لیا۔ وہ اب خود اس قابل ہو چکا تھا کہ یہ کام خود سے شروع کر سکے۔
بہت سوچ بچار اور ماں بہنوں کی صلح کے بعد روحان نے اپنے کسی دوست سے پیسے ادھار کر آتش بازی بنانے کا سامان خریدا اور گھر پر ہی یہ کام شروع کر دیا۔ جس میں اس کی بہنیں اور ماں بھی اس کی مدد کرتیں، وہ اتنی اچھی مگر سستی چیزیں بنانے لگا کہ اس کا بنایا مال مارکیٹ میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگا۔

یہی وجہ تھی کہ حالات تھوڑے سدھرنے لگے تھے۔ سکینہ کے ہاتھوں میں تھوڑا پیسہ جمع ہوا تو انہوں نے وہ چھوٹا مکان چھوڑ کر یہ نیا کرائے کا مکان لے لیا تھا جو پانچ مرلے پر بنا ہوا تھا اس میں چار کمرے ایک چھوٹا صحن اور اوپر کھلی چھت جس کی چار دیواری تھی۔ پہلے مکان کی نسبت یہ مکان کشادہ اور ہوادار تھا وہ سب یہاں بہت خوش تھے۔

”امی وہ جو آخر میں کمرہ ہے اس میں ہمارے جہیز کا سارا سامان رکھ دیں۔ ایک جگہ محفوظ رہے گا.....“ سب سے بڑی نگینہ نے ماں کو مشورہ دیا۔
”جیسا تم لوگوں کا دل کرتا ہے وہ کرو مکمل اجازت ہے.....“ سکینہ نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
سکینہ کی سب بیٹیاں شادی کی عمر میں پہنچ چکی

”اور امی اس گھر میں تو چار کمرے ہیں، آپ نے دیکھے..... چاروں کتنے بڑے بڑے ہیں اور یہ صحن..... ہم سردیوں میں یہاں دھوپ سینکا کریں گے۔“ صحن کے بیچوں بیچ کھڑی دونوں ہاتھ پھیلائے وہ گول گول گھوم رہی تھی۔
”پاگل کیا اوپر نہیں دیکھا کتنی بڑی چھت ہے دھوپ سینکنے کے لیے.....“ علینہ نے پیار بھری چپت رسید کرتے ہوئے اس کا دھیان اوپر کروایا۔
”اچھا عقل مند آپ..... مجھے بھی پتا ہے، امی اب ہمیں شدید گرمی میں کمرے میں سونا نہیں پڑے گا، ہم چھت پر چلے جایا کریں گے۔“ سونیا معصومیت سے کہتی ماں کے پاس آئی تھی۔
سکینہ اپنی بیٹیوں کو خوش دیکھ کر خود بھی بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھیں۔

”اور امی ہماری شادی کے بعد ہارون اور روحان کے ساتھ تو آپ کو یہ گھر بہت بڑا پڑے گا۔ عیش سے رہیے گا۔“ ملیحہ اپنے دانتوں کی نمائش کرتی کچھ زیادہ ہی خوش دکھائی دے رہی تھی۔

وہ سب طرح طرح کی باتیں کر کے اپنے دل میں دلی حسرتوں کو بیان کر رہی تھیں، سکینہ کی اوپر تلے کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ سکینہ کے شوہر وفات پا چکے تھے جب ان کا انتقال ہوا تو سب بچے چھوٹے ہی تھے۔ خود سکینہ نے بے انتہا جدوجہد سے اپنے بچوں کو پالا اور اب سب بچے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ صرف ہارون ان سب میں چھوٹا تھا۔ سکینہ خود تو محنتی تھیں ہی ماں کی طرح بیٹیاں بھی ہر طرح کے ہنر سے واقف تھیں۔ وہ کڑھائی، سلائی میں ماں کا ہاتھ بٹاتیں جبکہ روحان ایک آتش بازی کا سامان بنانے والی فیکٹری میں ملازم تھا، سکینہ نے اپنے بچوں کو پڑھانے کی لاکھ کوشش کی مگر مہنگائی اور اسکول کی فیسوں نے کمر توڑ ڈالی نتیجتاً ان کے بچے دس جماعتوں سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔

سنہری باتیں

☆ مسکراہٹ روح کا دروازہ کھول دیتی ہے۔
☆ غصے میں آدمی اپنا منہ کھول دیتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔
☆ خوش اخلاقی ایسا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔
☆ ظالم کے ظلم سے نہیں بلکہ صابر کے صبر سے ڈرو۔
☆ کسی کو حقیر مت سمجھو کیا پتا وہ تم سے بہتر ہو۔
☆ زندگی میں دو چیزیں ٹوٹنے کے لیے ہوتی ہیں آس اور سانس۔ سانس ٹوٹنے سے آدمی ایک بار مرتا ہے اور آس ٹوٹنے سے بار بار مرتا ہے۔
☆ مرسلہ: فریدہ فری یوسف زئی، لاہور
☆ سجائے بولی۔

”اور بالوں کی بھی کٹنگ کرواؤں گی.....“ ایک اور فرمائش ہوئی۔
”ہاں..... ہاں تم نے جو کرنا ہے کر لینا تمہیں کس نے منع کیا ہے۔“ روحان بولتا ان کے ساتھ آ بیٹھا تھا۔
”بچی بھائی آپ منع تو نہیں کریں گے.....؟“ اس کے شوق کا عالم ہی الگ تھا۔
”بالکل بھی نہیں.....“ زبان کے ساتھ اس کا سر بھی زور شور سے ہلاتا تھا۔ ”اور دودھ پلائی کے ننگ میں اپنے تینوں بہنوئیوں سے بہت بھاری لوں گی اور کسی کو بھی نہیں دوں گی.....“ وہ صرف ہارون سے بڑی اور ان چاروں سے چھوٹی تھی اور اپنے چھوٹے ہونے کا فائدہ وہ اکثر ہی اٹھایا کرتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اور خواہش بیان کرتی سیکنہ کمرے میں داخل ہوئیں۔
”کتنا کام رہ گیا تم لوگوں کا؟“
”ابھی تو بہت کام باقی ہے امی.....“ روحان

”خدا تیری زبان مبارک کرے روحان“
”جگ جگ جیے خدا تیرے جیسا بھائی ہر بہن کو دے سیکنہ نے بے ساختہ اسے دعا سے نوازا تھا۔
بھائی کو ماں کے پاس بیٹھے دیکھ کر وہ سب کام چھوڑ کر وہیں چلی آئیں اور ماں کے ہاتھ میں جب ان کی رقم دیکھ کر انہیں معلوم ہوا یہ سب پیسے ان کے اپنے ہیں ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔
انتہائی غربت میں زندگی گزار کر انہوں نے اب یہ دن دیکھے تھے..... ان کی خوشی دیدنی تھی۔

☆☆☆

رات کے کھانے سے فراغت کے بعد روحان ان کے درمیان بیٹھا ان سے پوچھ رہا تھا۔
”ہاں بھئی بولو، آج رات تم چاروں میں سے کون میرے ساتھ کام کروائے گا؟“
”گنیمہ اور سونیا کی ڈیوٹی ہے آج۔ کل ہم نے کام کیا تھا.....“ علیہ نے فوراً جواب دیا۔
”تو تم دونوں تیار ہو.....؟“ روحان ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔

”بالکل تیار ہیں بھائی۔“ سونیا نے کہا۔
”چلو پھر آ جاؤ۔ جلدی کام شروع کریں گے تو جلدی ختم ہوگا ورنہ پوری رات جاگنا پڑے گا.....“ ان کو کہتا وہ خود بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اسے کھڑا دیکھ کر وہ دونوں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”چلیں بھائی.....“ وہ تینوں ایک ساتھ کمرے سے باہر نکل کر آتش بازی بنانے کے لیے باقی کمروں سے الگ مخصوص کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ وہ باتیں کرتیں بارود ہاتھوں سے مکس کرتی تھیں۔

”گنیمہ آئی! آپ کی شادی میں، میں ساڑی پہنوں گی، میں نے امی کو بھی پہلے سے بتا دیا ہے۔“ سونیا ان کی شادی کا سوچ کر بڑی پرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

”نہیں لینا۔“ وہ دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر

اگلی صبح سیکنہ ناشتا کرتے ہی گھر سے نکل گئیں..... ان کا ارادہ رشتہ کرانے والی کسی خاتون سے ملنے کا تھا تا کہ وہ ان سے مل کر اپنی بیٹیوں کی شادی کے لیے رشتہ دیکھنے کا کہہ سکیں..... وہ بہت پُر امید تھیں کہ وہ بہت جلد اپنی بیٹیوں کی شادی کر کے ان کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گی۔
ان کی واپسی تقریباً دو گھنٹے بعد ہوئی جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئیں ان کی بیٹیوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔

”کیا بنا امی.....؟“ سب کا ایک ہی سوال تھا۔
”میں رشیدہ خالہ کو کہہ آئی ہوں، انہوں نے بڑا تسلی بخش جواب دیا ہے۔ ان کی نظر میں دو، تین اچھے رشتے ہیں انہوں نے کل ہی لڑکے والوں کو ہمارے ہاں لانے کا وعدہ کیا ہے۔“ خوشی ان کے ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی۔

”اوہ تو اب شہزادیاں دلہنیں بنیں گی۔“ سونیا نے اپنی بڑی بہنوں کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ گنیمہ، علیہ اور علیہ تینوں کے چہروں پر شرم کی لالی اتر آئی تھی۔

”بد تمیز شرم نہیں آتی تمہیں.....“ گنیمہ نے شرمیلی مسکان لبوں پر سجائے اسے چپت رسید کی۔
”آپ لوگوں کو شرم آ تو رہی ہے بس کافی ہے۔“

ہاتھوں میں دبا کر انہیں یقین دلانا چاہا۔ روحان تین بہنوں سے چھوٹا تھا گو کہ سیکنہ کی سب بیٹیاں گھر میں اجرت پر کام کرتی تھیں مگر ان کی کمائی میں کبھی اتنے پیسے ان کے ہاتھ نہیں آئے تھے..... اور اب تین بہنوں سے چھوٹے روحان نے انہیں نوٹوں سے بھر دیا تھا۔ خوشی سے کانٹے ہوئے انہوں نے کھینچ کر روحان کو گلے سے لگا لیا مگر ایک دم وہ اسے گلے سے ہٹاتے سامنے کر کے بولیں۔

”روحان بیٹا یہ کام خطرے کا ہے، تم زیادہ بڑا آرڈر مت لینا..... خیال رکھنا تم گھر میں یہ کام کرتے ہو۔“
”پیاری امی کام خطرے کا تو ہے مگر یہ دیکھیں اس میں پیسہ کتنا ہے کتنے سے وقت میں ہم نے کتنا پیسہ کمایا..... اور کسی کام میں اتنے وقت میں اتنا پیسہ کمانا ممکن نہیں ہوتا اور یہ خیال تو مجھے بھی ہے کہ میں یہ کام گھر میں کرتا ہوں۔ بس امی کچھ پیسہ اور جمع ہو جائے میں الگ سے کوئی گودام وغیرہ لوں گا جہاں ہم بے فکری سے اپنا کام کر سکیں گے۔“ اس نے ماں کو تسلی دی تھی۔ جس سے واقعی وہ مطمئن ہو گئیں۔
”میں ان پیسوں سے تیری بہنوں کی شادی کروں گی.....“ وہ ہاتھ میں پکڑے پیسوں کو دیکھ کر بولیں۔

”امی ستر ہزار میں کوئی شادی ہوتی ہے میں آپ کو اور پیسے کم کر دوں گا بہت سارے پیسے میری بہنوں کی شادی کیجیے گا..... یہ جو بھی فرمائش کریں وہ ہر چیز ان کے جہیز میں دیں، بہت حسرتیں دہی ہیں میری بہنوں کے دلوں میں، میں ان کی ہر حسرت پوری کروں گا۔ میرا باپ نہیں ہے میں ان کا باپ بن کر ان کا خیال رکھوں گا..... اور میری کمائی میں آدھا حصہ تو انہی کا ہے امی..... یہ ساری دن رات جاگ جاگ کر آرڈر پر آئے مال کو تیار کرتی ہیں۔ بہت محنتی ہیں میری بہنیں.....“ کام کرتی اپنی بہنوں پر پیار بھری نظریں جمائے وہ اپنی خواہش کا اظہار کر رہا تھا۔

وہ اسی یقین کے ساتھ اندر جانا چاہتی تھیں جب کسی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کی توجہ ایسولینس میں پڑی بری طرح جلی ہوئی لاشوں کی طرف کرائی۔ لاشوں کو اب سفید کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا۔

”بہن یہ تینوں آپ کے بچے ہیں؟“ سکینہ کو ساتھ لیے اس نے انہیں لاشوں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ سکینہ پاگلوں کی طرح کپڑا ہٹا کر انہیں دیکھتی جا رہی تھیں۔

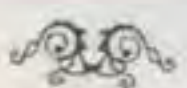
”یہ کیا ہو گیا میرے بچوں..... تمہیں کتنی تکلیف ہوئی ماں کو بتاؤ ناں.....؟“ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ سب ہنستے مسکراتے اپنی خواہشات کا اظہار کر رہے تھے..... اور وہ پیسے..... سکینہ نے اپنے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا۔

”اور وہ ایک، ایک پیسے سے ارمانوں سے جمع کیا جہیز.....“ کبھی کبھار جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

”سب جل جاتا..... تم تو زندہ رہتے میرے بچوں.....“ ایک ماں سے ایک ساتھ اس کے تین بچے جدا ہوئے تھے۔ ایک قیامت تھی جو اس ماں پر ٹوٹ پڑی تھی۔

وہ وہیں پر بیٹھ کر زمین سے خاک اٹھا اٹھا کر اپنے اوپر ڈالنے لگیں۔

”میں کیوں نہ مر گئی..... عمر تو میری تھی جانے کی، تم تینوں کیوں چلے گئے..... میرے روحان تیری ماں رو رہی ہے بیٹے اٹھ جاناں.....“ سکینہ کے بین ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ارد گرد کھڑے تمام لوگ انہیں رحم بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ زندگی کی اس بھیڑ میں دنیا کے شانہ بشانہ چلنے کی تنگ و دو میں انہوں نے اپنی زندگی ہی گنوا دی تھی۔ جس گھر کو انہوں نے بڑے ارمانوں سے لیا پھر سجا یا، اسی کے بلے تلے ان کے ساتھ ان کی خواہشات بھی دب کر دم توڑ چکی تھیں۔



پیش کے بعد آگ بجھانے والے عملے نے آگ پر قابو پا لیا۔ مقامی اسپتال سے آئی ایسولینس کا عملہ مستعد تھا۔ پورا گھر بری طرح جل کر گر چکا تھا۔ لوگوں نے ملہ ہٹا کر اس میں سے روحان، نگینہ اور سونیا کی جلی ہوئی لاشیں باہر نکالیں۔

دیکھنے والوں کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ تینوں اس بری طرح آگ میں جل چکے تھے کہ ان کی پہچان مشکل تھی۔ سکینہ اپنے لخت جگروں کی یہ حالت دیکھ کر اپنا اپنی توازن کھو بیٹھی تھیں۔ ایسا لگتا تھا قیامت سے بھی بڑی قیامت برپا ہو۔

”ان میں سے اگر تین مر چکے تھے تو وہ تین بھی بس اتنے زندہ تھے کہ ان کی سانسیں آ جا رہی تھیں۔“ ”اُدھر کمرے میں میری بچیوں کا جہیز جمع ہے۔ میں اپنی نگینہ، ملیحہ اور علیہ کی شادی کرنے والی ہوں.....“ نیم پاگل سی ماں اپنی اولادوں کی موت کا مدد سہہ ہی نہیں پار رہی تھیں۔

”سونیا ساڑی پہنے گی..... وہ بہت شرارتی ہے، ہمارے گھر کی رونق..... میں نے وعدہ کیا ہے میں خود اسے ساڑی لا کر دوں گی.....“ ان کی باتیں سننے والوں کے کلیجے پھاڑ رہی تھیں۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ الٹی یہ اس غریب خاندان پر کیا آفت ٹوٹ پڑی..... ریسکیو ٹیم نے بلے میں سے بارہ سالہ زخمی ہارون کو باہر نکالا تھا۔ خدا کی قدرت تھی اتنی تباہی اتنی آگ کے باوجود وہ بچہ زندہ و محفوظ تھا، اسے ایک فرش تک نہیں آئی تھی۔ ہارون کو دیکھ کر علیہ اور ملیحہ کی طرف بھاگیں۔ اسے گود میں اٹھائے وہ سکینہ کی طرف آئیں۔ سکینہ نے ہاتھ بڑھا کر ہارون کو گھما دیا..... اس کے زندہ ہونے کا یقین کر کے وہ تیزی سے اٹھ کر اندر بھاگیں۔

”میرا ہارون ٹھیک ہے، باقی بچے بھی سلامت ہیں.....“ ”میرا اللہ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا.....“

ہر طرف ایک کھرام بپا تھا۔ کچھ بل تو سکینہ کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ کیا ہو گیا..... اور جب انہوں نے شعور کی دنیا میں قدم رکھا تو وہ ننگے پاؤں، ننگے سر کمرے سے باہر بھاگتی آئی تھیں۔ دوسرے کمرے سے ملیحہ اور علیہ باہر آتی دکھائی دی تھیں۔ وہ دونوں بری طرح بدحواس دکھائی دے رہی تھیں۔ ماں کو دیکھ کر وہ اس سے لپٹی زار زار رو رہی تھیں۔

”امی، امی..... یہ کیا ہو گیا ہمارا گھر جل رہا ہے۔ امی وہ روحان، نگینہ اور ہماری سونیا..... کہاں ہیں امی؟“ ملیحہ ان کا بازو تھامے چیخ رہی تھی۔ آگ ان کے نزدیک آتی جا رہی تھی۔ جیسی محلے کے کچھ لوگ انہیں صحن سے کھینچ کر گھر سے باہر لے آئے..... فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے بجتے ہارن کی آوازیں نزدیک آتی محسوس ہو رہی تھیں۔

سکینہ سب سے ہاتھ چھڑا کر اندر کی جانب لپکیں۔ ”میرے بچے اندر ہیں، میں انہیں لے آؤں، وہ جل جائیں گے.....“ وہ سینہ پیٹ رہی تھیں۔ کئی خاتون نے انہیں روکنا چاہا۔

”اب کیا بچاؤ گی بہن..... آگ کی بلندی تو دیکھو۔ اس آگ میں تمہارے بچے اندر محفوظ ہوں گے بھلا؟“

”میرا روحان، میری نگینہ، سونیا.....“ وہ ہاتھ پاؤں چھوڑے وہیں سڑک پر گر پڑیں۔ علیہ اور ملیحہ ان کے قریب بیٹھی رو رہی تھیں۔

”امی ہمارے بہن بھائی جل گئے.....“ ”امی.....“ وہ ماں سے لپٹی بری طرح چلا رہی تھیں۔ سکینہ نیم دیوانوں کی سی حالت میں زمین پر ہاتھ مار مار کر بین کر رہی تھیں۔ آگ پھیلنے کی گاڑیاں آگ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ تینوں اپنے پیاروں کو بچانے کی خواہش میں بار بار اندر جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ محلے کی کچھ خواتین نے بہ مشکل انہیں قابو کیا ہوا تھا۔ ایک گھنٹے کی سرف

نے جواب دیا۔

”اور کیا امی ابھی تو یہ پٹاخوں کا مسالا بھی ٹھیک طرح کس نہیں ہوا.....“ سونیا دونوں ہاتھوں میں بارود لیے ماں کو دکھانے لگی۔ جب سکینہ کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑاتی ان سے بولیں۔

”کمرے میں ماچس تو نہیں رکھی ناں؟“ ”نہیں امی، میں خود باہر رکھ کر آئی ہوں.....“

نگینہ مصروف سے انداز میں بولی۔ ”چلو ٹھیک ہے پھر تم لوگ کام کرو..... میں ذرا سی نیند لے لوں پھر میں بھی آ کر تمہارے ساتھ کام کروادوں گی۔“ سکینہ یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ وہ تینوں اسی طرح باتوں میں مصروف اپنا کام نمٹا رہے تھے جب اچانک بجلی کے تار سے بھی سی چنگاری نکلی۔

ان تینوں نے ننھی سی اس چنگاری کو تار سے نکلنے اور بجھتے دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

تقریباً دو منٹ بعد اسی تار سے ایک بڑی سی چنگاری فضا میں بلند ہو کر بارود پر آگری..... پلک جھپکتے میں بارود نے چنگاری پکڑی اور سیکنڈ سے بھی کم وقت میں پورے بارود کو آگ نے اپنے لپیٹے میں لے لیا..... یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ وہ اپنا بچاؤ بھی نہ کر پائے۔ آگ اس قدر بھڑکی کہ بارود میں ہاتھ ڈالے ان تینوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

آگ پوری طرح پھیل چکی تھی کمرے میں رکھے بارود میں یکے بعد دیگرے دھماکے ہونے لگے اور کمرے کی چھت دیواروں سے الگ ہوئی ان کے اوپر آگری..... تیزی سے پھیلتی آگ نے کمرے کے ساتھ باقی کمروں کو بھی تیزی سے اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا تھا۔ آگ کے شعلے آسمان کو چھونے لگے تھے۔ جب سکینہ پڑ بڑا کر اٹھیں آگ کی پیش انہیں جھلسائے دے رہی تھی۔ پورا محلہ گھر کے باہر جمع تھا۔



منی ناول

ہمیشہ جنت کو

صائمہ اکرم

ایرینیاں کا بدن اوڑھے گلابی کاسی شام
 بڑی سرعت کے ساتھ اس چھوٹے سے بنگلے پر پھیلی
 تھی۔ دھوپ کی زردی دم توڑ چکی تھی اور دبے دبے
 قدموں کے ساتھ آنے والی شام کی تاریکی آہستہ
 آہستہ دن کے اجالے کو نگل رہی تھی..... فضا میں
 جنگلی پھولوں کی بڑی خوشگوار سی مہک تھی۔
 سفید ماربل کے ٹائلوں سے بنے اس گھر کے
 لان کو ایک نظر دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ گھر

کے مکتوب کو باغبانی سے کوئی خاص شغف نہیں، اس لیے لان میں لگے امرود، انار اور آم کے درختوں پر اداسی دور ہی سے پر پھیلائے نظر آتی تھی۔ لان سے چار پانچ میٹر ہیوں سے ذرا اوپر چھوٹے سے برآمدے میں داخلی دروازہ تھا۔ برآمدے کی میٹریاں گرد اور سوکھے پتوں سے اٹی ہوئی گھروالوں کی بے توجہی کا کھل کر اعلان کر رہی تھیں۔

اسلام آباد کے اس سیکٹر میں یہ چھوٹا سا بنگلا مین روڈ پر ہی واقع تھا۔ سامنے سڑک پر دائیں بائیں لگے سفیدے کے درخت اور ان کے پس منظر میں مارگلہ کی پہاڑیوں کا نظارہ پہلی دفعہ آنے والوں کو مبہوت کر دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ شہر ان دونوں کو پہلی ہی نظر میں بھا گیا تھا۔ وہ دونوں جو یہاں آنے سے پہلے ہزاروں اندیشوں کا شکار تھیں کم از کم اس سرسبز علاقے کو تو انہوں نے فوراً ہی پاس کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر اس جاذبِ نظر بنگلے کو دیکھ کر پوری ہو گئی۔ جس کے گیٹ پر ”الجنة“ نام کی تختی آویزاں تھی۔

سیاہ گیٹ کے آگے ایک پیلی ٹیکسی اور بھورے سے رنگ کی پک اپ بڑی تیزی سے آگے پیچھے آ کر رکیں۔ اسی لمحے گھر کے داخلی دروازے سے اسود کی کام سے ابھی ابھی باہر نکلا تھا۔ گیٹ بہت چھوٹا اور سلاخوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے باہر کا منظر بالکل صاف دکھائی دیتا تھا۔ اپنے گھر کے گیٹ پر ٹیکسی اور پک اپ دیکھ کر وہ کچھ چونکا۔ اندر کے مقابلے میں باہر کا موسم خاصا خوشگوار تھا۔ صبح کھل کر بارش ہو جانے کے بعد ہر چیز ہی تروتازہ لگ رہی تھی۔

”لگتا ہے کہ اوپر والے پورشن کے مکین آ ہی گئے.....“ اس نے جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بالکل درست اندازہ لگایا۔ وہ اب بھی اپنی جگہ پر جما کھڑا تھا لیکن اس کی نظریں سخت حیرانی سے سامنے سامانِ اترواتی خواتین پر جمی ہوئی تھیں۔

”پروفیسر صاحب نے تو کہا تھا کہ ایک خالہ

اور بھانجی ہوں گی لیکن ان میں خالہ کون ہے.....؟“ اس نے شدید حیرت سے اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑی بلیک جینز پر لگائی شرٹ پہنے لیڈی ڈیانہ ہیر کٹ میں ایک کامنی سی لڑکی کو دیکھا۔ وہ اتنے فاصلے پر بھی اس خاتون کے چہرے کے دلکش نقش اور سرخی مائل رنگت کا اندازہ کر سکتا تھا۔

اس کے ساتھ بلیو جینز پر بلیک لمبی ٹخنوں کو چھوٹی قمیص کے ساتھ کھڑی لڑکی کے نین نقش میں دل کو چھو لینے والی معصومیت اور جاذبیت تھی۔ اس کا قد خاصا دراز اور پوری شخصیت میں نمایاں بھورے سلکی بال تھے جنہیں ہیر بند میں جکڑ کر اونچی سی پونی ٹیل بنائی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس کی کمر کو چھو رہے تھے۔ اسود نے سخت حیرت اور توہینی انداز سے اس لڑکی کو دیکھا۔ اس کی خوب صورت پیشانی پر کئی سلوٹیں تھیں اور وہ اپنے مد مقابل موجود محترمہ کی کسی بات پر بیزاری سے سر جھٹک کر نفی میں سر ہلا رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی پونی کسی پنڈولم کی طرح دائیں بائیں گھوم رہی تھی۔ یہ بہت دلچسپ منظر تھا لیکن وہ زیادہ دیر اس سے محظوظ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ان میں سے ایک خاتون اس کی موجودگی سے آگاہ ہو چکی تھیں۔

اسود کچھ قدم چل کر آگے بڑھ آیا۔ پک اپ سامان اتار کر واپس جا چکی تھی۔ ان میں سے لمبے بالوں والی کی نظر اس پر پڑی۔ اس کی حسین آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اسود کو ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے پہاڑوں پر اترتی دلکش شام تھک کر چور ہو گئی ہو۔

”تم تو کرایہ ایسے مانگ رہے ہو جیسے ہمیں راول پنڈی انر پورٹ سے نہیں اسپین سے ڈائریکٹ لے کر آ رہے ہو.....“ لیڈی ڈیانہ کی جھنجھالی ہوئی آواز پر اسود نے اپنے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ کو بہ مشکل چھپایا۔ ٹیکسی والے اور ان کے درمیان شاید نہیں یقیناً کرانے کے سلسلے میں کوئی تنازعہ چل رہا تھا۔

گمشدہ جنت

نے میرا بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔“ ڈرائیور نے جھنجھلا کر کلائی میں بندھی گھڑی پر ناٹم دیکھا۔ اس کے رخسار غصے کی زیادتی سے سرخ ہوئے۔

”واٹ.....؟“ وہ آپ سے باہر ہوئی۔

”یہ باجی کسے کہا ہے.....؟“ وہ خاتون اسپینش بولتے بولتے اچانک مشتعل ہو کر اردو میں بولیں۔ ان کے غضب ناک انداز میں انگلی اٹھانے پر ٹیکسی ڈرائیور نے بوکھلا کر دوسری لڑکی کو دیکھا جو اس سارے معاملے سے سخت بیزار تھی۔

”مجھے کہہ رہا ہے آپ کو نہیں.....“ دوسری لڑکی نے انتہائی کوفت سے ٹیکسی ڈرائیور کی جان بخشی کروائی تھی جو اب ممنون نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسود کے لیے اپنی ہنسی روکنا سخت دشوار ہو گیا۔ وہ دونوں اب اسے دیکھ چکی تھیں جو ایک دوستانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے ان کے بالکل قریب آن کھڑا ہوا۔

”کیا مسئلہ ہے بھی.....؟“ اسود نے معصوم بن کر پوچھا۔

”پاکستان میں تو ہر بندہ ہی ایک دوسرے کو لوٹنے پر لگا ہوا ہے۔ اس لیے تو اس ملک کا کچھ بنتا نہیں ہے۔“ لیڈی ڈیانہ ہیر کٹ والی نے اسے دیکھ کر شکایتی انداز سے کہا۔

”یہ دیکھیں بی بی غلطی ہو گئی۔ چلیں تین سونہ سہی ڈھائی سو ہی زائد دے دیں.....“ ٹیکسی ڈرائیور نے انتہائی بد لحاظی سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ اس کے جان چھڑانے والے انداز پر دوسری لڑکی نے بڑی عجلت میں اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور سرخ رنگ کے تین نوٹ نکال کر ڈرائیور کی طرف بڑھائے جو اس نے فوراً جھپٹ لیے۔

”کیا کر رہی ہو شرمزہ.....؟“ یہ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے.....“ لیڈی ڈیانہ ہیر کٹ والی نے بوکھلا کر اپنے ساتھ کھڑی لڑکی کو دیکھا جس پر خجالت اور

”ہاں تو بی بی آپ نے بھی تو مجھے آئی ایٹ سیکٹر کا کہا تھا جو اسلام آباد ایکسپریس وے سے بالکل نزدیک ہے اور وہاں آکر پتا چلا کہ آئی ایٹ سیکٹر نہیں الی ایٹ سیکٹر جانا ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ اس سیکٹر سے بھی یہاں تک فاصلہ کتنا بنتا ہے۔“ ڈرائیور ان خاتون سے بھی زیادہ اکتایا ہوا تھا۔ اس لیے پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا تھا۔

”ہاں تو ہم کون سا اسلام آباد کے رہائشی ہیں جو یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں گے پھر ان رہائشی علاقوں کے اے بی سی والے ناموں سے اچھا خاصا حکمند بندہ بھی کنفیوژ ہو سکتا ہے.....“ محترمہ کی اس الوکھی منطق پر اسود کے ساتھ ساتھ ٹیکسی ڈرائیور بھی بھونچکا رہ گیا۔

”واہ بی بی یہ بھی خوب کہی۔ آپ کی ذرا سی کمزور یادداشت سے میرا اتنا سارا پیٹرول جل گیا اور آپ کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں.....“ ٹیکسی ڈرائیور مزید جھلایا۔ ”میں پورے دو سیکٹر درمیان میں کر اس کر کے یہاں آیا ہوں اس لیے تین سوزاؤں بی لوں گا۔“ ڈرائیور کے دو ٹوک انداز پر خاتون کی ٹنگی منی سی ناک غصے کی زیادتی سے سرخ ہوئی۔ اسود نے بڑی دلچسپی سے اس منظر کو دیکھا۔

”میرا دماغ خراب ہے جو تمہیں تین سوزاؤں دوں.....؟“ لیڈی ڈیانہ کٹ والی خاتون کے باقاعدہ چیخنے پر ساتھ کھڑی لڑکی کا منہ خفت سے سرخ ہوا۔ اس نے سپٹا کر تھوڑا سا رخ موڑ لیا جبکہ اس کی اس حرکت پر اسود ہلکا سا مسکرایا۔ اس نے دیکھا وہی لڑکی اب دوسری کا بازو پکڑے اسپینش میں اسے شاید معاملہ رفع دفع کرنے کے بارے میں کہہ رہی تھی۔ وہ زبان اسود کے ساتھ ڈرائیور کے لیے بھی ناقابل فہم تھی۔

”اُدہ باجی جی آپ دونوں یہ فارسی میں گفتگو کر جا کر کیجیے گا۔ مجھے فارغ کر س پہلے ہی آپ

چکر میں مارا گیا۔ سوچا کہ دور سے اتنی لشکر مار رہی ہیں تو قریب جا کر دیکھتے ہیں۔ اس نے بے تکلفی سے مزید اضافہ کیا۔ ”مجھے کیا پتا تھا کہ آپ مجھے قلی بنادیں گی.....“ اس کی آنکھوں میں شرارت کے بھی رنگ تھے۔ شرزمہ نے سخت تعجب اور حیرانی سے ان دونوں کو دیکھا جو ایک دوسرے سے ایسے عجیب گفتگو تھے جیسے صدیوں کی آشنائی ہو حالانکہ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔

وہ ہنی کے بے تکلفانہ مزاج سے تو واقف تھی کہ انہیں بس ایک سامع میسر آنا چاہیے خواہ وہ کوئی بھی ہو لیکن اگلا بندہ بھی ہنی کے جیسا ہی ہوگا، اس کا تجربہ اسے پہلی دفعہ ہوا تھا۔ وہ بے تکلفی سے ہنی کی شان میں زمین، آسمان کے قلابے ملا رہا تھا جبکہ اپنی تعریف پر ہنی کے گال اسٹرابیری کی طرح سرخ ہو رہے تھے۔

”یہ پروفیسر صاحب خود کہاں ہیں اور گھر میں کوئی نسوانی چہرہ نظر نہیں آ رہا۔ خیریت.....؟“ ہنی کو بڑی دیر بعد خیال آیا تو جھٹ سے پوچھ بیٹھیں۔

”کوئی ہوگا تو نظر آئے گا نا.....“ اس نے بڑا جاندار قہقہہ فضا میں بلند کیا۔ اس کی بات پر آرام سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے شرزمہ کو جھکا لگا، وہ فوراً سنبھل کر بیٹھ گئی جبکہ اس کے سامنے براجمان ہنی کا اطمینان ہنوز قابل دید تھا۔

”کیا مطلب بھئی.....؟“ ہنی نے ابرو چڑھا کر سوالیہ نظروں سے استفار کیا تو اس نے ہنستے ہوئے اطلاع دی۔

”بھئی اس گھر میں دو چھترے چھانٹ رہے ہیں۔ پروفیسر ماموں صاحب شادی کے جھنجھٹ میں پڑے ہی نہیں اور ادھر میری طرف معاملہ الٹا ہے، آج تک کسی محترمہ نے لفٹ ہی نہیں کروائی اس لیے تا حال کنوارہ ہوں۔“ وہ اچھا خاصا غیر سنجیدہ بندہ تھا۔ اس کی شوخی پر شرزمہ نے بلا مبالغہ کوئی تیسری

”اگر آپ اسی گھر کے مکین ہیں تو اللہ کا نام لے کر ہمارا سامان اندر منتقل کریں۔ شاباش.....“ ہنی نے مسکراہٹ دبا کر اسے اشارہ کیا۔

”آف مائی گاڈ.....“ اس بیگ میں کیا آپ ایٹھیں بھر کر لائی ہیں.....؟“ اس نے سامان اندر منتقل کرنے کی غرض سے بیگ اٹھایا تو وزن کے احساس سے بے اختیار دھرا سا ہوا تھا۔

شرزمہ کے چہرے پر ایک مبہم سی مسکراہٹ لمحے بھر کو نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی جبکہ ہنی نے ہنستے ہوئے اطلاع دی۔ ”دھیان سے، اس میں شرزمہ کی بکس ہیں.....“

”آف لگتا ہے کہ اسپین کے سارے کتب خانے ہی خالی کر آئی ہیں محترمہ.....“ وہ بیگ اٹھائے پہ مشکل چل رہا تھا۔

ہنی نے اپنا ہینڈی اور شرزمہ نے بھی ایک بیگ اٹھا رکھا تھا۔ وہ سارا سامان اٹھا کر ٹی وی لاونچ میں لے آئے۔ اسود کو پورے تین چکر لگانے پڑے تھے جبکہ وہ دونوں ایک ہی چکر میں تھک کر اب بے تکلفی سے صوفوں پر براجمان تھیں۔

”کیا پروفیسر صاحب نے تمہیں ہماری آمد سے مطلع کر رکھا تھا یا پھر ایسے ہی مروت میں مارے گئے ہو؟“ ہنی نے اسے اپنی سانس بحال کرتے دیکھ کر شرارت سے پوچھا جو آب صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔

”میں آپ کو شکل سے کیا اتنا ”بامروت“ لگتا ہوں.....؟“ اس کے انداز میں شوخی کا عنصر نمایاں تھا۔ ”ہرگز نہیں.....“ ہنی نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے صاف گوئی کی انتہا کر دی۔ وہ لمحے بھر کو ہکا بکا ہوا۔

”بالکل ٹھیک کہا۔ میں ہوں بھی نہیں.....“ اس نے بھی تائید کرنے میں ایک لمحے کا بھی توقف نہیں کیا۔ اب وہ انہیں حیران کرنے کو کہہ رہا تھا۔

”میں تو دو خوب صورت لڑکیاں دیکھنے کے

جھولتی لمبی پونی ٹیل پر تھیں۔

”سبحان اللہ.....! یہ پہلا غریب خانہ ہے شاندار دیکھا ہے جس کی مالیت کم سے کم دو ڈھائی کروڑ تو ہوگی۔ اللہ ایسے غریب خانے سب کو دے۔“ اسود کو ان کے لہجے میں طنز کے بجائے شرارت کی فراوانی محسوس ہوئی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

”آپ کی تعریف.....؟“ محترمہ نے ٹھیکھی نظروں سے گھورا تو وہ مروتا مسکرایا۔

”میں پروفیسر صاحب کا بھانجا ہوں.....“ اس نے تھوڑا سا گردن کو تعظیماً خم دے کر بتایا۔

”بھانجے صاحب کا کوئی نام تو ہوگا۔ جیسے میری اس بے وقوف بھانجی کا نام شرزمہ ہے.....“ وہ ان کے شرارتی انداز پر اب قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اسے دوستانہ مزاج کی یہ بے تکلف سی محترمہ پہلی ہی نظر میں اچھی لگی تھیں۔

”ہوں تو آپ ان کی خالہ ہیں.....؟“ اس کے لہجے میں خوب صورت ہنسی کا تاثر تھا۔

”جی میں صرف اور صرف شرزمہ کی ہی خالہ ہوں.....“ انہوں نے بے ساختہ ابرو اچکا کر سامنے کھڑے ہینڈسم سے لڑکے کو دیکھا۔ ”لیکن اسے بھی خالہ کہنے کی اجازت میں نے کبھی نہیں دی۔“ ان کی اطلاع پر وہ تعجب بھرے انداز میں دیکھنے لگا جو کہہ رہی تھیں۔ ”میں ہنی ہوں ساری دنیا کے لیے.....“ ان کی شرارتی آنکھوں میں کچھ تھا کہ اسود جیسا پُر اعتماد بندہ بھی ایک لمحے کو پزل ہوا۔

”آف کورس.....! میں بھی کوئی ایسا بد ذوق بندہ نہیں کہ آپ جیسی اسمارٹ اور حسین و جمیل خاتون کو خالہ کہہ کر اپنی طبیعت مکدر کروں.....“ وہ کون سا کسی سے کم تھا اس کی بات پر ہنی کا قہقہہ شرزمہ کے لیے سخت کوفت کا باعث بنا۔ وہ ساری گفتگو کے درمیان بالکل خاموش تھی۔ اسود نے محسوس کیا تھا کہ اس میں عجیب سی تمکنت اور وقار تھا۔

شرمندگی کا بھرپور حملہ ہوا تھا۔ ایک اجنبی شخص کے سامنے یہ صورت حال کم از کم شرزمہ کو کئی دن تک شرمندہ کرنے کو کافی تھی۔

”جہاں اتنی دنیا بے وقوف بناتی ہے وہاں ایک اور سہی.....“ اس نے کندھے اچکا کر سپاٹ انداز میں کہا۔

”السلام علیکم.....! جناب اب یہ کارنر میٹنگ ختم کر دیں وہ ٹیکسی والا تو جا بھی چکا ہے۔“ اس نے شائستگی سے دونوں کو مخاطب کیا۔

”تم نے دیکھا کہ وہ ٹیکسی والا کیسے ہم دونوں خواتین کو دن دیہاڑے لوٹ کر چلتا بنا.....“ وہ اس لیڈی ڈیانا ہیرکٹ والی کی بے تکلفی پر ابھی سنبھل ہی نہیں پایا تھا کہ دوسرا حملہ اس سے بھی زیادہ سرعت سے ہوا تھا۔

”یہ شرزمہ تو شروع ہی سے انتہائی اسٹوپیڈ ہے۔ میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اس ٹیکسی والے سے کیسے جان چھڑاؤں اس نے فوراً تین سو نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما بھی دیے حتیٰ کہ وہ اب ڈھائی سو پر آ بھی چکا تھا.....“ ان کا غصہ کسی طور کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

”ہنی فارگا ڈسک.....!“ دوسری لڑکی کے تیور خاصے خطرناک تھے۔ اس کی نگاہوں میں چھپی تنبیہ کی وجہ سے ہی دوسری نے فوراً موضوع بدلا۔

”ہاں بھئی ینگ مین.....! یہ پروفیسر آفاق صاحب ہی کا بنگلا ہے نا.....!“ ہنی صاحبہ کرائے کا غم بھول کر اب تو صغی نظروں سے سامنے کا سنی رنگ کی بوگن ویلیا کی ٹیل کو دیکھ رہی تھیں۔ گھر پہلی ہی نظر میں ان کو بھا گیا تھا اس لیے چہرے پر اطمینان کے رنگ نمایاں تھے۔

”جی جناب، یہ انہی کا غریب خانہ ہے.....“ وہ دونوں بازو سینے پر باندھے بڑی انکساری کے ساتھ بولا لیکن اس کی نظریں اب بھی پنڈولم کی طرح

دفعہ ہزاری سے پہلو بدلا تھا جو اسود کی زیرک نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔

”اور والدین.....؟“ ہنی کا تجسس کبھی کبھی شرمزہ کی برداشت کا امتحان لینے لگتا تھا۔ اس وقت بھی یہی صورت حال تھی۔

”والدین میرے سان فرانسسکو میں ہوتے ہیں۔ ماموں جی کی خدمت کرنے کے لیے مجھے پاکستان بھیج رکھا ہے۔ بس میں اور پروفیسر صاحب ہی یہاں ہوتے ہیں یا پھر ہمارا ملازم فضلہ، جو خود بھی ہماری طرح چھڑا چھانٹ ہے.....“ اس نے تفصیل سے بتایا۔

”اور تم صرف ماموں جی کی خدمت ہی کر رہے ہو یا پھر کچھ ڈگری وگری بھی حاصل کی ہے۔“ ہنی کی تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔

”خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں، یہاں رہنے کا میرا ایک مقصد اپنی تعلیم مکمل کرنا بھی تھا۔ وہ کچھ سنجیدہ ہوا۔

”واہ پہلا عقلمند بندہ دیکھا ہے جو تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکا سے پاکستان آیا ہوا ہے.....“ ہنی کے طنزیہ انداز پر بھی وہ سادگی سے گویا ہوا۔

”جی میں ایسا ہی عقلمند بندہ ہوں۔ پروفیسر صاحب کی اور اپنے وطن سے محبت کی وجہ سے میں یہاں بٹکا ہوا ہوں اور الحمد للہ مجھے اپنے اس فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں۔“ اپنی بات کہہ کر وہ اٹھا اور سامنے بنے امریکن طرز کے کچن کی طرف بڑھا شرمزہ نے پہلی دفعہ اسے غور سے دیکھا اس کا قد چھ فٹ اور آنکھیں بالکل بھوری سی تھیں۔ وہ متناسب جسم کا ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک محسوس کی جانے والی سادگی تھی۔

”اب بھی وقت ہے، سوچ لیں دو چھڑے چھانٹ بندوں کے گھر میں کیسے رہیں گے آپ لوگ.....؟“ وہ ساس پین میں پانی ڈالتے ہوئے ایک دفعہ پھر شرارت کر گیا۔

”کیا مطلب کہ کیسے رہیں گے؟“ ہنی نے ناک چڑھائی۔ ”ہمارا پورشن تو بالکل الگ تھلگ ہے اور ویسے بھی مجھے خواتین کی کمپنی بالکل پسند نہیں۔“ ہنی کی بات پر وہ چائے میں پتی ڈالنا بھول کر حیرانی سے ان منہ پھٹ خاتون کو دیکھنے لگا۔

”وہ کیوں جی.....؟“ اس نے سنبھل کر دریافت کیا۔

”بھئی میں تو ان گھریلو ٹائپ خواتین سے سخت گھبراتی ہوں۔ جنہیں فیشن، ٹی وی، میوزک، کوکنگ اور ایک دوسرے کی چغلیوں کے علاوہ کوئی دوسرا کام ہی نہیں ہوتا.....“ وہ برنر جلاتے ہوئے ان کی بات سن کر مسکرایا۔

”آپ بہت صاف گو لیکن پُر اعتماد خاتون ہیں۔“ اس نے کھلے دل سے سراہا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ ہنی، نہیں ”آپ لوگ بس اپنی خیر منائیں.....“ انہوں نے اپنے ڈیانا کٹ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے متبسم لہجے میں خبردار کیا۔

”اور جی ہم کیوں اپنی خیر منائیں.....؟“ وہ اب ابیرن باندھتے ہوئے حیران ہوا۔

”اس لیے کہ میں بلیک بیلٹ ہولڈر ہوں۔ جب غصہ آئے تو منہ کا استعمال کم اور ہاتھوں اور ٹانگوں کا زیادہ کرتی ہوں.....“ ہنی نے سائنڈ ٹیبل پر پڑے ڈرائی فروٹس کا چار کھولتے ہوئے شوخی سے لبریز لہجے میں اسے اپنی ایک اور خفیہ صلاحیت کا بتایا جسے سنتے ہی اسود نے ایک چھپت پھاڑ قسم کا قہقہہ لگایا۔

”یہ تو واقعی خطرناک بات ہے۔ اچھا کیا کہ آپ نے پیشگی بتا دیا میں پروفیسر صاحب کو بھی خبردار کر دوں گا.....“ وہ بھی بلا کا شریر، بذلہ سنج اور زندہ دل تھا۔

فریج سے ٹکٹس نکال رہا تھا۔ ان کی بات پر چونکا۔

”بے فکر رہیں۔ وہ اس سے اچھا سیٹ کیا ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب تو اسے بھی ریٹنڈ پر نہ دیتے لیکن فاروق بھائی ان کے بہت اچھے دوست ہیں اس لیے انہیں انکار نہیں کر سکے۔ آپ فاروق صاحب کی کیا لگتی ہیں.....؟“ وہ ٹکٹس والا پیکٹ کھولتے ہوئے بے پروائی سے پوچھ رہا تھا۔

”وہ میرے بہنوئی حسن بھائی یعنی شیریں کے پاپا کے بہت اچھے دوست تھے اس کے علاوہ بارسلونا میں ہمارے پڑوسی بھی..... ہم لوگوں کا بیس بائیس سال کا ساتھ ہے۔“ وہ ہنی کی بات پر چونکا۔

”کون شیریں.....؟“

”میں شرمزہ کو شیریں کہتی ہوں.....“ ہنی نے باداموں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے اطلاع دی تو اسود نے حیرت سے شیریں صاحبہ کو دیکھا جو ان کی گفتگو سے بے نیاز انگلش اخبار پڑھنے میں مگن تھی اس نے ساری گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا جس سے اسود نے اس کی کم گو طبیعت کا اندازہ لگایا۔

”سوری بھئی ہمارا لاڈلا اور نخریلا ملازم چھٹی پر ہے اس لیے آپ کو میرے ہاتھ کی بنی بد مزہ چائے پر گزارہ کرنا پڑے گا۔“ وہ اب کباب فرائی پین میں ڈال کر تل رہا تھا۔ کبابوں کی مہک اور چائے کے دم اٹنے کی خوشبو نے دونوں خواتین کی بھوک کو چمکا دیا۔

گمشدہ جنت

”اوہ، انہوں نے بتایا ہی نہیں.....“ ہانیہ کی پیشانی پر ہلکا سا بل آیا۔

”وہ صبح آجائیں گے انشاء اللہ.....“ اسود نے انہیں تسلی دیتے ہوئے مزید کہا۔ ”میں خود بھی پاکستان میں نہیں تھا۔ پرسوں ہی واپس آیا ہوں۔ صبح مجھے پروفیسر صاحب نے فون پر بتایا کہ ان کے بیسٹ فرینڈ فاروق صاحب کے توسط سے کوئی خالہ بھانجی صاحبہ آرہی ہیں۔“ لاؤنج میں چائے کے دم دینے کی مہک بڑی سرعت سے پھیلی تھی۔

”ایک تو تم مجھے بار بار خالہ کہہ کر کس چیز کا احساس دلانا چاہتے ہو؟ اب میری اتنی بھی عمر نہیں۔ پاکستان میں تو بتیس سال کی عمر میں لڑکیوں کی شادیاں ہو رہی ہیں۔“ ہنی کی شوخ آنکھیں شرارت سے جگمگائیں۔

..... وہ ٹرائی میں کباب رکھتے ہوئے ایک دم مڑا۔

”بائے گاڈ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا۔“ اس نے فوراً تردید کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے بھی آپ دونوں کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ آپ کبر درمیان خالہ بھانجی کا رشتہ ہے۔“ اس نے تسلی دیتے ہوئے فلاسک میں چائے ڈالی۔

”اچھا.....“ پھر کیا لگتا ہے؟“ ہنی کا اشتیاق دیدنی تھا۔ شرمزہ نے کوفت اور جھنجھلاہٹ بھرے انداز سے انہیں دیکھا جو اسود کی طرف متوجہ تھیں۔

”زیادہ سے زیادہ یہ ہی لگتا ہے کہ دونوں چھوٹی بڑی بہنیں ہیں.....“ بڑے سرسری سے انداز میں کہہ کر وہ ٹرائی ان کے پاس لے آیا تھا۔ ٹکٹس، چکن رول اور کباب دیکھ کر دونوں کی بھوک چمک اٹھی اور انہوں نے رسماً بھی تکلف کا مظاہرہ نہیں کیا۔

”اب آپ تفصیل سے اپنے بارے میں بتائیں۔“ وہ چائے کا کپ لے کر ان دونوں کے بالکل سامنے آن بیٹھا۔ براؤن جیمز پر اس نے نیوی بلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے گھنے سیاہ بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے جبکہ اس کی آنکھوں میں

اوپر کے پورشن کی سیڑھیاں کدھر ہیں؟“
 ”اوپر کی سیڑھیاں پورج سے جاتی ہیں، یہ ٹی وی لاؤنج سے اوپر جانے والا دروازہ تو ہم نے دونوں طرف سے لاک کر رکھا ہے۔“ اسود بھی دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال کر کھڑا ہوا تو شرزمہ نے سکون کی سانس لی۔ اسے اندازہ تھا کہ ہنی اس وقت مزید گپ شپ کے موڈ میں ہیں جبکہ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر سخت تھکن کا شکار تھی اور اب صرف اور صرف بستر کی طلب تھی۔ وہ دونوں اسود کی پیروی میں اوپر پہنچیں تو ٹھیک ٹھاک کھلا اور کشادہ پورشن دیکھ کر دونوں نے ہی اطمینان کی سانس لی۔
 دو بیڈرومز، ڈرائنگ، ڈائننگ کے ساتھ ٹی وی لاؤنج اور وسیع ٹیرس انہیں خاصا پسند آیا تھا۔ ان کی توصیفی نظریں اس فرنشڈ پورشن کے چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ فاروق بھائی کا انتخاب غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں فاروق بھائی کے بے تحاشا اصرار پر ہی یہاں رہنے کو تیار ہوئی تھیں ورنہ ہنی کا تو مکمل ارادہ تھا کہ علیحدہ سے اپنا سیٹ اپ شروع کیا جائے لیکن فاروق بھائی جو شرزمہ کے والدین کے اچانک انتقال کے بعد انہیں بھی اپنی بیٹیوں کی طرح ہی سمجھتے تھے وہ اس بات کے لیے بالکل تیار نہیں ہوئے۔ اس لیے انہیں یہاں آنا پڑا۔

اگلا سارا دن انہوں نے اپنا سامان الماریوں میں سیٹ کرنے میں لگا دیا۔ اسود نے اس سلسلے میں کافی مدد کی تھی۔ وہ ساتھ والے بنگلے سے ایک خاتون ملازمہ کو لے آیا جس سے ان کا کافی مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ سارے دن کی تھکن کے بعد وہ دونوں جو سوئیں تو اگلے دن ہی صبح نو بجے آنکھ کھلی۔

شرزمہ نے ٹیرس کی جانب کھلنے والے دروازے کو دھکیلا تو باہر موسم بہار کی خوشگوار ہوانے اس کا استقبال کیا وہ بلیک ڈھیلے ڈھالے سے ٹراؤزر

اس ملک میں جا رہے ہو جب تک اپنا گھر نہیں بن جاتا ہم لوگ ان کے دوست پروفیسر آفاق صاحب کے گھر کا پورشن رینٹ پر لے لیں۔ اس سے انہیں بھی تسلی رہے گی اور ہمیں بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اور تم کیا کرتے ہو۔۔۔۔۔؟“ اب انٹرویو لینے کی باری ہنی کی تھی جبکہ شرزمہ اس سارے سیشن سے جی بھر کر بوریت کا شکار ہو رہی تھی۔

”کچھ بھی نہیں، بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری لینے کے بعد آج کل انٹرویو، انٹرویو کھیل رہا ہوں یا پھر پروفیسر صاحب کے صبح شام ٹیچر سنتا ہوں۔“ اس کے مبسم انداز پر ہنی مسکرائیں۔

”تم پروفیسر صاحب کو ماموں کیوں نہیں کہتے۔۔۔۔۔؟“ ہانیہ نے اچانک ہنستے ہوئے پوچھا تو وہ رو بہ بولا۔

”آپ شرزمہ کو خالہ کیوں نہیں کہتے۔۔۔۔۔؟“ اس کے برجستہ انداز پر ایک مبہم سی مسکراہٹ شرزمہ کے لبوں پر بھی ابھری۔

”آف کورس۔۔۔۔۔ میں کہیں سے بھی بھاری۔۔۔۔۔ بھرم خالہ جو نہیں لگتی۔۔۔۔۔“ ہانیہ کون سا کسی کم تھیں۔

”بائے گاڈ۔۔۔۔۔ وہ بھی کہیں سے بھاری بھرم ماموں نہیں لگتے۔۔۔۔۔“ ہنستے ہوئے اس نے بھی ایک فقرہ اچھالا۔

”بہت تیز ہو تم۔۔۔۔۔“ ہانیہ کی بات پر اسود کا انتہائی جاندار اور محفوظ کن قہقہہ پورے لاؤنج میں گونجا تھا۔

”میرا خیال ہے ہنی اب ہمیں اٹھنا چاہیے۔۔۔۔۔“ شرزمہ کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی خالی پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”ہوں، میرا بھی یہی خیال ہے۔۔۔۔۔“ انہوں نے بھی بادل نا خواستہ وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ ”بھئی

بے پروائی سے کہتے ہوئے چائے کا گھونٹ لیا۔
 ”ان کی وفات کے بعد بھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔۔۔۔۔؟“ اسود کے سوال پر شرزمہ نے ایک خفاسی نگاہ ہنی کے چہرے پر ڈالی۔ اسے اس موضوع پر بات کرنا بالکل پسند نہیں تھا۔
 ”نہیں۔۔۔۔۔“ ہانیہ نے مختصر جواب دے کر صوفے سے ٹیک لگائی۔

”اور آپ کیا کرتی ہیں۔۔۔۔۔؟“ اسود نے خالی چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے موضوع گفتگو پھر انہی کی ذات تک محدود کیا۔

”میں نے اسپین سے فیشن ڈیزائننگ میں ماسٹر کیا۔ پہلے ڈیڈی کے ساتھ پھر ان کی ڈیڈی کے بعد حسن بھائی کی بزنس میں مدد کرواتی تھی۔ ہم لوگوں کا بارسلونا میں اچھا خاصا بزنس اسٹیمپلش ہو چکا تھا پھر حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ سب کچھ سیٹ سماٹ کر یہاں آنا پڑا۔ اب آگے دیکھتے ہیں۔“ ہانیہ نے چند جملوں میں ساری داستان کو سمیٹا۔

”اس کا مطلب ہے کہ اب آپ کا یہاں مستقل رہنے کا ارادہ ہے۔“ اس نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔

”کچھ کہہ نہیں سکتے۔۔۔۔۔“ ہانیہ نے کمال استغنا سے جواب دیا۔ ”اگر تو بزنس سیٹ ہو گیا تو ٹھیک ہے ورنہ پھر ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔۔۔۔۔“

”مجھے تو پروفیسر صاحب بتا رہے تھے کہ آپ کا بحریہ ٹاؤن میں کوئی پلاٹ ہے اور وہاں گھر وغیرہ بنوانے کا بھی ارادہ ہے۔“ اسود کی بات پر وہ دونوں چونکیں۔

”ہاں فاروق بھائی نے ان کو بتایا ہوگا لیکن اب یہاں رہنے کے بعد ہی ہم کچھ اور لائحہ عمل طے کر سکیں گے۔۔۔۔۔“ ہانیہ نے مزید کہا۔ ”ویسے تو میرے بزنس کے حوالے سے کچھ اور لوگوں سے بھی کونسلٹس تھے لیکن فاروق بھائی نے سختی سے منع کیا تھا کہ انجان لوگوں پر اعتبار نہیں کرنا۔ تم لوگ پہلی دفعہ

ایک مسکور کن سی چک تھی۔

”مجھے ہانیہ مصطفیٰ کہتے ہیں، اسپین میں ہی پیدا ہوئی۔۔۔۔۔“ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ہنی شروع ہوئیں۔ ”ہم دو ہی بہنیں تھیں ہماری مدر اسپینش جبکہ ڈیڈی پاکستانی تھے۔ دوھیال نے اسپینش لڑکی سے شادی کرنے کی وجہ سے پاپا کا بائیکاٹ کر دیا اس لیے کوئی رابطہ نہیں۔۔۔۔۔“ انہوں نے چند جملوں میں مکمل معلومات دینے کی کوشش کی۔

”پہلے ماما اور پھر ڈیڈی کی ڈیڈی کے بعد میں، سمیعہ آپ کی گھر ہی آگئی۔ آپ کی اور ان کے میاں حسن بھائی کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیڈی کے بعد ہم دونوں یعنی میں اور شرزمہ اسپین میں اکیلے رہ گئے تھے، شرزمہ آپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس لیے فاروق بھائی نے ہمیں زبردستی پاکستان بھجوا دیا۔ ورنہ میں اس حق میں ہرگز نہیں تھی۔“ انہوں نے ایک اور کباب اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بے تکلفی سے بتایا تھا جبکہ شرزمہ نے اس گفتگو میں بالکل حصہ نہیں لیا تھا وہ سر جھکائے کھانے میں مگن تھی۔

”اور شرزمہ کے والد کی فیملی کا تعلق کیا پاکستان سے نہیں تھا؟“ اسود کے سوال پر وہ لقمہ چبانا بھول کر حیرت سے دونوں کو دیکھنے لگی۔

”وہ تو میرے بھی دوھیال والوں سے چار ہاتھ آگے نکلے۔۔۔۔۔“ ہانیہ کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

”یہ پاکستانی والدین اپنے بچوں کو کمانے کے لیے باہر تو آرام سے بھیج دیتے ہیں لیکن ان بیچاروں پر باقی تمام خوشیاں حرام کر دیتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ ان کے استہزائیہ انداز پر وہ چونکا۔

”مطلب یہ کہ ان کا کیس بھی میرے ڈیڈی جیسا ہی تھا یعنی پسند کی شادی کے جرم میں گھر والوں نے واپسی کے دروازے ان پر بند کر دیے۔ اس لیے وہ وہیں بارسلونا کے ہی ہو کر رہ گئے۔“ ہانیہ نے

آکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”یہ بلی کا بچہ کیا آپ کا ہے؟“ اس کے
 لہجے میں اشتیاق کی فراوانی تھی۔
 ”نہیں..... یہ بلی کا بچہ میرا نہیں ”بلی“ کا ہی ہے۔“
 ”میرا مطلب ہے کہ اسے آپ نے رکھا ہوا
 ہے؟“ ان کے شرارت بھرے انداز پر وہ بری طرح
 جھینپ کر وضاحت دینے لگی۔
 ”شیری تم یہاں ہو، میں پورے گھر میں تمہیں
 آوازیں دیتی پھر رہی تھی.....“ ہمہنی بڑی تیزی سے
 میڑھیاں اتر کر لان میں آئیں اور سامنے ہی
 پروفیسر صاحب کو دیکھ کر خوشگوار انداز میں ٹھکیں۔
 ”آہا.....! پروفیسر صاحب بھی یہاں ہیں۔
 ارے آپ اپنی آواز سے تو اتنے یگ اور ڈشنگ
 نہیں لگتے.....“ ہمہنی کا ازلی بے تکلفانہ انداز اکثر
 شرزمہ کے لیے بڑی کوفت کا باعث بنتا تھا۔ اس نے
 جھنجھلا کر اپنے سامنے کھڑی ہمہنی کو دیکھا جو شاید تازہ
 تازہ شاور لے کر سیدھی نیچے آگئی تھیں۔ اس لیے
 سرخ رنگ کی شرٹ میں خاصی فریش لگ رہی تھیں۔
 ”جی مجھے ہی پروفیسر آفاق کہتے ہیں اور آپ
 کی ذرہ نوازی ہے جو ایک اچھے خاصے بوڑھے
 بندے کو یگ کہہ کر خوش فہمیوں میں مبتلا کر رہی
 ہیں۔“ ان کے انداز میں بڑی خوشگوار سی متانت تھی
 جبکہ ان کی بات پر ہمہنی بوگن ویلیا کے چند پھول فضا
 میں اچھالتے ہوئے بولیں۔
 ”پروفیسر صاحب وہ اپنے ممتاز مفتی صاحب
 ہمارے اور آپ کے لیے ہی تو کہہ گئے ہیں کہ زندہ
 رہنے کے لیے خوش فہمیوں کا آلنا (گھونسل) بنانا
 بہت ضروری ہے ہم تو ان کی بات پر من و عن عمل
 کرتے ہیں۔“ ہانیہ نے بڑی ادا سے اپنے بالوں
 میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پروفیسر صاحب کو دیکھا جو
 مسکرا رہے تھے۔
 ”ویسے پروفیسر صاحب آپ نے اچھا نہیں کیا

تھی۔“ انہوں نے یاد دلانے کی کوشش کی۔
 ”اچھا.....؟ فنکشن تو مجھے یاد ہے لیکن آپ سے
 ملاقات ذہن میں نہیں آرہی۔“ وہ شرمندہ ہوئی۔
 ”اٹس اوکے، آپ بتائیں کہ کیا ہو رہا
 ہے؟ فاروق بتا رہے تھے کہ آپ نے یونیورسٹی میں
 بھی ایڈمیشن لینا ہے۔“ پروفیسر صاحب نے اس کے
 مفرد سے انداز اور نیمکھی سی ناک سے دانستہ نظریں
 چرائی تھیں۔
 ”پتا نہیں، ابھی سوچا نہیں۔ ابھی ہمہنی سے مشورہ
 کروں گی جیسا وہ کہیں۔“
 ”اور کیا سبکیٹ لیں گی آپ.....؟“ انہوں
 نے بات بڑھانے کی غرض سے پوچھا، وہ جو جانے
 کے لیے برتول رہی تھی ان کی بات پر رک گئی۔
 ”ابھی کوئی آئیڈیا نہیں جو ہمہنی کہیں گی۔“ اس
 کے سادہ سے انداز پر وہ کچھ جھنجھلائے۔
 ”یہ کیا بات ہوئی ہانیہ اگر کہیں گی کہ فارسی یا
 پنجابی لے لیں تو کیا آپ پڑھ لیں گی؟“
 ”جی پڑھ لوں گی.....“ اس کا جواب پروفیسر
 صاحب کے لیے سخت غیر متوقع تھا۔ انہوں نے
 انتہائی تعجب سے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا جو
 انہیں قدم قدم پر چونکا رہی تھی۔
 ”کیا مطلب، آپ کی اپنی کوئی پسند یا ناپسند نہیں؟“
 ”کیوں؟ پنجابی یا فارسی برے مضامین ہیں
 کیا؟“ ان کے قدرے برا ماننے پر وہ تعجب انگیز
 انداز میں گویا ہوئی۔
 ”بات اچھے یا برے مضامین کی نہیں، بات
 آپ کی چوائس کی ہو رہی ہے۔ یہ آپ اچھی طرح
 جانتی ہیں۔“ انہوں نے تحمل انداز میں یاد دلایا۔
 ”اوہ سوری!“ اس نے سادہ انداز میں مزید
 کہا۔ ”اصل میں مجھے اس کا کوئی آئیڈیا نہیں ویسے
 مجھے اکٹا کس سبکیٹ اچھا لگتا ہے۔“ اس نے بلی کے
 سنے کو ایک دفعہ پھر اٹھا لیا تھا جو اپنی معصوم سی کرنجی

”آپ ہانیہ مصطفیٰ کی بھانجی ہیں.....؟“ ان
 کی نگاہ شرزمہ کے بے داغ چہرے پر جمی ہوئی تھی۔
 ”میں ہانیہ مصطفیٰ بھی تو ہو سکتی ہوں.....“ اس
 کے منہ سے بے اختیار پھسلا اگلے ہی لمحے اس نے سخت
 زدہ انداز سے اپنا گلابی لب دانتوں تلے دبایا تھا۔
 ”جی آپ بالکل ہانیہ ہو سکتی ہیں اگر میری
 نزدیک کی نظر کمزور ہو تو۔“ ان کے متبسم انداز پر
 شرزمہ کا چہرہ سرخ ہوا۔
 ”مجھے معلوم ہے کہ آپ ہانیہ مصطفیٰ نہیں ہیں
 اس لیے کہ میری ان سے کئی دفعہ فون پر بات ہو چکی
 ہے۔“ انہوں نے اجلی دھوپ جیسے اس کے چہرے
 سے بہ مشکل نظریں ہٹاتے ہوئے وضاحت دی تھی۔
 شرزمہ نے بلی کے بچے کو بڑی احتیاط سے سب سے
 اونچی سیڑھی پر رکھ دیا تھا۔
 ”مجھے پروفیسر آفاق کہتے ہیں۔ ہانیہ تو مجھے
 جانتی ہیں لیکن آپ کے ساتھ کوئی تعارف نہیں.....“
 ان کے انداز میں سنجیدگی اور متانت نمایاں تھی۔ وہ
 چالیس کے جند سے کو کر اس کر چکے تھے لیکن اپنے
 ظاہری حیلے سے پینتیس سال سے زائد نہیں لگتے تھے۔
 ”میں شرزمہ ہوں۔ آپ کے بارے میں فاروق
 انکل نے بتایا تو تھا لیکن میں نے شاید توجہ سے سنا
 نہیں۔“ وہ بڑے جھینپے سے انداز میں بتا رہی تھی۔
 ”میں فاروق کا ہی نہیں آپ کے قادر کا بھی اچھا
 دوست تھا۔ فاروق کے حوالے سے ان سے اچھی گپ
 شپ تھی اور ایک دفعہ میں بارسلونا بھی آیا تھا اور وہیں
 میں نے فاروق کے گھر میں آپ کو بھی دیکھا تھا۔“ ان
 کی بات پر وہ زبردست انداز سے چونکی۔
 ”کب.....؟“ بے حد عجلت بھرے انداز میں
 اس نے ان کی بات کاٹی۔
 ”یہ بہت پرانی بات ہے اس وقت شاید آپ بارہ
 تیرہ سال کی ہوں گی۔ اس دن فاروق نے اپنی ویڈیو
 اینورسری کے سلسلے میں اپنے گھر میں پارٹی اریج کر رکھی

پر کاسی رنگ کی شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے لمبے
 بھورے رنگ کے سلکی بال کسی آبشار کی طرح پشت پر
 گرے ہوئے تھے۔ سامنے انار کے درخت پر
 چڑیوں نے اودھم سا مچا رکھا تھا۔ پورے لان میں
 بوگن ویلیا اور انار کے درختوں کے پتے بکھرے
 ہوئے تھے۔
 ”اس لان کو ایک اچھے مالی کی اشد ضرورت
 ہے.....“ کل سے یہ خیال بارہا اس کے ذہن میں
 آچکا تھا۔ اس نے ریلنگ سے جھک کر لان میں
 دیکھا سامنے آم کے درخت کے نیچے سفید رنگ کے
 بلی کے بچے کو دیکھ کر وہ کچھ بے تاب ہوئی اور لپک کر
 نیچے لان میں آگئی۔ بے دھیانی میں تیزی سے چلتے
 ہوئے اس نے بے ساختہ بلی کے بچے کو اٹھا کر پیار
 کیا تو وہ کچھ مچلا۔ وہ اسے اٹھا کر اوپر لے جانے کی
 غرض سے مڑی تو ایک نفیس سی آواز اس کی سماعتوں
 سے ٹکرائی۔
 ”اس کے پاؤں پر چوٹ لگی ہوئی ہے۔ فضلو
 اندر میرا میڈیکل بکس لینے گیا ہے میں اس کی پٹی کر
 دوں تو آپ لے جائیے گا۔“ وہ ہڑبڑا کر مڑی اور
 اپنی راج ہنس جیسی گردن اٹھا کر سامنے لان میں
 رانگ چیئر پر براجمان شخص کو اخبار گوڈ میں رکھے
 دیکھا تو بوکھلا کر سلام کر دیا۔
 ”میں تین دن سے یہاں نہیں تھا کسی نے بھی
 اس کا خیال نہیں کیا۔ میں نے بھی صبح دیکھا ہے جبکہ
 اس کا زخم تو دو تین دن پرانا ہے۔“ وہ بڑے مہذب
 اور شستہ انداز میں اسے بتا رہے تھے۔ ان کے
 چہرے پر بڑی اپنائیت بھری مسکراہٹ تھی۔
 ”میں نے بھی آج پہلی دفعہ ہی اسے دیکھا
 ہے.....“ اس نے بوکھلا کر فوراً صفائی دینے والے
 انداز میں کہا تو وہ ایک دفعہ پھر مسکرا دیے۔ انہوں
 نے بات بدلتے ہوئے بہت سرسری سے انداز میں
 دریافت کیا تھا۔

ہمارے ساتھ۔ گھر آئے مہمانوں سے گھبرا کر خود کراچی چل دیے..... مہنی کے شکایت بھرے انداز پر وہ بلکے سے شرمندہ ہوئے۔

”آئی ایم سوری، وہ کانفرنس پہلے سے طے شدہ تھی اس لیے اسے منسوخ نہیں کیا جاسکتا تھا۔“ ان کا لہجہ پُر وقار تھا۔

”ہوں..... اس پر تو کوئی جرمانہ ہونا چاہیے آپ پر۔“ مہنی کی ہنسی میں آج نرالی سی کھٹک تھی شرمندہ کو معلوم تھا کہ اگلے چند منٹوں میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ یوں محو گفتگو ہوں گے جیسے صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ یہ ہانیہ کی سب سے بڑی خوبی تھی وہ اگلے بندے کو ایک لمحے میں اپنے سحر میں جکڑ لیتی تھیں ان کے آنے کے بعد ہر چیز پس منظر میں چلی جاتی تھی۔ جیسا کہ ابھی ہوا تھا۔ شرمندہ خاموشی سے اوپر آگئی تھی اور دونوں کو ہی اس کی غیر موجودگی کا احساس کافی دیر بعد ہوا تھا۔

مغرب سے ذرا پہلے کا وقت تھا..... مین روڈ پر واقع ”ارجمندولا“ پر بھی تیرگی اپنے پنکھ آہستہ آہستہ پھیلا رہی تھی۔ پورے گھر پر خاموشی کا راج تھا حالانکہ اس گھر میں دو خاندان آباد تھے۔ ارجمندولا کے ماسٹر بیڈ روم میں الماس ابراہیم ڈریننگ ٹیبل کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھی پوری توجہ سے کلیننگ کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ مقامی کالج میں پرنسپل تھیں اور پچھلے ہفتے اسپورٹس ویک کی وجہ سے خود پر توجہ نہیں دے پا رہی تھیں۔ آج موقع ملتا ہی وہ اپنے پسندیدہ مشغلے کی طرف متوجہ تھیں۔ پچاس سال کی ہونے کے باوجود ان کی اسکن بالکل فریش اور تروتازہ تھی اور اس کی بڑی وجہ ان کی اچھی خوراک اور اسنے اوپر ضرورت سے زیادہ توجہ دینا تھا۔ وہ کہیں سے بھی تین جوان بیٹیوں کی ماں نہیں لگتی تھیں۔

اس وقت بھی وہ اپنی صراحی کی طرح لمبی گردن پر بڑی مہارت سے مساج کر رہی تھیں۔ نزاکت اور نفاست ان کی شخصیت میں رچ بس گئی تھی۔ اپنے دبلے پتلے جسم اور دراز قد کے ساتھ وہ اپنی بیٹیوں کی ماں کم اور بڑی بہن زیادہ لگتی تھیں۔

”ماما، ماما.....“ نویرہ نے اچانک ہی بڑی تیزی سے ان کے بیڈ روم کا دروازہ کھولا تھا۔ اسے کسی طوفان کی طرح اندر آتے دیکھ کر ان کے ماتھے کی تیوری کے بل گھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک سردی نگاہ اپنی بیٹی پر ڈالی۔

”نویرہ کون سی آفت آگئی ہے جو تمہیں کسی کے روم میں آنے کے میز ز ہی بھول گئے ہیں۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ کمرے میں آنے سے پہلے ناک کیا کرو۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا شوغصے سے ڈسٹ بن میں اچھالتے ہوئے اپنی انیس سالہ بیٹی کے سرخ چہرے کو دیکھا تھا۔ جو ان کے اس انداز سے چڑ کر اب قدرے بد لحاظی سے بولی۔

”آفت نہیں بلکہ سمجھیں طوفان آرہا ہے۔“ ”اس گھر میں طوفان آنا بھی کون سی نئی بات ہے۔ چھوٹے موٹے جھکڑ تو روز ہی چلتے ہیں۔“ انہوں نے ڈریننگ ٹیبل کے شیشے میں اپنا چہرہ تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے نویرہ کو کوئی خاص لفٹ نہیں کروائی تھی کیونکہ وہ ان کے اس خاص کام میں نکل ہوئی تھی جس میں تھوڑی سی بھی ڈسٹر بنس ان کا مزاج برہم کر دیتی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر کلیننگ کریم اب اپنے ہاتھوں پر لگا رہی تھیں۔

”ماما میں آپ سے مخاطب ہوں.....“ الماس بیگم کی بے نیازی نے نویرہ کے تن بدن میں آگ لگا دی بھی وہ احتجاجاً قدرے بلند آواز میں بولی تھی۔ ”تو میں بھی تو تمہاری ہی سن رہی ہوں اور کون سا کمرے کی دیواروں کی طرف متوجہ ہوں.....“ انہوں نے سامنے پڑے لکڑی کے منقش نشوونما پر بکس

نشوونما تھا۔ اپنے ہاتھوں کو بڑی نفاست سے صاف کرتے ہوئے انہوں نے بھوس اچکا کر سامنے کھڑی اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو دیکھا جس کے مزاج کی عجلت اور جذباتی پن کبھی کبھی انہیں سخت ہموار گزرتا تھا۔ اوپر سے وہ نہ صرف شکل صورت میں بلکہ مزاج میں بھی ان کا پرتو تھی۔ اس لیے انہیں بعض دفعہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بہت سی چیزیں نظر انداز کرنا پڑتی تھیں ورنہ وہ طوفان اٹھا دیتی تھی۔

”ہاں بتاؤ کون سا طوفان آرہا ہے.....؟“ اپنے کام سے فراغت پا کر انہوں نے تکیلی نظروں سے اپنی بیٹی کے برہم انداز کو دیکھا جو کمر پر ہاتھ رکھے بڑی ناراضی سے انہیں گھور رہی تھی۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ جب تک وہ اسے مکمل توجہ نہیں دیں گی وہ منہ سے کچھ بھی نہیں پھوٹے گی اور سر پر کھڑی گھورتی رہے گی۔

”احتشام آرہا ہے پاکستان.....!“ اس نے اطلاع نہیں دی تھی بلکہ بم پھوڑا تھا وہ بھی ان کے سر پر کچھ لچکوں کے لیے وہ سن سی ہو گئیں۔

”شامی..... وہ کیوں آرہا ہے؟“ انہوں نے بوکھلا کر نویرہ کو دیکھا جو ان کی اثری رنگت اور جو اس بافت انداز سے باقاعدہ لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ”تمہیں کس نے بتایا؟“ انہوں نے سخت پریشانی سے اس کا پرسکون چہرہ دیکھا۔

”دادو بتا رہی تھیں.....“ اس نے کندھے اچکا کر بڑے لاابالی پن سے ماما کو دیکھا جن کا پورا وجود ہی زلزلوں کی زد میں تھا جبکہ دل و دماغ سخت کھولن کی زد میں تھے۔

”وہ آخر کرنے کیا آرہا ہے.....؟“ وہ بری طرح جھنجھلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور آگے بڑھ کر کھڑکیوں کے سارے پردے پیچھے کر دیے تھے۔ سامنے لان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسی ہی تاریکی ان کے اندر بھی بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی۔

گمشدہ جنت

”مجھے کیا پتا ماما کہ وہ کیا کرنے آرہا ہے۔ دادو اپنی بات کرتے ہوئے کسی دوسرے کی تھوڑی سی ہنسی ہیں اور میں تو ان کی ناپسندیدہ لسٹ میں سر فہرست ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ رومیصہ خالہ کو بتایا ہو۔“ وہ اپنی ماں کی حالت سے دل ہی دل میں لطف اندوز ہوتے ہوئے بظاہر سپاٹ سے انداز میں انہیں بتا رہی تھی۔ رومیصہ خالہ جو اس کی چچی بھی لگتی تھیں اور اپنے میاں کی وفات کے بعد بھی ایک بیٹی کے ساتھ اسی گھر میں مقیم تھیں۔ ان کے اپنی ساس کے ساتھ تعلقات کچھ بہتر تھے۔

”رومی کو کیا پتا، وہ تو صبح شام ایک مشین کی طرح گھر کے کاموں میں مگن رہتی ہے۔ اس کی ناک کے نیچے اس گھر میں اللہ جانے کون، کون سے ڈرامے ہوتے رہے اور اس بے وقوف کو پتا تک نہیں چلا۔“ الماس بیگم نے زہر خند لہجے میں کہا انہیں اپنی سگی بہن سے بھی ہزاروں شکوے تھے۔

”خیر اس میں رومی خالہ کا کیا قصور، وہ بے چاری تو سیدھی سی ہیں۔“ نویرہ نے اپنی خالہ کی طرف داری بڑے ہی غلط موقع پر کی تھی جس کا خمیازہ بھی اسے فوراً ہی جھگتنا پڑ گیا تھا۔ الماس بیگم نے خاصے کڑے انداز میں اسے دیکھا اور سلگ کر بولیں۔

”تم اپنی چونچ بند ہی رکھو۔ یہ تم لوگوں کی حرکتوں کی وجہ سے میں ذلیل ہو رہی ہوں ورنہ کسی کی جرات تھی کہ الماس ابراہیم کے سامنے بول سکے۔“ ”ماما آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ بیٹیاں اپنی ماں کا ہی پرتو ہوتی ہیں۔“ وہ بے خوف انداز میں انہیں دیکھ کر مزید گویا ہوئی۔ ”اور آپ کو دن میں کئی دفعہ یاد دلانا پڑتا ہے کہ یہ آپ کا کالج نہیں، گھر ہے۔ اس لیے اپنی پرنسپل شپ کالج میں چھوڑ کر ہی آیا کریں۔“ نویرہ کی بات پر وہ حد درجہ مشتعل ہوئیں۔

”شٹ اپ، جسٹ شٹ اپ اینڈ گیٹ

لاسٹ۔“ اشتعال اور غصہ کسی سیال مادے کی طرح ان کے وجود میں دوڑ رہا تھا۔ نورہ نے سخت ناگواری سے ماما کو دیکھا جن کی آنکھوں سے چنگاڑیاں اڑ رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ نورہ کی بدتمیزی پر اس کا بازو پکڑ کر کمرے سے باہر نکال دیں۔ وہ بڑی سرعت سے کمرے سے نکلی اور پوری قوت سے دروازہ بند کر کے باقاعدہ اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔

الماس ابراہیم نے کھا جانے والی نظروں سے بند دروازے کو دیکھا جہاں سے ابھی ابھی نورہ نکل کر گئی تھی اور انہیں لگا تھا کہ وہ دروازہ بند کر کے نہیں بلکہ ان کے منہ پر مار کر گئی تھی۔ اس سوچ نے ان کے سارے جسم میں انگارے بھر دیے تھے۔

”آئیے دو اس کے باپ کو۔ اس کا تو دماغ سیٹ کروانی ہوں۔“ ان کا دھیان وقتی طور پر احتشام کی طرف سے ہٹ کر نورہ کی بدتمیزی اور ہٹ دھرمی کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ روز بروز گستاخ ہوتی جا رہی تھی۔

”یہ پروفیسر آفاق تو بڑے کمال کے بندے ہیں۔“ ہنی کے توصیفی انداز پر وہ چونکی۔ وہ دونوں ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر براجمان تھیں۔ شرزمہ نے ہاتھ میں ہاشم ندیم کی ایک محبت اور کھولی ہوئی بھی جو اس نے اب بند کر دی تھی کیونکہ یہ تو طے تھا کہ ہنی کی موجودگی میں کم از کم مطالعے کا کام یکسوئی سے نہیں ہو سکتا۔

”کیا کہا آپ نے؟“ شرزمہ نے اپنے سامنے بڑی محویت سے نسل پالش لگاتی ہانیہ کو غور سے دیکھا۔

”میں بتا رہی تھی کہ آفاق صاحب تو بہت زبردست بندے ہیں۔“ وہ پھونکیں مار کر ناخن پالش سکھا رہی تھیں۔

”کیوں وہ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل

چلاتے ہیں یا آگ کے گولے پر کوئی کرتب دکھائے ہیں؟“ اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش محسوس کر کے وہ ہلکا سا ہنس دی تھیں۔

”نہیں یار۔۔۔۔۔! ان کی گفتگو کرنے کا انداز بہت دل نشیں، پُر اثر اور سحر انگیز ہے۔ خوب صورت بولنا ایک آرٹ ہے اور وہ اس سے بخوبی واقف ہیں۔“ انہوں نے نیل پالش کا ایک اور کوٹ لگاتے ہوئے اسے بتایا تھا جبکہ شرزمہ نے ان کی بات پر تبصرہ کرنے کے بجائے ایک لمبی جمائی لی تھی۔

”پتا ہے شیری ان کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ ہر موضوع پر ان کے پاس معلومات کا ایک خزانہ ہے۔“ ہانیہ نے ہاتھ کی انگلیوں کو موڑ کر ایک نفعہ پھر پھونک ماری۔

”پھر تو وہ انسان کے بجائے انسائیکلو پیڈیا ہوئے ناں۔۔۔۔۔“ شرزمہ نے اکتاہٹ سے ان کے مشغلے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”بہت خبیث روح ہو تم۔۔۔۔۔“ وہ بے ساختہ ہنسیں اور احتیاط سے نیل پالش کی شیشی کا ڈھکن بند کرنے لگیں۔ ”کل وہ نیولین بونا پارٹ کی اپنی فارج فوج کے سامنے کی گئی تقریر کے اقتباسات سن رہے تھے۔ ان کا انداز اتنا متاثر کن تھا کہ میں تو بس فدا ہوتے ہوتے رہ گئی۔“

”حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو نیولین بونا پارٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ شرزمہ کے بے ساختہ انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنس دیں جبکہ ان کے یوں ہنسنے پر وہ بھی مسکرا دی۔

”ویسے تم نے نوٹ کیا ناں کہ پروفیسر صاحب کتنی نفیس طبیعت کے حامل ہیں اور ڈرینگ سینس تو کمال کا ہے۔۔۔۔۔“ وہ ایک دفعہ پھر شروع ہو گئیں۔

”ہنی، آپ کی طبیعت ٹھیک ہے ناں، یہ پروفیسر نامہ آج ضرورت سے زیادہ نہیں ہو گیا۔۔۔۔۔؟“ شرزمہ نے اپنی طرف سے ہلکے پھلکے

انداز سے چوٹ کی تھی لیکن دوسری طرف بھی ہانیہ مصطفیٰ تھیں جن کی طبیعت میں شوخی اور مزاج میں گفتگوئی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

”تمہیں پتا ہے ناں کہ مردوں کی اچھی پرستاشی میری کمزوری ہے۔ بینڈ سم لوگوں کو دیکھ کر میری طبیعت ایک دم فٹ ہو جاتی ہے۔“ ہنی نے ایک آنکھ دبا کر شرارت سے کہا۔

”شرم کریں ہنی، شرم۔۔۔۔۔“ ان کے اس انداز پر شرزمہ خفت زدہ انداز سے ہنس دی۔

”یار شرم ہی تو نہیں آتی، یاد نہیں کہ سمیعہ آپ کی میری شادی کی کتنی ٹینشن تھی مگر اپنی طبیعت کہیں شہرتی ہی نہیں۔۔۔۔۔“ انہوں نے شانِ استغنا کا لا جواب مظاہرہ کیا۔

”قسم سے ہنی اگر آپ مرد ہوتیں تو ایک دم فلرٹ ہوتیں۔۔۔۔۔“ شیری کی صاف گوئی پر انہوں نے تہقیر لگا کر تصدیق کی۔

”ویسے میں اب بھی کچھ کم فلرٹ نہیں۔“

”ہونہ۔۔۔۔۔ پتا ہے مجھے یہ سب۔“ شرزمہ نے بے پروائی سے گردن جھٹکی۔ ”پتا ہے کہ بس شغل میلا لگانے کو ایسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ ورنہ آپ برکون سا کوئی پابندی بھی۔۔۔۔۔ یا اب ہے۔۔۔۔۔“ اس نے کشن سر کے نیچے رکھتے ہوئے انہیں یاد دلایا۔

”تمہیں کیا پتا مائی ڈیئر، یہ نئے چہروں کی دید کا شوق کتنا کٹھن اور ظالم ہوتا ہے۔۔۔۔۔“ وہ اب بھی غیر سنجیدہ تھیں۔

”آپ مجھے کہہ رہی ہیں کہ مجھے نہیں پتا۔“ وہ جوش جذبات سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”اس دنیا میں اگر کوئی آپ کو جاننے کا دعویٰ کر سکتا ہے تو یاد رکھیے گا کہ وہ صرف شرزمہ حسن ہے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں۔۔۔۔۔“ اس کے ٹھونک بجا کر بولنے والے انداز پر وہ زرب لب مسکرائیں۔

”میں نے دنیا میں آنکھ کھولتے ہی جو چہرہ

گمشدہ جنت

دیکھا وہ آپ کا تھا۔ ماما میری پیدائش پر کتنا بیمار ہو گئی تھیں۔ پورے چھ ماہ آپ نے مجھے سنبھالا۔ مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ مجھے قلم پکڑ کر پہلا لفظ لکھنا سکھایا۔ میں نے جو پہلا لفظ بولنا سیکھا تو وہ ”ہنی“ تھا۔ میری بہترین دوست، استاد، بہن، خالہ اور بعض دفعہ تو آپ مجھے اپنی ماما ہی لگتی ہیں۔“ وہ اچھی خاصی جذباتی ہو گئی تھی۔

”خبردار لڑکی جو مجھے ماما، شاما کہا، سخت ماسنڈ کروں گی میں۔۔۔۔۔“ ان کے لہجے میں شرزمہ کے لیے محبت ہی محبت تھی۔

”آپ مجھ سے تیرہ یا چودہ سال بڑی ہیں لیکن مجھے ہمیشہ اپنی ہم عمر ہی محسوس ہوئی ہیں۔ مجھے آپ کی موجودگی میں کبھی کوئی دوست بنانے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوئی۔“ وہ اٹھ کر ان کے پاس آگئی تھی اور انتہائی محبت سے ان کے ماتھے کا بوسہ لیا تھا۔ محبت کے اس مظاہرے پر ہانیہ کی آنکھیں کچھ لمحوں کے لیے نم ہوئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ شرزمہ محبتوں کے اظہار کے معاملے میں بالکل کوری ہے۔ وہ انتہائی کم گو اور اپنے آپ میں مگن ایسی لڑکی ہے جسے لوگوں کے ہجوم سے وحشت ہوتی ہے۔ ان دونوں کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن اس کے باوجود ان دونوں میں قابلِ رشک ذہنی ہم آہنگی تھی۔

”ویسے یار پروفیسر صاحب کو متاثر کرنے کا کوئی طریقہ تو بتاؤ۔۔۔۔۔“ ہنی کی سوئی وہیں انگلی ہوئی تھی۔ شرزمہ کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ صرف اور صرف اسے تنگ کرنے کے لیے بار بار ان کا ذکر کر رہی ہیں اس کے باوجود وہ اس بات سے چڑ گئی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے ہنی آپ کو، ساری دنیا تو آپ سے متاثر ہے اگر ایک آدھ بندہ نہیں بھی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے اور ویسے بھی آپ کو پتا ہے کہ یہ لڑکوں کے بارے میں بات کرنا اور انہیں اس طرح ڈسکس کرنا میرا مشغلہ بھی نہیں رہا بلکہ مجھے تو ایسی باتوں

”اس لیے کہ ایک تو یہ اس کے تین، تین

ماموؤں کا گھر ہے پھر الحمد للہ اماں جان حیات ہیں جو غلطی سے اس کی نان لگتی ہیں اور پھر اسی گھر کے اوپر والے پورشن میں اس کی سگی بہن بیہ کراپنے ماموں کے ہاں آئی ہے۔ اب تین تین رشتے داریوں کی موجودگی میں، میں کس طرح یہ احمقانہ سوال کروں کہ وہ کیوں آرہا ہے اور وہ کون سا پہلی دفعہ آرہا ہے.....“ ابراہیم کا سخت طنز یہ لہجہ الماس کو خائف کر گیا۔ وہ بہت کم غصے میں آتے تھے لیکن آتے تو اگلے بندے کو چھٹی کا دودھ یاد دلادیتے تھے۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ عطیہ کے پاس آرہا ہے۔“ انہوں نے بلند آواز میں اندازہ لگایا۔ عطیہ ان کی دیورانی تھیں اور اوپر والے پورشن میں اماں جان کے ساتھ مقیم تھیں۔ جن کے ساتھ ان کی پہلے دن سے ہی نہیں بنی تھی۔

”عطیہ بھابی کا تو پتا نہیں لیکن مجھے شفق آپا نے فون کر کے کہا ہے کہ شامی کو انر پورٹ سے پک کر لوں.....“ بے پروائی سے توس کھاتے ہوئے انہوں نے ایک دفعہ پھر اپنی بیگم کا سکون غارت کیا تھا۔

”کیوں؟“ انہوں نے ٹیکھی نظروں سے اپنے میاں کے پرسکون چہرے کو دیکھا اور طنزاً بولیں۔ ”احمر کے پیروں میں مہندی لگی ہوئی ہے کیا، وہ نہیں جاسکتا.....؟“

”مہندی تو میرے بھی پیروں میں نہیں لگی ہوئی.....“ انہوں نے سنجیدگی سے اطلاع دینے والے انداز میں کہا تو بیگم الماس نے بے چینی سے پہلو بدلا انہیں اپنے میاں کے مزاج سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ آج کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں۔ اپنی گزشتہ ازدواجی زندگی کے تجربات سے انہیں اچھی طرح علم تھا کہ ویسے تو ابراہیم صاحب خاصے بے ضرر، کم گو اور ان کے ساتھ اختلافی امور پر بات کرنے سے حتی الامکان گریز ہی کرتے تھے۔ جس

رکھ دیا تھا۔

”میرا اسٹریمری شیک کہاں ہے.....؟“ انہوں نے ایک نظر میں سینٹرل ٹیبل پر اپنی پسندیدہ چیز کی غیر موجودگی محسوس کر لی تھی۔

”آپ کی آمد کی اطلاع نہیں تھی اس لیے میں بنوایا ہی نہیں، آپ یہ فریش جوس لے لیں.....“ الماس بیگم نے قدرے ناگواری سے جگ ان کی طرف بڑھایا۔

”آپ نے شفق آپا سے پوچھنا تو تھا۔“ الماس بیگم کو آج سارا ناشتا ہی زہر لگ رہا تھا اور وہ اس وقت صرف اور صرف ابراہیم صاحب کے لیے بیٹھی تھیں کیونکہ انہیں علم تھا کہ وہ ناشتا کرتے ہی آفس کے لیے نکل جائیں گے اور مزید انتظار کی ان میں ہمت نہیں تھی۔

”کس چیز کا پوچھنا تھا.....؟“ ابراہیم صاحب کی توجہ اخبار میں اشاک ایکس چینج کے اتار چڑھاؤ پر تھی اس لیے انہوں نے بے توجہی سے جواب دیا تھا جسے سن کر الماس بیگم سر سے لے کر پاؤں تک سلگ اٹھیں۔

”یہ اخبار اپنے آفس جا کر پڑھ لیجیے گا.....“ انہوں نے غصے سے اخبار جھپٹ کر ان کے سامنے سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھا۔ اپنی بیٹیوں کے سامنے اس عزت افزائی پر وہ کچھ جھینپ سے گئے تھے۔

”بھئی کیا پوچھنا تھا شفق آپا سے.....؟“

”آپ نے ان سے پوچھنا تھا کہ احتشام کس مسئلے میں پاکستان آرہا ہے.....؟“ وہ لفظوں کو چبا چبا کر یہ مشکل تحمل انداز میں گویا ہوئیں لیکن ان کی اس بات پر خلاف توقع ابراہیم صاحب بھڑک اٹھے۔

”کمال کرتی ہیں آپ بھی الماس بیگم، میں بھلا کیسے آپا سے پوچھ سکتا ہوں کہ ان کا بیٹا کیا کرنے آرہا ہے پاکستان؟“ وہ بری طرح جھٹلا اٹھے۔

”کیوں، آپ کیوں نہیں پوچھ سکتے.....؟“ وہ ہلکا کھانے کودوڑیں۔

کیونکہ ایسی جستجو انسان کو وندہ رہنے کا بہترین جواز فراہم کرتی ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ ستاروں سے آگے والے جہان زیادہ دلفریب ہیں۔ چھپی ہوئی چیزیں زیادہ دلکش لگتی ہیں۔ انسان ان کو پانے کو پھل جاتا ہے۔ ان کو اپنی دسترس میں لینے کی دھن انسان کو ہر لمحہ متحرک رکھتی ہے جبکہ منزلیں انسان کو سست کر دیتی ہیں..... جمود کا شکار کر دیتی ہیں۔ اسی لیے مجھے منزل سے زیادہ اسے حاصل کرنے کی لگن سے لگاؤ ہے۔“

”یہ تو بہت عجیب سی تھیوری ہے ہنی، اس کا مطلب ہے کہ منزل کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی.....“ وہ ابجھن کا شکار ہوئی۔

”مائی ڈیر اصل چیز تو منزل ہی ہے ناں، اسی لیے تو اس کو حاصل کرنے والے راستے اچھے لگتے ہیں۔“ ہانیہ کی وضاحت پر بھی اسے تسلی نہیں ہوئی تھی۔

”پتا نہیں آپ کبھی کبھی اتنی مشکل باتیں کیوں کرنے لگتی ہیں.....“ اس نے بے پروائی سے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی چلایا۔

”جب ہم کسی چیز کو سمجھنا نہیں چاہتے تو اس پر ”مشکل“ ہونے کا لیبل لگا کر ایک سائڈ پر رکھ دیتے ہیں تاکہ کل کو ہمیں اس کے لیے کہیں جواب دہ نہ ہونا پڑے۔“ ہنی کے لہجے میں کچھ تھا کہ اس نے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔ ان کے چہرے پر بڑا عجیب سا تاثر تھا۔

”آپ کو پتا ہے کہ احتشام پاکستان کیوں آرہا ہے.....؟“ ناشتے کی میز پر الماس ابراہیم نے توس پر جیم لگاتے ہوئے بڑی فکر مندی سے پوچھا تھا۔ ابراہیم صاحب آدھے گھنٹے پہلے ہی فلائٹ سے کراچی سے آئے تھے۔ گزشتہ رات ان کی بیگم نے بڑی ذہنی پراگندگی کے ساتھ گزاری تھی۔

”بھئی میں کیا کہہ سکتا ہوں.....“ ان کے انداز میں موجود بے پروائی نے الماس بیگم کو سلا کر

سے ابجھن ہوتی ہے.....“ اس کی جھنجھلاہٹ ان کے لیے نئی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ ہر بار اس سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔

”میری جان، یہی تو سارا مسئلہ ہے کہ اگر ساری دنیا میں سے ایک بندہ نہیں ہے تو آخر کیوں نہیں ہے.....؟“ وہ کشن گود میں رکھ کر بیٹھ گئیں اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں جما کر شرمزہ کے چہرے پر پھیلی کوفت سے حظ اٹھایا۔

”ہو جائیں گے متاثر وہ بھی اور اس کے بعد پتا ہے کیا ہوگا.....؟“ شرمزہ نے ان کے تجسس کو ہوا دی۔

”ہاں کیا ہوگا.....؟ بولو، بولو.....“ وہ بے تاب ہوئیں۔

”اس کے بعد آپ کا ان میں انٹرسٹ ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ ماضی میں ہوتا آیا ہے.....“ شرمزہ کی سو فیصد درست بات پر وہ ہنستی چلی گئیں۔

”ویسے پتا نہیں یار، میں ایسی کیوں ہوں۔ ماما مجھے بتاتی تھیں کہ تم بچپن میں جس کھلونے کے لیے پاگل ہو جاتی تھیں اسے حاصل کرنے کے پندرہ منٹ کے بعد ہی تمہاری اس میں دلچسپی ختم ہو جاتی تھی اور تم اسے پھینک کر کسی اور چیز کے پیچھے لپک جاتی تھیں..... کتنی بری عادت ہے ناں یہ؟“ ہانیہ کے معصومانہ انداز پر وہ بے ساختہ بولی۔

”یہ انسانی فطرت ہے جو چیز جتنی دور اور ناممکن نظر آتی ہے اس میں کشش بھی اتنی ہی زیادہ نظر آتی ہے۔ فاصلے بہت سی چیزوں کے عیب اور خامیاں چھپا لیتے ہیں۔ جو چیزیں دور سے بہت خوب صورت دکھائی دیتی ہیں ان کے بہت نزدیک جانے پر کچھ بھدے رنگ بھی دکھائی دینے لگتے ہیں جو دل کو بھاتے نہیں ہیں اور ان سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ وہ زیر لب مسکرا کر مزید بولیں۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے ناں بعض لوگوں کو منزل سے زیادہ اس کے لیے کی جانے والی جستجو سے عشق ہو

کی وجہ الماس بیگم کی ہٹ دھرم، ضدی طبیعت کے ساتھ ساتھ اپنی ہی بات منوانے کی عادت تھی۔ انہوں نے بہت جلد الماس بیگم کی اس بات سے سمجھوتا کر کے اپنی زندگی آسان کر لی تھی لیکن اس عرصے میں الماس بیگم کو بھی اچھی طرح یہ تلخ تجربہ ہو چکا تھا کہ جب وہ کسی بات پر اڑ جاتے تھے تو انہیں ایک انچ بھی اپنی جگہ سے ہلانا مشکل ہو جاتا تھا۔

”پتا نہیں یہ بیٹھے بٹھائے آپ کی بہن صاحبہ کو کیا سوچھی جو صاحبزادے کو یہاں بھجوا رہی ہیں.....“ وہ ابھی تک اپنی کوفت اور بیزاری کے احساس پر قابو نہیں پاسکتی تھیں۔

”ان کا تو مجھے پتا نہیں لیکن آپ کے ساتھ ضرور کوئی نہ کوئی مسئلہ ہے جو آپ اپنے گھر کو بھی کالج سمجھ کر چلانے کی کوشش کرنے لگتی ہیں۔ ہزار دفعہ سمجھایا ہے کہ اپنا بیسواں گریڈ کالج میں ہی چھوڑ کر گھر آیا کریں۔ اب یہ کیا تک بنتی ہے کہ رشتے دار اور عزیز واقارب اس گھر میں آنے کے لیے آپ سے اپیل پر مٹ لیں؟“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا تو س یا قاعدہ پلیٹ میں پٹا تھا۔ نویرہ نے ہر اسان نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کی آپ کو؟ کیوں ٹیمپرز لوز کر رہی ہیں آپ؟“ کچن سے گرما گرم پراٹھالانی ہوئی رومی خالہ نے ایک لمحے میں ماحول کی سنگینی کو محسوس کیا جبکہ ان کی بات پر الماس بیگم کا چہرہ ایک دم سرخ ہوا۔ ناشتے کی میز پر ہونے والی اس بد مزگی سے ان کی دونوں بیٹیاں بھی گھبرا گئی تھیں۔

”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اپنا دماغ خراب کرنے کی، انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیوں اتنی ٹینس ہوں.....؟“ ان کے لہجے میں چھپی تیش کو وہاں موجود سبھی لوگوں نے محسوس کیا اسی لمحے ابراہیم صاحب کو بھی اپنی غلطی کا ادراک ہوا۔

”جو ہونا تھا، وہ ہو گیا تو کیا اب ہم اپنی، اپنی

زندگیاں اسی ایک بات کے پیچھے خراب کر لیں.....؟“ ابراہیم صاحب نے دانستہ اپنا لہجہ نرم کر کے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ الماس بیگم کا سارا غصہ اور اشتعال بھک کر کے اڑ گیا۔ نویرہ نے معنی خیز انداز سے اپنی بڑی بہن کو جنگ ختم ہونے کا اشارہ کیا اور خود آ پلیٹ کی پلیٹ پر جھک گئی۔

”وہ ایک بات نہیں تھی ابراہیم صاحب۔ آپ کو نہیں پتا کہ کتنے عذابوں کی فصل کاٹی ہے میں نے؟ سر جھکا کر اور آنکھیں چرا کر بات کرنا الماس ابراہیم کی سرشت میں ہی شامل نہیں تھا۔“ انہوں نے اورنج جوس کے گلاس پر پھیلے ہوئے جھاگ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کے لہجے میں دکھ اور اذیت کی جو آنچ تھی اس کی تیش کو بھی نے محسوس کیا تھا۔ کمرے میں ایک چھپنے والی خاموشی اور سنائے نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے۔

”شیری تم بہت بیوقوف لڑکی ہو.....“ مہنی نے صوفے پر دھڑام سے بیٹھتے ہی اعلان کیا۔ ان کا مزاج برہم اور تیر خا صے خطرناک تھے۔ ”یہ تو کتنی پرانی خبر ہے، کوئی نئی بات بتائیں.....“ شرزمہ نے کھوجتی نظروں سے ان کے چہرے پر پھیلی ناراضی کی شکنوں کو بڑی سرعت سے پڑھا تھا۔ اس کی غیر سنجیدگی پر انہوں نے لب بھینچ لیے اور پیشانی پر کئی لکیریں نمودار ہو گئیں۔

”آخر ہوا کیا ہے؟“ شرزمہ نے ہاتھ میں پکڑا انگلش میگزین کا ریٹ پر اچھالا۔ ”آپ تو خیر سگالی کے دورے پر نیچے گئی ہوئی تھیں، کیا انہوں نے ہری مرچوں کا سوپ پلا دیا؟“ اس نے معصومیت سے ٹھوڑی برانگی رکھ کر شریر انداز میں پوچھا۔

”تمہیں آخر ضرورت کیا پڑی تھی پروفیسر صاحب کو یہ کہنے کی کہ تمہارے مضامین کا انتخاب میں کروں گی.....“ ان کے ناگوار انداز پر وہ حیران ہوئی۔

”تو اس میں کون سی غلط بات ہے؟ میں کیا پہنوں گی، کیا خریدوں گی، کون سی چیز مجھے سوٹ کرے گی اور کیا چیز میرے لیے بہتر ہے، ان تمام چیزوں کا انتخاب آپ ہی تو کرتی آئی ہیں۔“ مہنی کے چہرے کے تنے ہوئے نقوش دیکھ کر شرزمہ نے سنجیدگی سے وضاحت دی۔

”مائی ڈیئر وہ سب چیزیں تو میں تمہاری محبت میں کرتی ہوں کیونکہ دنیا کو علم نہیں کہ تم میرے لیے کتنی اہم ہو.....“ مہنی نہ جانے کیوں خفا ہو رہی تھیں وہ بکھنے سے قاصر تھی۔

”تو آخر ہوا کیا ہے؟“ وہ الجھ کر مہنی کا جھنجھلایا چہرہ دیکھنے لگی۔

”دنیا ہمارے دلوں میں جھانک کر نہیں دیکھتی بلکہ ظاہری باتوں اور چیزوں سے اندازے لگاتی ہے۔ تمہیں اس چیز کی خبر نہیں۔ اس لیے محتاط رہا کرو۔“ انہوں نے نصیحت کی۔

”تو لگانے دیں اندازے، ہمیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے.....“ شرزمہ نے بے ساختگی سے کہہ کر مہنی کو تعجب اور بے یقینی سے دیکھا۔ وہ تو بڑی سی بڑی بات کو بھی چٹکیوں میں اڑا دیتی تھیں لیکن آج چھوٹی سی بات پر پتا نہیں کیوں ان کی سوئی انک سی گئی تھی۔

”میری جان فرق پڑتا ہے۔ لوگ ہماری زندگیوں سے بھی نہیں نکل سکتے۔ ہم ان سے کٹ کر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اسی لیے تو انسانوں کو معاشرتی جانور کہا گیا ہے۔“ وہ پتا نہیں اسے کیا سمجھا چاہ رہی تھیں۔

”اچھا، اب مجھے سیدھے سادے الفاظ میں یہ بتا دینا کہ آخر ہوا کیا ہے.....؟“ شرزمہ نے تحمل سے کہا۔

”ہونا کیا تھا.....“ انہوں نے اپنے لیڈی ڈیانا کٹ ہیر اسٹائل میں ہاتھ پھیرتے ہوئے قدرے ناراض انداز میں کہا۔ ”وہ پروفیسر آفاق صاحب مجھے سمجھا رہے تھے کہ شرزمہ کو اپنے فیصلے خود کرنے دیا

کریں ورنہ اس کی شخصیت منخ ہو جائے گی۔“ ”اوہ مائی گاڈ.....“ شرزمہ ہنس دی۔ ”آپ اس چھوٹی سی بات کی وجہ سے پریشان ہو رہی تھیں خواہ مخواہ۔“ اس نے مصنوعی تعجب سے پوچھا۔

”یہ چھوٹی سی بات نہیں ہے شیری۔“ وہ نروٹھے پن سے بولیں۔ ”وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے کتنی ظالم اور ہٹلر ہوں میں۔“ ان کا صدمہ کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

”اگر وہ ایسا سوچتے ہیں تو سوچنے دیں۔ ہمارا کیا جاتا ہے؟.....“ اس نے اپنی طرف سے بڑا عقلمندانہ مشورہ دیا تھا مگر وہ مہنی کو بالکل نہیں بھایا۔

”کیسی بچوں جیسی باتیں کرتی ہو شرزمہ تم.....“ وہ ٹھیک ٹھاک برا مانا گئیں۔

”کیوں؟“ شرزمہ کے تحمل میں رتی بھر بھی فرق نہیں آیا تھا۔

”ان کے ذہن میں میرے بارے میں کتنا غلط اور منفی قسم کا امیج بن گیا ہوگا۔“ ان کی پریشانی پر شرزمہ کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔

”اوہ، آئی ایم سوری مہنی.....“ وہ اپنی انگلی میں موجود چھلے کو گھماتے ہوئے سنجیدہ ہوئی۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر سنجیدہ ہو جائیں گے حالانکہ کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ پروفیسر حضرات کا تو پڑھ پڑھ کر ویسے ہی دماغ گھوما ہوتا ہے۔ پتا نہیں آپ کو کیا کچھ کہہ گئے.....“ شرزمہ نے بڑے نرم انداز میں ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا تو وہ کچھ پرسکون ہوئیں۔

”پھر آپ نے اپنی بوتیک کے لیے کہاں مناسب جگہ دیکھی.....؟“ شرزمہ نے ان کا دھیان بٹانے کو گفتگو کا رخ بدلا۔

”بوتیک کے لیے جناح سپر اور سینٹورس مال میں کچھ جگہیں مجھے اسود نے دکھائی ہیں۔ بزنس کے معاملے میں اس کی اپروچ خاصی شارپ ہے۔ اس

کے ساتھ میں نے مارکیٹس کا وزٹ کیا ہے اور اسی نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں عفان صاحب سے پارٹنرشپ کرنے کے بجائے اپنا کام اکیلے ہی شروع کروں۔“ ان کی بات پر شرزمہ بری طرح چوکی۔ عفان صاحب کے ساتھ وہ اسپین میں رہتے ہوئے پاکستان میں پارٹنرشپ کی مدد سے کام کر رہی تھیں۔

”کیا..... دماغ ٹھیک ہے اسود صاحب کا؟“ شرزمہ پریشان ہوئی۔ ”عفان صاحب نے سارا سیٹ اپ یہاں اچھے طریقے سے بنا رکھا ہے تو آپ کو کیا ضرورت پڑی ہے نئے تجربے کرنے کی.....؟“ شرزمہ کو یہ مشورہ بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

”عفان صاحب نے یہاں سارا سیٹ اپ اپنی بیٹی کے نام سے جمارکھا ہے تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے میں ان کے نام کو مزید مستحکم کروں۔“ ہنی کا انداز بے لچک اور دو ٹوک تھا۔

”آپ اکیلے کیسے کریں گی سب کچھ.....؟“ وہ سخت بے یقینی سے ان کا پر عزم چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”کیوں، میں کوئی بچی ہوں کیا.....؟“ انہوں نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ چپ کی چپ رہ گئی۔ ”دیکھو شرزمہ میں تمہاری عمر میں بھی جب ڈیڈی مجھے بزنس میں لے آئے تھے۔ ان کی ڈیڈی کے بعد کافی عرصہ میں نے اکیلے ہی سارا بزنس سنبھالا تھا اور تمہارے پاپا بھی کاروباری معاملات میں میری رائے کو کتنی اہمیت دیتے تھے یہ تو تمہیں بھی پتا ہے۔“ ان کے لہجے میں خود ستائی کی جھلک شرزمہ کے لیے نئی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ خود کو بولنے سے نہیں روک پائی۔

”ہنی وہ اسپین تھا جہاں ہم پیدا ہوئے، پلے بڑھے۔ سبھی اپنی کیونٹی کے لوگ تھے اور بہت اچھی طرح سے جانتے تھے۔ یہ پاکستان ہے جہاں ملک سے لے کر تجارت، بزنس، صنعت، ہر چیز کے حالات خراب ہیں اور سب سے بڑھ کر کہ ہم یہاں

کسی کو زیادہ جانتے بھی نہیں۔ ایسے میں اکیلے اتنا پیسہ انویسٹ کرنا دانشمندی نہیں۔“

”دیکھو شرزمہ، مجھے ان سب چیزوں کا بخوبی علم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی قابلیت، تجربے کاری اور ذہانت پر بھی کوئی شک نہیں۔ الحمد للہ میں نے بزنس میں بہت جلدی اپنا ایک مقام ایسے ہی نہیں بنا لیا تھا۔ تم بس اپنی اسٹڈی پر توجہ دو۔“ انہوں نے بات کو ختم کرنے کے لیے چینل تبدیل کیا۔

”ہنی میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں، کوئی بھی کام عجلت میں کرنے کی ضرورت نہیں اور پھر ہر جگہ حالات ایک جیسے نہیں رہتے۔ ہمیں کیا پتا تھا کہ ماما، پاپا کی اس طرح اچانک روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈھکے ہو جائے گی اور ان کے بزنس پارٹنر کی ایسے نیت بدل جائے گی۔ آپ کے سامنے ہی تھا کہ کس طرح اس نے ہمیں ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ مجبوراً ہمیں انکل فاروق کی بات مان کر پاکستان آنا پڑا۔“ شرزمہ نے اس حقیقت کو ان کے سامنے دہرایا تو وہ جھنجھلا گئیں۔

”وہ سب فاروق بھائی کی بزدلی تھی جس نے ہمیں بھی بوکھلا کر رکھ دیا تھا.....“ ان کا لہجہ دل دکھانے والا تھا۔ ”اور پر سے تم اس خبیث کے اوباش قسم کے بیٹوں سے ڈر گئی تھیں جو تمہارے پیچھے کالج میں آنے لگے تھے۔ ورنہ مجھے پاکستان آنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں تھا میں صرف اور صرف تمہاری وجہ سے یہاں آئی ہوں۔“ ان کے اس طرح جتانے پر وہ ایک دم خفت کا شکار ہو کر چپ ہو گئی۔

”ان لوگوں کی کیا اوقات تھی مجھے اچھی طرح سے علم ہے۔ کیا بگاڑ لیتے وہ ہمارا؟ تمہاری اور فاروق بھائی کی جذباتیت اور کم اعتمادی نے ہی ان کے حوصلے بلند کیے تھے۔ ورنہ میں تو ان کا دماغ ٹھیک ٹھاک درست کرنے والی تھی۔“ ہانیہ کو ابھی تک اس بات کا غصہ تھا یہ تو شرزمہ اور فاروق انکل

ی جانتے تھے کہ انہوں نے ہنی کو کس طرح سے وہاں سے آنے پر راضی کیا تھا۔ وہ کسی صورت بھی بارسلونا چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔

”میں بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی زندگی میں مجھے یعنی ہانیہ مصطفیٰ کو اس طرح سب کچھ سمیٹ ساٹ کر چوروں کی طرح اسپین سے ٹھکنا ہوگا۔ آج بھی سوچتی ہوں تو ذلت کا احساس ہوتا ہے۔“ وہ ان کی تکلیف اور شرمندگی کا اندازہ کر سکتی تھی لیکن اس کی سب سے بڑی مجبوری یہ تھی کہ وہ ان کی طرح، نڈر، پراختاد اور بے خوف نہیں تھی۔ ان دونوں کے مزاجوں میں زمین، آسمان کا فرق تھا۔

”آف ہانیہ کیا ہو گیا ہے؟ اب بس بھی کر دیں، زندگی میں جب بھی دوبارہ موقع ملے گا تو جا کر اپنا حساب بے باق کر آئیے گا.....“ شرزمہ نے دانستہ اپنے لہجے کو بے پروا کیا۔

”ہاں تو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں ایسا نہیں کروں گی کیا؟“ ان کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔ ”مجھے ذرا اپنا بزنس یہاں سیٹ کر لینے دو، دیکھنا سب کے کیسے دماغ سیٹ کر کے آتی ہوں، ہانیہ اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتی.....“ ان کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت اب بھی نمایاں تھی۔

”ہاں ناں، ضرور جائیے گا۔ ایسے ہی تو پاپا آپ کو شیرینی نہیں کہتے تھے.....“ شرزمہ کے مصنوعی شیریں انداز پر ہنی کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے، وہ خاموش رہیں۔ کمرے میں پھیلی بو جھل غاموشتی کو ختم کرنے کے لیے اس نے مزید کہا۔ ”قسم سے یہاں آ کر عجیب پوستی سی بن گئی ہوں میں۔ ہر وقت سستی اور کاہلی سوار رہتی ہے مجھ پر.....“ شرزمہ نے ایک لمبی جمائی لی۔

”تو تم بھی میرے ساتھ موروالی کوٹھی میں بنے رہو جو آئن کرلو، مسز شیرازی بہت مزے کی خاتون ہیں.....“ دوسری جانب سے فوراً کھٹ کر کے مشورہ

آیا۔ شرزمہ نے آنکھیں پھاڑ کر سامنے صوفہ کم بیڈ پر بے ترتیبی سے لیٹی ہوئی ہانیہ کو دیکھا۔ جن کا موڈ تبدیل ہو گیا تھا وہ کسی بھی چیز کو زیادہ دیر تک اپنے سر پر سوار رکھنے کی قائل نہیں تھیں۔

”مائی گاڈ، آپ وہاں سے بھی ہو آئیں؟ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے، ہمیں یہاں آئے ہوئے۔ کیا چیز ہیں آپ؟“ شرزمہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بالکل ٹی وی اسکرین کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”افوہ شیریں پیچھے ہٹو ناں، فیشن شو کی رپورٹ آرہی ہے۔“ وہ ایک دم جھنجھلا گئیں تو شرزمہ نے ٹی وی اسکرین پر ایک نگاہ ڈالی۔

”بے فکر رہیں یہ یورپ کا فیشن شو ہے یہاں پر یہ پتوں، پھول بوٹوں والے لباس نہیں چلیں گے۔“ اس کے جل کر بولنے پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دیں۔

”جتنا ایڈوانس پاکستان ہوتا جا رہا ہے مجھے تو یہ وقت بھی دور نہیں لگتا۔ قسم سے کبھی تو اس ملک پر بھی یورپ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ماما پتا نہیں کون سے دور کے قصے کہانیاں سنایا کرتی تھیں جس میں ٹوپی والے برقعے، پردہ، تانگے اور ڈولیلوں کا ذکر ہوتا تھا۔“ وہ جوش سے اٹھ بیٹھیں۔

”ہاں مجھے بھی یہاں آ کر خاصی مایوسی ہوئی ہے۔ پتا نہیں نانو کس دور کے قصے سنایا کرتی تھیں۔“ شرزمہ کچن کی طرف جاتے جاتے رکی۔ اسے یاد آیا۔

”آپ نے بتایا نہیں کہ آپ وہ موروالی کوٹھی میں کیسے پہنچیں.....؟“ اس نے تعجب بھرے انداز میں دریافت کیا۔

”تمہیں پتا ہے یار کہ میں اپنی صحت کے معاملے میں کتنی کوشش ہوں۔ یہاں آنے کے بعد سب سے پہلے بہترین پارلر اور جم کا پتا کروایا ہے۔ کل دوپہر جب تم سو رہی تھیں تو اسود کے ساتھ جا کر

جم کا وزٹ بھی کر آئی۔“ انہوں نے مزے سے اپنا کارنامہ سنایا۔

”توبہ ہے ہنی، اتنی فریش اسکن اور زبردست فکر ہے آپ کا۔ آپ کو کہاں ان چیزوں کی ضرورت ہے؟“ شرزمہ نے برا سامنہ بنایا تو وہ آہستگی سے بولیں۔

”مائی ڈیئر عورت کی زندگی کے کیلنڈر میں پہلے بیس سال خوشنما تلی کی طرح ہوتے ہیں۔ اسے سارے موسم سرخ گلابوں کے موسم لگتے ہیں۔ بیس سے تیس کی عمر میں بھی عورت کو زندگی اپنی دسترس میں محسوس ہوتی ہے وہ خود کو جگنوؤں کی بستی کا مکیں بھتی ہے۔ تیس کا ہندسہ کراس کرتے ہی وہم، اندیشے اور عمر کے ڈھلنے کا خوف کسی مکڑی کی طرح عورت کے ذہن میں جالے بنانے لگتا ہے۔ وہ بے چینی اور خوف کے عالم میں بار بار آئینہ دیکھتی ہے۔ چالیس کا سن عورت کو بالکل یڑمردہ کر دیتا ہے اور وہ ہتھیار پھینک کر بڑھاپے کو تسلیم کرنا شروع کر ہی دیتی ہے اور یہ ہی سب سے کڑا مرحلہ ہوتا ہے۔“

”آپ بھی ناں ہنی بہت عجیب ہیں.....“ شرزمہ ان کے فلسفے پر حیران ہوئی تو انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے فوراً وضاحت کی۔

”آپ ڈرنے والی چیزوں سے ڈرتی نہیں اور جو چیزیں فطری ہیں ان سے خوف زدہ ہو رہی ہیں.....“ وہ مسکراتے ہوئے فریج کھول کر چکن نکالنے لگی۔ اسی لمحے اس نے مڑ کر دیکھا ہنی انتہائی سنجیدگی سے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھ رہی تھیں۔

”کہاں ہوتی ہیں شرزمہ آپ؟ نظر ہی نہیں آتیں؟“

وہ جو گل داؤدی، موتیا اور چپا کے نئے پودوں کا بغور جائزہ لینے میں مگن تھی۔ اس اچانک آواز پر اس کے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ لرز کر رہ گیا۔ اس نے مڑ کر اپنے پیچھے بڑے مگن سے انداز میں کھڑے

اسود کو دیکھا۔ چونہ جانے کب اس کے پیچھے آن کر رہا تھا اور اسے پتا ہی نہیں چلا۔

”اوہ سوری.....! لگتا ہے کہ میرے یوں اچانک بولنے سے آپ ڈر گئیں۔“ شرزمہ کے ہراساں چہرے کو دیکھ کر اس نے بالکل سونفیدر درست اندازہ لگایا۔

”جی ایسا ہی ہوا ہے.....“ اس نے صاف گوئی سے کہتے ہوئے گل داؤدی کے پیلے پھول پر بیٹھی تلی کو غور سے دیکھا۔

”سوری، میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے آپ کو لان میں بیٹھے دیکھا تو خود کو باہر آنے سے نہیں روک سکا۔ آپ تو نظر ہی نہیں آتیں۔“ وہ بڑی شائستگی سے اس کے ساتھ مخاطب تھا جبکہ وہ قصداً تھوڑا سا ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا محتاط انداز اسود کو بہت اچھا لگا۔

”میں کون سا پہلے ہر وقت یہاں پائی جاتی تھی جو آپ میرے نظر نہ آنے کا گلہ کر رہے ہیں.....؟“ اس کے سپاٹ اور لالہ لعل انداز پر وہ تھوڑا سا شرمندہ ہوا۔

”آپ مجھ سے خفا ہیں کیا.....؟“ اس کی بے رخی سے اس نے ایک اور اندازہ لگایا۔

”میں.....؟“ اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا۔ ”اور آپ سے ناراض..... مگر کیوں؟“ اس کے لہجے میں اس قدر حیرانی اور اجنبیت تھی کہ اسود کو فوراً ہی اپنے سوال کے بے تکلف ہونے کا احساس ہوا۔

”اصل میں ہنی تو دن میں ہمارے پورشن کے کافی چکر لگا جاتی ہیں اور آپ نہیں آتیں اس لیے میں نے سوچا کہ شاید خفا ہیں۔“ وہ اب کہ قدرے محتاط انداز میں بولا تھا۔

”وہ تو آپ سے اپنے بزنس معاملات میں گفت و شنید کے لیے آتی ہوں گی لیکن میرے ساتھ ایسا کوئی ایشو نہیں۔“ وہ خاموشی سے اب اپنے

پیروں سے لپٹی بی بی کو غور سے دیکھ رہی تھی جو اس سے کافی مانوس ہو گئی تھی۔

”کس ڈیپارٹمنٹ میں ایڈیشن لیا ہے آپ نے.....؟“ وہ گفتگو کو طول دینے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

”بی بی اے میں.....“ اس سے مختصر جواب وہ نہیں دے سکتی تھی۔

”ہوں، اس کا مطلب ہے کہ بزنس.....“ ہنٹریشن پڑھ کر آپ بھی اپنی خالہ کی طرح بزنس کی دنیا میں آئیں گی۔“ اسود کو سنہری رنگت اور لمبے بالوں والی باریبی ڈول جیسی لڑکی پہلی ہی نظر میں اچھی لگی تھی۔ اس لیے وہ اس کی کم گوئی اور لالہ لعل انداز کے باوجود اس سے زبردستی بات چیت کرنے کا مشکل مرحلہ انجام دے رہا تھا۔ جبکہ وہ اس سے زیادہ اپنے پیروں سے لپٹی بی بی کو اہمیت دے رہی تھی۔

”بزنس..... اور میں؟“ اس کے چہرے پر اس قدر بے یقینی اور حیرت تھی کہ اسود کو لگا کہ اس نے کوئی انتہائی مشکل سوال کر لیا ہے۔

”مجھے بزنس سے کبھی دلچسپی نہیں رہی اور جہاں تک بات ہنی کی ہے تو انہوں نے بھی یہ سبکیٹ پڑھ کر بزنس اشارٹ نہیں کیا وہ فیشن ڈیزائننگ کی اسٹوڈنٹ تھیں۔“ اس کے لفظوں سے زیادہ لہجے میں رکھائی کا عنصر نمایاں تھا۔ اسود نے خفت زدہ انداز سے اسے دیکھا جو بڑی سنجیدگی سے بی بی کی طرف متوجہ تھی۔

”آپ آج کل کیا کر رہے ہیں.....؟“ اس نے اچانک ہی پوچھا تھا۔

”کچھ خاص نہیں چھوٹا موٹا بزنس! اسود نے انتہائی تحیر سے اسے دیکھا اور نپے تلے انداز میں جواب دیا۔

”کس طرح کا بزنس.....؟“ شرزمہ نے اسے مزید حیران کیا۔

گمشدہ جنت

”بس ایسے ہی ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہوں، ورنہ میرے جیسا نکمہ بندہ کیا خاک بزنس کرے گا۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں اپنا مذاق خود اڑایا جو شرزمہ کو اچھا نہیں لگا۔

”خیر اب تو آپ ضرورت سے زیادہ ہی.....“ کس نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ آپ جیسا بندہ سارے ہی کام کر سکتا ہے۔“ اس نے مانو بی کو لان کی گھاس پر کھیلنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

”آپ کو معلوم نہیں میں حقیقت میں بہت ہی بے پروا، غیر سنجیدہ اور بے وقوف انسان ہوں۔“ وہ اسے نہ جانے کیا چیز سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”خیر اپنے بارے میں آخری بات تو آپ نے بالکل غلط کہی ہے۔ آپ بے پروا یا غیر سنجیدہ تو ہو سکتے ہیں لیکن بے وقوف نہیں۔“ شرزمہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ بات کہی تھی وہ اس کے اس انداز پر شیشا سا گیا۔ اپنی بات کہہ کر وہ رکی نہیں جبکہ اسود اس کی پشت پر ناگن کی طرح لہرائی چوٹی کے بلوں میں ہی الجھ کر رہ گیا۔

ہنی پچھلے چند دنوں سے بے تحاشا مصروف تھیں حتیٰ کہ ان کی اور شرزمہ کی تفصیلی ملاقات کو بھی کافی دن گزر گئے۔ بس آتے جاتے ہلکی پھلکی سی ہیلو ہائے ہو جاتی تھی۔ نئے بزنس نے ان کے ہاتھ پیر پھلا رکھے تھے۔ وہ سارا وقت کمپیوٹر، فون اور لوگوں کے ساتھ میل ملاپ میں الجھی رہتیں۔ رات کو جب انہیں فراغت ملتی تب تک شرزمہ سوچکی ہوتی اور صبح ان کے اٹھنے سے پہلے وہ یونیورسٹی جا چکی ہوتی۔

اس دن اتوار تھا۔ ملازمہ نے واشنگ مشین لگا رکھی تھی۔ یہ ملازمہ بھی اسود کی مہربانی سے ہی دریافت ہوئی تھی۔ موسم خاصا بدل گیا تھا۔ اب دھوپ جسم کو چھنے لگی تھی۔ شرزمہ ناشتے کی ٹرے اٹھا کر ٹیرس پر لے آئی۔ جہاں پنکھا لگا ہوا تھا۔ بوگن ویلیا کے کاسنی پھول چاروں طرف بکھرے ہوئے

تھے۔ ٹیرس پر ہانیہ نے سنگ مرمر کے گملے لا کر شاید پچھلے ہی دنوں رکھے تھے۔ جس کی وجہ سے کشادہ سا ٹیرس بڑا ہرا بھرا سا لگنے لگا تھا۔

”مجال ہے کہ پاکستانی اخباروں میں ایک بھی ڈھنگ کی خبر ہو۔ ان اخباروں کے اوپر ادارے کو لازمی لکھنا چاہیے کہ خبردار ہائی بلڈ پریشر کے مریض ان منحوس خبروں کو پڑھنے سے اجتناب کریں۔“ ہنی چائے کا بڑا سا گک اٹھا کر وہیں آگئیں۔ ان کے ہاتھ میں تازہ اخبار تھا جسے انہوں نے لا کر باقاعدہ میز پر بٹھا تھا۔

”تو آپ کے لیے کیا مسئلہ ہے؟ آپ کون سا ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں.....؟“ شرزمہ نے ان کا تروتازہ چہرہ دیکھتے ہوئے انہیں چھیڑا۔ آج کافی عرصے بعد دونوں کو ایک ساتھ بیٹھنا نصیب ہوا تھا۔

”ہوں تو نہیں لیکن لگتا ہے کہ اگر اسی طرح روزانہ نیوز پیپر پڑھتی رہی تو ضرور کسی دن میرا بی پی شوٹ کر جائے گا.....“ وہ دھپ کر کے کرسی پر بیٹھیں۔

”ہاں رات فاروق بھائی کا فون آیا تھا تم سو رہی تھیں اس لیے میں نے جگایا نہیں.....“ انہیں اچانک یاد آیا تھا۔ وہ اب سامنے رکھی کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر بے تکلفی سے بیٹھ گئیں۔

”ارے فاروق انکل کا فون آیا تھا.....؟“ ایک بے ساختہ سی خوشی اس کے چہرے پر چھلکی۔ ”کیا کہہ رہے تھے؟ وردہ اور ثمرہ کا کیا حال تھا؟“

”کچھ خاص بات نہیں ہوئی، بس انہیں ہماری ٹینشن تھی۔ میں نے خوب تسلی کروادی اور پروفیسر آفاق اور اسود کو کیریئر سٹوفیلیٹ بھی دے دیا۔ اس لیے وہ مطمئن ہو گئے۔“ انہوں نے اسے ہنستے ہوئے بتایا۔

”کچھ خدا کا خوف کریں ہنی، وہ کیا سوچتے ہوں گے کہ آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔“ شرزمہ چائے کا گھونٹ لینا بھول کر فکر مندی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی جس پر شرارت ہی شرارت تھی جبکہ آنکھوں میں مچلتی

شوخی بھی اس کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی۔

”لو، وہ کون سا مجھے پہلی دفعہ سن رہے تھے انہیں پتا ہے کہ میں پیدائشی ایسی ہوں اور جہاں تک پروفیسر آفاق اور اسود کی شرافت کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں انہیں ہم سے زیادہ علم ہے تبھی تو یہاں بھیجا ہے۔ ورنہ وہ ایسے ہی کم از کم ہمیں یہاں رہنے کا مشورہ نہ دیتے۔“ ہنی نے چائے پیٹے ہوئے اسے تسلی دی۔

”خیر فاروق انکل کے خلوص پر تو ہم کبھی مر کر بھی شبہ نہیں کر سکتے۔ جس طرح انہوں نے سگی بیٹیوں کی طرح ہمارا خیال رکھا اور اب تک رکھ رہے ہیں۔“ شرزمہ اب سکون سے ناشتا کر رہی تھی جبکہ ہنی نے دوبارہ اخبار کھول لیا۔

”ہاں فاروق بھائی بتا رہے تھے کہ وردہ کی اگلے مہینے شادی ہے.....“ ہنی کی اطلاع پر وہ اچھل کر رہ گئی۔

”اتنی جلدی، ابھی تو اس نے اپنا بی ایس بھی مکمل نہیں کیا۔“ شرزمہ کو اپنے سے دو سال بڑی ان کی بیٹی کی شادی کی خبر نے حیران کر دیا تھا۔ اس سے اس کی دوستی بھی تو خوب تھی۔

”میں نے بھی کہا تھا کہ اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے لیکن وہ کہنے لگے کہ تعلیم شادی کے بعد بھی مکمل ہوتی رہے گی۔ اب میں کیا کہتی، ظاہر ہے کہ ان کی بیٹی ہے وہ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔“ انہوں نے سستی اور کاہلی سے انگڑائی لی۔ ”ہاں وہ ایک اور بات بھی بتا رہے تھے کہ ہمارے جانے کے بعد تمہارے تایا آئے تھے۔ انہیں کسی نے تمہارے ڈیڈی کی وفات کی اطلاع دی تھی۔“ ہنی کی اس بات پر وہ منہ میں ڈالانوالہ چباننا بھول گئی تھی اور ہاتھ میں پکڑا فرنیچ ٹوسٹ بھی پلیٹ میں رکھ کر سخت تعجب سے ہانیہ کا پرسکون سا انداز دیکھا۔

”وہ کیا کرنے آئے تھے وہاں.....؟“ اسے

”اچھا کیا کہ تم نے بتا دیا کہ یہ پروفیسر صاحب نے بھجوا یا ہے، میں خواہ مخواہ تمہارے خیر سگالی کے جذبے سے متاثر ہونے والی تھی۔“ وہ بھی کون سا کسی سے کم تھیں۔ ان کی بات پر وہ کان کھجاتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں گویا ہوا۔

”اتنا ہی پروفیسر صاحب کو ان بیبیوں کا خیال ہوتا تو میں سیڑھیاں چڑھ کر خود اوپر نہ آ جاتے، یہ میں معصوم ہی تھا جو ”ایچ بی او“ چینل پر ایک پشمارے دار قلم ادھوری چھوڑ کر اوپر آیا۔“ اس کی آنکھوں میں شوخی ابھی تک رقصاں تھیں۔ شرمزہ بے تاثر چہرے کے ساتھ دونوں کی نوک جھونک سن رہی تھی۔

”جہنی یہ آپ کی بھانجی کچھ خشک اور بورسی نہیں ہیں.....“ وہ اب جہنی کی طرف قدرے جھک کر سرگوشی میں پوچھ رہا تھا، یہ اور بات کہ اس کی سرگوشی اتنی بلند تھی کہ سامنے بیٹھی شرزما نے صاف سنی تھی اور سن کر بھی اس کا چہرہ سپاٹ رہا تھا۔ وہ اب میز پر سے اخبار اٹھا کر زبردستی پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں، شیریں کو ہر
 ارے غیرے کے منہ لگنے کی عادت نہیں، وہ بہت
 سلیکھ لوگوں کو گھاس ڈالتی ہے.....“ انہوں نے
 سراسر اسے چڑایا تھا۔

”شکر الحمد للہ کہ میں گدھا نہیں، ورنہ مجھے بھی گھاس کھانی پڑتی، آپ کو تو دن رات گھاس ڈالی جاتی ہوگی، ہے ناں۔“ اس کا جوانی حملہ خاصا زوردار تھا۔ ہنی کے چہرے کی رنگت پل بھر کو متغیر ہوئی تھی اور شرمزہ ان کے چہرے پر نظر ڈالے بغیر بھی جان سکتی تھی کہ انہوں نے بہ مشکل خود کو مشتعل ہونے سے روکا ہوا ہے۔

”جی، میرے پاس ضرورت سے زیادہ ہئی
گھاس اکھٹی ہو گئی ہے، میں آج کل ایک اور گدھے
کی تلاش میں ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ آج میری

دو فیروز صاحب کہتے پھرتے ہو، سیدھی طرح انہیں
 نہ کر.....، مہنی نے اسے ایک دفعہ پھر ٹوکا۔

میں نے کہا: "اے کتنی دغلی خاتون واقع ہوئی ہیں آپ، سارا دن شرمہ آپ کے سامنے ہنسی، ہنسی کی گردان کرتی رہتی ہے، اسے تو کبھی آپ نے نہیں کہا کہ مجھے خالہ کہا کرو جبکہ میرے ماموں صاحب نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو ان کو زبردستی ماموں کہلوانے پر بضد ہیں۔" اس نے سخت شکایتی نظروں سے شرمہ کو دیکھا جس کے انداز میں ایک محسوس کی جانے والی لالچ اور بے نیازی تھی اور اسود کو لگتا تھا کہ یہ۔۔۔

”بھئی سادہ سی بات ہے کہ میں تو سخت ماسٹرڈ کرتی ہوں جبکہ وہ تو بالکل بھئی برا نہیں مناتے، انہوں نے مجھے خود بتایا کہ میں نے اسود سے کئی دفعہ کہا ہے کہ مجھے ماموں کہا کرے لیکن اس پر اثر ہی نہیں ہوتا۔“ وہ اب چچ کے ساتھ ڈونگے ہی میں حلیم کھانا شروع ہو گئی تھیں۔

”تو یہ ہے، آپ نے ان کے ساتھ بھی۔۔۔
 بتکلفانہ اپنے دکھ سکھ پھرو لئے شروع کر دیے، کم از کم
 اس شہر میں اپنے واحد دوست کا ٹائٹل تو میرے پاس
 رہنے دیتیں۔“ اس نے مصنوعی دکھی لہجے میں کہہ کر
 جُچّا اٹھایا اور خود بھی حلیم کھانے کے مشن میں شریک ہو
 گیا۔ ہنی نے بھویں اچکا کر اسے گھورا۔

”خبردار اس ڈونگے پر کوئی غلط نگاہ ڈالی، اپنے گھر جا کر کھانا.....“ انہوں نے فوراً اس کے آگے سے ڈونگا اٹھا کر ملازمہ کو پکچن میں لے جانے کا مشورہ دیا۔

”لنئی ظالم خاتون ہیں آپ، نیچے پروفیسر صاحب نے کھانے نہیں دیا کہ پہلے اوپر بیچاری خواتین کو دے کر آؤ اور یہاں آپ نے بے مروتی کی انتہا کر دی، ختم ہو جاتا تو اور لا کر دے دیتا، کم از کم بچے کا دل تو نہ توڑتیں.....“ اس کی اداکاری لودج برتھی جبکہ ہنی آج اس کے چکر میں آنے کے

کروں گی۔“ ہانیہ کے لہجے میں جھلکتی سنجیدگی نظر
 کر کے اس نے بیزار سی دودھ کا گلاس اٹھا
 زیر دستی پینے لگی۔ وہ ان کی کوئی بات ٹال نہیں
 تھی۔ اس بات کا ہنی کو بھی اندازہ تھا۔ اسے شہر
 دیکھ کر وہ ایک دفعہ پھر کسی فیشن شو کی تصاویر کی طرف
 متوجہ ہو گئیں۔

”ہیلو بنگ گرلز.....! کیا ایک ہیڈ سم بنو
کی کمپنی کو جوائن کر سکتا ہے.....؟“ پانچ مہر
اسود کی شوخ آواز پر وہ دونوں چونکیں اور مر کر کہیں
وہ ہاتھ میں کوئی ڈونگا اٹھائے منتظر نگاہوں سے ان کی
طرف دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر ایک شوخ سی مسکراہٹ
اور آنکھوں میں چمکنے والی جوت نمایاں تھی۔

موسٹ ویلکم اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر صرف ویلکم..... مہنی نے ہاتھ میں پکڑا میگزین میز پر رکھ دیا۔
ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔

”بھئی ہمیں پتا ہے کہ ہانیہ مصطفیٰ کو حلیمہ
پسند ہے، کل سارا دن اس فضلو کے بچے کی منظر
ہیں تب جا کر اس نے آج یہ بنایا۔ سوچا کہ خیر
کے جذبات کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش
آؤں۔“ اس کا انداز بھی شریعت تھا۔

”اوہ ففا شک، جم جم آؤ، اگر بتا کر آتے تو ہم اندر سے پلاسٹک کے پھول لا کر آپ کی راہوں میں بکھیر دیتے۔“ ان کا مزاج ایک دم خوشگوار ہوا۔ وہ اب ڈھکن اٹھا کر گرم چای کو لپٹائی ہوئی نظر دلا سے دیکھ رہی تھیں۔

”اے خوب صورت خاتون، وہیان سے کہیں اس ڈونگے میں اپنا سرمت دے دیجئے گا۔ رنہ پروفیسر صاحب میرا سر قلم کر دیں گے۔“ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی انہیں ایک دفعہ پھر چھیڑا جبکہ کلفی کا یہ مظاہرہ شرمزہ کو خاصا حیران کر گیا۔

ایک دم ہی غصہ آیا۔

”ظاہر ہے کہ افسوس کرنے آئے تھے اور فاروق بھائی بتا رہے تھے کہ خاصہ رنجیدہ تھے وہ۔“
ہنی کا انداز ہنوز سرسری سا تھا۔

”ان کی رنجیدگی کا اب ہمیں کیا فائدہ، جب ڈیڈی کو ان کی ضرورت تھی اور وہ بار بار انہیں فون کرتے تھے تب تو انہوں نے کوئی گھاس نہیں ڈالی تھی۔“ شرمزہ کو بہت کم غصہ آتا تھا اور جب آتا تھا تو اس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے تمنے لگتا۔

”وہ فاروق بھائی سے تمہارا ایڈریس مانگ رہے تھے.....“ ہنی کی بات پر اس کی سانس اٹکی۔
”کہیں فاروق انکل نے دے تو نہیں دیا.....؟“
اس نے غلت میں بات کاٹی۔

”بے وقوف ہو تم بھی، وہ بھلا ہماری اجازت کے بغیر کیسے ایڈریس دے سکتے ہیں۔ ان سے کیا چیز پوشیدہ ہے۔ ہر بات سے تو وہ آگاہ ہیں۔ انہوں نے حال دیا اور کہا کہ جب وہ پاکستان آئیں گے تو ملاقات کروادیں گے.....“ مہنی کی بات پر اس نے ایک طویل سانس لی۔

”مجھے کسی سے نہیں ملنا، نہ اب اور نہ بعد میں
 کبھی.....“ اس نے قدرے ناگواری سے ناشتے کی
 بے بھی سائڈ پر کھسکا دی۔ ہانیہ کو افسوس ہوا کہ وہ
 اس وقت اس بات کا ذکر نہ ہی کر تیں تو اچھا تھا۔

سرزم، یہی بچوں والی بائیں کرتی
 - انہوں نے انتہائی محبت سے اپنی بھانجی کا
 افس چہرہ دیکھا جو منہ پھلایا بیٹھی تھی۔

ہے کہ مجھے خود اس خاندان سے شدید چڑ ہے۔“
 وں نے اسے مطمئن کرنے کی بھرپور کوشش کی وہ
 زخاموشی سے اپنے ناخنوں کو غور سے دیکھنے میں
 لگی تھی۔ ”اب آرام سے اچھے بچوں کی طرح ناشتا
 کرو، ورنہ آئندہ میں ایسی کوئی بات تم سے شیر نہیں

تلاش ختم ہو گئی ہے۔“ ہانیہ نے دانستہ اپنا لہجہ ہلکا پھلکا رکھا تھا۔

”ارے، آپ تو مائنڈ ہی کر گئیں۔ ورنہ آپ تو ہیلن آف ٹرائے ہیں۔ آج بھی آپ کے لیے سرحدوں پر جنگ شروع ہو سکتی ہے۔“ اس نے اپنی خارجہ پالیسی میں واضح تبدیلی کر کے ”مکھن پالیسی“ کا استعمال کیا تھا۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔

”باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔“ ان کا مزاج کچھ خوشگوار ہوا تھا۔

”یہ آپ کے گھر میں مہمانوں کو چائے، پانی پوچھنے کا کوئی رواج نہیں.....“ اسود نے گن اکھیوں سے شرزمہ کے سامنے پڑا چائے کا فلاسک دیکھا۔

”میری کتاب میں تو ایسی کوئی چیز درج نہیں، شرزمہ سے پوچھ لو، اگر وہ تمہارے لیے ہاتھ پیر ہلا سکتی ہو تو.....“ انہوں نے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔

”لیس، وہ تو مجھے ایڈ وولف ہٹلر کی بھانجی لگتی ہیں، آپ سے تو پھر بھی امید کی جاسکتی ہے لیکن وہ تو لگتا ہے کہ نظروں سے ہی الٹا لٹکا دیں گی.....“ اس کی بلند آواز میں کی جانے والی سرگوشی نے شرزمہ کو کوفت اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا کیا۔ اپنی ذات کو موضوع گفتگو بنانے سے اسے سخت چڑھی۔

”بھئی اب ہر کوئی ہانیہ مصطفیٰ کی طرح، زندہ دل، ہنس مکھ، مخلص، ذہین اور دوستانہ مزاج کا حامل تو نہیں ہو سکتا ناں.....“ انہوں نے اپنے فرضی کالر اوپر کیے تو وہ مسکرا دیا۔ ”اصل میں میرے ڈیڈی بہت زندہ دل انسان تھے۔ بلا کے پُر اعتماد اور ذہین، مٹی کو ہاتھ لگا کر سونا بنا دینے والے اور ہمارے سرکل کے لوگوں کا کہنا ہے کہ میں بالکل ان کا پُرتو ہوں۔“ ان کے چہرے پر پھیلنے والی ”خود پسندانہ“ سی مسکراہٹ اسود جیسے زیرک بندے کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ ”اپنا تو زندگی کا نظریہ ہے کہ ہر

لمحے کو انجوائے کیا جائے۔ پابندیاں، روک ٹوک، قواعد و ضوابط سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ میں اپنی زندگی کا نصاب خود مرتب کرنے کی قائل ہوں۔“ ان کی بات پر شرزمہ نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ جس پر ایک عجیب سا تاثر نمایاں تھا۔ اسی لمحے اس نے بھی اس کا چونکنا محسوس کیا جبکہ ہانیہ ان دونوں کے تاثرات سے بے خبر اپنی کامیابی کی داستانیں سنانے میں مگن تھیں۔

اس دن موسم بہت عجیب اور روکھا سا تھا۔ فضا میں عجیب سی اداسی اور وحشت رقص کر رہی تھی۔ وہ صبح سے کچھ ست سی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے اسے ہلکا ہلکا نمپر پچر بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ تھکاوٹ کی وجہ سے ہے۔ اس دن وہ یونیورسٹی سے سیدھی ایک پرائیویٹ کلینک چلی گئی۔ وہیں اسے ہا چلا کہ وہ ملیریا بخار کا شکار ہو چکی ہے۔ ادویات لے کر وہ باہر نکلی تو پچھتم سے آنے والی گرد آلود آمدنی کی وجہ سے اس کی آنکھیں اور گلا گرد سے بھر گیا تھا۔ طبیعت سخت مکدر ہوئی۔ وہ بہ مشکل گھر پہنچی تو ٹھیک حسب معمول کھلا ہوا تھا۔

”اوہ نو.....!“ اسے اچانک یاد آیا کہ اپنے پورشن کی چابیاں تو صبح وہ غلت میں ڈانٹنگ نیبل پر ہی بھول گئی تھیں۔ اس نے سخت مایوسی کے عالم میں مٹی کو فون کرنے کے لیے سیل نکالا تو پتا چلا کہ رات انجین میں فاروق انکل کو کی جانے والی کال کی وجہ سے بیلنس بھی ختم ہے اور اسے آج کیپس میں کارڈ لینا بھی یاد نہیں رہا۔

”یہ بھی ابھی ختم ہونا تھا.....“ اس نے سخت بیزاری اور کوفت سے سیل فون اپنے بیگ میں پھینکا تھا۔ اس کا حلق تک کڑوا ہو چکا تھا۔ آج واقعی اس کے ستارے گردش میں تھے۔ جسم بخار کی وجہ ٹوٹ رہا تھا اور سر میں گویا کوئی ہتھوڑا مار رہا تھا۔ اوپر سے

اسے دودن سے فلو کی بھی شکایت تھی۔ گرد آلود آمدنی کی وجہ سے باہر فضا میں اب بھی مٹی اور ریت کے ذرے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے چاروں طرف پھیلے درختوں کے پتوں اور بوگن ویلیا کے کاسنی پھولوں کو بڑی بیزاری سے دیکھا۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد وہ نچلے پورشن کی طرف بڑھی لیکن دروازے میں ہی وہ ٹھنک کر رہ گئی۔

کوئی اندر بڑی مہارت اور خوب صورتی کے ساتھ ستار بجار ہا تھا۔ سازوں کے ردھم سے بجانے والے کی مہارت کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ چاروں طرف پھیلی خاموشی میں فیض کی غزل کی دھن پوری نوت سے دل و دماغ پر اثر کر رہی تھی۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے؟ تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے وہ کچھ دیر تو بڑی محویت سے کھڑے ہو کر سنتی رہی لیکن طبیعت کی خرابی نے اسے زیادہ دیر کھڑے ہونے نہیں دیا۔ مجبوراً اس نے دروازے کی ڈور نیل پر ہاتھ رکھا۔ نیل کی آواز کے فوراً بعد ستار بجنا بند ہو گیا تھا ایسے لگا تھا کہ جیسے کوئی طلسم ٹوٹ گیا ہو۔

”السلام علیکم.....!“ اس نے اپنے سامنے کھڑے حیران سے پروفیسر صاحب کو دیکھ کر جھٹ سے سلام کیا۔ ”آئی ایم سوری میں اوپر والے پورشن کی چابیاں گھر میں ہی بھول گئی تھی، کیا میں آپ کے گھر سے مٹی کو کال کر سکتی ہوں۔“ اس نے نشو سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے فوراً مدعا بیان کیا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے.....؟“ پروفیسر صاحب اس کی سرخ آنکھیں اور پتے رخسار دیکھ کر چونکے تھے۔ سیاہ جینز پر سرخ شرٹ پہنے، گلے میں اسکارف ڈالے وہ کہیں سے بھی ٹھیک

گمشدہ جنت

نہیں لگ رہی تھی۔ حالانکہ بخار نے اس کی دلکشی کو اور بڑھا دیا تھا۔

”نہیں مجھے بخار ہے اور طبیعت ٹھیک نہیں۔“ آپ کے پاس اگر اوپر والے پورشن کی ایکسٹرا چابیاں ہوں تو پلیرز مجھے دے دیں۔“ وہ بہ مشکل کھڑی تھی۔

”اٹس اوکے، میں چیک کرتا ہوں، آپ پلیرز اندر آ جائیں، یوں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں۔“ انہوں نے سائیڈ پہ ہو کر اسے راستہ دیا جو کچھ تذبذب کا شکار لگ رہی تھی۔

”ڈونٹ ووری، آپ اندر آ جائیں، آج کل فضلہ کی والدہ بھی گاؤں سے آئی ہوئی ہیں، وہ کچن میں ہیں.....“ پروفیسر صاحب کا انداز بہت سادہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایک دم شرمندہ ہو گئی تھی۔ انہوں نے اس کی ہچکچاہٹ کو بھانپ کر ہی شاید یہ وضاحت دی تھی۔ وہ فوراً اندر آ گئی تھی اور سامنے نی وی لاؤنج کے صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھی تھی۔ اس کے ہر انداز سے نقاہت اور کمزوری عیاں تھی۔ وہ اسے بٹھا کر خود فوراً اندر اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئے تھے۔ شرزمہ نے صوفے کے پاس رکھے ستار کو بڑے اشتیاق سے دیکھا۔

”بیٹا طبیعت ٹھیک ہے آپ کی.....؟“ ایک بوڑھی سی خاتون سامنے امریکن طرز کے کچن میں سبز یوں کے ساتھ الجھی ہوئی تھیں اسے دیکھ کر لپک کر آ گئیں۔

”بس آنٹی جسم کچھ گرم سا ہو رہا ہے اور سردی لگ رہی ہے.....“ اس کی بات اندر آتے آفاق صاحب نے بہت دھیان سے سنی۔

”بوا آپ شرزمہ کو گیٹ روم میں لے جائیں.....“ انہوں نے فوراً ہدایت جاری کی تو اس نے حیرت سے انہیں دیکھا جو بتا رہے تھے۔ ”سوری شرزمہ، کوئی بھی ایکسٹرا کیز (keys) نہیں ہیں،

اگر ہیں بھی تو اسود کو پتا ہوگا۔ میں نے ابھی ہانیہ کو کال کی ہے وہ اسود کے ساتھ کسی بزنس میٹنگ میں مصروف ہیں اور ان کو آنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ اب مجبوری ہے آپ کو یہیں قیام کرنا ہوگا.....“ انہوں نے اس کے بخار کی حدت سے تپتے چہرے سے نظریں ہٹا کر یہ مشکل بتایا۔

”اوہ نو.....!“ اسے یہ بات سن کر سخت مایوسی ہوئی۔ سرکار دردتھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

”بوا، آپ گیسٹ روم میں فضلہ سے کہہ کر کمر کمر رکھوا دیں اور شرزمہ کے لیے کوئی سوپ وغیرہ بنائیں۔“

”نہیں، پروفیسر صاحب میں یہیں ٹی وی لاؤنج میں ٹھیک ہوں.....“ اس نے غلت میں ان کی بات کاٹ کر کہا تھا۔ وہ ہلکا سا چونکے اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اصل میں میری طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے اور وہاں اکیلے، میں ڈسٹرب رہوں گی، یہاں کم از کم..... سامنے چکن میں بوا تو ہوں گی ناں.....“ اس نے بوکھلا کر وضاحت دی اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ اس کے لیے بیٹھنا سخت دشوار ہو رہا تھا۔ اوپر سے وہ گیسٹ روم میں اکیلے کسی صورت بھی نہیں لیٹنا چاہتی تھی اس لیے دو ٹوک انداز میں انکار کر دیا تھا۔ اگلے بندے کو بھی شاید اس سے اسی بات کی توقع تھی اس لیے اس نے کوئی بحث نہیں کی۔

”یہ بھی ٹھیک ہے، چلیں فضل دین آپ اسٹور سے ایک کمبل یہیں لا دیں..... اور بوا سوپ بعد میں بنائیے گا، پہلے ایک کپ چائے بنا دیں شرزمہ کو.....“ انہوں نے ایک دفعہ پھر ہدایات جاری کیں اور اس دفعہ وہ بالکل خاموش رہی۔ اسے ہانیہ پر سخت غصہ آ رہا تھا جو اس کی خرابی طبیعت کا سن کر بھی اپنی میٹنگ جاری رکھے ہوئے تھیں۔

”یہ میڈیسن بھی ساتھ لیں اور خاموشی سے

اچھے بچوں کی طرح یہ چائے کے ساتھ بوا بھی لیں.....“ پندرہ بیس منٹ بعد ان کی آواز پر اس نے بے مشکل آنکھیں کھولیں اور اوڑھے گھٹن سر کے نیچے رکھے پتا نہیں کب کب کا شکار ہوئی۔ اس نے سرخ، متورم آنکھوں سے اپنے سامنے کھڑے مہربان سے شخص کو دیکھا۔ اس کے انگ انگ سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔ انہوں نے کچھ فاصلے پر بوا کو بھی دیکھا تھا۔ بوا کی مدد سے اس نے اٹھ کر میڈیسن اور بسکٹس اور بوائٹڈ ایگ کے ساتھ چائے کی اسے کچھ توانائی کا احساس ہوا تھا۔

اس نے اب غور سے اپنے سامنے صوفے بیٹھے کتاب پڑھتے پروفیسر صاحب کو دیکھا جن کا ڈریسنگ سینس کمال کا تھا۔ ان کے لباس، گفتگو، مزاج میں ایک محسوس کی جانے والی نفاست تھی۔ ان کی شخصیت میں خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ بڑی سادہ ساختہ سی بے نیازی جھلکتی تھی۔ ان تمام چیزوں کے امتزاج نے ان کی شخصیت کو ایک خاص قسم کا وقار عطا کیا تھا۔ اسے پہلی دفعہ ہانیہ کی بات کا یقین آیا تھا وہ ایسے ہی نہیں ان سے متاثر ہوئی تھی۔

”کیا ہوا شرزمہ؟ اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہیں.....؟“ انہوں نے بڑے شائستہ انداز میں زیر لب مسکرا کر کہا تھا لیکن اس پر تو گھڑوں پانی گیا تھا۔

”آئی ایم سوری، میں وال کلاک پر ناٹم دیکھ رہی تھی کہ ہنی کب تک آئیں گی.....“ اس نے بوکھلا کر پھر ایک اور غلط بات کر دی تھی۔

”دیکھیں شرزمہ، زندگی میں ایک اصول لیں اور اسے ذہن نشین کر لیں کہ جن لوگوں کو جھوٹ بولنا نہ آتا ہو، انہیں ایسی کوئی کوشش کرنی بھی نہیں چاہیے، اب سامنے ہر کوئی میرے جیسا بامروت بندہ تو نہیں ہو سکتا ناں جو فوراً منہ پھاڑ کر کہہ دے کہ ال

کلاک میری پچھلی سائڈ کی دیوار پر نہیں، آپ کی بک سائڈ پر لگا ہوا ہے۔“ وہ کچھ شرمندہ انداز میں ہنس دی۔

”خیر اب آپ ایسے بھی کوئی بامروت نہیں، جتنا خود کو بنا کر پیش کر رہے ہیں.....“ اس کی طبیعت قدرے کچھ سنہیل گئی تھی اس لیے اس نے بھی ترکی بہ ترکی کہا تھا۔

”آپ تو بہت ظالم لڑکی ہیں، پچھلے چالیس منٹ سے میں صوفے پر ایک ہی پوزیشن پر بیٹھا ہوں..... اور صرف اس لیے اٹھ کر نہیں جا رہا کہ کہیں آپ کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے لیکن آپ نے تو شاید دل رکھنے کا کوئی ہنر سیکھا ہی نہیں۔“ ان کے شائستہ سے انداز میں ایک ہلکا سا گلہ جھلکا تھا۔

”آئی ایم سوری، میں واقعی مذاق کر رہی تھی، بیوی.....“ اس نے مدھم آواز میں صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔

”آپ تو مذاق بھی اتنے جان لیوا سنجیدہ انداز سے کرتی ہیں کہ بندہ بوکھلا کر رہ جاتا ہے۔“ وہ ہلکا سا مسکرائے۔ ”یہ بتائیں کہ اسٹڈی کے علاوہ کیا شغل ہیں آپ کے؟“

”کچھ خاص نہیں، بس کتابیں ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ وہ ہی میری بیسٹ فرینڈ ہیں۔ انہی کے ساتھ مصروف رہتی ہوں۔“ اس نے ان کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ وہ اس کی بات پر چونکے۔

”اٹس گڈ شرزمہ.....!“ انہوں نے توصیفی لہجے میں کہا۔ ”ویسے کس قسم کی کتابیں آپ کو پسند ہیں.....؟“ ان کا انداز سرسری سا تھا۔

”ہر طرح کا فکشن مجھے پسند ہے اور اس کے لیے میں نے مختلف زبانیں بھی سیکھی ہیں کیونکہ فکشن کو اس کی زبان میں ہی پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ یہ

گمشدہ جنت

نے پہلی دفعہ تفصیل سے جواب دیا تھا۔ کچھ دیر بعد فضلہ گرما گرم سوپ لے آیا۔

”اب اچھے بچوں کی طرح آپ کو اسے فوراً ختم کرنا ہے۔“ وہ اسے بالکل بچوں کی طرح ٹریٹ کر رہے تھے۔ اس کا اندازہ شرزمہ کو ابھی ابھی ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ سے سوپ کا باؤل پکڑتے ہی وہ بری طرح چونکی۔ انہوں نے ایک لمحے میں اس کے چہرے پر پچھلی مایوسی کو پڑھا تھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں، بس تھوڑا سا ڈال دیں، اصل میں مجھے چکن کارن سوپ اچھا نہیں لگتا.....“

”اوہ.....“ اب کہ انہیں جھٹکا لگا۔ ”سوری مجھے پتا نہیں تھا.....“ انہوں نے شرمندگی سے وضاحت دی۔

”اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں، مجھے بتا دینا چاہیے تھا.....“ شرزمہ کی شرمندگی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

”اٹس او کے شرزمہ کیا ہو گیا ہے؟ ہم اور بنوا لیتے ہیں.....“ انہوں نے سنجیدگی سے اس کا خفت زدہ چہرہ دیکھا۔ وہ بالکل ایک چھوٹی سی بچی کی طرح جھینپی ہوئی لگ رہی تھی۔

”نہیں، نہیں، آپ بس مجھے بغیر شوگر کے ایک اچھی سی چائے بنوا دیں.....“ اس نے اپنی خفت کو کم کرنے کے لیے فوراً فرمائش کی۔

”بغیر شوگر کے کیوں.....؟“ وہ بری طرح سے چونکے۔

”مجھے چائے میں چینی اچھی نہیں لگتی، ہاں میٹھا میں شوق سے کھاتی ہوں.....“ شرزمہ کی بات پر انہیں ایک دفعہ پھر جھٹکا لگا۔ وہ سخت حیرت، بے یقینی اور تعجب سے اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے جس کی آنکھوں میں روشنیوں کے سوتے سے پھوٹ رہے تھے۔ ان کی نظروں کے ارتکاز اور مسلسل خاموشی سے اسے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

”کیا ہوا پروفیسر صاحب.....؟“ اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا تھا۔ اس کی بات پر وہ تھوڑا سا سنبھلے اور سانسوں کے ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے قدرے سکون سے گویا ہوئے۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ زندگی سے بڑھ کر حیران کن اور عجیب عجوبہ بھی کوئی اور ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو لوگ مٹی کا ڈھیر بن جائیں، ان کی عادتیں چلتے پھرتے لوگوں میں جھلکنے لگیں اور اس قدر جھلکیں کہ اسی شخص کا گمان ہونے لگے۔“ ان کا دماغ ماؤف ہوا اور بے شمار سوچوں اور خیالات نے ذہن میں ایک بھونچال سا برپا کر دیا۔ وہ سخت انتشار کا شکار لگ رہے تھے۔ شرزمہ نے انہیں تھکن بھرے انداز سے اٹھتے دیکھا۔

”آئی ایم سوری شرزمہ میری طبیعت کچھ بہتر نہیں، میں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکوں گا، میں بوا کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔“ اپنی بات کہہ کر وہ رکے نہیں اور ہوا کے جھونکے کی طرح فوراً کمرے سے نکل گئے جبکہ وہ حیرانی سے انہیں کمرے سے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

”اوہ مائی گاڈ! اٹس امیزنگ، ٹولی اینڈ وٹر فل.....“ ٹی وی لاؤنج کی سیڑھیوں کے نیچے رکھے خوب صورت پیانو پر ابھی ابھی شرزمہ کی نگاہ پڑی۔ اس کے چہرے پر پھیلے حیرت اور دلچسپی کے رنگ اسود کے لیے بہت انوکھے تھے۔ وہ جوتنی کے بے پناہ اصرار پر چکن شاکلک اور چکن میٹ بالز کی ڈشز نیچے دینے آئی تھی، پیانو پر نظر پڑتے ہی فوراً ٹرے ڈاننگ ٹیبل پر رکھی اور لپک کر پیانو کے پاس پہنچی۔

”یہ کس کا ہے.....؟“ وہ اب گھوم گھوم کر اس کا انتہائی پر شوق انداز سے جائزہ لینے میں لگن بھی جبکہ وہ اتنی ہی محویت سے اس کے چہرے پر پھیلنے والی

فطری خوشی کا عکس پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا۔

”یہ پروفیسر صاحب کا ہے، ایسے مجھے ہی انورڈ کر سکتے ہیں بابا.....“ وہ اپیرن باندھنے سے ٹکرا اور بے خیالی میں سالن والا کچھ بھی ہاتھ اٹھا لیا۔

”یہ حقیقت میں بہت فنانسٹک ہے۔ کیا اسے چلا کر دیکھ لوں.....؟“ اس کی آنکھوں میں اس قدر التجا اور معصومیت تھی کہ اسود کے لیے اس کے چہرے سے نظر ہٹانا انتہائی مشکل کام تھا جو اس کے مشکل سے ہی انجام دیا۔

”آف کورس.....!“ وہ سنبھل کر گویا ہوا۔ وہ پیانو کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھی تو اسود کو چہرے رکھے چاولوں کا خیال آیا تو اس کا دماغ بھک کر کے گیا۔ وہ آج صبح سے ایک فرائیڈ رائس بنانے کے لیے بے حال تھا۔ اس نے فوراً جا کر ابلے چاول چھلنی میں ڈال کر ٹھنڈے پانی کے نیچے رکھا۔

وہ بہت مہارت اور تیزی کے ساتھ پیانو کی پر کسی فرانسیسی سوئنگ کی ڈھن بجا رہی تھی۔ اس کی انگلیوں کی جنبش اور روانی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کام وہ پہلی دفعہ نہیں کر رہی۔ کمرے میں دھنسنے میں بچتے میوزک کی آواز سن کر اندر آتے پروفیسر آفاق ٹھٹکے۔ شرزمہ کی پشت ان کی جانب تھی اس کی کمر پر کسی آبشار کی طرح گرتے سلکی بالوں کو انہیں نے بڑی توصیفی نظروں سے دیکھا تھا۔ اپنی باری والے واقعے کے بعد وہ بلا جھجک کبھی بکھار نیچے آگئی تھی۔ وہ ٹی وی لاؤنج کے بالکل درمیان میں کھڑے تھے کہ اچانک اسود کی نظر ان پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا انڈیا چھل کر دیکھی میں گرا۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اسے معلوم

تھا کہ وہ اس پیانو کے بارے میں کتنے حساس ہیں۔ ”آپ کی متحرک انگلیوں کی حرکت بتا رہی ہے کہ آپ نے باقاعدہ پیانو چلانے کی تربیت لے لی

ہے.....“ وہ اس کے سر پر پہنچ کر اچانک بولے تھے۔ ان کی آواز پر وہ بری طرح چونکی اور اس کی انگلیاں اسی پوزیشن میں ساکت ہو گئیں۔

”اوہ.....! آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا.....“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کھلکھلا کر ہنسی۔ کمرے میں موجود دونوں نفوس کو لگا جیسے کسی مندر میں بہت سی سُریلی گھنٹیاں ایک ساتھ بج اٹھی ہوں جبکہ اس کے دانت موتیوں کی لڑی کی صورت ان کے سامنے تھے۔ ان دونوں نے ہی اتفاق سے اس کی ہنسی کا جھرتا پہلی دفعہ سنا اور دیکھا تھا۔

”مجھے میوزک سے عشق ہے اور پیانو اور ستار میرے پسندیدہ انسٹرومنٹس ہیں۔ پایا نے مجھے ایک بہت خوب صورت پیانو جرمینی سے منگوا کر دیا تھا جو ہمارے بارسلونا والے گھر میں اب بھی موجود ہے۔ میں نے اپنے اسکول میں اس کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔“ وہ بڑے دلکش انداز سے مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔

”اوہ اٹس ریٹلی ٹائس.....!“ پروفیسر صاحب بھی کھل کر مسکرائے اور انہیں مسکراتا دیکھ کر اسود کے سینے میں انکی سانس بحال ہوئی۔

”اوہ..... مجھے یاد آیا کہ اسود نے بتایا تھا کہ یہ پیانو آپ کا ہے، سوری میں نے آپ کی اجازت کے بغیر اسے استعمال کر لیا، اصل میں، میں، بہت ایکسائٹڈ ہو گئی تھی۔“ اسے اچانک یاد آیا تو فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی اس وضاحت سے اسود کے چہرے کے پھیکے رنگوں میں بڑی سرعت سے تبدیلی آئی۔

”کم آن شرزمہ..... کیا ہو گیا ہے آپ کو.....؟ اتنا فارمل ہونے کی ضرورت نہیں، آپ کا جب دل چاہے، آپ اسے استعمال کر سکتی ہیں۔“ پروفیسر صاحب کی اس حیرت انگیز بات پر اسود کے ہاتھ سے جھج جھج گرتے گرتے بچا۔ اس نے بہت غور

گمشدہ جنت

سے گرے شرٹ پر میروں ٹانگی لگائے بڑی جان لیوا مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے پروفیسر صاحب کو دیکھا تھا۔ اس کے لیے یہ بات اور ان کی مسکراہٹ دونوں ہی حیران کن چیزیں تھیں۔

”اوہ..... ریٹلی، اٹس امیزنگ.....!“ اس کی دلکش مسکراہٹ میں ممنونیت کے رنگ بھی شامل ہوئے تھے جبکہ پروفیسر صاحب اپنی بات مکمل کر کے رکے نہیں تھے اور اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئے۔

”یہ اس صدی کی انتہائی حیران کن خبر ہے شرزمہ۔“ اسود کی بات پر اس نے چونک کر اپنے سامنے اپیرن باندھے اسود کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر حیرت، تعجب اور بے یقینی کے سارے ہی رنگ موجود تھے۔

”کون سی خبر.....؟“ وہ چونکی۔ ”یہی کہ پروفیسر صاحب نے اپنے پیانو کو نہ صرف ہاتھ لگانے بلکہ استعمال کرنے کی بھی اجازت دے دی.....“ وہ ابھی تک تحیر کے عالم میں مسلسل اپنا سرنفی میں ہلا رہا تھا۔

”کیا مطلب.....؟“ اس نے اپنی چھوٹی سی تیکھی ناک چڑھا کر اسے دیکھا۔

”بھئی اس معاملے میں وہ بہت بے مروت اور ظالم واقع ہوئے ہیں۔ مجال ہے کہ اس پیانو کو ایک انگلی لگانے کی بھی اجازت دے دیں۔ میرا چھوٹا بھائی پچھلے سال پاکستان آیا ہوا تھا اور اس نے پروفیسر صاحب کی اجازت کے بغیر اس پیانو کو استعمال کر لیا۔ مت پوچھیں کیسا سونامی جیسا طوفان آیا تھا۔ وہ بے چارہ تو اتنا ڈر گیا کہ دوبارہ پاکستان میں بھی قدم نہیں رکھا۔“ اسود کی بات پر شرزمہ کو بالکل بھی یقین نہیں آیا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟“ ”محترمہ یہ ہو چکا ہے۔“ اس کی بڑبڑاہٹ پر اسود نے فوراً کہا۔

”میرے خیال میں اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے.....“ شرزمہ نے کندھے اچکا کر تعجب کا گہرا اظہار کیا تو اسود مسکرا دیا۔

”بس وہ اپنی کچھ چیزوں کے معاملے میں بہت حساس اور شدت پسند ہیں اور انہیں کسی کے ساتھ بھی شہیر کرنا پسند نہیں کرتے.....“ اسود باتیں کرتا کرتا اب یکن کی طرف آگیا۔ پورے کمرے میں دم کیے چاولوں کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ وہ اب اپنا اپیرن اتار رہا تھا۔

”مجھے ہرگز بھی اندازہ نہیں تھا کہ پروفیسر صاحب کو اپنی چیزوں کا استعمال کیے جانا پسند نہیں، ورنہ میں ہرگز اسے ہاتھ نہ لگاتی۔“ شرزمہ کی سوئی ابھی تک وہیں انکی ہوئی تھی۔

”اوہو.....! اس میں ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں، انہیں اگر برا لگتا تو فوراً ہی آپ کو منع کر دیتے کیونکہ وہ ضرورت سے زیادہ صاف گو واقع ہوئے ہیں.....“ اسود نے اسے تسلی دیتے ہوئے اس کا پریشان چہرہ غور سے دیکھا وہ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی لیکن اس کے چہرے پر پھیلی شرمندگی اسود کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی۔

”ایک بات کہوں.....؟“ اسود کے چہرے پر تذبذب تھا جو شرزمہ کو فوراً محسوس ہوا۔

”جی..... ضرور۔“ وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

”آپ پروفیسر صاحب کی تمام چیزیں بے دھڑک استعمال کر سکتی ہیں۔ آپ کو وہ کافی مارجن دے سکتے ہیں کیونکہ.....“ اس کی ادھوری بات میں چھپے ہزاروں معنی وہ سمجھنے سے قاصر تھی اس نے اسی لیے الجھ کر اسود کو دیکھا جو خاصی سنجیدگی سے دیکھی کا ڈھکن اٹھا کر چاولوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

”وہ مجھے کیوں مارجن دے گے بھلا؟“ اس کے انداز میں ہلکی سی الجھن بھری خفگی جھلکی۔

”یہ بھی آپ کو بہت جلد پتا چل جائے گا۔“ وہ

بڑے پراسرار انداز سے مسکرایا تو شرزمہ بری طرح جھنجھلا گئی۔

”کب پتا چلے گا؟“

”جب پروفیسر صاحب پر قنوطیت کا عظیم دورہ پڑے گا اور عموماً ایسا بہار کے موسم میں ہوتا ہے جب پھولوں کے ساتھ ساتھ ان کے دل کے زخم بھی ہرے ہونے لگتے ہیں۔“ اس کے انداز میں شوخی اور شرارت محسوس کر کے شرزمہ کو ایک دم ہی غصہ آیا۔ اسے اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں بتائے گا بلکہ اسے الٹا الجھائے گا ہی، اسی سوچ نے اس کے اندر موجود غصے کو ہوا دی۔

”بھاڑ میں جائیں آپ اور آپ کے پروفیسر صاحب.....“ وہ ایک دم ہی جل کر بولی تھی۔ اپنی بات کہہ کر وہ واپسی کے لیے مڑی تو اسے سوواٹ کا جھٹکا لگا۔ اس کے بالکل سامنے پروفیسر صاحب کھڑے اسے بہت عجیب سے انداز سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے گہرا کرپلٹ کر اسود کو دیکھا جس کا فق چہرہ دیکھی سے نکلنے والی بھاپ میں دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔

”ویسے ایک بات تو آپ لکھ لیں ابراہیم صاحب، آپ کی والدہ محترمہ سے بڑا ڈراما کوئی نہیں ہو سکتا.....“ الماس بیگم ایک جھٹکے سے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے شعلہ فشاں نظروں سے ابراہیم صاحب کو دیکھا۔ جو طبیعت کی خرابی کی وجہ سے آج گھر پر تھے اور لیپ ٹاپ پر کچھ کام بننا رہے تھے۔ انہوں نے سامنے کھڑی اپنی بیوی کو دیکھا جو کمر پر ہاتھ رکھے بالکل کسی جھگڑالو خاتون کی طرح انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”کیوں، اب کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے اپنے اندر سے اٹھتی ناگواری کی لہر کو بڑی مشکل سے دبا کر محل سے پوچھا۔

”میں نے ان سے پوچھا کہ احتشام کس لیے پاکستان آ رہا ہے تو سرے سے ہی مکر گئیں کہ انہیں انہی کوئی اطلاع ہی نہیں، اب بندہ پوچھے کہ لمحے لمحے کی رپورٹنگ ادھر کی ادھر جاتی ہے اور وہ اگلے بندے کو بے وقوف سمجھتی ہیں جیسے ہماری عقل گھاس چرنے لگی ہوئی ہو.....“ ناراضی ان کے انگ انگ سے مترشح تھی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا سیل فون بیڈ پر پھینکا اور خود سامنے صوفہ کم بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

”ساری زندگی ان ماں بیٹیوں نے دوسروں کو ہمیشہ پاگل ہی تو سمجھا ہے، پہلے دو تھیں پھر ان کے ساتھ وہ عطیہ بیگم بھی شامل ہو گئیں۔ شکل سے جتنی معصوم لگتی ہے اندر سے اتنی ہی گھٹی اور ایک نمبر کی چاپلوس عورت ہے یہ عطیہ.....“ انہیں سبھی سے ہی گلہ تھا۔ ابراہیم صاحب نے اپنے سینے میں دبی سانس کو خارج کیا۔

”اماں کو واقعی شامی کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں، شفق آپا نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے اماں کو سر پرانز دینا ہے اور جہاں تک بات عطیہ کی ہے تو وہ تو آپ کی ہزار باتوں کے جواب میں بھی خاموش رہتی ہیں۔“ انہوں نے بڑے بڑے نپے نپے انداز سے انہیں اصل حقیقت بتائی۔

”لو یہ سر پرانز والے ڈرامے بھی خوب رہے، پہلے زندگی میں کم ڈرون حملے ہوئے ہیں جو آپ سر پرانز کے نام سے ہم پھوڑے جا رہے ہیں۔“ وہ اور زیادہ مشتعل ہوئیں۔

”آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے الماس.....؟“ انہوں نے ایک سرد نگاہ اپنی بیگم پر ڈال کر بڑے محل سے لیپ ٹاپ بند کیا۔

”مسئلہ میرے ساتھ نہیں، آپ کے خاندان کے ساتھ ہے۔ جس نے پہلے دن سے سوچ رکھا ہے کہ میرا دامغ خراب کرنے والا ہر کام کرتا ہے۔ غضب خدا کا، میں پڑھی لکھی بیسیویں گریڈ کی

گورنمنٹ ملازم، جس کے ساتھ یہ لوگ درجہ چہارم کے ملازم جیسا سلوک کرتے ہیں۔“ وہ ہر چہیں چبار ہی تھیں۔

”انتہائی معذرت کے ساتھ الماس بیگم، آپ کہیں سے بھی بیسیویں گریڈ کی آفیسر نہیں لگتیں۔“ ان کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا.....؟“ وہ تڑخ کر بولیں۔

”آپ کی حرکات اور اکثر باتیں اخلاقیات کے نچلے درجے سے بھی کم تر ہوتی ہیں۔“ انہوں نے طنزیہ ہنکارا بھر کر الماس بیگم کا لال چہرہ دیکھا۔

”جی بجا فرمایا آپ نے، آپ کے خاندان میں شامل ہونے کے بعد سے مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ اتنے جاہلوں کے درمیان ایک پڑھا لکھا بندہ کیا کرے گا۔“ وہ بھڑک اٹھی تھیں۔

”بعض لوگوں پر ڈگریاں بھی کوئی اثر نہیں ڈالتیں۔ وہ جب بھی گفتگو کرنے کے لیے اپنا منہ کھولتے ہیں، ان کا سارا علم، ثقافت اور ڈگریاں شرمندگی سے منہ چھپا کر ایک طرف ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگوں کے اندر جہالت کی تاریکی کبھی ختم نہیں ہوتی، چاہے وہ ساری زندگی بڑی بڑی جامعات کی شمع کے نیچے ہی کیوں نہ گزار دیں۔“ ابراہیم صاحب کے ضبط کا پیمانہ بری طرح چھلکا تھا۔ ان کے ایسے انداز الماس بیگم نے کب دیکھے تھے۔ وہ تیر کی طرح اٹھیں، غضب ناک نظروں سے سامنے لیپ ٹاپ پر مصروف اپنے مجازی خدا کو دیکھا اور کمرے سے نکلتے ہوئے انہوں نے پوری قوت سے دروازہ بند کیا کہ ایک لمحے کو تو پورے کمرے کی دیواریں ہل گئیں۔

”الماس آپنی کیا ہوا.....؟“ رومیصہ جو دھڑام سے دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر بوکھلا کر کچن سے نکلی تھیں ان کے ہاتھ آٹے میں لتھڑے ہوئے تھے۔

صرف تین بیٹیاں جویریہ، عمیرہ اور نورہ تھیں۔ ان سے چھوٹے فہیم صاحب کے دو بیٹے احمد اور ارسلان اور سب سے چھوٹے رضا کی ایک بیٹی انعم تھی جبکہ احسان صاحب کی ایک بیٹی شفق تھی جو سب بھائیوں سے بڑی تھیں اور شروع سے امریکا میں اپنے شوہر اور تین بچوں احتشام، فرزام اور حرا کے ساتھ مقیم تھیں۔ حرا کی شادی فہیم صاحب کے بڑے بیٹے احمد کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ارجمندولا میں ہی رہ رہی تھی جبکہ سب سے بڑے ابراہیم صاحب کی بیگم الماس کی چھوٹی بہن رومیہ کی شادی ان کے سب سے چھوٹے بھائی رضا کے ساتھ ہوئی تھی جو ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔

”ویسے آپس کی بات ہے مہنی کہ اس قدر خوب صورت اور اسٹائلش سی خاتون کو کیا ابھی تک کسی نے پروپوز نہیں کیا.....؟“ اسود کے لہجے میں شرارت، تجسس اور شوخی کا عنصر غالب تھا۔ ڈائمنگ نیبل پرسلاد کے پھول بناتی شرزمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ سامنے ٹی وی لائونج کے کارپٹ پر فلورکشن پر براجمان اسود اور اس کے بالمقابل صوفے سے ٹیک لگائے مہنی نہ جانے کس حساب کتاب میں مگن تھیں۔ ان کا مزاج خاصا خوشگوار تھا۔ وہ دونوں اتوار کی وجہ سے آج گھر میں ہی کوئی پرانے کھاتے کھولے بیٹھے تھے۔

”اب ایک آدھ بندے نے پروپوز کیا ہو تو بندے کو کچھ یاد بھی رہے، ادھر تو کافی لمبی فہرست ہے.....“ غرور و فخر کی لہریں جتنی سرعت سے مہنی کے چہرے پر پھیلی تھیں اس سے زیادہ رفتار سے ان کے لہجے سے پھلکی تھیں

”آف کتنے لوگوں کا قتل عام کر چکی ہیں آپ؟“ وہ مصنوعی صدے سے بولا تھا۔

”ڈھیر لگ چکا ہے یار پروانوں کا، کوئی شمار ہی

جرات ہے کہ آپ کو کچھ کہہ سکے۔“ ان کے خوشامدانہ لہجے نے فوری اثر کیا تھا الماس بیگم کے منہ ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔

”ویسے بھی اگلے ہفتے سے آپ کے کالج میں یونین ویک شروع ہو جائے گا اور آپ تو وہاں بڑی ہو جائیں گی جبکہ مجھے انعم کو لے کر لاہور ڈاکٹر کے پاس جانا ہے اور نورہ کا تو ویسے ہی کالج کا لانگ ٹرپ جارہا ہے۔ کوئی بھی نچلے پورشن میں نہیں ہوگا اور میرا نہیں خیال کہ شامی دس بارہ دن سے زیادہ یہاں مکے گا۔“ ان کی بات پر الماس بیگم کی متحیر رنگت بحال ہوئی۔

”تھینک یو رومی، اس گھر میں مجھے تمہارا ہی تو آسرا ہے۔ تم نہ ہو تو یہ سارے لوگ مل کر مجھے پاگل کر دیں۔“ انہوں نے مشکور نظروں سے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا جو اتنی چھوٹی عمر میں بیوگی بڑے پروقار انداز سے کاٹ رہی تھیں ان کی اٹھارہ سال کی ایک بیٹی تھی جو مختلف قسم کے ذہنی امراض کا شکار تھی اس نے بہ مشکل ایف اے کیا تھا اور وہ سارا سارا دن خود کو کمرے میں بند رکھتی تھی۔ اپنی اکلوتی بیٹی کی یہ حالت رومیہ کو دن رات اذیت میں رکھتی تھی۔

”لاہور کیسے جاؤ گی.....؟“ انہیں اچانک یاد آیا۔

”ابراہیم بھائی کی کوئی میٹنگ ہے انہوں نے کہا ہے کہ وہ مجھے صباحت کی طرف چھوڑ دیں گے.....“ انہوں نے اپنی خالہ زاد بہن کا بتایا جو لاہور میں مقیم تھیں اور کسی اسپتال میں گائناکالوجسٹ تھیں۔ رومیہ اپنی بیٹی کے علاج کے سلسلے میں ہمیشہ انہی کے گھر میں قیام کرتی تھیں۔ ان کی بات پر الماس بیگم نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

ارجمندولا میں احسان صاحب کے تین بیٹے اور ان کی اولادیں شروع سے اکٹھے رہ رہی تھیں۔ بھائیوں میں سب سے بڑے ابراہیم صاحب جن کی

ریلینگ سے جھانک کر سارے تماشے سے لگے اندوز ہو رہی تھی۔

”کیا ہوا ماما، کیا آج پھر پاپا نے آپ کی ٹیوننگ کر دی.....؟“ اس نے وہیں کھڑے کمرے ہی میں کوجھیرا۔

”شٹ اپ نورہ.....! بی بیو یو سیلف.....“ وہ اوپر کومنہ کر کے چیخیں جبکہ ان کے اس انداز پر نورہ منہ کھول کر بے پروائی سے ہنس رہی تھی۔ رومیہ نے خوفزدہ نظروں سے اپنی بہن اور بھانجی کو دیکھا تھا جو عادتاً اور شکل ایک دوسرے کا پرتوتھیں۔ وہ تو شکر تھا کہ نورہ نے آگے سے پلٹ کر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”فارگا ڈسک آئی..... کیوں ٹینس ہو رہی ہیں آپ، ادھر آئیں اور سکون سے بیٹھیں.....“ رومی خالہ نے انہیں بازو سے پکڑ کر بٹھانا چاہا تو نورہ نے اپنے آٹے میں لتھڑے ہاتھوں کا خیال آیا تو ڈائمنگ روم میں لگے واش بیسن سے ہاتھ دھو کر آئیں۔

”مجھے علم ہے کہ آپ کو شامی کے آنے کی ٹینشن ہے۔ کیوں اس چیز کو اپنے ذہن پر سوار کر رہی ہیں.....“ انہوں نے تو لیے سے ہاتھ صاف کر کے بڑی ہمدردی سے بہن کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا جو ٹی وی لائونج کے صوفے پر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھی ہوئی تھیں۔

”کیوں ٹینشن نہ لوں، مجھے پتا ہے کہ اس کے آنے سے اماں صاحبہ اور ان کی لاڈلی بہو صبح شام پرانے کھاتے کھول کر بیٹھ جایا کریں گی۔“ وہ سخت بدگمان تھیں۔

”آئی یہ سب آپ کے خود ساختہ مسائل ہیں۔ کوئی بھی ایسا نہیں کرے گا۔ شفق آپا نے دوبارہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی عطیہ بھابی اور اماں نے کوئی ذکر کیا اور ویسے بھی آپ کی وہ سب لوگ آپ سے دب کر رہتے ہیں۔ کس میں اتنی

انہوں نے سخت حیرت سے اپنی بڑی بہن کا غضب ناک چہرہ دیکھا تھا۔ جو فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر پانی گلاس میں انڈیل رہی تھیں۔

”کچھ نہیں، دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارے ابراہیم بھائی کا، آج کل جو اوپر دربار میں صبح شام حاضری دے رہے ہیں اور تعویذوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں، ان کا اثر دکھا رہے ہیں۔ لیکن میں بھی الماس بیگم ہوں سارے ڈھیلے پڑے کس دوں گی ذرا کچھ وقت گزرنے دو.....“ وہ اب ایک ہی سانس میں سارا پانی حلق سے اتار گئی تھیں۔ سرخ رنگ کے کاٹن کے سوٹ میں ان کی سرخ و سفید رنگت سے گویا سرخیاں چھلک رہی تھیں۔ وہ بے انتہا حسین خاتون تھیں۔ رومیہ نے بہ مشکل اپنی نظریں ان کے صاف شفاف چہرے سے ہٹائی تھیں۔

”کیوں اپنا دل جلا رہی ہیں دفع کریں اور جہاں تک ابراہیم بھائی کی بات ہے تو آپ کو پتا تو ہے کہ وہ آج کل خود بھی کتنے پریشان ہیں۔ اس لیے ان سے متنازعہ امور پر گفتگو کرنے سے گریز ہی کیا کریں.....“ انہوں نے خلوص دل سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی جو کافی مہنگی پڑی۔

”بھاڑ میں جائیں ابراہیم صاحب اور ان کا خاندان، ان کی پروا کرتی ہے میری جوتی، ایک، ایک کا دماغ سیٹ نہ کیا تو میرا نام بدل دینا۔“ منہ پر ہاتھ پھیر کر قسم کھاتیں الماس بیگم کہیں سے بھی کسی کالج کی پرنسپل نہیں لگ رہی تھیں۔ ”اور تم ان سب کی طرف داریاں کرنا چھوڑ دو، جس طرح سے بھگو بھگو کر انہوں نے تمہارے جوتے مارے ہیں، سارا خاندان جانتا ہے۔ بیٹھے بٹھائے تمہاری ساری زندگی برباد کر دی اس بڑھیا نے۔ اوپر سے تم بھاگ بھاگ کر ان کی خدمتیں کرنے پہنچ جاتی ہو۔ خبردار اگر کسی نے بھی اوپر قدم رکھا، میں ٹانگیں توڑ دوں گی۔“ آخری فقرہ انہوں نے نورہ کو دیکھ کر کہا تھا جو

درد و بیکراں

نگہت اعظمی



آج صبح سے عالیہ بیگم بہت بے چین تھیں۔ وہ پاکستان میں اپنے چھوٹے بیٹے حسن سے بات کرنا چاہ رہی تھیں اور صبح سے تین دفعہ فون ملوا چکی تھیں لیکن ان کی من سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ آج اس کی سالگرہ بھی اور حسن سے انہیں بہت ساری باتیں بھی کرنا تھیں۔

حسن ان کے چھ بچوں میں سب سے چھوٹا اور لاڈلا بڑا تھا وہ جب چار سال کا تھا تو عالیہ بیگم کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا جو ان کے چچا زاد بھی تھے اور انہیں شروع سے ہی بے حد پسند کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی ماں کی شدید ترین مخالفت کے باوجود ان سے شادی کی تھی..... اور شادی کے بعد ان کی محبت اور فرہنگی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ان دونوں کی محبت خاندان میں مثال بن گئی تھی۔ خدا نے انہیں مال اور اولاد سے بھی نوازا تھا۔ گھر میں دو دو گڑیاں تھیں۔ ہر بچے کی سالگرہ، عقیقے، بسم اللہ، روزہ کشائی غرض یہ کہ ہر چھوٹی بڑی تقریب بڑی شان و شوکت اور اہتمام سے منائی جاتی۔ وہ زندگی کے ہر رنگ سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہو رہی تھیں کہ ایک دم جیسے ان کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی یا پھر زندگی کا چلن ہی یہ ہے کہ جہاں خوشیوں کی شہنائیاں بجیں وہاں فوج و ماتم کی صدا میں بھی ضرور بلند ہوں۔

عالیہ بیگم کے شوہر کو اچانک حلق کا کینسر ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سال کے اندر ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی موت کے بعد وہ دنیا سے بالکل بیگانہ ہو گئیں۔ انہیں اپنا ہوش رہا نہ بچوں کا..... سارا وقت خاموش بیٹھی دیواریں تکتی رہتیں۔ کھانا سامنے رکھ دیا جاتا تو کھانا کھا لیتیں۔ ورنہ بھوک بیٹھی رہتیں۔ کئی کئی دن کپڑے نہیں بدلتیں..... کنگھی نہیں کرتیں..... بیٹیاں زبردستی کپڑے بدلواتیں تو چیخ، چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیتیں۔

ان کا بڑا بیٹا محسن اٹھارہ سال کا تھا۔ اس کے بعد چار بیٹیاں تھیں۔ سب سے چھوٹا حسن تھا۔ بیٹیوں میں بڑی دو خاصی سمجھدار تھیں جبکہ دونوں چھوٹی ساتویں اور پانچویں جماعتوں میں پڑھ رہی تھیں۔ بڑی دونوں بیٹیاں ماں کے ساتھ ساتھ بہن بھائیوں کو بھی سنبھال رہی تھیں۔

ہی بغیر سوچے سمجھے ایک عجیب سے موڑ میں داخل گئی تھی۔

”کیا واقعی.....؟“ اسود جی بھر کر حیران ہوا۔ ”کیوں، میں انسان نہیں ہوں کیا.....؟“

عجیب سے انداز میں مسکرائی تھیں ان کے چہرے پر ایک ناقابل فہم سا تاثر تھا۔ ”کون تھا وہ شخص.....؟“ اسود ہنوز سابقہ موڑ میں تھا لیکن اب ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”تھا ایک شخص، جو کسی اور سرشتی کا مسافر تھا.....“ مہنی کی بات پر شرزمہ کے ساتھ ساتھ اسود بھی جھٹکا لگا۔ دونوں نے ہی سراٹھا کر ان کا حد درجہ سنجیدہ انداز دیکھا۔ وہ کہیں سے بھی مذاق کے موڑ میں نہیں لگ رہی تھیں۔

ان کے چہرے پر ایسی وحشت تھی کہ شرزمہ کے ساتھ اسود کی نگاہ بھی صرف ایک پل کے لیے ٹپک سکی۔ دم گھوٹی سی خاموشی نے بڑی سرعت کے ساتھ کمرے کا احاطہ کیا تھا۔ اگلے چند لمحات شرزمہ کے ساتھ ساتھ اسود کے لیے بھی بڑے اعصاب شکن تھے۔ ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ شرزمہ نے ایک دفعہ پھر مہنی کا نارسائی کے دھویں میں لپٹا پھیکا اور زرد چہرہ دیکھا تھا۔ باوجود خود پر قابو پانے کے اسے اپنا دل پہلی دفعہ حقیقی معنوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ”یہ مہنی کا کون سا روپ ہے جس سے میں کبھی واقف نہیں تھی.....“ ایک ہی بات اس کے ذہن و دل پر تھوڑے کی طرح برس رہی تھی جبکہ مہنی کے بالکل سامنے بیٹھا اسود خود بھی تعجب کی انتہا پر تھا۔ اس قدر صاف گوئی کی اسے توقع ہی کہاں تھی۔

”پھر، کیا ہوا ہانیہ.....؟“ اسود نے اپنا حلق تر کرتے ہوئے بہ مشکل پوچھا تو وہ جبراً مسکرائیں جبکہ شرزمہ اب مہنی کو چھوڑ کر اسود کے دھواں دھواں چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

نہیں.....“ ہانیہ کی بے تکلفی شرزمہ کے لیے خاصی کوفت کا باعث بنی۔ اس نے کن انگلیوں سے دونوں کو دیکھا تھا جو بزنس کے معاملات پر بات کرتے کرتے پٹری سے اتر گئے تھے وہ دونوں ہی شوخ اور زندہ دل تھے۔

”کیوں ظلم کرتی ہیں آپ۔ کسی ایک آدھ کو گھاس ڈال ہی دیں اب آپ.....؟“ اسود نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے مفت مشورہ دیا۔ نیوی بلیو شرٹ اور آف وائٹ ٹراؤزر میں اس نے لگتا تھا کہ آج شیو بھی خوب دل لگا کر کی تھی۔ ”گھاس ڈال تو دوں لیکن کیا کروں کہ مجھے گدھے اچھے نہیں لگتے.....“ وہ خود بھی خاصی غیر سنجیدہ تھیں۔

”پھر میرے جیسا کوئی گھوڑا دیکھ لیں، گھوڑے تو گھاس نہیں کھاتے نا.....“ اس کی شوخی پر مہنی کا قہقہہ شرزمہ کا مزاج برہم کر گیا۔ اسے لڑکوں کے ساتھ اس طرح کی ذومعنی گفتگو سخت ناپسند تھی۔ اسے ہمیشہ سنجیدہ مزاج کے ڈینٹ لوگ اچھے لگتے تھے۔ ”گھوڑوں کی بھی کافی لمبی لائن ہے، کیا کیا جائے.....“ مہنی نے شان استغنا سے کندھے اچکائے۔

”ویسے آپس کی بات ہے کہ آپ کو کبھی کسی سے واقعی محبت نہیں ہوئی.....؟“ وہ شرارت سے تھوڑا اور جھک آیا۔

”ہوئی تھی.....“ مہنی کی بات پر شرزمہ کے ہاتھ میں پکڑا کھیرا گھبراہٹ سے نیچے گر اٹھا۔

”واقعی.....؟“ وہ خود بھی تعجب کا شکار ہوا۔

”ہاں نا.....“ ہانیہ نے سنجیدگی سے اس کا متحیر انداز دیکھا۔

وہ دونوں اسے اہمیت دیے بغیر ایک دوسرے میں گمن تھے۔ شرزمہ نے ہاتھ میں پکڑی چھری میز پر رکھ کر مہنی کا اداس چہرہ دیکھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات بڑی تیزی سے بدلے تھے۔ گفتگو اچانک

کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آتی۔“ ان کی بیٹی نمرہ انہیں تسلی دیتی۔

☆☆☆

”میں سوچ رہی ہوں نصرت سے بات کروں اس کی نند کی بیٹی بہت خوب صورت ہے۔ سلیقہ مند بھی ہے اور میڈیکل میں پڑھ رہی ہے بلکہ میرا خیال ہے اب تو پڑھ چکی ہوگی۔“ پھر ایک دن وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے نمرہ سے اپنی نند کی نند کی بیٹی کے بارے میں بات کی۔

”میں نے تو کئی سال پہلے دیکھا تھا تب تو بہت چھوٹی تھی۔ ویسے پچھو کے سرال والے تو سب ہی بہت خوب صورت ہیں اور پچھو ہمیشہ اپنی سرال والوں کے عادات، مزاج کی بھی بہت تعریف کرتی تھیں۔“ نمرہ نے بھی ماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔

انہوں نے بیٹی سے مشورہ کر کے اپنے باقی بچوں سے بھی بات کی کسی کو بھی اعتراض نہیں تھا تو انہوں نے دوسرے ہی دن نند کو فون کر دیا۔ وہ تو بہت ہی خوش ہوئیں۔ بھابی نے انہیں اتنی اہمیت دی اور پھر میکے سے اتنا اچھا رشتہ اور وہ بھی ان کی نند کی بیٹی کے لیے وہ تو سوچ، سوچ کر ہواؤں میں اڑ رہی تھیں پوری سرال میں واہ، واہ ہو جائے گی۔ نصرت کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ شوہر کے سامنے گردن اکڑائے اکڑائے چل رہی تھیں۔

”بھئی حمنہ کا تو نصیب ہی کھل گیا۔ حسن سے زیادہ اچھا رشتہ تو اسے مل ہی نہیں سکتا تھا۔ کتنا خوب صورت پڑھا لکھا، پیسے والا اور سب سے بڑی بات یہ کہ کس قدر خوش مزاج اور ہنس مکھ بھتیجا ہے میرا۔ جتنی دیر بیٹھا رہے گا سب کو ہنساتا رہے گا۔“ وہ ہر تھوڑی دیر بعد یہ جملہ کہتیں۔

”اس میں کیا شک ہے۔“ نصرت کے میاں چاہتے ہوئے بھی بیوی کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے کہ حسن انہیں بھی بہت پسند تھا۔

عالیہ بیگم چلنے کے قابل ہوئیں تو پاکستان جانے کی تیاریاں کرنے لگیں مگر ایک دن بلڈ پریشر اتنا شوٹ کر گیا کہ بے ہوش ہو گئیں۔ ایک آنکھ کی بینائی چلی گئی پھر ان کا جانا ملتوی ہو گیا۔ اسی طرح پورا سال گزر گیا۔ وہ کسی طرح سفر کے قابل ہی نہیں ہو پارہی تھیں اور جتنی دیر ہو

کروں گی جو خوب صورت بھی ہو، پڑھی لکھی بھی ہو، خوش اخلاق بھی ہو، خوش اطوار بھی ہو اور خوش گفتار بھی ہو۔“

”اور خوش خوراک بھی ہو۔۔۔۔۔“ حسن درمیان میں لقمہ دیتا تو عالیہ بیگم کے چہرے پر مسرتوں کے پھول کھل اٹھتے۔

☆☆☆

عالیہ بیگم کی تلاش جاری تھی کہ ان کی بڑی بیٹی جو کینیڈا میں رہتی تھی اس کی بیٹی کی شادی طے ہوگئی، انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی بھی بہت کم عمری میں کی تھی۔ اس نے بھی اپنی بیٹی کی شادی اٹھارہ سال کی عمر میں طے کر دی اور پھر فون پر شدید اصرار کہ امی ضرور آئیں۔ داماد بھی روز فون کرتے، نو اسی بھی ضد کرتی، خود ان کا بھی دل چاہ رہا تھا۔ وہ اپنی تلاش ادھوری چھوڑ کر کینیڈا روانہ ہو گئیں۔

حسن شادی اٹھارہ سال کے چند دن بعد واپس آ گیا جبکہ عالیہ بیگم کو بیٹی نے روک لیا اور ایک روز بیڈ روم سے واش روم جاتے ہوئے وہ ایسا گریں کہ کوٹھے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اس طرح کئی مہینے تو وہ بستر سے ہل بھی نہیں سکیں۔ ساری اولاد ماں کے لیے بے چین ہو گئی۔ بڑا بیٹا حسن اور بہو جو امریکا ہی میں رہتے تھے انہیں دیکھنے آئے اور پورا ہفتہ ان کے پاس رہ کر گئے۔ تیسرے نمبر کی بیٹی کے گھر بیٹا پیدا ہوا تھا۔ وہ ان سے ملنے تو نہ آ سکی لیکن روز فون کرتی، باقی دونوں بیٹیاں بھی اپنے، اپنے مسائل میں گرفتار تھیں۔ وہ بھی نہ آ سکیں لیکن وہ بھی روزانہ دو تین مرتبہ فون کرتیں۔

عالیہ بیگم بستر پر لیٹے لیٹے سارا دن فون پر باتیں کرتیں یا skype پر سب کو دیکھتی رہتیں۔ حسن بھی بہت باقاعدگی سے فون کرتا تھا جبکہ وہ خاصا بے پروا تھا۔ طبیعت کے بہتر ہوتے ہی انہیں پھر حسن کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ جب یہ فکر حد سے سوا ہو جاتی تو بیٹی کو جی بھر کے باتیں سناتیں۔

”تم کیسی بہن ہو، بیٹی کی تو شادی کر دی اور بھائی کی کوئی فکر نہیں۔ بے چارہ اکیلا رہتا ہے میں تو اس کی فکر میں ساری ساری رات جاگتی رہتی ہوں۔“

”امی آپ ٹھیک ہو جائیں تو پاکستان جا کر فوراً اس کی شادی کر دیجیے گا۔ ہم سب بہن، بھائی اس کی شادی میں شریک ہوں گے لیکن آپ لڑکی تو پسند کیجیے۔ آپ کو تو

”اب میں تمہارا کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ خدا کا انتیس سال کے ہو گئے ہو اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔“ تو حسن نے مسکراتے ہوئے اپنا رشتہ منقطع اظہار کر دیا۔

”میں نے کب منع کیا ہے، میں تو کب سے اپنے سہرے کے پھول کھلنے کا انتظار کر رہا ہوں لیکن آپ کو تو اپنی دوسری اولادوں سے ہی فرصت نہیں۔“ عالیہ بیگم بیٹے کے جواب پر اتنی شاد ہوئیں کہ انہوں نے اسی شام اپنا بہت پرانی سینی کی فون کیا۔

”بس شمیم اب تم مجھے جلد از جلد حسن کے لیے لڑکی دکھاؤ، میں چاہتی ہوں اسی سال اس کی شادی کے امریکا واپس جاؤں۔“

اور شمیم بیگم جو اپنے بچوں کی شادی بیاہ سے فارغ ہو کر سارا دن ٹی وی پر ڈرامے دیکھتی رہتیں اور اپنے ڈراموں کی نانی، پرانیوں اور دادیوں۔۔۔۔۔ پر دادیوں کی طرح اپنے آپ کو جوان سمجھیں اور بجائے اس کے کہ ڈھلتی عمر میں عبادت میں دل لگائیں، بہوؤں، پوتیوں اور نواسیوں سے چھپ چھپ کر جھریوں کو ختم کرنے والی اور کم عمر نظر آنے والی نام نہاد کریمیں آزمایا کرتیں، ان میں مزید زندگی کی امنگ بیدار ہو گئی، وہ دوسرے ہی دن عالیہ بیگم کے گھر پر تھیں۔

”لڑکی بے حد حسین اور سلیقہ مند ہے بالکل حسن کے جوڑی ہے ماشاء اللہ چاند سورج کی جوڑی ہوگی۔“

پھر عالیہ بیگم، ان کی بہن اور شمیم بیگم سچ دھج کر لڑکی کے گھر پہنچیں تو معلوم ہوا کہ ایک ہفتے پہلے ہی اس کی بات طے ہو چکی تھی۔ عالیہ بیگم دل مسوس کر رہ گئیں۔ لڑکی انہیں بھی بہت پسند آتی تھی اور پھر یہ روز کا معمول ہی بن گیا۔ عالیہ بیگم اپنے سارے دکھ درد بھول گئیں۔

”امی آپ کی جو ڈیمانڈز ہیں، میرا خیال ہے اس کے لیے مجھے کم از کم چار شادیاں تو ضرور کرنی پڑیں گی کیونکہ ایک لڑکی میں تو وہ ساری خصوصیات جمع نہیں ہو سکتیں جو آپ چاہتی ہیں۔“ حسن ماں کا جوش و خروش دیکھ کر انہیں چھیڑتا۔

”فکر نہ کرو، میں تمہاری شادی ایسی ہی لڑکی سے

گھر پر مستقل سوگ کی سی کیفیت طاری رہتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ عالیہ بیگم زندگی کی طرف لوٹیں اور انہیں احساس ہوا کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ کیسی زیادتی کر رہی ہیں۔ بچوں کا باپ تو دنیا سے رخصت ہو گیا اور ماں نے دنیا میں رہتے ہوئے بھی ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ بچوں کے چہروں پر حزن و یاس کی کیفیت رقم ہو گئی تھی اور خاص طور پر حسن جو باپ کا انتہائی لاڈلا تھا اور ہو بہو باپ کی صورت تھا خالاؤں اور بہنوں کی توجہ کے باوجود بالکل بچہ کر رہ گیا تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بدلا۔ بچوں کی خاطر ہنسنا بولنا شروع کیا۔ گھر کے ماحول سے اداسی اور یاسیت کو اپنی شگفتہ گفتگو کے ذریعے ختم کیا۔ گھر میں پھر سے بچوں کی ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ یہ اور بات ہے کہ عالیہ بیگم دن بھر جتنا ہنستی مسکراتی تھیں رات بھر اسی طرح رو کر ٹپکے کو بھگوتی رہتیں۔ ان کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کے شوہر اتنا چھوڑ کر مرے تھے کہ ان کی سات پشتوں کے لیے کافی تھا۔ ماں کی توجہ سے بچوں نے خوب دل لگا کر پڑھا تر قیاں کی۔ بیٹے تو بیٹے بیٹیاں بھی ڈاکٹر، انجینئر بنیں۔ انہوں نے اپنی ساری ذمے داریاں احسن طریقے سے نبھائیں، بچوں کی شادیاں کیں، سب سے پہلے بڑا بیٹا امریکا گیا پھر بڑی بیٹی کے شوہر کو اس کی فرم نے کورس پر کینیڈا بھیجا اور پھر کچھ عرصے بعد سارا خاندان امریکا اور کینیڈا میں بس گیا۔

عالیہ بیگم کو امریکا زیادہ پسند نہیں تھا لیکن بچوں کی وجہ سے مجبور تھیں پھر بھی سال میں ایک دو دفعہ پاکستان ضرور آتیں، ان کے سب بچوں میں صرف حسن ہی تھا جس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی گو کہ اس کے پاس گرین کارڈ تھا لیکن وہ پاکستان میں اپنی خالہ کے پاس رہتا تھا جنہوں نے اسے اولاد کی طرح پالا تھا۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جو حسن کا بہت گہرا دوست بھی تھا۔

عالیہ بیگم اس کی شادی کے لیے لڑکیاں تلاش کر رہی تھیں لیکن وہ شادی کے لیے راضی نہیں ہوتا تھا لیکن دو سال پہلے جب وہ پاکستان آئیں تو انہوں نے حسن سے صاف، صاف کہہ دیا۔

تو وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

”مجھے تم لوگوں پر کوئی اعتبار نہیں ہے، تم لوگ چاہتے ہی نہیں کہ میں پاکستان جاؤں۔ ان کافروں کے ملک میں آکر تو تمہارے خون ہی سفید ہو گئے ہیں، تمہیں اپنے بھائی کی کوئی فکر نہیں لیکن میں ماں ہوں، میری آنکھیں اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے ترس رہی ہیں۔ پتا نہیں مجھے کیسے کیسے وہم آنے لگے ہیں۔ میں ایک بار حسن کو دیکھ لوں، اس کا گھر سالوں پھر مجھے چین آجائے گا پھر میں سکون سے مر سکوں گی۔ بس ایک بار مجھے پاکستان جانے دو، مجھے میرے بچے سے ملوادو۔“

وہ رورور کرتے ہوئے تڑپ تڑپ کر اس کی منت کر رہی تھیں اور محسن اس طرح خاموش بیٹھا تھا۔ جیسے کوئی زندہ لاش، اس کا چہرہ مٹی، مٹی ہو رہا تھا اور آنکھیں لہو رنگ جیسے ان سے خون ٹپکنے لگے گا۔ وہ ضبط کی ان منزلوں سے گزر رہا تھا کہ اگر اس کی جگہ پتھر بھی ہوتا تو چیخ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا وہ ماں کو پاکستان کیسے جانے دیتا۔ وہ ماں کو حسن سے کیسے ملنے دیتا، وہ ماں کو کیسے بتائے کہ اب حسن اس دنیا میں موجود نہیں۔ وہ ایک سال پہلے ایک بم بلاسٹ کے حادثے میں دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور ایک سال سے وہ سب بہن بھائی ان سے بہانے بنا رہے تھے۔ انہیں پاکستان جانے سے روک رہے تھے۔ انہوں نے ماں کی محبت میں ان سے یہ خبر چھپائی تھی۔ ایک سال سے ان کی خالہ کا بیٹا ان سے حسن بن کر باتیں کر رہا تھا۔ عالیہ بیگم چیخ، چیخ کر رو رہی تھیں بین کر رہی تھیں۔

”آج حسن اکیس سال کا ہو گیا ہے، مجھے اس کے ہاتھ سے مسجد میں شیرینی تقسیم کرانی تھی۔ فقیروں کو کھانا کھانا تھا۔ وہ بہت بے پروا ہے اسے کہاں ان باتوں کا خیال ہوگا۔ میں نے پچھلے سال بھی ثریا سے کہا تھا لیکن ثریا بھی بہت بھلکڑ ہے۔ وہ بھول گئی ہوگی۔ اب میں پاکستان جا کر اس کی سلامتی کے لیے مولا مشکل کشا کی نیاز دلاؤں گی اور مسجد میں اس کے ہاتھ سے شیرینی بھی تقسیم کرواؤں گی۔ خدا میرے بچے کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ خدا کرے میرا بچہ خیریت سے ہو۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر حسن کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

تھیں کیونکہ انہیں بیٹیوں کے گھر میں رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ بڑا بیٹا دل و جان سے ان کی خدمت کرتا تھا۔ ان کی ہر بات سنتا تھا۔ دونوں پوتے بھی دادی کو بہت چاہتے تھے۔ اب ان کی طبیعت بھی خاصی سنبھل گئی تھی لیکن اب پاکستان جانے کے لیے ان کی ضد میں وہ شدت پائی نہیں رہی کیونکہ حسن رج کرنے چلا گیا تھا۔ وہ حج سے واپس آیا تو دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے مری ایٹ آباد چلا گیا۔ وہاں سے ایک آدھ دفعہ ہی اس سے بات ہوئی اور ادھر کئی دنوں سے یہی ہو رہا تھا کہ وہ اس سے بات کرتیں تو ڈھنگ سے بات ہی نہیں ہو پاتی۔ کبھی اسے کہیں جانے کی جلدی ہوتی کبھی آواز کم آرہی ہوتی ویسے بھی اب انہیں سنائی بھی کم دیتا تھا اور آج تو حد ہی ہو گئی تھی، آج اس کی سالگرہ تھی۔ انہوں نے صبح اٹھتے ہی فون کیا تو اس کے بجائے ان کی بہن نے اٹھایا اور بتایا کہ وہ شاور لے رہا ہے پھر ایک گھنٹے بعد فون کیا تو معلوم ہوا کہ دوستوں کے ساتھ باہر چلا گیا پھر شام کو فون کیا تو گھر میں بہت سارے لوگ جمع تھے۔ اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ موبائل فون وہ استعمال نہیں کرتا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ان کا غصہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

”میری فوراً بنگ کرادو، مجھے ہر صورت میں پاکستان جانا ہے۔ ورنہ کان کھول کر سن لو میں اپنی جان دے دوں گی۔“ انہوں نے رات کے کھانے کے بعد محسن کو اپنا فیصلہ سنادیا۔

”امی آپ جانتی ہیں آج کل گرمیوں کی چھٹیاں ہیں، فلائٹس پر بڑا رش ہوتا ہے اس سیزن میں سیٹ نہیں ملے گی۔“ محسن نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”غضب خدا کا مجھے پاکستان سے آئے دو سال ہو گئے ہیں، میں دو سال سے پاکستان نہیں گئی اتنا لمبا عرصہ تو میں کبھی ان بے دینوں کے ملک میں نہیں رہی اب یہاں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔“ عالیہ بیگم کا غصہ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔

”آپ فکر نہیں کیجیے۔ میں پوری کوشش کروں گا جیسے ہی کسی فلائٹ میں جگہ ملے گی، میں آپ کی سیٹ کرا دوں گا۔“ محسن نے بہت تحمل سے انہیں پھر سمجھایا لیکن اب

تھی تو اس موسم میں کبھی جو شائدہ، کبھی قہوہ، اور کبھی گرم پانی میں ملا کر رات کو پلاتی تھی جیسی میرے ہوسے ہوئے بھی اس کا گلا خراب نہیں ہوا۔ اب میں ثریا سے کہوں گی وہ خیال رکھے۔“

”چھوٹی خالہ تو خیر بہت خیال رکھتی ہیں۔“ نمرہ نے آنسو خشک کرتے ہوئے خالہ کی وکالت کی۔

”ہونہ۔ ضرور خیال رکھتی ہوں گی۔ اپنی اولاد سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہوتا۔ اسے تو دنیا میں باہر کے ہوا کوئی نظر ہی نہیں آتا۔“ باہر چھوٹی خالہ کا اگوتا بیٹا تھا جو شادی کے دس سال بعد بڑی منتوں مرادوں سے پیدا ہوا تھا۔ جب تک ان کا کوئی بچہ نہیں تھا حسن زیادہ تر چھوٹی خالہ کے پاس ہی رہتا تھا جبکہ باہر کی پیدائش کے بعد بھی چھوٹی خالہ حسن کے پہلے کی طرح ہی ناز اٹھاتی تھیں لیکن عالیہ بیگم کو ایسا لگتا جیسے حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ ان کی بہن اپنے بیٹے کو زیادہ چاہتی ہیں۔ ”بہر حال میں کچھ نہیں جانتی۔ تم میری بکنگ کروادو۔“ انہیں جیسے ضد ہو گئی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گا۔“ ان کے داماد کا منہ بن گیا یا شاید انہیں محسوس ہوا۔

وہ دن گن گن کر گزارنے لگیں کہ امریکا سے تیسرے نمبر والی بیٹی صبا کا فون آ گیا کہ اس کے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور ان کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے، اس طرح سب کچھ بھول کر وہ امریکا چلی گئیں۔ وہاں بھی ان کے پاس سوائے حسن کی شادی کے اور کوئی موضوع نہیں تھا۔ وہ اتنی دفعہ اس کی شادی کا ذکر کرتیں کہ ان کی بیٹی جھنجھلا جاتی۔

”امی آپ کوئی اور بات بھی کر لیا کریں۔ میں اتنی پریشان ہوں آپ کو میری فکر نہیں۔“ بیٹی کے اس طرح کہنے پر وہ غصے سے منہ پھلا لیتیں اور اس سے بات چیت کا بالکل بند کر دیتیں اور جب تک وہ انہیں رو رو کر منانا نہیں لیتی وہ منہ پھلائے ہی رہتیں اور پھر شاید ان کے داماد کو ہر وقت کی روک ٹوک پسند نہیں آتی یا ان کی بیٹی نے اپنے بڑے بھائی کو فون کر دیا کہ وہ امی کو اپنے پاس بلا لیں۔ بڑے بیٹے نے فوراً انہیں اپنے پاس نیویارک بلا لیا۔ بیٹے کے پاس آکر وہ کچھ مطمئن ہو گئی

رہی تھی ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ مجھے پاکستان جانا ہے، تم میری بکنگ کرادو، میں اسٹریچر پر لیٹ کر چلی جاؤں گی۔“ ایک دن تو انہیں اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے داماد کا بھی لحاظ نہیں کیا اور ان سے بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہ سکتیں۔

”امی میں آپ کو اس حالت میں کیسے جانے دوں؟“ عالیہ بیگم کے اس طرح ضد کرنے پر نمرہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”تو تم بھی میرے ساتھ چلو۔“

”امی، میں بھلا کیسے جاسکتی ہوں۔“ ابھی بچوں کے امتحان ہو رہے ہیں، نمرہ کے یہاں ڈیوڑی ہونے والی ہے۔“ نمرہ نے اپنی مجبوری بتائی تو انہیں غصہ آ گیا۔ ”تمہیں اپنے بچوں کی کتنی فکر ہے۔“ میرے بچے کی کوئی فکر نہیں، پتا نہیں کیا کھاتا ہے، کیا پیتا ہے، کب گھر آتا ہے؟“

”ہاں، آپ کو ہمیشہ ہی لگتا ہے جیسے ہمیں اس کی فکر ہی نہیں۔“ آپ کو کیا پتا۔“ نمرہ کو ماں کی بات پر اتنا غصہ آیا کہ وہ رونے لگی۔

”بیٹا تم سمجھتی کیوں نہیں۔ تمہارا گھر بار ہے، شوہر ہے، بچے ہیں، میرا بچہ اکیلا رہ رہا ہے، نہ جانے کہاں مارا مارا پھرتا ہوگا۔ کتنے دنوں سے میری اس سے بات بھی نہیں ہوئی۔“ بیٹی کے رونے پر عالیہ بیگم کو اپنی بات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ نمرہ نے تو حسن کو اولاد کی طرح پالا تھا۔ وہ حسن کو اپنا بیٹا کہتی تھی۔

”ٹھیک ہے، میں ابھی اس سے آپ کی بات کرا دیتی ہوں۔“ نمرہ نے اسی وقت حسن کا نمبر ملا یا وہ دیر تک اس سے باتیں کرتی رہیں پھر بھی ان کی سیری نہیں ہوئی بلکہ وہ اور فکر مند ہو گئیں۔

”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اسے شدید زکام ہو رہا ہے۔“

”آج کل وہاں کا موسم بدل رہا ہوگا ناں۔“ نمرہ نے تسلی دی۔

”اور پھر وہ اپنا دھیان بھی تو نہیں رکھتا۔ میں ہوتی

مکمل ناول

مہم منزل تھی جن کی اور

خالدہ نسیم

ڈرائیور چھٹی پر تھا۔ میں اسلام آباد میں عام طور پر
... کار نہیں چلاتا تھا اس لیے بس میں سفر کر رہا تھا۔ اچھا
کا آخر عموماً راول پنڈی، اسلام آباد میں اتنا گرم نہیں
ہوتا اس دن معمول سے کچھ زیادہ گرمی تھی، اسلام آباد
سے راول پنڈی تک کے بس کے سفر نے کچھ مت بھی
ماری ہوئی تھی۔ جونہی میں گھر میں داخل ہوا اندر
اندھیرے اور ٹھنڈک میں ابھی سکون کی سانس بھی نہیں
لینے پایا تھا کہ کریم بابا پر نگاہ پڑی۔



”آج پھر چھوٹے صاحب.....؟“

”آپ مجھے ٹھنڈا پانی پلا دیں، میں دیکھتا ہوں۔“
میں نے انہیں ٹالا۔ وہ پانی لینے چلے گئے اور میں وہیں
لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھ میں کھڑے رہنے کی
بھی ہمت نہیں تھی۔ پانی پی کر حواس کچھ ٹھکانے آئے تو بابا
جی کو مخاطب کیا۔

”اب بتائیں کیا بات ہے؟“

”آج تو جی صاحب، بی بی پورے چار گھنٹے
غائب رہیں، میں گھبرا کر آپ کو فون کرنے والا تھا آپ
سے کہا بھی ہے کہ آپ دوسرا فون لے لیں۔“ ان کا
مطلب موبائل فون تھا۔ ”صاحب پورے چار گھنٹے.....“
انہوں نے ہاتھ پھیلا کر انگلیاں گن کر مجھے بتایا۔

”یہ کچھ ٹھیک نہیں ہو رہا، آپ جی کسی عامل یا
مولوی صاحب سے دم درود کروائیں، میں پہلے بھی کہہ
چکا ہوں یہ آسیب کا اثر معلوم ہوتا ہے، بات بڑھ گئی تو
معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔“ میں انہیں ہاتھ سے
آہستہ بولنے کا اشارہ کر رہا تھا کہ ماما کمرے سے نکل
آئیں اور بابا سے کھانا میز پر رکھنے کو کہا وہ ویسے ہی بولتے
ہوئے باورچی خانے کی طرف چلے گئے۔

کھانا کھاتے ہوئے میں نے بغور ماما کی طرف
دیکھا وہ مجھے کچھ الجھی الجھی اور کمزوری لگیں۔

”ماما کیا بات ہے؟“ میں نے ان کا ہاتھ تھامتے
ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے کھانا برائے نام کھایا ہے۔ آپ
ٹھیک تو ہیں؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں، بس اتنی ہی بھوک تھی۔“
حسب معمول مجھے ہمیشہ والا جواب ملا۔ ”تمہارے
امتحانوں کی تیاری کیسی ہو رہی ہے؟“ میں نے ایک لمبی
سانس لی۔

”بس ماما امتحان میں تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے،
آپ میرے لیے دعا کریں، کرتی ہیں ناں؟“ پوچھنا
میں کچھ اور چاہ رہا تھا مگر منہ سے یہی الفاظ نکلے، وہ
ہولے سے مسکرائیں میری ماما کبھی کھل کے نہیں ہنستی تھیں
عرصہ ہو گیا تھا انہیں اسی طرح ہلکی سی مسکراہٹ کے

ساتھ دیکھتے ہوئے، دل میں حسرت تھی کہ کبھی
ہوئے میں ان کی آواز سنوں، مجھے ان کی ہنسی یاد تھی مگر
بہت عرصے پہلے کی۔

کھانے سے فارغ ہو کر ماما اپنے کمرے میں چلی
گئیں اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ کپڑے تبدیل
کرتے ہوئے کریم بابا کی طرف دھیان چلا گیا پھر
عرصے پہلے غالباً چھ سات ماہ سے انہیں یہ شکایت تھی کہ ماما
کہیں غائب ہو جاتی ہیں، گھر کے دروازے کھڑکیاں
سب بند ہوتے ہیں مگر وہ موجود نہیں ہوتیں ان کا خیال تھا
کہ وہ کسی جادو کے اثر سے روح بن کر ہوا میں تحلیل
ہو جاتی ہیں اور پھر نہ جانے کیسے واپس آ جاتی ہیں، وہ ہر
وقت دعا میں پڑھ پڑھ کر دیواروں..... پر پھونکتے رہتے
تھے۔ میں خود بھی ماما میں اس تبدیلی سے پریشان تھا پہلے
کچھ دیر کے لیے اور اب کچھ عرصے سے تین، تین چار،
چار گھنٹے وہ اپنے آپ کو چھپائے رکھتی تھیں کبھی پٹنگ کے
نیچے کبھی کسی الماری کے اندر یا دروازے کے پیچھے اس
طرح سے کہ کسی کو نظر نہ آسکیں..... اور بابا بے چارے
انہیں کہاں اتنی باریکی سے تلاش کر پاتے کہ وہ سمجھ جاتے
کہ ماما خود اپنے آپ کو چھپا لیتی ہیں۔ وہ تو میں نے ایک
بار اتفاق سے الماری میں لٹکے ہوئے کپڑوں کے پیچھے
سے انہیں نکلتے دیکھ لیا تھا لیکن انجان بن گیا تھا۔

بہر حال بات پریشانی والی تھی۔ کتنے کتنے گھنٹے وہ
بغیر کچھ کھائے پیے اسی طرح سے اپنے آپ کو کہیں بند
کر لیتی تھیں خدا نخواستہ گرمی سے بے حال ہو کر بے ہوش
ہو جائیں یا کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں زیادہ دیر گھر سے باہر
نہیں رہ سکتا تھا، ماما کی وجہ سے گھر جلدی آنا پڑتا تھا۔ میرا
اے لیول کا امتحان تھا بعض اوقات پریکٹیکل کی وجہ سے یا
کسی اسائنمنٹ کی ڈسکشن کی وجہ سے دیر ہو جاتی تھی۔ میرا
سارا دھیان گھر میں اور ماما میں اٹکا رہتا تھا کیسوی سے
تیاری بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ پچھلے سال فہد اور مہر بانو نے
امتحان دینا تھا تو ماما سارا سارا دن ان کے خڑے اٹھاتی
تھیں۔ اس کے باوجود ایک ماہ پہلے فہد ہاسٹل میں دوست
کے ساتھ اور مہر بانو اپنی سہیلی کے گھر تیاری کے لیے چلے

گئے تھے۔ گھر کے نچلے پورشن میں رات گئے تک پارٹیز
اور ہڈا گلا چلتا تھا اس لیے وہ پڑھائی نہیں کر پاتے تھے۔
اب کریم بابا ان کی بیوی میں اور ماما گھر میں تھے۔ اب
جب میرے امتحان آئے تو فہد اور مہر بانو انگلینڈ یونی
ورسٹیز جا چکے تھے۔ بابا کی بیوی اپنی بیٹی کا کوئی سرالی
جھگڑا بنانے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ عنقریب بابا بھی جانے
والے تھے اور ماما جو ہماری ہمیشہ ہمت بندھاتی تھیں
میرے سامنے ریت کی دیوار کے مانند ڈھس رہی تھیں۔
شاید وہ فہد اور مہر بانو کے جانے سے خاصی ڈسٹرب تھیں
مگر ان کا جانا تو پچھلے دو سال سے طے تھا، ہم نے ماما کے
دیزے کے لیے کوشش کی تھی مگر صاف انکار ہو گیا تھا۔ ہم
تینوں بھائی، بہن کے پاس انگلینڈ کی شہریت تھی کیونکہ
ہماری وہاں کی پیدائش تھی جبکہ ماما نے وہاں عارضی قیام
کیا تھا۔ انٹرویوز کے دوران ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ اب
ماما کو ویزا اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ ہم تینوں میں کوئی
وہاں نوکری کرتا ہو اور اپنے خرچ پر ماما کی کفالت کر سکے
شاید ماما کو یہ پریشانی تھی کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں جاسکتیں
مگر اس کا حال آسان تھا کہ میں نہ جاؤں اور پاکستان
میں ہی آگے داخلہ لے لوں، ماما کو یوں اکیلے تو نہیں
چھوڑنا تھا اور یہ بات ماما بھی جانتی تھیں کہ میں انہیں اکیلا
یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا پھر وہ کیوں پریشان تھیں؟ یا
واقعی وہ نفسیاتی کیس ہو رہی تھیں۔

مجھے پڑھائی کے لیے اپنے دوست کے ساتھ
اسلام آباد شفٹ ہونا تھا اس کی دو جوہات تھیں پہلی گھر کا
شور اور دوسری روزانہ اسلام آباد سے راول پنڈی
ویسٹرنج تک کا سفر..... گرمی اور ڈرائیونگ کا جھنجٹ
الگ۔ میں یہ بھی کر لیتا مگر مجھے صبح سے شام تک ہر صورت
گھر سے باہر ہونا تھا کیونکہ اکیڈمی جہاں سے میں اولیول
کی تیاری کر رہا تھا وہ اسلام آباد میں تھی۔ سوچا یوں تھا کہ
میں اور میرا دوست، اسلام آباد میں اکٹھے مل کر پڑھائی
کر لیں گے۔ اس نے ایک کمرہ اکیڈمی کے نزدیک
کرائے پر لیا ہوا تھا۔ کچن اور باتھ روم کے ساتھ کسی
رشتے دار نے ٹیکسی بنائی ہوئی تھی دوست کے والدین

منزل تھی جن کی اور

کچھ عرصے پہلے لاہور شفٹ ہوئے تھے مگر انہوں نے
اے لیول کے لیے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔
پریولس میں ہم دونوں کا رزلٹ بہت اچھا تھا اور فائنل
کی تیاری بھی زبردست طریقے سے کرنی تھی مگر اب ماما
کو اکیلا چھوڑنا مشکل لگ رہا تھا۔ بی بی جان کہتی تھیں
رشتے دار خدا تعالیٰ کا انعام ہوتے ہیں مگر میں آج اس
نعت کے ہوتے ہوئے بھی تنہا تھا، ضرورت کی اس
گھڑی میں میرے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ میں نے ماما سے
بات کرنے کا سوچا کہ شاید ان کی نگاہ میں کوئی ہو جو یہ دو
ماہ کا عرصہ ان کے ساتھ آکر رہ سکے مگر اس سے بھی پہلے
ماما کا چیک اپ ہونا ضروری تھا۔ اب میں انہیں راضی
کیسے کروں۔

”میں کوئی پاگل ہوں؟“ وہ کہیں گی۔ یہ فقرہ
سوچتے ہوئے میں مسکرانے لگا۔ دیکھا تو ماما بھی مجھے دیکھ
کر مسکرا رہی تھیں۔ نہ جانے وہ کب سے مجھے خیالوں میں
بھٹکتا دیکھ رہی تھیں۔

”کیوں شاہد جی، یہ کس کو سوچا جا رہا ہے؟ جس نے
ہونٹوں کو مسکراہٹ دے دی ہے۔“ انہوں نے اپنی پرانی
والی دوستانہ ٹون میں پوچھا۔

”میری سب سے اچھی دوست میری ماما ہیں اور
میں آپ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔“ میں نے بھی
سچ بولا اور ساتھ ہی موقع محل غنیمت جانا کہ دوسری الجھن
بھی بتا دوں شاید کوئی حل نکل آئے میں نے بڑے موڈ بانہ
انداز میں بات شروع کی۔

”میری ماما ہمیشہ دنیا کا سامنا کرتی تھیں اور ہمیں
بھی میدان چھوڑ کر بھاگنا نہیں سکھایا پھر آج کل یہ آنکھ
مچولی کا کھیل کیوں.....؟ وجہ بیان کی جائے مابودلت
پوچھ رہے ہیں، ملزم جواب مرحمت فرمائے۔“ ساتھ ہی
میں ٹھکھٹا کر ہنس دیا۔ ماما بھی ہنس دیں۔

”میرا خیال ہے کوئی نفسیاتی گرہ لگ گئی ہے کسی
ڈاکٹر کی خدمات مستعار لینی چاہئیں۔ ملزم احوال عرض
کرتا ہے کہ دل چاہتا ہے کہیں چھپ جائیں، ہوا کے
ساتھ اڑ جائیں، آپ کیا فرماتے ہیں؟“ ماما نے واقعی

اب اسے اپنے رشتے داروں کے ساتھ گوجرانوالہ بارات میں جانا پڑ گیا تھا۔ اس نے مجھے کافی راستے سمجھا دیے تھے، میرا پہلا اتفاق تھا لاہور جانے کا، راول پنڈی سے ریل کا ریح چھ بجے چلتی تھی گیارہ بجے لاہور پہنچتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہم شام سات بجے تک فارغ ہو جائیں گے اور بس سے واپس راول پنڈی آ جائیں گے۔ اگلے پندرہ دن شفیق کو اپنے گھر بلا لوں گا اس کے بعد ہمیں چھٹیاں ہو جانی تھیں تب تک کریم بابا اور اس کی بیوی بھی واپس آ جائے گی پھر ہم امتحانوں کے لیے اسلام آباد چلے جائیں گے۔ وہاں سے اکیڈمی آنا جانا آسان رہے گا۔

ہم اگلی صبح لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ میں ماما سے لاہور کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا تھا مگر انہوں نے سیٹ کی پشت سے سر نکالیا اور اپنے آپ کو سویا ظاہر کرنے لگیں۔ میں ان سے ان کے گھر کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا کسی رشتے دار کے متعلق جاننا چاہتا تھا..... آخر شادی سے پہلے کی زندگی انہوں نے لاہور میں گزاری تھی۔ کوئی سہیلی تو رہی ہوگی۔ ہمیں صرف اتنا پتا تھا کہ ہمارے نانا لاہور ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے اور اب کافی عرصے سے امریکا میں تھے۔ چار پانچ گھنٹے کا سفر خاموشی سے کٹ گیا شاید ماما جاگی ہوں مگر میں خود سو گیا۔ اسٹیشن سے ہم نے رکشا پکڑا اور کمین آباد سیدھے ڈاکٹر صاحب کی کلینک پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر باہر انتظار گاہ میں بیٹھے اور پھر انہوں نے اندر بلا لیا۔ جونہی ہم کمرے میں داخل ہوئے وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے منہ سے نکلا۔

”ارے تم.....“ میں نے پلٹ کر ماما کی طرف دیکھا کہ شاید وہ بھی انہیں جانتی ہوں مگر ان کے چہرے اور آنکھوں میں کوئی پہچان نہ تھی، وہ اپنے جوتے سے باہر پاؤں نکال کر انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھیں اور زیادہ پریشان لگ رہی تھیں۔

”معاف کیجیے مجھے مغالطہ ہوا“ آئیے تشریف رکھیں۔“ ڈاکٹر صاحب فوراً بولے۔ پھر اپنے سامنے کچھ

”آ نے جانے میں تمہارا وقت ضائع ہوگا۔“ انہوں نے فکر مندی سے کہا۔

”اپنی ماما کے لیے میرے پاس وقت ہی وقت ہے، میں ایک دن میں دو دن کا پڑھ لوں گا۔“

”ہاں، میں اپنے بیٹے سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولیں۔

”جی نہیں، آپ فہم کو زیادہ چاہتی ہیں سچ بتائیں۔“ وہ کچھ اداس سی ہو گئیں۔

”جنہیں ہم چاہتے ہیں، بس چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، اب بی جان کو ہی دیکھ لو۔“ انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”آج کے دن بی جان کی وفات ہوئی تھی۔“

”اوہ.....! اسی لیے ماما اداس ہیں۔“

”ماما وہ بہت بوڑھی ہو گئی تھیں۔“ میں نے ناکام سی کوشش کر کے ماما کو ہنسانے کا سوچا مگر خود بھی رنجیدہ ہو گیا کہ کاش آج بی جان ہوتیں تو مجھے یہ فکریں نہ ہوتیں۔

اگلا سارا ہفتہ پڑھائی میں مصروف گزرا اور اتفاق سے ماما بھی غائب نہ ہوئیں لہذا کریم بابا بھی مطمئن رہے، میرے پوچھنے پر کہ ماما کیا کرتی رہتی ہیں، انہوں نے بتایا کہ وہ میرے لیے کھانا بنا رہی ہیں اور الماریوں کی صفائیاں کر رہی ہیں اور کچھ پیکنگ بھی کر رہی ہیں۔ گویا مصروفیت میں وہ جھپکتی نہیں تھیں مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے وہ بہت خاموش اور خیالوں میں کھوئی کھوئی سی لگتی تھیں ہاں..... ہوں..... کے سوا کوئی بات نہیں کر رہی تھیں۔ جمعہ کے روز کریم بابا جانا چاہ رہے تھے رات کی پندرہ ترین سے۔ وہ صبح انہیں ملتان پہنچاتی اور بلرون میں سفر کر کے وہ اپنے گاؤں چلے جاتے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد از جلد اپنی بیوی کو لے کر واپس آ جائیں گے۔ ہم نے اپنی تیاری کی۔ اتفاق سے میرے دوست شفیق کو گوجرانوالہ شادی پر جانا پڑ گیا اور وہ اتوار تک واپسی کا کہہ کر جمعرات کو ہی لاہور چلا گیا۔ صرف اتنا ہی پتا تھا کہ ماما کو لے کر لاہور جاؤں گا پہلے خیال تھا کہ وہ لاہور میں مجھے اسٹیشن سے لے لے گا مگر

لاہور۔ کریم بابا ابھی ادھر ہی ہیں، میں تمہارے لیے کچھ کھانے تیار کر دوں۔ اسلام آباد ساتھ لے جانا۔“ انہیں میرے پروگرام کا پتا تھا کہ میں پڑھائی کے لیے اسلام آباد جانا چاہتا ہوں۔

”ماما کریم بابا چلے جائیں گے تو آپ اکیلا ہو جائیں گی، میں سوچ رہا ہوں گھر پر ہی رہ لوں۔ شفیق کو بھی ادھر بلا لوں گا آپ مزے مزے کے کھانے پکائیے گا؟“ میرے جواب پر وہ کچھ انگلیوں پر گنتے لگیں پھر بہت عجیب سے لہجے میں بولیں۔

”مگر مجھے تو جانا ہے۔“

”ماما کہاں جانا ہے؟“ میں نے ان کے پاس جا کر پوچھا۔

”کہیں بھی پر یہاں سے جانا ہے۔“ پھر وہ گھبرائی سی کمرے میں چلی گئیں، میں حیران تھا اور جب میں کمرے میں ان کے پیچھے گیا تو وہ نہ کمرے میں تھیں اور نہ ہی غسل خانے میں۔ اپنے کسی گوشہ عافیت میں چھپ گئی تھیں اور اب آواز دینا بھی فضول تھا بس میں نے یہ دعا کی کہ جلدی باہر نکل آئیں، میں نے بابا سے ناشتا بنانے کو کہا اور ڈاکٹر کا نمبر ملانے لگا۔ پہلی گھنٹی پر ریسیور اٹھالیا گیا۔

”ڈاکٹر ارشد بول رہا ہوں“ میں نے انہیں سلام کرنے کے بعد اپنا نام بتایا اور اپنا مدعا بیان کیا اور یہ بتایا کہ اگر ہفتے کے دن کا ٹائم دے دیں تو ٹھیک رہے گا۔ انہوں نے چند چھوٹے چھوٹے سوال ماما کے بارے میں پوچھے اور اگلے ہفتے کے روز کا وقت دے دیا۔ مجھے ادھر سے اطمینان ہوا۔ بابا نے ناشتا لگا دیا تھا اور کچھ ہی دیر میں ماما بھی آ گئیں جیسے کہیں گئی ہی نہیں تھیں، میں نے بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور ناشتا کرنے لگا۔ کریم بابا کو لسٹ دی کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ جا کر سامان لے آئیں۔ میں نے انہیں ہفتے کے پروگرام کا بھی بتا دیا تھا۔ لاہور پہنچا۔ نام سن کر ماما کے چہرے پر ایک رنگ آیا مگر تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنے جذبات کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیتی تھیں۔

میرے ہی لہجے میں جواب دے کر میری پریشانی کو قدرے دور کر دیا۔ ان کا موڈ کافی دنوں کے بعد ہشاش بشاش تھا۔

”ابھی تو بادشاہ سلامت اپنی ماما کے ساتھ آئیں کریم کھانے جائیں گے، کل فیصلہ سنایا جائے گا۔“ میں نے فوراً کہا۔ یوں ہم ماں، بیٹا شام میں باہر نکلے اور پھر کھانا اور آئیں کریم وغیرہ کھا کر واپس آئے ایک بہت اچھی شام میں نے بہت عرصے کے بعد ماما کے ساتھ گزاری تھی گھر آ کر ماما تو اپنے کمرے میں چلی گئیں اور میں اخبار دیکھنے لگا۔ کوئی ایک دو دن پرانا اخبار تھا میں بالکل خالی الذہنی کے ساتھ اس پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ دوسرا صفحہ کھولا تو اس پر ایک کانفرنس کی خبر چھپی تھی ملکی اور دیگر ممالک سے آئے ہوئے دماغی امراض کے ماہرین اور نفسیات کے ڈاکٹرز کے بارے میں رپورٹ تھی ساتھ سب کے نام، ڈگریاں اور ایڈریس لکھے تھے۔ میں دھیان سے پڑھنے لگا..... کچھ نام راول پنڈی، اسلام آباد کے ڈاکٹرز کے تھے مگر میرے لیے بے معنی تھے۔ یہاں ماما کو کسی سے ملانا گویا اپنا راز فاش کر کے ڈیڈی تک بات پہنچانا تھا اور ڈیڈی کو کسی بھی صورت میں ماما کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا، یہ محاذ بھی مجھے اکیلے ہی جیتنا تھا..... ڈیڈی کیا، میں کسی پر بھی یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ماما ٹھیک نہیں۔ انہوں نے خود ہی اپنی بیماری کی تشخیص کر کے مجھے علاج کے راستے پر ڈالا تھا۔ میں نے لاہور کے ڈاکٹرز کے بارے میں دیکھا ایک نام اور ڈگریوں سے میں متاثر ہوا۔

ان ڈاکٹر صاحب سے وقت لینے کا مرحلہ تھا اور اس کے لیے صبح فون کرنا ہوگا۔ اگلے دن ہفتہ تھا، میں نے فون نمبر اور ایڈریس مع ڈاکٹر صاحب کے نام کے علیحدہ پرچے پر لکھ کر والٹ میں رکھ لیے۔ ماما کو دودھ کا گلاس دیا خود بھی ساتھ بیٹھ کر پیا کیونکہ اگر ان پر چھوڑ دیتا تو حسب معمول بھرے کا بھرا ملتا۔ صبح اٹھا تو ماما نے ناشتے سے پہلے ایک لمبی لسٹ سامان کی مجھے پکڑادی۔

”تمہیں گیارہ بجے اکیڈمی جانا ہے پہلے یہ سامان

جاؤ میں نے ماما کو خدا حافظ کہا اور ڈاکٹر کے ساتھ اسپتال کے باہر آ گیا اچانک انہوں نے مجھ سے وہ سوال کر لیا جس کا جواب میرے لیے بہت مشکل تھا۔

”تمہارے والد کیوں نہیں ساتھ آئے، کیا وہ پاکستان میں نہیں کسی ٹور وغیرہ پر گئے ہیں؟“ اب میں آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ ہاں وہ ملک سے باہر ہیں اس لیے نہیں آئے..... مگر غلط بیانی کرنا مجھے مناسب نہیں لگا بقول بی جان اور ماما کے حقیقت سے منہ نہیں موڑنا چاہیے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ وہ ہمارے گھر میں ہوتے ہیں مگر ہمارے ساتھ نہیں رہتے دوسری بیوی کے ساتھ نچلے پورشن میں رہتے ہیں۔

”اچھا ڈاکٹر صاحب کچھ حیران ہوئے۔“

”کب کی دوسری شادی.....؟“

”کب کی یہ تو ہمیں نہیں پتا مگر پچھلے کوئی چار سال سے وہ انہیں اسی گھر میں لے آئے ہیں، ہم تینوں اور ماما اوپر کے حصے میں ہیں اور وہ نیچے رہتے ہیں۔“

”اور خرچ، اخراجات.....؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ڈیڈی کو گمان ہے کہ وہ ایک ایسے باپ ہیں، ہمیں کسی بھی چیز کی کمی نہیں کبھی بکھار بلا کر ہماری خبر بھی لے لیتے ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ مجھے لگا کہ شاید وہ فیس یا اسپتال کے خرچ کی ادائیگی کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے جی میں نے فوراً کہا۔

”آپ خرچ کی فکر نہیں کریں، ہم تمام ادائیگی کریں گے۔“ میری بات سن کر وہ ہلکا سا مسکرائے پھر کہنے لگے۔

”میں مع سود کے وصول کروں گا تم فکر نہ کرو۔“ موبائل خرید لینا اور ساتھ اپنے ڈرائیور کو کہا کہ وہ مجھے بس میں چڑھا آئے۔ میں تھوڑا سا حیران ہوا مگر بولا کچھ

نہیں۔ ڈرائیور نے مجھ سے پوچھ کر مجھے tdcپ کی بس جو اس زمانے میں فلیکسٹر ہوٹل سے چلتی تھی اور راول پنڈی صدر میں اتارتی تھی (ابھی موٹروے نہیں کھلا تھا اور ڈائمیو کی بس نہیں چلتی تھیں) کے اڈے پر چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بس چلی۔ میرا دل ماما کو چھوڑ کر آنے

”تو پڑھائی.....؟“ اب ساری توجہ پڑھائی پر دینی۔ ماما نے فوراً کہا۔ ”سنو میری الماری کی دراز میں چیک بک پڑی ہے، میں سارے چیکز پر سائن کر آئی ہوں۔“ میں نے ان کی بات کاٹی۔

”سب پر کیوں؟ کیا یہاں چھاونی ڈال کر بیٹھنے کا ارادہ ہے، جس وقت کریم بابا اور ان کی بیوی آئیں یا ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ آپ ٹھیک ہیں، میں آکر لے جاؤں گا۔“

”دیکھو شاید اس میں صفحے کم رہ گئے تھے۔ تم نے نئی چیک بک بھی لینی ہے۔“ انہوں نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ میرا اور ماما کا جوائنٹ اکاؤنٹ تھا اگر مجھے پیسے نکلوانے ہوتے تھے تو دونوں کے دستخط ضروری تھے۔ ہم شام تک باتیں کرتے رہے کھانا اسپتال سے ہی آ گیا تھا۔ ماما نے مجھے ڈھیر ساری نصیحتیں کیں۔ صبح میں ناشتے کے بعد ماما سے ملنے ان کے کمرے میں گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے مزید نصیحتیں کرتیں، میں نے بولنا شروع کر دیا۔

”آپ نے اداس نہیں ہونا، ڈاکٹر صاحب کی ہدایات پر عمل کرنا ہے، دو وقت پر لینی ہے، زیادہ کتابیں نہیں پڑھیں، وقت پر سونا ہے وقت پر جاگنا ہے، ہم تینوں کے لیے دعائیں کرنی ہیں۔“

”میرا کتنا دل چاہتا تھا کہ امتحانوں کے دنوں میں، میں تمہارے ساتھ ہوتی مگر میری مجبوری.....“ وہ ذرا سا مسکرائیں پھر کہنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ وہ زیادہ سنجیدہ ہوتیں اور چھپنے کو جگہ ڈھونڈتیں میں نے انہیں تسلی دی۔

”ماما میں اگلے چند روز میں ہی آکر آپ کو لے جاؤں گا، آپ نے اپنا بے حد دھیان رکھنا ہے اور جو میں نے کہا ہے اس پر عمل کرنا ہے۔“

”اچھا بیٹا جی، ابا بننے کی کوشش نہ کرو۔“ وہ بھی میرے ساتھ..... ساتھ ہی وہ فیس دیں۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب بھی راؤنڈ لیتے ہوئے آ گئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ رات کیسی گزری نیند آگئی تھی وغیرہ وغیرہ اور کہنے لگے کہ آؤ شاید تمہیں باہر تک چھوڑ دوں مطلب یہ کہ اب تم

”ہم تفصیلی چیک اپ کے لیے انہیں واپس لے گے۔ شاید ایک ہفتہ یا اس سے بھی زیادہ.....“ آپ نے انہیں سے مل لیں ویسے آپ رات رکنا چاہیں تو ہم نے انہیں لوائیٹن میرا مطلب ہے مریض کے ساتھ آنے والوں کے لیے ایک دو کمرے bed and breakfast والے بنائے ہوئے ہیں۔ آپ رک سکتے ہیں۔ دو بارہ ماما سے مل کر چلے جائیں اور اپنا موبائل نمبر دے دیں۔“

”میرے پاس تو موبائل نہیں ہاں شیٹل انیکسی کا نمبر دے دیتا ہوں وہ میرا دوست ہے میں اس کے ساتھ رہوں گا۔“ میں نے بتایا۔

”بچے میرا خیال ہے کہ ایک موبائل فون آپ فورڈ کر سکتے ہیں۔ خرید لیں اور مجھے نمبر ایس ایم ایس کر دیتا۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا مگر مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے بریگیڈیئر کا بیٹا ہو کر فون نہ رکھنے پر طنز کر رہے ہیں۔ ہمارے سب دوستوں کے پاس موبائل موجود تھے مگر ہم بہن بھائی نے کبھی ضرورت نہیں سمجھی تھی یوں بھی ہم اپنی ضروریات محدود کی ہوئی تھیں مگر میں کچھ نہیں بولا۔

”دراصل بات یہ ہے کہ.....“ ڈاکٹر صاحب نے میری طرف بغور دیکھا اور بھانپ گئے کہ کچھ راز ہے۔ ”دوست کے گھر میں صرف شام کو آپ سے کوئی کر سکو گا اور اسی طرح اگر آپ نے اپنی ماما سے کوئی بات کرنی ہو تو آپ انہیں رات کو ڈسٹرب کریں گے۔“

موبائل کا فائدہ یہ ہے کہ دن میں کسی بھی وقت آپ سے رابطہ ہو سکے گا اور شاید مجھے آپ کو دوبارہ بھی بلانا پڑے۔ آپ خود آنا چاہیں تو بات کرنے میں آسانی ہو جائے گی لہذا آپ خرید لیں۔ ضرورت ہے۔“ میں نے ہنس کر مثبت انداز میں سر ہلایا پھر وہ مجھے ماما کے کمرے میں لے گئے میں حیران ہوا کہ انہوں نے ماما کو میرے کہنے سے پہلے ہی وی آئی پی کمرہ دیا تھا۔ ماما پر سکون تھیں یا ظاہر کر رہی تھیں۔ میں ماما کے قریب چلا گیا۔

”ڈاکٹر صاحب نے موبائل لینے کو کہا ہے تاکہ میں ہر وقت آپ سے باتیں کر سکوں۔“

فارم رکھ لیے۔ میری طرف دیکھا کچھ سوچا پھر گھٹنی بجائی ایک نرس اندر آئی تو اس سے کہا۔ ”تم بی بی کو اندر کمرے میں لے جاؤ میں یہ فارم پُر کر کے آتا ہوں۔“ نرس ماما کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

”مریض کے سامنے ہم سوال نہیں پوچھا کرتے۔ آپ جو کچھ مناسب سمجھیں مجھے بتا دیں۔ ویسے ڈاکٹر کو جتنا تفصیل سے مریض کے بارے میں معلوم ہوگا اتنا علاج جلدی اور آسان ہو جائے گا۔“ ڈاکٹر صاحب نے یہ کہتے ہوئے پین کھول کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور فارم بھرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

”ڈاکٹر صاحب میری ماما بیمار نہیں آپ انہیں مریض نہ سمجھیں، میرے دل کو کچھ ہوتا ہے ہم نے اپنے ہوش میں اپنی ماما کو کبھی بیمار نہیں دیکھا۔ بس ڈراسی کسی الجھن میں ہیں جو میں سلجھنا نہیں پارہا۔ اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، چلیں پہلے اپنا تعارف کروائیں۔“ انہوں نے دوستانہ انداز میں پوچھا اور پین ہاتھ سے رکھ کر خود پیچھے ہو گئے۔

”میرا نام شاہد ہے، عمر اٹھارہ سال ہے اے لیول کا امتحان دینے والا ہوں۔“

”بہن، بھائی.....“ انہوں نے پوچھا۔

”ایک بڑی بہن اور پھر بھائی.....“

”باپ کا نام؟ احمد رضا۔“ انہوں نے میری طرف دیکھا۔

”بریگیڈیر احمد رضا، ہارٹ اسپیشلسٹ؟“

”جی..... آپ جانتے ہیں؟“

”کنگ ایڈورڈ سے پڑھا ہے سب ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں۔“ مجھے صاف لگا کہ وہ ڈیڈی کو خوب جانتے ہیں مگر انجان بن رہے ہیں۔

”ماما کا نام؟“

”شاہینہ.....“ میں نے بتایا پھر انہوں نے عمر پوچھی اور یہ کہ کب سے یوں چھپ رہی ہیں۔ میں نے تفصیل سے بتایا پھر وہ تھوڑی سی دیر کے لیے اندر ماما کے پاس گئے۔

”کس کی بیٹی ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بیٹی تو مجھے نہیں پتا مگر وہ میری ماما ہیں۔“

”مارے گئے!“ یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر چلے

گئے پھر دوبارہ نظر نہیں آئے۔“ بی جان ہنسنے لگیں، اتنے

میں ڈیڈی اوپر آئے بہت اچھے موڈ میں تھے مگر ہم نے

دیکھا ماما کو دیکھ کر اچانک ان کا چہرہ بدل گیا تھا۔

”تم نے یہ کالے کپڑے کس کے سوگ میں پہنے

تھے، تمہیں کب عقل آئے گی۔ موقع محل کی مناسبت سے

کب ڈریس اپ ہونا سیکھو گی؟“ ڈیڈی چلا رہے تھے۔

ماما پریشان سی ہو گئیں تھوڑی دیر پہلے ہم سب ان کی

تعریف کر رہے تھے۔

”وہ دراصل بی جان نے کہا تھا کہ یہ ساڑی پہنیں

لو، رات کے وقت اچھی لگے گی۔“ وہ ہکلائے لگیں۔

”اچھی لگے گی..... کس کو، تمہیں؟ تم نے دیکھا تھا

تمام لیڈیز کتنی سویر اور اسارٹ لگ رہی تھیں اور تم.....

ان کے درمیان کیا لگ رہی تھیں، چھوڑی سی..... اور وہ

بے ہودہ سالز کا تم سے کیا باتیں کر رہا تھا؟“ ماما کو کوئی

جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

”ڈیڈی میں بتاؤں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ بی جان

اور ماما کو دیکھا ان کے رنگ فق تھے۔

”شاہد خاموش رہو اور اندر جاؤ۔“ بی جان نے

بات سنبھالی۔

”احمد جانے دیں ناں آج خوشی کا موقع ہے۔“ ماما

نے بے چارگی سے کہا۔

”تمہیں کس بات کی خوشی ہے؟ میرا گھر بنا ہے،

میری ترقی ہوئی ہے۔“

”میں آپ کی خوشی میں خوش ہوں، چلیں آپ

کپڑے بدل لیں، تھک گئے ہوں گے آرام کریں۔“ مگر

ڈیڈی بہت غصے میں تھے۔

”پہلے تم میری بات کا جواب دو..... جو میں نے

پوچھی ہے، تم میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش

کر رہی ہو۔“ ماما کھڑی ہو گئیں۔

”احمد چھوڑیں ناں۔“ انہوں نے بہت منت

زیادہ ہوشیار لگتیں کیونکہ وہ بالکل ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتی

تھیں ان کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی اور ان کی

یہ طمانیت شاید ڈیڈی کو زیادہ غصہ دلاتی تھی۔ رات کا کھانا

ہم ڈیڈی کے آنے سے پہلے کھا کر بستر میں چلے جاتے

تھے۔ ہمارے ڈیڈی اس وقت آرمی میں لیفٹیننٹ کرنل

تھے۔ ڈاکٹر تھے جانی پہچانی شخصیت اور ماہر سرجن، خوب

لے، اونچے خوب صورت اور ڈشنگ۔ ہماری زندگی میں

کوئی کمی نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ ہم نے ماما اور ڈیڈی

کو کبھی اکٹھے بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی ہم سب مل کر کبھی

سیر کے لیے گئے تھے۔ اکثر ڈیڈی کو ماما پر چیختے چلاتے،

عجب، عجیب جملے کہتے سنا۔ بی جان، ڈیڈی کو ڈانٹتے تو ہم

تینوں کو خوشی ہوتی کیونکہ ڈیڈی ہماری ماما کو ڈانٹتے ہیں

اس لیے وہ اپنی اماں سے ڈانٹ کھاتے ہیں یہ سوچ کر ہم

اپنی مصروفیت میں گمن ہو جاتے۔

”ڈیڈی کی پروموشن ہوئی اور ساتھ ہی ہم اپنے

نئے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ خوب بڑا سا گھر تھا۔ میں نے

ڈیڈی کو کہتے سنا کہ نیچے وہ اپنی پریکٹس کریں گے اور اوپر

ہم رہیں گے۔ اوپر ایک بڑا سالانہ، تین بیڈرومز، ایک

کشاہدہ کچن تھا۔ نیچے بھی تین بیڈرومز تھے جن میں سے

ایک ڈیڈی کا آفس تھا۔ کچن، سٹنگ روم، ڈائننگ روم

وغیرہ تھے۔ ڈیڈی نے نئے گھر کی اور پروموشن کی پارٹی

دی تھی پارٹی کیونکہ گھر میں تھی اس لیے ہم سب شریک

تھے۔ اس سے پہلے ہم کبھی کسی پارٹی میں ڈیڈی اور ماما

کے ساتھ شامل نہیں ہوئے تھے۔ ماما نے کالی ساڑی پہنی

ہوئی تھی جب وہ چلتی تھیں تو اس پر ستارے چمکتے تھے،

موٹی موٹی آنتیوں میں ماما سب سے اسارٹ لگ رہی

تھیں ہنستی مسکراتی تو اور بھی اچھی لگتیں۔ دعوت ختم ہونے

پر ہم اوپر آ گئے۔ ڈیڈی نیچے کچھ مصروف تھے، ہم کپڑے

تبدیل کر کے لاؤنج میں آ گئے۔ بی جان بھی ساتھ تھیں

اور ہم دعوت اور لوگوں پر تبصرہ کر رہے تھے۔

”یہ کالی ساڑی میں جوڑی ہے تم اس کو جانتے ہو۔“ میں

بی جان کو بتا رہا تھا کہ ایک کمپین صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں بالکل جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

معمول تھا۔ ڈیڈی، ماما کو کچھ بولتے تو بی جان میدان میں

مقابلے کو اتر آتیں اور ڈیڈی کو ہار مان کر کمرے میں جا

پڑتا۔ مہربانو اور فہد تو پہلی آواز کے ساتھ فوراً منظر سے

غائب ہو جاتے تھے۔

”اور یہ تم..... اب بڑے ہو گئے ہو، زمین پر لوٹ

رہے ہو، ماں تمیز سکھائے تو تب ناں!“ اب ڈیڈی میری

طرف مڑے اور بولے۔ میں صوفے پر کھڑا ہو گیا۔

”بڑا ہو گیا ہوں تو لائیں ذرا اپنی ٹوپی دیں

میں پہنوں گا۔“ میں نے ان کی فوجی کیپ کی طرف

اشارہ کیا۔

”یہ ٹوپی پہنوں گے؟ بچو جی یہ ٹوپی بہت محنت سے

حاصل ہوئی ہے پھر سر پر آتی ہے بہت پڑھنا پڑتا ہے۔“

ڈیڈی کہنے لگے۔

”ہاں یہ بھی بتاؤ کہ بریگیڈیئر کی بیٹی کے لیے بھی

سب کرنا پڑتا ہے۔“ اور آگے جو کچھ بی جان نے کہا وہ

میرے سر پر سے گزر گیا۔ یہ چند جملے ساری عمر کے لیے

ذہن سے چپک گئے۔

”جاؤ بیٹی کھانا لگواؤ، میں نماز پڑھ کر آتی ہوں۔“

بی جان ماما سے مخاطب ہوئیں۔

ماما جو اس کوشش میں تھیں کہ اون سبھالیں تاکہ ہم

کرویسے ہی سمیٹ کر ٹوکری میں ڈال کر اٹھ گئیں۔ ڈیڈی

کس بات پر ماما سے ناراض رہتے تھے ہمیں کبھی سمجھ نہیں

آیا۔ جوں جوں ہم نے ہوش سنبھالا یہ ناراضیاں شدت

اختیار کرتی گئیں۔ ماما کی خاموشی بات بڑھنے نہیں دیتی

تھی، بی جان ماما کی طرف داری میں ڈیڈی کو برا بھلا

کہتیں۔ ان تمام جھگڑوں کے باوجود ماما ہمارے ساتھ

بہت خوش رہتیں۔ صبح اسکول کے لیے تیار کرتیں، ناشتا

کرواتیں، ڈیڈی کے تیار ہونے سے پہلے وہ ہمیں اسکول

کے لیے ڈرائیور کے ساتھ روانہ کر دیتیں۔ واپسی پر

ڈرائیور ہی ہمیں لینے آتا، دوپہر کا کھانا بی جان اور ڈیڈی

کے ساتھ ہم سب مل کر کھاتے۔ اس کے بعد ہم اسکول کا

کام کرتے جو ماما اپنی نگرانی میں کرواتیں۔ ڈیڈی بات

بات پر ماما کو جاہل کہتے مگر ہمیں وہ ہمیشہ اپنی نیچر سے

پر اداس ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ خالی گھر میں کیسے جا

پاؤں گا۔ اپنی پچھلی اٹھارہ سال کی زندگی میں، میں کبھی ماما

کے بغیر گھر میں نہیں رہا تھا۔ اچھی بھلی زندگی تھی ہماری

اب کیسی الجھ کر رہ گئی ہے کوئی سراہا تھا نہیں آ رہا۔ بالکل اسی

طرح سے جب میں نے نیا نیا اسکول جانا شروع کیا تھا۔

شاید چار سال کا تھا، اسکول سے ہم واپس آئے تو بڑے

دونوں بہن اور بھائی کمرے میں چلے گئے، میں ماما کے

پاس لاؤنج میں بیٹھ گیا وہ بنائی کر رہی تھیں سامنے ٹوکری

میں اون کا گولا کبھی دائیں جاتا تھا اور کبھی بائیں طرف۔

میرے دل میں نہ جانے کیا آیا میں نیچے بیٹھ گیا اور ہاتھوں

سے اون چھینچی شروع کی گولا تیزی سے ٹھوما، کھیل دلچسپ

لگا میں نے اون کھولنی شروع کی آہستہ آہستہ وہاں اون کا

ڈھیر بنتا گیا۔ میں نے خوب الجھایا، اچانک اوپر دیکھا تو

ماما بنائی ایک طرف رکھ کر مجھے غور سے دیکھ رہی تھیں۔

میں جھینپ گیا۔

”یہ کیا بلی کے بلوگڑے کی طرح اون سے کھیل

رہے ہو؟“

”میں بلی کا بچہ اور میری ماما بلی..... میاؤں،

میاؤں کریں ناں! یہ دیکھ کر کہ وہ ناراض نہیں میں نے

کہا۔ وہ نیچے قالین پر بیٹھ گئیں اور میاؤں میاؤں کرتے

ہوئے مجھے گدگدی کرنے لگیں۔ ہم دونوں کی ہنسی کی آواز

سن کر بی جان، میری دادی جو غالباً ظہر کی نماز کی تیاری

میں تھیں ہاتھ میں تولیا پکڑے کمرے سے باہر نکل

آئیں۔ فہد اور مہربانو بھی لاؤنج میں آ گئے اور ہمیں دیکھ

کر سب ہنسنے لگے۔ اچانک ڈیڈی اندر داخل ہوئے۔

”کیا ہوا..... کیا ہو رہا ہے؟“ ہمیں اس طرح ہنستے

دیکھ کر بولے۔ ماما کی طرف گھورا۔ ”بے وقوف عورت یہ

کیا ماسیوں کی طرح زمین پر بیٹھی ہو، صوفہ کاٹ رہا تھا،

کبھی اپنی اوقات بھول بھی جایا کرو۔“

”کس کو؟ کس کی اوقات یاد کروا رہے ہو، یہ تو

افسر کی بیٹی اور افسر کی بیوی ہے، ماں کو بھول گئے جب

تمہیں بچی زمین پر لیپ کر کے دری بچھا کر بٹھایا کرتی

تھی۔“ یہ میری دادی یعنی بی جان تھیں اور یہ روز کا

”چھوڑنا ہوں تمہیں..... مگر اتنی آسانی سے نہیں۔“ اور ساتھ انہوں نے ماما کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ماما اس صوفے پر گرنے لگیں جدھر مہربانو بیٹھی تھی مگر صوفے کے بازو پر ہاتھ رکھ کر سنبھل گئیں ہم سب ہنکا ہنکا کھڑے تھے۔ ماما کے ہونٹ سے خون نکل آیا۔ مہربانو نے یہ دیکھ کر چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر لڑھک گئی سب کو اسے ہوش میں لانے کی پڑ گئی، مہربانو ویسے بھی ڈیڈی کی لاڈلی تھی اور بقول ڈیڈی ہم دونوں بھائی ماما کے چچے تھے، مہربانو نے ہوش میں آکر رونا شروع کر دیا۔ یوں تو مہربانو بڑی ہونے کی وجہ سے یا ویسے ہی ہم تینوں میں زیادہ سمجھدار تھی مگر روتے ہوئے وہ ہسٹرک ہو جاتی تھی یوں جیسے چپ ہونا اس کے بس میں نہ ہو، ماما بتاتی تھیں کہ بچپن میں تو آدمی رات کو چیخ، چیخ کر رویا کرتی تھی اب تجھیں تو نہیں مارتی تھی مگر ہچکیوں اور سسکیوں سے جو رونا شروع کرتی تھی تو چپ نہیں ہوتی تھی اب بھی وہی ہوا ڈیڈی اسے بہلانے کو خوش کر رہے تھے اور وہ آنکھیں بند کیے تکرار کیے جا رہی تھی۔

”کیوں مارا.....؟ ماما کو کیوں مارا؟“

”سوری بیٹا..... چپ ہو جاؤ، غلطی ہو گئی۔“

”ماما سے معافی مانگیں۔“

”اچھا بیٹا، آپ کی ماما سے بھی معافی مانگ لیتے ہیں، آپ چپ تو کریں۔“

”اُدھر منہ کر کے معافی مانگیں۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا جدھر تھوڑی دیر پہلے ماما کھڑی تھیں مگر ماما تو کمرے سے جا چکی تھیں۔ اس کے اُدھر اشارہ کرنے پر مجھے ہنسی آ گئی۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے شاید..... جاؤ ماں کو بلاؤ۔“ ڈیڈی کے اونچا بولنے پر مہربانو نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور ساتھ ہی اس کا رونا بند ہو گیا۔ میرے ہنسنے کی وجہ بھی ماما ہی تھیں جو ہمیشہ ہمیں سمجھاتی تھیں کہ جو لوگ مشکل گھڑی میں مسکراتا سیکھ لیتے ہیں ان کی مشکل آسانی میں بدل جاتی ہے۔ اسکول میں بھی اکثر ایسا ہوتا تھا ایک

بار کسی ایک لڑکے کی شرارت پر ساری جماعت کو ٹیچر نے ناراض ہو کر کھڑا کر دیا ٹیچر سخت غصے میں تھیں اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی میں شاید غیر ارادی طور پر مسکرا رہا تھا۔ ”شاید تم..... تم کیوں ہنس رہے ہو، سزا ملی ہوگی ہے کوئی لطیفہ نہیں سنارہی ہوں میں۔“ میرے دوست نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔

”اور جعفر تم کیوں ہاتھ کھڑا کر رہے ہو، میں نے کوئی سوال پوچھا ہے تم سے؟“ وہ جلدی جلدی بولا۔

”دراصل شاہد کی امی نے اس سے کہا تھا کہ ہر مشکل میں مسکراتا چاہیے اس وقت ہم مشکل میں ہیں ماں سزا کی..... تو شاید..... اس لیے.....“ ہماری ٹیچر نے منہ بلیک بورڈ کی طرف موڑ لیا ہم سب کو احساس ہوا کہ وہ جعفر کے رک رک بولنے پر خود بھی ہنسی ضبط کر رہی ہیں پھر انہوں نے ہماری سزا معاف کر کے بٹھا دیا۔

وہ رات ہماری زندگی کی مشکل راتوں میں سے ایک تھی۔ بی جان سمیت ہم سب کو ڈیڈی کے روئے پر غصہ تھا اور ہم ماما سے شرمندگی سی محسوس کر رہے تھے۔ اگلے دن ڈیڈی اسپتال چلے گئے ہم ناشتے کے بعد بی جان کے کمرے میں تھے۔ ہمیں اسکول سے موسم بہار کی چھٹیاں تھیں۔ بات نہ جانے کیا شروع ہوئی مہربانو نے بی جان کو بتانا شروع کیا کہ کل رات کو مہمان عورتوں میں سے ایک آنٹی ڈیڈی سے کہہ رہی تھیں کہ ہمیں وہ دن یاد ہیں جب لاہور سی ایم ایچ میں آپ کی پوسٹنگ ہوئی تھی، اسپتال کے سب سے خوب صورت اسارٹ اور لائق ڈاکٹر کے پیچھے بہت سی نرسیں، ڈاکٹرز اور آفیسرز کی بیٹیاں دیوانی تھیں مگر چند روز میں سب کو آپ کے عشق کا پتا چل گیا تھا۔ ہم بڑے شوق سے اس لڑکی کو دیکھنے آفیسرز وارڈ میں گئے تھے جس کی اماں بیمار تھیں اور آپ بھاگ بھاگ کروہاں جاتے تھے۔ مگر افسوس ہم اس لڑکی کو نہ دیکھ سکے کیونکہ وہ گھر کی کام سے گئی ہوئی تھی اور شادی میں آپ نے سوائے چند دوستوں کے کسی کو بلایا ہی نہیں تھا۔ آج اتنے سال کے بعد ہم اس خوش قسمت لڑکی سے ملے ہیں، آپ نے اتنے سال انہیں کہاں اور کیوں چوری کے

سامان کی طرح چھپائے رکھا اور اب ہم سوچ رہے ہیں کہ خوش قسمت وہ لڑکی ہے یا آپ لگی ہیں۔ جنہیں ایسی بیوی ملی ہے۔“

”ایسی باتیں مجھ پر ایسا نہیں کرتے۔ بی جان یہ سب سن کر مہربانو پر ناراض ہوئیں کہ وہ اتنی سی عمر میں کیا بڑے بڑے الفاظ بول رہی ہے۔“

”مگر بی جان!“ مہربانو بھی چپ ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔ ”آپ یہ بتائیں اگر ڈیڈی کی پسند کی شادی تھی تو پھر ماما سے ان کا یہ رویہ کیوں ہے..... یا ماما سے آپ نے زبردستی ان کی شادی کر دی اور وہ پسندیدہ لڑکی انہیں مل نہیں مل سکی اس لیے ڈیڈی ماما سے ناراض رہتے ہیں۔“

”مہربانو تم تیرہ سال کی ہو ایسے سوال مت پوچھو، کبھی نہ کبھی تمہیں خود ہی جواب مل جائیں گے۔“

”میرے پاس بہت سے سوالات ہیں جو میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں، ہمارے گھر ہمارا کوئی رشتے دار نہیں آتا۔ میری سہیلیوں کے ماموں ہیں، خالائیں ہیں چچا، پھوپھی کیا ہمارا کوئی نہیں، ثانی، نانا کوئی بھی رشتے دار نہیں چچا اور پھوپھی ہیں مگر ہمارے گھر کبھی نہیں آتے۔ آپ ہی ان سے ملنے جاتی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“ حقیقت بھی یہی تھی کہ بی جان سال دو سال بعد دینی جاتی تھیں اگر وہ ایک مہینے کے لیے جاتیں ہم پندرہ دن بعد شور مچا دیتے اور اگر کبھی پندرہ روز کے لیے جاتیں تو ہمارے کہنے پر ہفتے بھر بعد واپس آ جاتیں، ہمارے سب رشتے صرف ان سے ہی تھے۔ ان کے بغیر ہمارا دل نہیں لگتا تھا ہر سال وہ حج کا ارادہ کرتیں مگر اگلے سال پرٹل جاتا۔ ماما اور وہ بالکل سہیلیوں کی طرح رہتی تھیں۔

”اللہ رکھے تمہارے نانا، ثانی، ماموں اور خالہ سب ہیں، تمہیں یاد نہیں تم سب بہت چھوٹے تھے وہ ملنے آتے تھے مگر کیا کہوں، ایک طرف سے وہ داخل ہوتے تھے تو تمہارا باپ دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتا تھا۔ ان سے کیوں نہیں ملتا تھا رب جانتا ہے..... پھر تمہارے ماموں امریکا چلے گئے، خالہ پہلے ہی امریکا میں تھیں۔ انہوں نے ماں، باپ کو بھی وہیں بلالیا۔“

گھر۔ اداس۔ ویران۔ جو اولاد نہیں

آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ اولاد نہ ہونے سے دوسری شادی یا طلاق جیسے گھریلو جھگڑے، اداسیاں اور جدائیاں جنم لے رہی ہیں۔ آپ خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ ہم نے صرف دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ آپ کے ہاں بھی خوبصورت اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔ آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوالیں۔ خدا کے لئے ہمارا بے اولادی کورس ایک دفعہ تو آزمالیں اور خدا را اپنے گھر کے ماحول کو تو جنت بنالیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ

ضلع حافظ آباد۔ پاکستان

0301-6690383

0300-6526061

فون اوقات

صبح 10 بجے سے عصر 4 بجے تک

تمہاری ماما کی فون پر بات ہوتی رہتی ہے۔ باہر سے آنا جانا کون سا آسان ہے، اللہ سب کو خیر سے رکھے۔ چچا اور پھوپھی سے ملنے اس بار سردیوں میں گاؤں چلیں گے۔ وہ لوگ بھی دہی سے وہاں آئیں گے۔ بی بی جان نے ہمیں بہلا دیا۔ ہمیں پتا تھا ڈیڈی نے ہمیں گاؤں جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔

ہم دونوں بھائی غالباً چھٹی ساتویں میں تھے جب ڈیڈی نے ہمیں کیڈٹ کالج بھیجنے کا فیصلہ خود سے ہی کر لیا تھا جس پر فہد نے تھوڑی ہمت دکھائی تھی۔

”مگر کیوں ڈیڈی؟ ہم گھر میں اچھا خاصا پڑھ رہے ہیں ہمارا اسکول راول پنڈی کا ایک اچھا اسکول ہے۔“ فہد کی بات پر ڈیڈی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”گھر میں تم صرف اپنی ماں کے پلو سے بندھے رہتے ہو۔ کوئی کھیل اور نہ کوئی دلچسپی..... وہاں تمہاری ہر طرح کی ٹریننگ ہوگی اور رزلٹ بھی اچھا آئے گا۔“

”رزلٹ؟“ فہد بولا۔ ”آپ نے ہمارا رزلٹ کارڈ دیکھا ہے؟ ہم دونوں اپنی، اپنی کلاس میں سیکنڈ ہیں اور ہم دونوں فٹ بال اور ہاکی بھی کھیلتے ہیں۔ اگلے سال تو میں ٹیم میں بھی سلیکٹ ہو جاؤں گا۔ آپ اسکول کے سالانہ فنکشن میں جاتے تو ہمارے بارے میں جانتے ناں۔ صرف ماما اور بی بی جان گئی تھیں ان سے پوچھیں ہم نے کتنے سرٹیفکیٹ اور انعام لیے تھے۔“

ڈیڈی کھڑے ہو گئے۔

”مجھے کچھ نہیں سننا تم لوگ کیڈٹ کالج جاؤ گے اور ضرور جاؤ گے۔“ یہ سنتے ہی سب سے آگے فہد دھڑو دھڑکرتا بیڑھیاں چڑھا۔

”یہی تمیز ماں نے سکھائی ہے، بڑوں کے آگے بولتا ہے۔“ ڈیڈی غصے سے بولے اوپر بیڑھیوں پر بی بی جان کھڑی تھیں۔

”یہ تم ہر بار ماں کو کیوں الزام دیتے ہو، تمہاری اپنی ماں بھی ان کی تربیت کر رہی ہے۔“ وہ بھی زور سے بولیں۔ ڈیڈی نیچے اپنے آفس میں چلے گئے۔ رات کو سونے سے پہلے میں نے فہد کو دیکھا وہ سو نہیں رہا تھا بلکہ

پوری آنکھیں کھول کر چھت کو گھور رہا تھا۔ میں نے اسے بلایا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ایک بات تو طے ہے کہ ہمیں حسن ابدال کیڈٹ کالج نہیں جانا..... مگر.....“ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ماما کو کمرے میں آتا دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

”تو تم ڈیڈی کا کہنا نہیں مانو گے؟“ انہوں نے پوچھا۔ فہد کچھ زیادہ ہی حساس ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”آپ ہمارے بنارہ لیں گی؟“ اس نے گلو گھر آواز میں پوچھا۔ ماما میں بھی کمال کا حوصلہ تھا کہنے لگیں۔

”بچوں کے مستقبل کی خاطر ہر ماں جدائی سہہ لیتی ہے..... اور ابھی سے پریشان کیوں ہو ابھی تو اگلے سال جانا ہے۔ چلو سو جاؤ۔“

”ماما آپ کچھ نہیں جانتیں۔“ فہد نے آہستہ سے کہا۔

”ماما کیا نہیں جانتیں فہد.....؟“ جب ماما کمرے سے چلی گئیں تو میں نے پوچھا۔

”یہی کہ پاپا کو ہمارے مستقبل سے کوئی ہمدردی نہیں وہ صرف اور صرف ہمیں ماما سے دور کرنا چاہتے ہیں۔“

”مگر کیوں.....؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا، وہ ایک دن بی بی جان سے کہہ رہے تھے کہ وہ تینوں بچوں کو ماما سے دور کرنا چاہتے ہیں بس میں نے اتنا ہی سنا تھا..... اور اب تم دھیان سے سنو کل جب میں ماسٹر صاحب سے بات کروں تو تم نے صرف میری ہاں میں ہاں ملائی ہے، خبردار جو کچھ اور بولے۔“ اس نے مجھے تنبیہ کی۔ فہد کبھی کبھار بڑے ہونے کا رعب ڈالا کرتا تھا سو میں خاموش ہو گیا۔

”سر ہم پڑھائی میں کیسے ہیں؟“ اگلی شام جب ہمارے ٹیوٹر آئے تو پڑھائی ختم کرنے کے بعد فہد نے کہا۔

”بہت اچھے، مجھے آپ دونوں پر فخر ہوتا ہے۔“

”تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ فخر برقرار رہے؟“

”کیسا مطلب.....؟“ وہ حیران ہوئے۔

”آپ ہمیں کیڈٹ کالج کی تیاری کروائیں گے

مگر اس کے باوجود ہم پر بچے خالی دے کر آئیں گے۔

بی بی جان میں گے پھر ڈیڈی تو آپ کو ہی کہیں گے ناں کہ آپ نے اچھا نہیں پڑھایا۔ کیا آپ کو اچھا لگے گا؟“

”میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ وہاں جانا نہیں چاہتے اور آپ کی مرضی یہ ہے کہ میں آپ کے ڈیڈی کو سمجھاؤں

آپ کو کیڈٹ کالج نہ بھیجیں۔ ویسے آپ بے فکر رہیں، میں اسکول کے پرنسپل صاحب سے بھی کہلاوا دوں گا، وہ اپنے دو اچھے شاگرد ہاتھ سے نہیں گنوائیں گے۔ آپ کے

gcse کے لیے سوچے ہوئے ہیں آپ انشاء اللہ اپنے اسکول کا نام روشن کرنے والوں میں سے ہوں گے۔“ میں نے بھی جلدی سے ہاں، ہاں کی کیونکہ

فہد نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔ اب انہوں نے کیسے اگلے چند ماہ میں ڈیڈی کو راضی کیا کہ دوبارہ گھر میں کیڈٹ کالج

کا ذکر نہیں آیا پھر ڈیڈی چھ ماہ کے کسی کورس پر انگلینڈ اور امریکا چلے گئے اور ہمارا گاؤں جانے کا پرانا خواب پورا

ہوا۔ دسمبر کی چھٹیوں میں ہم وہاں گئے..... پھپھو اور چچا نے بھی آنے کا پروگرام بنالیا۔ ہم ان کے آنے سے دو

چار روز قبل پہنچے تھے۔ خوب کھلا سا گھر تھا۔ بڑا سا مچن، بڑے بڑے کمرے گھر دو حصوں میں تھا مگر مچن اکٹھا تھا

کچن اور باتھ رومز بالکل ماڈرن طریقے پر بنے ہوئے تھے بی بی جان نے بتایا کہ یہ سب چچا کی کاوش ہے کیونکہ وہ

ہر سال بچوں کے ساتھ یہاں پر آتے ہیں۔ دوسرے حصے میں ڈیڈی کے چچا رہتے تھے بہت شفیق بزرگ تھے۔

بی بی جان نے بتایا کہ ہمارے دادا بھی ایسے ہی تھے رحمدل، شفیق مگر اصول کے پکے۔ گھر میں ڈیڈی کے بچپن اور

شادی کی تصویریں دیوار پر لگی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر ماما کے ساتھ ہم تینوں کی بھی تھی۔ بی بی جان کا کہنا تھا کہ یہ تصویر

شادی کی چوتھی سالگرہ کی تھی۔ اتفاق سے ہم تینوں بہن بھائیوں کی سالگرہ ایک ہی مہینے میں آتی تھی پہلے مہربانو

پھر فہد اور میں ہم تینوں میں ایک سال کا فرق تھا۔ اس

تصویر میں میں بالکل چند دنوں کا ہی تھا۔ رات میں ہم...

ماما جان کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ مہربانو بی بی جان سے ڈیڈی

منزل تھی جن کی اور

کے بچپن کے بارے میں پوچھنے لگی کچھ عرصے پہلے جو بات ادھوری رہ گئی تھی وہ ہمیں بھی جاننے کی جستجو تھی۔ بی بی جان نے بتانا شروع کیا۔ ”دادا آرمی میں سپاہی بھرتی ہوئے

تھے۔ پڑھائی کے شوقین تھے اور اسی پڑھائی کی بدولت ترقی کر کے صوبیدار، منیجر اور پھر آنریری کیپٹن بن کر

ریٹائرڈ ہوئے۔ میڈیکل کور میں میڈیکل اسٹور میں کام کرتے تھے، ملازمت کے دوران بہت سے شہروں میں

تعینات رہے۔ ہم دو بہنیں، دو بھائیوں سے چچا کے گھر بیاہ کر آئی تھیں۔ اسی گھر میں پہلے میں اور دو سال کے بعد

زہرہ..... یہ گھر ہمارا سب کا آبائی گھر ہے جس میں ضرورت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہیں۔“

مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ اب بھی بی بی جان میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہیں، ہم ماما سمیت ان کے پاس

بیٹھے ہیں، دسمبر کی سردی میں کمرے کے اندر آتش دان میں آگ جل رہی ہے، ہوا کے لیے کھڑکی آدھی کھلی ہے

اور ہم ان کی آواز سن رہے تھے۔ ہمارے سامنے گھر کا بنا میوے والا کُڑ اور ڈرائی فروٹ پڑا ہے مگر کسی کی بھی توجہ

کھانے میں نہیں۔

”چار سال تک تمہارا باپ احمد رضا گھر میں اکیلا بچہ رہا اور جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے دادا، دادی، ماں، باپ،

چچا، چچی سب کا لاڈلا ضدی اور بگڑا ہوا اپنی منوانے والا بچہ تھا۔ اس کے بعد علی رضا تمہارا چچا اور اس سے دو سال

چھوٹی تمہاری پھپھو شہر بانو میری بہن اور دیورانی زہرہ کے دو بچے شہر یار اور جمال آرا ان چاروں میں خوب دوستی تھی احمد رضا کی کسی سے بھی دوستی نہیں تھی۔ محمد رضا، تمہارے دادا کیونکہ آرمی میں تھے اس لیے ہم صرف گرمی کی چھٹیوں میں ہی گھر آتے جبکہ زہرہ اور اس کا میاں مستقل یہاں رہتے تھے۔ زمین اور گھر کی دیکھ بھال

کرتے تھے۔ اسکول آٹھویں تک تھا باقی پڑھائی دونوں بچوں نے صوابی کے اسکول سے کی تھی۔ ہمارے بچے

ہمارے ساتھ ساتھ مختلف شہروں کے مختلف اسکولوں میں پڑھتے رہے۔ احمد رضا کو ہم نے شروع سے راول

پنڈی کے ایک انکس میڈیم پرائیویٹ اسکول میں داخل

تھاما اور ڈیڈی کے درمیان سردمہری کی وجہ جاننے کا۔
”پلیز آپ مختصر کر کے سنا دیں ناں۔“ مہربانوں نے
بی جان سے کہا۔

”یہ تم کیا داستان امیر حمزہ سننے بیٹھ جاتے ہو۔
بی جان کہنے لگیں۔

”داستان امیر حمزہ نہیں قصہ بی جان کے بڑے
سپوت ولی عہد بہادر ڈاکٹر احمد رضا ایف آری ایس محترم
بریگیڈیر صاحب کا۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔“ فہد نے حسب
عادت بات پکڑی۔ مہربانوں نے ایک دھمو کا اس کی کمر پر دیا۔
”در باری صاحب! اسٹیج سے نیچے اتر آئیں۔“

فہد اکثر اسکول کے سالانہ پروگرام میں ایکٹنگ کیا کرتا تھا
ماما کا کہنا تھا کہ یہ ان کا شوق تھا جو وہ پورا کرتا ہے۔

”ہو سکتا ہے میں بات کرتے کوئی سال آگے پیچھے
کر جاؤں، فہد مجھے پتا ہے تمہارا حساب بہت اچھا ہے پر
اب انگلیوں پر گنتے نہ بیٹھ جانا۔“ بی جان نے کہا۔ فہد نے
فوراً نفی میں سر ہلایا۔

”ہمارے کیا اکثر خاندانوں میں شادیاں خاندان
میں ہی کرنے کا رواج چلا آ رہا تھا۔ خاندان کا بڑا لڑکا اور
بڑی لڑکی، عمر میں فرق کم ہو یا زیادہ آپس میں منسوب
سمجھے جاتے۔ اسی طرح ہمارا خیال تھا کہ جہاں آرا اور
احمد رضا کی نسبت طے ہے گو کہ کبھی زبانی کلامی بات نہیں
ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم احمد رضا سے بات کرتے
اس کا خط آ گیا کہ اسے ایک بریگیڈیر صاحب کی بیٹی پسند
ہے، ہم لاہور آ کر ان سے رشتے کی بات کر لیں نام پتا
سب لکھا ہوا تھا۔ میں تو حیران رہ گئی اور سچی بات
بریگیڈیر صاحب، ان کی بیوی اور بیٹی کو دل ہی دل میں
خوب برا بھلا کہا۔ میں جانتی تھی یہ افسروں کی بیٹیاں کس
قدر تیز طرار ہوتی ہیں اور کس طرح سے نوجوان افسروں
کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ بعض اوقات ماں، باپ
لڑکوں کو اپنے خاندان کی طرف مائل کرنے کی کوششیں
کرتے تھے۔ سب نہیں مگر اکثر لوگوں کی یہ عادت اور
طریقے تھے۔ بیٹا معاف کرنا تم سب ابھی چھوٹے ہو
مجھے شاید اس طرح تمہیں یہ سب نہیں سنانا چاہیے۔ مگر
میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم کسی اور کے منہ سے غلط باتیں

احمد رضا کا کہنا یہ تھا کہ اس نے آج تک کبھی ہم سے کچھ
لیں مانگا۔ اسکا لڑپا پر پڑھا ہے۔ اب ضرور کچھ
تیں، تمہارے دادا نے سمجھایا کہ تم ایک سال نوکری کر
کے پیسے اکٹھے کر لو تب تک ہم بھی کوئی انتظام کر لیں گے
مگر وہ نہیں مانا، اس کا کہنا تھا کہ باقی لوگ آگے نکل
جائیں گے، اسے ابھی جانا ہے۔ دادا نے بھائی سے بات
کی انہوں نے زمین گروی رکھنے کا مشورہ دیا۔

سو ہم نے اپنے حصے کی زمین گروی رکھ کر بینک سے
قرض لیا اور احمد رضا باہر ایف آری ایس کرنے چلا گیا۔

قرض کے پیسے اگلے دو سالوں میں ہم نے واپس
کر کے زمین گروی سے چھڑالی۔ کچھ پیسے احمد رضا نے
بھی واپس کر دیے تھے وہاں جاب شروع ہونے پر تین
مال کے بعد تمہارے ڈیڈی واپس آ گئے ہم لاہور اسے
لے گئے تو وہ اپنے کسی دوست کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔
ہمارے ساتھ واپس گھر نہیں آیا کہ یہیں نوکری تلاش کرنی
ہے ہم نے کہا چلو ٹھیک ہے پھر اسے آری میں چانس مل گیا۔
وہیں سے وہ ایبٹ آباد چھ ماہ کے کورس کے لیے چلا
گیا۔ اس وقت تو آری میں اگر ڈاکٹر ز نے باہر کی ڈگری
لی ہو تو انہیں سیدھے میجر کے رینک مل جاتے تھے مگر
زینک کرنا بھی ضروری ہوتی ہے۔ خیر اس کی پہلی
پوسٹنگ لاہور ہی ایم ایچ میں ہوئی، ہم چاہتے تھے کہ اب
جلدی سے بچوں کی شادیاں کریں، سب تعلیم سے فارغ
ہو کر اپنی اپنی نوکریوں پر لگ چکے تھے۔ اب گھر میں کچھ
دفع چاہیے تھی۔“

اس سے پہلے کہ بی جان شادی کی خوشیاں
مناتیں۔ چھوٹی دادی نے آ کر ہماری باتوں کا سلسلہ ختم
کر دیا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ کھانے کے بعد ماما
کو چھوٹی دادی اپنے ساتھ لے گئیں کسی کے گھر انہیں
مبارک باد دینے جانا تھا یا شاید عیادت کے لیے بھی یہی دو
سورتیں ہو سکتی تھیں گھر سے باہر جانے کی۔ بی جان
گرمی کی دوپہر میں بھی آرام نہیں کرتی تھیں اور اب تو
گرمی کا موسم تھا بقول ان کے بوند سادن۔۔۔۔۔ اگلے دن
پاپا اور پچھو نے بھی آنا تھا۔ ہمارے پاس بس آج کا دن

کی نشاندہی بھی کرتی جا رہی تھیں جس کی وجہ سے انہیں
کے مزاج کا کوئی خاص پہلو بھی سامنے آتا جا رہا تھا۔
”خیر اس طرح ہوتے ہوتے کیڈٹ کا کتا سے تم
حاصل کی پھر لاہور میڈیکل کالج میں اپنی قابلیت پر
ملا۔ پڑھائی میں احمد رضا ہمیشہ سے اول تھا بلکہ اسکا لڑپا
بھی لیتا تھا۔ بس چھوٹا بھائی علی رضا جب ساتھ ساتھ
ہونے لگا تو احمد رضا اس سے بہت مقابلہ کرتا اور اسے ہر
علی رضا کی چاہیے ہوتی حالانکہ چار سال کا دونوں کی عمر
میں فرق تھا۔ کبھی تو شہر بانو کی گڑیا سے بھی کھیلنے کی ضد کرتے۔
پھر باپ کے سمجھانے پر کہ لڑکے گڑیا سے نہیں کھیلتے
اس نے بہن کو تنگ کرنا چھوڑ دیا لیکن گڑیا کے علاوہ علی
شہر بانو کی ہر پسندیدہ چیز اسے چاہیے ہوتی تھی۔ جب
تک وہ گھر میں ہوتا چھوٹے سہرے رہتے۔

”جیسے ہم۔۔۔۔۔“ اس وقت فہد نے یک دم کہا۔
”تمہارے کون سے کھلونے ڈیڈی نے بچے
ہیں۔“ ماما جو غور سے سن رہی تھیں چونک کر بولیں۔
سب ہنس دیے۔

”اب سو جاؤ باقی باتیں کل ناشتے کے بعد کریں
گے۔“ جی بی جان بولیں۔ میں نے ماما کو بغور دیکھا
بھی بچوں کی دلچسپی سے بی جان کی باتیں سن رہی
تھیں۔ اس کے بعد ہم سونے کے لیے لیٹ گئے میرے
کانوں میں رات بھر یہی باتیں گونجتی رہیں۔

دوسرے دن ہم ناشتا کرتے ہی بی جان کے پاس
کمرے میں آ گئے، چھوٹے دادا نے کہا بھی کہ آؤ تم سب
اتنے دن بعد آئے ہو چلو تم سب کو کھیتوں کا چکر لگوا دوں
نے کہا کہ چچا کو آنے دیں اکٹھے جائیں گے ابھی ہم گھر
میں ہی رہیں گے۔ وہ اکیلے ہی چلے گئے۔ چھوٹی دادی
اپنے حصے میں کوئی کام کر رہی تھیں۔ اب بی جان نے
داستان وہیں سے شروع کر دی جہاں چھوڑی تھی۔

”تمہارے ڈیڈی نے ہاؤس جاب شروع کر دیا تھا
اور ساتھ ہی اسے باہر جانے کی لگن شروع ہو گئی اس نے
کرائے اور کم از کم وہاں ایک سال کے خرچ کے لیے
پیسے مانگے تمہارے دادا اپنا سارا پیسہ گھر پر لگا چکے تھے

کر دیا تھا مگر ہوا یوں کہ روزانہ وہ گھر آ کر کہتا کہ اس کی
کلاس کے بچے بڑی، بڑی گاڑیوں میں آتے ہیں،
ہمارے پاس کار کیوں نہیں جب اب مجھے سائیکل پر اسکول
چھوڑتے ہیں تو بچے پوچھتے ہیں تمہاری کار کدھر ہے۔ سب
بچے بڑے، بڑے گھروں میں رہتے ہیں ہمارا گھر چھوٹا
کیوں ہے۔ سب بچوں کی مائیں اور طرح سے ہوتی ہیں،
آپ یہ بڑی سی چادر لیتی ہیں فر فر انگریزی بھی نہیں بولتیں۔
سب سے بڑی مشکل اس دن سامنے آئی مجھے اس کی استانی
نے اسکول بلایا اور کہا کہ احمد رضا بہت اچھا اسٹوڈنٹ ہے
مگر دوسروں کی چیزیں لیتا ہے، میں نے پریشان ہو کر پوچھا
کیا مطلب چوری کرتا ہے؟“ اس نے میری بات پر فوراً کہا۔
”نہیں ایسی بات نہیں اپنی چیز انہیں دیتا ہے اور
ان کی چیزیں مانگ لیتا ہے۔ بعض اوقات اپنی اچھی
پنسلیں ربر اور کاپیاں یا شاپنر انہیں دے کر ان کی سستی
چیزوں سے بدل لیتا ہے، نیچر بولی کہ میں نے پوچھا کہ
تم ایسا کیوں کرتے ہو تو احمد رضا نے کہا کہ دوسرے بچوں کی
چیزیں میری چیزوں سے اچھی ہوتی ہیں۔ میں نے اسے
سمجھایا اور کہا کہ دیکھو تمہاری پنسلیں اور باقی چیزیں
دوسروں سے زیادہ مہنگی اور اچھی ہیں۔ تم نے خراب اور
سستی چیز لے لی ہے۔ نیچر نے آخر میں مجھ سے کہا کہ وہ
ابھی بچہ ہے سمجھ نہیں رہا۔ آپ گھر میں کوشش کریں۔ جب
کوئی بچہ چیز بدلنے پر راضی نہیں ہوتا تو یہ مار کٹائی نہیں
کرتا۔ یہ بھی اچھی بات ہے مگر۔۔۔۔۔ کسی نہ کسی طرح یہ
اسے منا کر چیز حاصل کر لیتا ہے۔“ نیچر کی بات سن کر مجھے
پریشانی ہوئی کہ یہ اچھے اسکول میں پڑھانے کے شوق
نے ہمارے بچے کو ایک تو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا
ہے اور اب یہ ایک نئی عادت۔۔۔۔۔ ہمارا بھی یہ ایک اکیلا
بچہ اسکول جاتا تھا ظاہر ہے ہر ماں کی طرح ہماری کوشش
ہوتی تھی کہ اچھی سے اچھی چیز اسے دیں۔۔۔۔۔ کپڑے،
جوتے، بستہ غرض ہر چیز مہنگی اور اچھی ہی لیتے تھے۔ وہ تو
اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہوئی اور ہماری پوسٹنگ جہلم ہو گئی اور
پھر کافی سال ہم وہیں رہے۔ بی جان ڈیڈی کے بچپن کی
باتیں بتا رہی تھیں مگر اس میں سے وہ اس خاص۔۔۔۔۔ نقطے

”آپ مجھے گولی مار دیں، زندگی میری خراب ہوئی ہے۔“ وہ زور سے بولا۔

”اور خود پھانسی چڑھ جاؤں اور اس بے قصور لڑکی کو مفت میں بیوہ کر دوں۔“ وہ بھی اس کے باپ تھے۔ ”تم اوپر جاتے ہو یا گولی چلاؤں؟“

”آپ کیا کر رہے ہیں؟“ میں زور سے چلائی آوازیں سن کر سب لوگ اپنے کمروں سے باہر آ گئے۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ تمہارے دادا نے پھر ایک بار کہا۔

”جلدی فیصلہ کرو، اس سے پہلے کہ شاہینہ بھی نیچے آجائے۔“ احمد رضا نے سب کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے جانے لگی تو مجھے تمہارے دادا نے روک لیا اور دروازہ بند کر دیا اور سب کو بیٹھنے کے لیے کہا پھر زہرہ اور اپنے بھائی کو مخاطب کر کے کہا۔

”تم سب کل صبح واپس چلے جاؤ اور جاتے ہی علی اور جہاں آرا کا نکاح کر دو۔ باقی سارا کچھ پروگرام کے مطابق ہوگا، ہم بھی پرسوں آجائیں گے۔ کچھ مت سوچو جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مگر بات کیا ہوئی تھی؟“ زہرہ نے پوچھا۔

”وہاں آکر بتاؤں گا۔ آپ جائیں آرام کریں۔“ علی اس دوران پستول واپس ہولسٹر میں ڈال چکا تھا وہ اسے ساتھ لیے چلا گیا۔

”احمد رضا سے کوئی بات پہلے ہوئی تھی؟“ انہوں نے سب کے جانے کے بعد مجھ سے پوچھا۔

”میں نے علی اور جہاں آرا کی نسبت کی بات بتائی تھی۔ تبھی سے اکھڑا ہوا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”میں سمجھ گیا یہ علی کی پسندیدہ چیز چھپنے کی عادت ابھی تک گئی نہیں۔ اسے جہاں آرا میں کوئی دلچسپی ہوتی تو پہلے کبھی تو کچھ کہتا خاندان کے رواج کا اسے پتا ہے مگر یہ شادی بھی اس کی اپنی پسند ہے دعا کرو ہمیں کل بریگیڈیر صاحب اور ان کی فیملی کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے اور کل کانفرنس خیریت سے گزر جائے۔ پرسوں انشاء اللہ

شہر بانو نے سچایا تھا ہم بھی اوپر دوسرے کمرے میں تھے۔ نیچے کے دو کمروں میں گھر کے باقی افراد تھے۔ ہم نے دہلی کی کورونما دی اور شہر بانو اور جہاں آرا سے اوپر لے گئے۔ احمد رضا دوستوں کو الوداع کہہ کر کافی دیر بعد اندر آیا۔ میں اور تمہارے دادا لاؤنج میں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے باقی لوگ آرام کرنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ احمد رضا واپس آکر وہاں کھڑا ہو گیا اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”آپ کیسی ماں ہیں؟ ہمیشہ میری چیزیں علی کو دیتی آتی ہیں۔ میری شادی ہونا تھی جہاں آرا کے ساتھ آپ نے کیسے اور کیوں علی کی نسبت طے کر دی۔ میرے ساتھ ہمیشہ حق تلفی ہوئی ہے۔“ مجھے تو اس وقت سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا بولوں پر تمہارے دادا اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

”تم کیا چاہتے ہو کھل کر کہو؟“

”میں جہاں آرا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے عجب انداز میں کہا۔

”تو اس لڑکی کا کیا ہوگا جس کو ابھی رخصت کروا کر لائے ہو؟“ انہوں نے آرام سے پوچھا۔

”میں اسے چھوڑ دوں گا۔“ لگتا تھا احمد اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ ”مجھے نہیں پتا، مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا۔ میں ابھی اسے.....“

”بس ایک لفظ اور نہ بولنا۔“ تمہارے دادا نے اس کے سامنے ہاتھ کھڑا کر کے آگے بولنے سے روکا۔ ”پہلی بات اس کا حق مہر دس لاکھ ہے تمہارے پاس ادائیگی کرنے کو کیا ہے؟ نہیں ہے ناں۔ دوسری بات، شادی کی پہلی رات طلاق دینے کی کوئی معقول دلیل نہیں ہے فوری تمہارے پاس؟ میں تمہیں وجہ دیتا ہوں۔“ وہ تیزی سے اپنے بیک کی طرف گئے اور پستول نکال لی۔ اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور کنپٹی پر رکھ لی۔

”تم اوپر دہلی کے کمرے میں جاتے ہو یا میں اپنے آپ کو گولی ماروں۔ کل ولیمہ کینسل کرنے کی اور دہلی کو واپس مےکے چھوڑنے کی وجہ تمہیں مل جائے گی۔“

تھا۔ وہ اتنی تاخیر سے پہنچے کے ہم بارات کے لیے لے والے تھے، میں نے ان سے کہا کہ اب وہ سب جہاں آرا کے ہوٹل پہنچ جائیں ہم چلتے ہیں کیونکہ فوجی ٹائم کے پابند ہوتے ہیں اور یہاں تو دونوں طرف فوجی تھے اور انتظار کروانے کے حق میں نہیں تھے۔ شاہینہ دہلی کے روپ میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ شاہینہ کی بہن نے شہر بانو سے کہا کہ دولہا کو بلا لیں ہم سلامیاں پہلے دیتے ہیں پھر کھانے کے لیے جائیں گے۔ احمد رضا بھی ماشاء اللہ دولہا بنا بہت بچ رہا تھا۔ دونوں اسٹیج پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ مجھے جہاں آرا کی ہنسی کی آواز سنائی دی، وہ سب لوگ دروازے سے اندر آ رہے تھے اور جہاں آرا کسی بات پر علی کی طرف چہرہ کیے ہنس رہی تھی۔ احمد رضا نے بھی اسی طرف دیکھا، میں نے اس سے کہا دونوں اچھے لگ رہے ہیں ناں بیٹا۔ ہم نے ان کی منگنی کر دی ہے۔ علی نے بڑی چاہت سے جہاں آرا کے لیے مجھ سے کہا تھا وہ اسے پسند کرتا ہے ناں۔“ میری بات کا منہ توڑا کہ احمد رضا کے چہرے کا رنگ بدلا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلط وقت پر غلط بات کر دی ہے مگر اتنے میں رشتے دار خواتین اور شاہینہ کی امی اسٹیج پر آگئیں اور انہوں نے سلامی دینا شروع کی۔ اس کے بعد تصویریں، فیر، کھینچیں۔ جہاں آرا، علی رضا، شہر یار تمہارے بچا، چچی شہر بانو سب کے گروپ فوٹو بنے۔ احمد رضا نے بڑی مشکل سے ہنسی چہرے پر سجائی ہوئی تھی اس کی بے اعتنائی صاف ظاہر ہو رہی تھی وہ سب رشتے داروں سے بددلی سے مل رہا تھا حالانکہ بہت عرصے کے بعد بھائی اور چچی سے ملا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی دلچسپی اتنے اہم فنکشن سے ختم ہو گئی ہے پھر وہ مردانے میں چلا گیا۔ وہاں اپنے دوستوں میں مگن رہا۔“ بی جان کچھ لمحے خاموش رہیں ایسا لگتا تھا کہ اب وہ مزید نہیں سناسکتیں مگر کچھ دیر بعد بولیں۔

”رخصتی کے وقت احمد رضا، شاہینہ کے ساتھ کھڑا ہوا اور اسے کار تک ساتھ لے کر گیا پھر ہم سب میس میں آ گئے۔ یہ میس گھر نما تھا۔ اوپر کی منزل میں دہلی کا کمر

عجیب اتفاق ہوا کہ علی اور جہاں آرا کی نسبت کے بارے میں اس دوران احمد سے کوئی بات نہ ہو پائی، ہم بھول گئے اور اس نے بھی بھائی کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ نہ ہی چچا چچی کا حال پوچھا۔ راستے میں بس میں، میں اور تمہارے دادا اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے شہر بانو آگے ایک عورت کے ساتھ بیٹھی تھی۔“ بی جان نے پھر کچھ توقف کیا اور آگے جو باتیں سنائی وہ یہ تھیں۔

”تمہارے دادا نے راستے میں بہت فکر مندی سے کہا کہ تمہارا بیٹا احمد رضا نہ جانے کیا کچھ کرتا پھر رہا ہے پتا ہے، بریگیڈیر صاحب نے کیا کہا ہے مجھ سے؟ اس نے انہیں اپنے ایک دوست کے ذریعے دھمکی بھجوائی ہے کہ ہم خاندانی لوگ جس لڑکی کا رشتہ مانگ لیں ان سے نہ نہیں سنا کرتے..... نتیجے کے ذمے دار آپ خود ہوں گے۔“ بریگیڈیر صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ اپنے بیٹے کو سمجھا دیں میں بھی فوجی ہوں دھمکی سے ہرگز مرعوب ہو کر نہیں بلکہ آپ کی اور آپ کی بیوی کے رشتہ مانگنے پر اور آپ کی محبت دیکھ کر ہاں کر رہا ہوں لیکن حق مہر اب ہماری مرضی کا ہوگا۔ بیٹی کا باپ ہوں ویسے تو اللہ مالک ہے مگر میں اس کا مستقبل محفوظ کرنا چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر تمہارے دادا چپ ہو گئے تھے اور بہت افسوس سے بولے۔ ”مجھے احمد رضا نے صحیح معنوں میں شرمندہ کر دیا ہے۔ تم نے اس کا غصہ دیکھا تھا؟ میں اسی لیے چاہتا ہوں شادی جلد سے جلد ہو جائے۔“ بی جان کی آواز میں اس وقت سچ بچ کی اداسی رچی ہوئی تھی۔

”میں سوچتی تھی کہ بہت سی باتیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں بھول گئی ہوں مگر یادیں اگر تلخ ہوں تو کبھی پیچھا نہیں چھوڑتیں، خیر شادی والا دن بھی آیا۔ شادی کا فنکشن رات کا تھا۔ مہندی شاہینہ کے گھر والوں نے سادگی سے کی تھی صرف میں اور شہر بانو ہی گئے تھے۔ مردوں کو انہوں نے نہیں بلایا تھا۔ ویسے بھی تمہارے دادا اور احمد ہی تو تھے۔ شہر یار اور علی نے شادی کے دن سے چھٹی لی تھی تا کہ بعد میں لمبی رخصت پر رہ سکیں۔ انہوں نے چچا چچی کے ساتھ جہاں آرا کو لے کر شام تک پہنچنا

انفرادی دلکشی اور شخصیت کے نکھار کیلئے



BREAST DEVELOPING CREAM

ڈولفین بریسٹ ڈویلپنگ کریم میں شامل قدرتی اجزاء انسانی ابھار کیلئے نہایت آزمودہ ہیں۔ اس کا صرف چند روزہ دن کا استعمال کمزور ٹیٹوز کو طاقت فراہم کر کے ان میں سختی اور جسامت میں نمایاں اضافہ کرتا ہے۔ انفرادی دلکشی اور شخصیت کے نکھار کیلئے یقینی موثر مطلقاً بے ضرر خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے یکساں مفید



Rs. 350

تمام ہومیو اور یونانی اسٹورز پر دستیاب

STOKIST
Khuwaja Store Saddar Karachi. Tel: 35212257
Sindh Medical Saddar Karachi. Tel: 35670816
Ibraheem Sun Mall. Tel: 34502764.
Shabir Brothers Aram Bag. Tel: 32215111
Usman Bhai Khachi Gali Tel: 32435877
Central Homoeo Nazimabad. Tel: 36617486
Abid Homoeo Gulshan Tel: 34821193.
Taha Traders water pump. Tel: 36338065.
Kirin Medical u.p. Tel: 36909909.
German Al noor. Tel: 36366372.
Mohammad Homoeo Maleer. Tel: 34506620
Irfan Qadri Landi. Tel: 35013919.
Adnan Medical Korangi. Tel: 35049056.
Bismillah Homoeo New Saeedabad. Tel: 32810777.
Murad Homoeo Stadium Road. Tel: 34933664.
Al Habib Zenat Market. Tel: 32720328.
Bilal Homoeo Kherpur. 0301-3436572.
Hassan Medical Larkana. 4043813.
Al-Shahab Homoeo Merpur Khas. 0300-3314450
Raheel Medacal Nawabshah. 64248.
Noman Homoeo Hyderabad. 2720259.
Maria Dawakhana Hyderabad. 2781798.
Multan Homoeo Multan. 4513805.
Al-Shifa Homoeo Bahawalpur. 2877259.
Tahir Homoeo Rahemyarkhan. 5877170.
Sadeat Traders Quetta. 2830919.
Star Shop Suk. 23503.
Kent Homoeo Lahore. 6317276.

تقسیم کار: حادی ٹریڈر فون : 0313-2603241

اس طرح کرو، چچا اور چھوٹے دادا نے ہمیں خوب سیر کروائی۔ صبح سویرے ہم کھیتوں کی طرف چلے جاتے، گئے کی فصل تیار تھی۔ جگہ جگہ گڑ بنانے کے لیے بھٹیاں جلتی تھیں اور خوشبو پھیلی تھی۔ ہم دس دن گزار کر گھر آئے تو بی جان ہفتہ دس روز کے لیے وہیں ٹھہر گئیں کیونکہ چچا نے ابھی کچھ دن اور رہنا تھا۔

☆☆☆

ہمارے اسکول کھل گئے تھے۔ ڈیڈی بھی امریکا سے واپس آ گئے تھے۔ ہم روزمرہ کی مصروفیتوں میں لگ گئے۔ ہمارے اسکول کھلے دو چار روز ہوئے تھے۔ ایک دوپہر واپس آ کر فہد باہر لان میں نصب بیچ پر ہی بیٹھ گیا۔ ”اوپر نہیں چلنا پڑے“ میں نے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”بات کیا ہے؟“ میں نے پھر پوچھا۔
”میری آج عثمان سے لڑائی ہوئی ہے۔“
”کیوں؟“

”وہ کہہ رہا تھا کہ اس کی امی کسی سے باتوں کے دوران کہہ رہی تھیں کہ تمہارے ڈیڈی نے دوسری شادی کر لی ہے۔ میں نے اسے مکارا کہ جھوٹ مت بولو، میرے ڈیڈی ایسا نہیں کر سکتے مگر وہ بغیر ہا اس نے میری بات کا برا بھی نہیں منایا بلکہ کہنے لگا میں نے کچھ اور بھی سنا ہے کہ اس بار تمہارے ڈیڈی تمہاری دوسری والی ماما کو ساتھ لے کر انگلینڈ گئے تھے، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے شرمندگی ہوئی ہے اس وقت سب بچے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے اور پتا ہے میرا دوست کاشف ہے ناں اس نے کہا کہ فہد کوئی بات نہیں جب میری امی مرگئی تھیں تو میرے پاپا نے بھی دوسری شادی کر لی تھی..... مگر ننئی امی مجھے بہت مارتی تھیں دھوپ میں کھڑا کر دیتی تھیں سزا دے کر۔ وہ تو ایک روز میرے ماموں آگئے تو وہ مجھے ساتھ لے گئے اب میں نانا نانی کے ساتھ رہتا ہوں۔ تمہیں تمہاری ننئی اماں نے مارا تو تم کہاں جاؤ گے؟ مجھے پتا ہے تمہارے نانا، نانی تو امریکا میں ہیں۔ بہت برا ہوا ہے۔ کاشف خود بھی رویا اور مجھے بھی رلا دیا۔“

اپنے آنے کی اطلاع دی۔ تمہارے دادا کی طبیعت اب کچھ خراب رہتی تھی۔ جس دن میں نے انہیں احمد رضا کے آنے کی اطلاع کا بتایا انہیں دل کا دورہ پڑا۔ احمد رضا اور تم سب جس روز آئے ان کا دسواں دن تھا۔ وہ خاموشی سے دنیا چھوڑ گئے جب ان کی طبیعت بہت بگڑی اور ڈاکٹر نے کہا کہ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے آپ صرف دعا کریں۔ میں ان کے پاس ہی تھی ان سے پوچھنے لگی کہ آپ نے بڑے بیٹے کو معاف تو کر دیا ناں؟ تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے مگر کچھ بولا نہیں گیا۔ ”بی جان کی باتیں سن کر ہم سب بھی آنسو بہا رہے تھے۔“

”تم سب آئے احمد رضا دو دن رکا اور ڈیوٹی کا کر کر واپس راول پنڈی چلا گیا مگر تمہاری ماں ایک مہینہ یہاں ہمارے ساتھ رہی۔ پتا ہی نہیں لگتا تھا کہ پہلی بار یہاں آئی ہے۔ سب اس سے پیار کرنے لگے پھر ایک دن احمد نے ڈرائیور کو بھیجا کہ تم سب کو لے آئے شاید نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور بولی۔

”بی جان، میری خواہش ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں۔ میں اکیلی نہیں رہ سکتی، مجھے آپ کی ضرورت ہے..... آپ کی شفقت کی اور آپ کے ساتھ کی۔“ ان کی آنکھوں میں اتنی منت تھی کہ میں انکار نہیں کر سکی وہ دن اور آج کا دن ہے میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”ارے، یہ کیا شام ہو گئی اور ابھی تک گھر میں روشنی نہیں جلائی کہاں ہو تم سب؟“ ہمیں ماما اور چھوٹی دادی کی آوازیں سنائی دیں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا ہم نے جلدی جلدی آنکھیں خشک کیں اور اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلائی۔

”اچھا تو یہاں محفل جمی ہوئی تھی۔“ ماما بھانپ گئیں کہ ہم دادی سے کیا سن رہے تھے۔ اگلے دن چچا، چچی، پھوپھی، شہر بانو سب اپنے بچوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ ان کے بیٹے ہماری عمر کے تھے مگر بیٹی چھوٹی تھی۔ دونوں کے دو دو بچے تھے۔ چچا کے دو بیٹے اور پھوپھی کے ایک بیٹا اور ایک بیٹی حور بانو۔ مہر بانو سب سے بڑی تھی اور ان دنوں بالکل ہی بڑی بہنوں والا رعب ڈال رہی تھی۔ یہ نہ کرو

ہماری واپسی ہوگی۔“

صبح سویرے سوائے شہر بانو اور ہمارے سب گاؤں کے لیے روانہ ہو گئے۔ احمد رضا نے اٹھنے کے بعد اور ناشتے کے دوران کسی کے بارے میں نہ پوچھا کہ سب کدھر ہیں۔ ناشتا دلہن والے لائے تھے۔ شکر تھا کہ احمد نے کوئی بد مزگی نہ کی تھی اور وہ دلہن کو ساتھ لے کر چلے گئے کہ شام کو تیار کروا کر چھوڑ جائیں گے پھر دلہن ہمارے ساتھ ہوٹل جائے گی ویسے کے لیے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ ہم انتظار کریں گے۔ ویسے کے فنکشن میں زیادہ لوگ نہیں تھے بس دلہن کے رشتے دار تھے اور احمد کے چند دوست..... اصل میں فنکشن گاؤں میں ہونا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ دو لہا دلہن ہمارے ساتھ ہی چلیں گے مگر احمد رضا نے کہا کہ وہ ابھی نہیں دو دن بعد آئیں گے۔ ہم نے بھی بات نہ بڑھائی مگر ہوا یوں کہ وہ دوبارہ کبھی گاؤں آیا ہی نہیں۔“

”کیوں بی جان؟“ ان کی بات پر ہم سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا تھا۔

”معلوم نہیں وہ نہ ملے آیا نہ دونوں شادیوں میں شرکت کی۔ شاہینہ کو اس نے کیا کہا تھا ہمیں کچھ معلوم نہیں پھر پتا چلا کہ وہ دوبارہ لمبی چٹھی لے کر انگلینڈ چلا گیا ہے مزید پڑھنے۔ اگلے چار سالوں میں اس نے ہم سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ شاہینہ کے خط اور فون آتے تھے۔ شہر بانو نے اسے پہلی ملاقات میں گھر کا پتا اور فون نمبر دے دیا تھا۔ وہ بچوں کی تصویریں بھی بھیجتی رہتی تھی اور اس بات پر تمہارے دادا اس کے لیے بہت دعا کرتے تھے۔ علی رضا، جہاں آراء، شہر بانو اور شہر یار اپنے، اپنے گھروں میں خوش تھے۔ ہمیں ان کی طرف سے اطمینان تھا دونوں لڑکوں علی اور شہر یار نے نوکری چھوڑ کے اپنا اسٹور کھول لیا تھا۔ سال میں ایک بار یہاں گاؤں کا چکر لگاتے تھے دونوں ساتھ نہیں آ پاتے تھے کیونکہ ایک کو وہاں رکنا ضروری ہوتا تھا۔ تمہارے دادا بڑے بیٹے کی کمی بہت محسوس کرتے تھے۔ وہ اس سے ناراض تو تھے مگر بھولتے بھی نہیں تھے۔ آخر شاہینہ نے ایک دن فون کر کے

خواتین کے لئے روزمرہ کن سے نجات ہر دم چستی اور توانائی

VITALITA SYRUP

Food Supplement for Vitality

Verified by
PCSI

Rs.250/-

ایک انمول خزانہ
ہر دم رکھے توانا

★ بدن کو معدنیات کی فراہمی

★ پروٹین کی کمی کا خاتمہ

★ دماغی کارکردگی میں بہتری

★ بدن کے لئے چستی اور توانائی

★ بیماریوں کے خلاف بھرپور مدافعت

★ سائنڈ ایفکٹ سے مکمل محفوظ

★ روزمرہ کاموں کے لئے بھرپور توانائی

کراچی میں وائٹالیٹا سیرپ حاصل کرنے کیلئے

مراومیڈیکو اسٹیڈیم روڈ، نزد آغا خان ہسپتال

786 میڈیکل اسٹور بلاک 17، گلستان جوہر نزد جوہر چوگرگی

www.facebook.com/castlegate.com.pk

کچھ نہیں کہنا جب تک کہ پتا نہ لگ جائے کہ وہ کیوں کلاسز میں کرتا رہا ہے۔ بس اسے دھیان میں رکھے وہ کمرے سے باہر نہ جائے۔ دو تین دن کے بعد ٹیچر نے پرنسپل سے شکایت کی فہد ہنگامہ کر بول رہا ہے اور کام میں دھیان بھی نہیں دے رہا۔ پرنسپل نے کہا کہ مجھے فکر ہو رہی ہے ایک ماہ میں gcse کے لیے بچوں کے ٹیسٹ ہونے ہیں ہمیں اس سے بہت امید ہے مگر مسئلہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کیوں پریشان ہے؟ پرنسپل صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ ہم گھر میں دیکھیں یا بچے سے پوچھیں کہ اسے کیا ہوا ہے۔ وجہ تلاش کریں۔ یہ کہہ کر ماما مجھ سے کہنے لگیں۔

”تم یاد کرو شاید فہد نے تمہیں شاید کچھ بتایا ہو۔ وہ تم سے ہر بات کرتا ہے، یاد کرو۔“ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

”ہاں ماما، مجھے یاد آ گیا ہے۔“ یوں میں نے ہفتے بھر پہلے کی پوری بات ماما کو سنا دی اور یہ بھی بتایا۔ ”فہد کہہ رہا تھا کہ وہ اب کلاس روم میں نہیں جائے گا اسے دوسرے لڑکوں سے شرم آتی ہے اور یہ میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا۔“ ماما نے لمبی سانس لی ایک بار پھر فہد کو کچھ نہ بتانے کا کہا۔

رات ہم سب لاؤنج میں تھے سوائے پاپا کے۔ ماما نے ایک کتاب کھولی اور کہنے لگیں۔ ”میں آج آپ کو اس کتاب سے پڑھ کر کچھ سناؤں گی۔“ انہوں نے ہمیں حضرت محمد ﷺ کی زندگی کے حالات سنائے جو پہلے بھی ہم نے پڑھے ہوئے تھے مگر اس دن انہوں نے ہمیں ان کی بیویوں کے متعلق بتایا اور یہ کہ خاص حالات میں مردوں کو دوسری شادی کی اجازت ہے اور یہ بات بچوں کے لیے باعث شرمندگی نہیں ہونی چاہیے۔ انہوں نے بغیر کسی کو مخاطب کیے وہ باتیں کیں مگر میں سمجھ گیا کہ وہ فہد کو سمجھا رہی ہیں۔

دوسرے دن صبح آفس میں ماما کے ساتھ ہم دونوں بھی موجود تھے۔ ہمیں چڑا اسی بعد میں بلا کر لایا تھا غالباً ماما انہیں سارا قصہ سنا چکی تھیں۔ عثمان بھی موجود تھا پرنسپل صاحب نے عثمان سے کہا۔

صاحب پڑھانے کے لیے آگئے، ہم دونوں نیچے جانے لگے تو ماما نے فہد سے کہا۔

”تم جاؤ شاید ابھی آتا ہے تمہارے پیچھے پیچھے۔“

فہد نے کتابیں اٹھائیں اور نیچے کھانے والے کمرے میں چلا گیا۔ ماسٹر صاحب ہمیں ڈائننگ روم میں پڑھاتے تھے۔

”اسکول سے پرنسپل صاحب نے آفس میں آکر ملنے کو بلایا ہے فہد کے لیے۔ کیا کوئی شرارت کی ہے اس نے یا کوئی اور بات ہوئی ہے؟“ ماما نے مجھ سے پوچھا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا بتاؤں جبکہ ایسی کوئی بات ہوئی نہیں تھی۔

”جاؤ پڑھو اور فہد کو ابھی کچھ نہیں بتانا۔ میں صبح اسکول ساتھ ہی چلوں گی۔“ ماما نے مجھ سے کہا۔

میں رات تک سوچتا رہا مگر فہد کی کوئی شرارت یا غلطی میرے ذہن میں نہیں آئی۔ اگلے دن ماما، پرنسپل صاحب سے ملیں اور دوپہر میں جب فہد تھوڑی سی دیر کے لیے سو گیا تو انہوں نے مجھے بلایا۔

”شاید کچھ یاد کرو۔ پچھلے دنوں میں کیا غیر معمولی بات ہوئی ہے؟“ پرنسپل صاحب نے بتایا ہے کہ فہد کلاس میں نہیں جا رہا ہے۔ پہلے دو دن تو سب نے سمجھا کہ شاید اسکول سے غیر حاضر ہے بیماری یا کسی کام کی وجہ سے پھر ایک دن مالی نے آکر بتایا کہ ایک لڑکا درخت کے نیچے سو رہا ہے۔ پرنسپل صاحب خود گئے تو دیکھا کہ فہد وہاں بستہ سرہانے رکھ کر سو رہا تھا۔ انہوں نے اسے جگایا نہیں اس کی کلاس میں گئے اور ٹیچر سے پوچھا۔

”وہ تین دن سے کلاس میں نہیں آ رہا۔“ ٹیچر نے بتایا تب پرنسپل صاحب اس پر بھی ناراض ہوئے کہ بچہ تین دن سے جماعت میں نہیں اور استاد کو فکر نہیں۔ اس سے اگلے دن بچوں کے آنے کے وقت پرنسپل خود گیٹ پر تھے فہد کا رے اتر اس نے پرنسپل کو دیکھا اور خاموشی سے پہلی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ پرنسپل نے اسے نگاہوں میں رکھا ہوا ہے۔ وہ سیدھا کلاس روم میں چلا گیا۔ ٹیچر کو پرنسپل نے سمجھا دیا تھا کہ ابھی اسے

”دیکھو فہد ہماری ماما تو زندہ ہیں۔ اگر نئی امی نے کچھ کہا تو بی جان اور ماما دونوں مل کر اسے ماریں گی اور پھر دیکھو ناں ہماری دو، دو مائیں ہوں گی۔ لوگوں کی ایک ہوتی ہے۔“ میں نے اسے خوش کرنے کو کہا۔ فہد نے مجھے گھورا۔

”شاید تم چھوٹے ہو اور بے وقوف بھی۔ کاشف سے جب میں نے کہا کہ میری ماما تو ہیں تو اس نے کہا تھا کہ پھر تم دیکھنا تمہاری نئی امی تم سب کو گھر سے نکال دیں گی۔ دوسری بیویاں ایسا ہی کرتی ہیں۔“ فہد ابھی بات کر رہا تھا کہ ڈیڈی کی کار آ کے رکی۔

”میں ڈیڈی سے ابھی پوچھتا ہوں نئی اماں ہمیں گھر سے تو نہیں نکال دیں گی۔“ میں نے جھٹ کہا۔ اس سے پہلے کہ میں بھاگ کر ڈیڈی کے پاس پہنچتا میں نے مڑ کر فہد کو دیکھا وہ درخت کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ اب میں چھوٹا اور بے وقوف تو تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ اس کے چھپنے کا مطلب نہ سمجھ پاتا۔ میں ڈیڈی کے پاس پہنچ کر رک گیا اور انہیں دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے؟“ انہوں نے غصے سے پوچھا۔

”دھوپ میں کیوں کھڑے ہو؟“

”ڈیڈی سردیاں ہیں۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ انہیں بھی احساس ہوا کہ وہ بیکار میں ڈانٹ رہے ہیں۔

”اچھا جاؤ اوپر جاؤ اور فہد کہاں ہے؟“ انہوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اس دوران یہ دیکھ کر کہ میں نے عقلمندی کا ثبوت دیا کچھ نہ بول سکے۔ وہ دونوں بستے اٹھائے سامنے آ گیا اور ہم خاموشی سے اوپر آ گئے۔

کچھ دن اور گزر گئے ایک دن مجھے اسکول میں پرنسپل کے آفس سے بلاوا آیا۔ انہوں نے مجھے ایک لفافہ دیا کہ اپنی والدہ یا والد کو پہنچا دوں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے وہ لفافہ ماما کو دیا۔ اسکول سے یوں کوئی پیغام لانا اسٹوڈنٹ سمجھ سکتے ہیں کہ ضرور کوئی شکایت ہوگی۔ ماما نے کھول کر پڑھا مگر کچھ بولی نہیں۔ ہم نے کھانا کھایا کچھ دیر آرام کیا اور پھر اسکول کا کام کیا۔ اتنی دیر میں ماسٹر

”اچھے بچے گھروں کی باتیں اسکول میں نہیں کرتے اور نہ ہی سنی سنائی باتوں کو آگے پھیلاتے ہیں۔ آپ فہد سے معذرت کریں اسے آپ کی غلط بیانی سے تکلیف پہنچی ہے۔“ عثمان نے فہد سے ہاتھ ملایا اور سوری کہا۔ اس کے ساتھ ہمیں پرنسپل صاحب نے کلاس روم میں واپس جانے کو کہا۔ ماما بھی آفس سے باہر نکل آئیں مگر وہ پریشان تھیں۔ اگلے دن اچانک بی جان واپس آ گئیں۔ یہ سارا قصہ ماما نے انہیں بھی ضرور سنایا ہوگا۔ انہوں نے ڈیڈی سے بات کی ہوگی۔ رات کے کھانے کے بعد ڈیڈی نے ہم سب سے کہا کہ انہوں نے کوئی شادی وادی نہیں کی۔ ساتھ ہی انہیں غصہ آگیا اور اونچی آواز میں کہنے لگے۔

”اگر مجھے دوسری شادی کرنا ہوگی تو مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ تم لوگ اپنی پڑھائیوں پر توجہ دو۔ میں آئندہ کسی کے بارے میں کوئی شکایت نہ سنوں اگر کسی کا رزلٹ خراب آیا تو پڑھائی چھڑوا دوں گا۔“ ان کی بات سن کر فہد سب سے پہلے میز سے اٹھا پھر مہربانو اور میں بھی۔ ماما حسب معمول پہلے ہی غیر حاضر تھیں۔ بی جان اور ڈیڈی کافی دیر بحث میں لگے رہے۔ کافی دن ماما فہد کے ساتھ ساتھ رہیں۔ خاص کر اس سے انگلش اور اردو کی کتابوں کی ریڈنگ زور زور سے کرنے کو کہتیں کبھی مضمون لکھ کر دیتیں اور زبانی یاد کرواتیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ بولے۔ ہمیں بھی کہتیں کہ اس سے زیادہ باتیں کرواؤ تاکہ اس کا اعتماد واپس آئے۔

سب کچھ بظاہر ٹھیک تھا مگر گھر میں عجیب طرح کی ٹینشن تھی۔ ڈیڈی کی غیر حاضری بڑھ گئی تھی اکثر ٹورز پر رہتے۔ بی جان ماما کو ساتھ لے کر بینک کے کچھ کام نمٹاتی رہتیں۔ ایک دن وہ ہمیں بھی لے گئیں۔ ماما کے ساتھ ہمارے بھی بینک اکاؤنٹ کھلوائے۔ کچھ پیپرز وغیرہ پر بھی دستخط کروائے مجھے بینک منیجر صاحب کی ایک بات یاد رہ گئی۔ انہوں نے کہا تھا۔ ”جب تک ہمارے آئی ڈی کارڈ نہیں بن جاتے ہم پیسے نہیں نکلوا سکتے“ تب کچھ بھی سمجھ نہیں آیا تھا کہ یہ سب بی جان کیوں

کر رہی ہیں۔

☆☆☆

کافی عرصے بعد کی بات ہے۔ فہد کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں اب میرا ٹیسٹ ہونا تھا۔ ماسٹر صاحب پڑھاتے تو تھے مگر میں اپنے طور پر بھی محنت کر رہا تھا۔ بی جان اور مامرات کو دیر تک نفل پڑھتی رہتی تھیں یاد دہائی کرتی رہتی تھیں۔ اس روز بھی میں اسی طرح رات کو سو تک پڑھتا رہا۔ ایک سوال سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ فہد دیکھا تو وہ سو رہا تھا۔ بی جان کے کمرے سے روشنی آرہی تھی۔ میں نے سوچا ماما جاگ رہی ہوں گی۔ ان دونوں مہربانو ڈیڈی اور ماما والے کمرے میں ہی پڑھائی کرتی تھی اور ڈیڈی کے گھر سے باہر رہنے کی وجہ سے دوسری سوئی تھی۔ میں دبے پاؤں اٹھا بی جان کے ادا کمرے دروازے سے اندر کا منظر سامنے تھا۔ بی جان اور ماما دونوں جاگنا پڑھتی تھیں بی جان نے ماما کے دونوں ہاتھ تھامے ہوئے تھے اور وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”میرے بیٹے نے تمہارے ساتھ بہت ظلم کیا ہے مگر تم اسے کوئی بددعا نہیں دینا۔“

”بی جان روتے ہوئے بولیں۔“

”آپ میرے صبر سے پریشان نہ ہوں، دعا کریں میرا اللہ میرے صبر کا اجر دے۔ میرے بچوں کا حامی ناصر ہو۔“ یہ منظر دیکھ اور سن کر میں خاموشی سے واپس پلٹ آیا۔ یہ دونوں کیوں پریشان ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر میرا دل بھر آیا تھا۔ سوچا صبح ماما سے پوچھوں گا مگر حسب عادت بھول گیا۔

اس پر وہ چڑ جاتی۔ ایک دن صبح صبح ماما نے فہد کو جگایا۔ ”جاؤ نیچے سے ڈیڈی کو بلاؤ، بی جان کی طبیعت خراب ہے۔“ فہد تیزی سے بھاگا۔ ہم سب ان کے گرد تھے بی جان نے ڈیڈی کو دیکھا پھر ماما کی طرف دیکھا اور کلمہ پڑھنے لگیں۔ ان کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ ڈیڈی نے ایسبولینس بلوائی تھی مگر اس سے پہلے ہی بی جان نے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈیڈی نے سانس دلانے کی کوشش کی مگر بے سود۔

”رونا بند کرو اور دینی چچا اور پھوپھو کو فون کرو۔ پہنچ سکتے ہیں تو بتائیں ورنہ میں انتظار نہیں کروں گا۔“ ماما بے آواز رو رہی تھیں۔ ڈیڈی نے مہربانو سے کہا۔ مہربانو کے بجائے ماما نے فون کیا۔ بارہ بجے کے قریب وہ دونوں پہنچ گئے تھے۔ بی جان کی خواہش کا انہیں پتا تھا کہ وہ دادا کے پہلو میں گاؤں والے قبرستان میں دفن ہونا چاہتی تھیں۔ تیاریاں مکمل تھیں ان کے پہنچنے ہی ہم گاؤں روانہ ہو گئے۔ ڈیڈی اگلے دن واپس آ گئے۔ وہاں بہت لوگ جمع تھے ماما کچھ دن رکنا چاہتی تھیں مگر ڈیڈی کے آرڈرز تھے کہ جلدی واپس آنا ہے۔ فہد کے اور میرے امتحان ہونے والے تھے۔ چچا اور پھوپھی بھی زیادہ نہیں رک سکتے تھے ان کے بچے ساتھ نہیں آ سکتے تھے۔ یہاں آ کر گھر میں بھی افسوس کے لیے لوگ آتے رہے مگر نہ ماما نیچے جاتی تھیں نہ ہم۔ ڈیڈی خود ہی سب سے ملتے تھے بعد میں پتا چلا کہ سب کو ڈیڈی یہ کہتے کہ ہم سب ابھی گاؤں میں ہیں۔

”لو تو ہمیں وہیں رہنے دیتے۔ امتحان تو ابھی مئی میں ہونا تھا۔“ میں نے ایسے ہی سوچا۔

بی جان کی وفات کو دس روز گزرے تھے۔ ایک رات ڈیڈی اوپر آئے اور ماما سے کہا کہ انہوں نے کچھ بات کرنی ہے کمرے میں آؤ۔ دس پندرہ منٹ کے بعد وہ باہر آئے اور ہم سب کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔

”میں نے بی جان سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی زندگی میں دوسری بیوی کو گھر میں نہیں لاؤں گا مگر اب بی جان موجود نہیں ہیں۔ میں بھی دو گھروں کا خرچ پورا نہیں کر سکتا

منزل تھی جن کی اور

اس لیے میں اسے یہاں لے کر آ رہا ہوں۔“ فہد نے کچھ کہنا چاہا مگر ڈیڈی نے اشارے سے روک دیا۔

”میری بات پوری نہیں ہوئی، ہم نیچے پورشن میں رہیں گے اور تم لوگ اوپر پہلے کی طرح۔ تمہاری زندگی میں کوئی دخل نہیں دے گا اور تم بھی سوچ لو۔ میری مخالفت تمہیں مہنگی پڑے گی۔ کار، ڈرائیور، فینس تمہارے اخراجات سب تمہارے ادا ہوتے رہیں گے۔ وہ سب میں پورے کروں گا۔“ فہد کھڑا ہو گیا۔

”ہمیں آپ کا فیصلہ منظور نہیں میں آپ کی دوسری بیوی کی جان لے لوں گا یا اپنی دے دوں گا۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ صرف ہمارے ڈیڈی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ چلا کر رونے لگا۔

”ہمیں بہت پہلے سے پتا تھا ہمارے ساتھ یہ ہونے والا ہے۔“ مہربانو نے اسے پکڑا اور روتے ہوئے بولی۔ عموماً ایسے حالات میں ماما ہمیں سمجھانے لگ جاتی تھیں مگر اس بار وہ کمرے سے باہر نہ نکلیں۔ ڈیڈی نے ایک بار پھر کہا۔

”جان لینی اور دینی اتنی آسان نہیں ہوتی۔ میں تمہارا باپ ہوں اور رہوں گا۔“

وہ تو ہمارے باپ رہے مگر ہم سب اسی لمحے بدل گئے۔ ہماری زندگی سے ان کی اہمیت ختم ہو گئی یا ہم نے ایسا سمجھا پھر ایک اور رات پوری سفاکی سے ہماری زندگی میں آئی اور اپنے اثرات چھوڑ کر گزر گئی۔ ہم وہ نہ رہے جو تھے۔ زندگی یکسر بدل گئی۔ ڈیڈی کے جانے کے بعد ماما باہر آئیں نیچے جانے والا دروازہ انہوں نے بند کر دیا اور کنڈی لگا دی۔ ہماری طرف مڑیں اور ایک جہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں انہوں نے کہا۔

”آج کے بعد اس گھر میں کوئی نہیں روئے گا۔ اپنے آنسو پونچھ لو، ہمیں اپنی زندگی ہنسی خوشی کے ساتھ گزارنی ہے اور دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا ہے۔ شرمندگی سے نہیں بلکہ سرائٹھا کر۔“ مہربانو ایک دم سے اٹھی اور ان سے لپٹ گئی۔ میں اور فہد بھی ان کے ساتھ چٹ گئے۔ وہ ہمیں ساتھ لگائے صوفے پر بیٹھ گئیں

اور پھر نہ کہتے بھی بہت کچھ بدل گیا۔

مہربانو اور فہد نے کہا کہ وہ اے لیول کے بعد انگلینڈ چلے جائیں گے۔ ایک سال کے بعد میں اور ماما بھی وہیں چلے جائیں گے اور ہم سب ساتھ رہیں گے۔ مہربانو نے فہد کے ساتھ gcse کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ کریم بابا جو پہلے نیچے کھانا پکاتے تھے اوپر آگئے۔ انہوں نے ڈیڈی سے کہا کہ وہ ہمیشہ سے بچوں کے ساتھ رہتے تھے اب بھی رہنا چاہتے ہیں ورنہ انہیں فارغ کر دیں، وہ گاؤں چلے جائیں گے۔ ہمیں انہوں نے بتایا کہ وہ دوسری ماما کی پسند کے کھانے نہیں بنا سکتے تھے اس لیے ایسا کہا تھا۔

”تو گویا یہ ہماری محبت میں نہیں تھا۔“ میں نے انہیں چڑایا۔

”یہ آپ کی ماما کی محبت میں فیصلہ لیا ہے۔“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ اس طرح سے بابا اور ان کی بیوی دونوں ہمارے گھر آگئے۔ بینک کے چکروں کا عقدہ بھی کھلا۔ بی جان نے اپنے حصے کی زمین کی ساری آمدنی ماما کے اکاؤنٹ میں جمع کروانی شروع کر دی تھی جو ماما کو منظور نہیں تھا اس لیے سب کے نام پر اکٹھا اکاؤنٹ کھولا گیا تھا۔ ہمیں خرچ اخراجات کی کبھی تنگی نہ ہوئی اس کے باوجود ہمیں بے جا خرچ کرنے کی عادت نہ پڑی۔ ہم جی جان سے پڑھائیوں میں لگ گئے۔ مہربانو، ماما سے بڑی بہنوں کا ساسلوک کرنے لگی، ہر بات میں ان کا دھیان رکھتی بعض اوقات ماما تک آجاتیں کہ تم کیا میری اماں بن گئی ہو مگر حقیقت ہم سب سمجھتے تھے کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ نقصان میں وہ ہیں۔۔۔۔۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ صرف ہماری خاطر وہ زندہ تھیں۔ نماز روزے کی وہ پہلے بھی پابند تھیں اب اور زیادہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ہمیں سختی سے منع کر رکھا تھا کہ ڈیڈی کی دوسری شادی کی خبر امریکا نانا، نانی کو نہیں کرنی۔ مہربانو اکثر خالہ سے اور نانا، نانی سے بات کرتی رہتی تھی۔

شروع میں ڈیڈی ہمیں رات کے کھانے پر نیچے بلاتے تھے۔ مہربانو نے ایک بار کے بعد ڈیڈی سے کہہ دیا۔

کہ وہاں بہت لوگ ہوتے ہیں اور عجیب سے ہوسٹ ہیں اس لیے وہ آئندہ سے نہیں آئے گی۔ فہد نے پڑھائی کا اور کام کا بہانہ کیا۔ میں نے کہا میں اکیلا نہیں آ سکتا ہمیں معاف ہی رکھیں۔ اس کے بعد ہمیں کوئی کام ہوتا تھا ڈیڈی نے کچھ کہنا ہوتا تھا تو وہ اسپتال میں بلا لیتے تھے۔ ایک سال نیچے حالات پرسکون رہے مگر بعد میں مہربانوں کا تانتا شروع ہوا۔ آدھی رات تک تیز میوزک اور شور شرابا رہتا۔ ہمیں سکون میں رہنے کی عادت تھی اور ڈیڈی بھی شور پسند نہیں کرتے تھے اب وہ کیسے بدل گئے تھے۔ بابا نے بتایا کہ اردلی کہہ رہا تھا کہ وہ ان محفلوں میں شامل نہیں ہوتے۔ آرمی کلب میں رات گئے تک بیٹھے رہتے ہیں اور بہت دیر سے گھر آنے لگے ہیں۔

ہم بھی بدلنے لگے تھے۔ پہلے ہم اپنی خوشیاں اپنے شوق اپنی ٹکٹیں ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے آہستہ آہستہ یہ سوچ کر کہ اپنی پریشانی دوسرے کو بتائی تو وہ بھی پریشان ہوگا۔ ہم ایک دوسرے کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے اور بے چینیاں اپنے تک محدود رکھتے۔ ایک وقت آیا کہ ہمارے پاس بات کرنے کو الفاظ کم پڑنے لگے۔ ہم کتنا کتنا وقت خاموش بیٹھے رہتے۔ ماما شاید بڑی شدت سے یہ محسوس کر رہی تھیں جبھی اس روز انہوں نے ہم سب کو بلایا۔

”ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑو اور ایک دائرے میں ہو جاؤ اور عہد کرو کہ تم لوگ اپنی خوشیاں اور غم ہمیشہ آپس میں بانٹو گے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ایک دوسرے کو بتاؤ گے۔ اپنے دوستوں کو آپس میں ملواؤ ہر کام، ہر انسان، ہر سوچ آپ تینوں کی ایک ہونی چاہیے اور ہمیشہ ایک دوسرے کی مصروفیت سے آگاہ رہو ورنہ تنہا ہو جاؤ گے۔ یہی دعا کرو کہ ہمیشہ اکٹھے رہو تنہائی کبھی تمہارا مقدر نہ بنے۔“ ماما کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔

”ماما آپ بھی آئیں ناں ہمارے ساتھ عہد کریں۔“

”نہیں، یہ بہن بھائیوں کا آپس کا عہد ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

مہربانو اور فہد نے اکٹھے اے لیولز کیا۔ امتحانوں کے بعد ڈیڈی نے اے اسپتال میں اپنے آفس میں بلایا اور بغیر کسی تمہید کے اس سے کہنے لگے۔

”ایک بہت اچھا رشتہ ہے تمہارے لیے۔“ اس سے پہلے کہ وہ بات مکمل کرتے مہربانو نے ایک دم کہا۔

”میری تعلیم ابھی صرف ایف اے کے برابر ہے۔“

مجھے ساری عمر اپنی ماں کی طرح جاہل ہونے کا طعنہ نہیں سننا حالانکہ انہوں نے پرائیویٹ بی اے بھی کر لیا تھا پھر بھی وہ جاہل ہی کہلائیں۔ مجھے ماسٹر فہد کرنا ہے۔ ہم چند ہفتوں تک انگلینڈ جانے والے ہیں۔ میرا اور فہد کا وہاں داخلہ ہو چکا ہے۔ ہم جانے سے پہلے آپ کو بتا دیں گے۔“

ڈیڈی کی خواہش تھی کہ فہد میڈیسن لے مگر وہ آئی ٹی میں دلچسپی رکھتا تھا۔ سو ڈیڈی اس سے ناراض تھے اور اب مہربانو نے بھی رشتے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ناراضی ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی مگر وہ ضبط کر گئے۔

”ڈیڈی شادی جب بھی ہوگی آپ کی مرضی سے ہوگی آپ ہمارے ڈیڈی ہیں۔ میں آپ کی مرضی کے خلاف کبھی نہیں جاؤں گی مگر پلیز ابھی چار سال تک نہیں۔“ مجھے پڑھائی مکمل کرنی ہے۔

چند ہفتوں بعد وہ دونوں لندن چلے گئے ماما نے خوشی سے انہیں رخصت کیا مگر اب ہمارا روشنی کا مینار دھند میں چھپ رہا تھا۔۔۔۔۔ کیوں؟

میں جہاں سے چلا تھا بس کے چھ گھنٹوں کے سفر میں پھر اُمی ”کیوں“ پر کھڑا تھا۔ بس اب اسٹاپ پر کھڑی تھی میرے ارد گرد کے تمام مسافر اتر چکے تھے۔ کنڈیکٹر میرا انتظار کر رہا تھا۔ یہ بتاتا چلوں کہ شاید راستے میں بھی بس ایک دفعہ کی تھی مگر میں دوسرے مسافروں کے برعکس اپنی جگہ پر ہی چپکا بیٹھا رہا تھا یا اپنے ماضی میں کھویا ہوا تھا اب جبکہ اترنا ہی مقصود تھا تو میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر نکل کر ٹیکسی لی۔ دوپہر کو چلا تھا اب شام کے سائے پھیل رہے تھے ملگجاسا اندھیرا ہر طرف اتر آیا تھا۔

میں نے گھر میں آکر دروازہ کھولا۔ پہلے ڈاک دیکھی دو خط تھے فہد کا اور مہربانو کا۔ دونوں علیحدہ علیحدہ

منزل تھی جن کی اور

لغافوں میں پوسٹ کیے تھے۔ اندر گھر میں خاموشی اور گہرے سناٹے نے خیر مقدم کیا۔ میں جانے سے پہلے روشنی جلتی چھوڑ گیا تھا تا کہ گھر خالی ہونے کا لوگوں کو پتا نہ چلے۔ میرا خیال تھا کہ میں فوراً ہی سامان اور کھانے کے ڈبے جو ماما نے فریزر میں رکھے تھے لوں گا اور اسلام آباد نکل جاؤں گا پھر سوچا خط پڑھ لوں۔ فہد نے خط انگریزی میں لکھا تھا۔ میں اور مہربانو اردو میں زیادہ اچھے تھے باوجود کوشش کے بھی فہد کے نمبر ہم سے کم ہوتے تھے۔ بی جان اور ماما نے ہمیں اردو پڑھنے اور لکھنے میں بہت مدد کی تھی ان کا کہنا تھا کہ انگلش تو تم سیکھ ہی لو گے مگر اردو لکھنا اور پڑھ کر سمجھنا محنت طلب ہوتا ہے۔ بچپن سے انہوں نے ہمیں اردو کتابیں اور شعرا کا کلام پڑھنے کی عادت ڈالی تھی۔

فہد نے لکھا تھا میں گھر کو مرس کر رہا ہوں۔ تمہارے لیے میں اداس ہوں۔۔۔۔۔ میں آکسفورڈ میں ابھی تک کسی کو بھی دوست نہیں بنا پایا۔ انٹر پورٹ پڑھتی رخصت کرنے آئے تھے مگر میری نظریں ماما کو ڈھونڈتی رہیں۔ انہوں نے گھر میں ہی خدا حافظ کیوں کہہ دیا تھا۔ مہربانو جب سے آئی ہے صالحہ آنٹی کے گھر ہے وہیں سے یونیورسٹی چلی جاتی ہے۔ آنٹی نے اسے ہاسٹل نہیں جانے دیا۔ لگی ہے وہ گھر میں رہ رہی ہے۔ شاہد میں تمہیں ایک بات بتاؤں، میں ماما کو تو مرس کرتا ہی ہوں مگر مجھے ڈیڈی بھی بہت یاد آتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے فلیٹ میں جب رہتے تھے تو ہم سارے ڈیڈی کا انتظار کرتے تھے، وہ آتے تھے ہم کو ڈانٹتے کہ ہم ابھی تک باہر کیوں ہیں گھر کے اندر کیوں نہیں گئے۔ ہم انہیں کبھی یہ نہیں کہہ پاتے تھے کہ ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے پھر نئے گھر میں آکر بھی ہم سیڑھیوں پر بستے رکھ کر ان کی راہ دیکھا کرتے تھے اور ایک دن جب بہت ڈانٹ پڑی تھی تو اس کے بعد سے ہم اوپر کھڑکی میں کھڑے ہو کر انہیں آنا دیکھتے تھے۔ ماما کو بھی پتا تھا کہ ہم کھڑکی کے پاس کیوں کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ رشتے بھی عجیب ہیں۔ ماما کہتی تھیں پیار کے رشتے چاہت سے نبھانے چاہئیں ہمیں پیار تو تھا مگر ڈیڈی کی چاہت کہاں

گی۔ جیل میں جائیں گے یہاں کا قانون کسی پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا۔“ پھر تمہارے انکل ذرا نرم لہجے میں بولے میرے دوست اپنے سے کمزور پر کیا ہاتھ اٹھانا اور چند ماہ میں وہ آپ کے بچے کی ماں بن جائے گی۔ ماں قابل عزت ہوتی ہے۔“ اس کے بعد انہوں نے دوبارہ ایسا نہیں کیا مگر دوسرا گھر لینے کی جلدی کی مگر ہم نے بھی انہیں دور نہیں جانے دیا۔ میں نے شاہینہ سے کہا کہ تم واپس چلی جاؤ ابھی شادی کو ایک سال بھی نہیں ہوا اور ابھی یہ حال ہے تو آگے کیا ہوگا۔ اس نے بڑی عجیب بات کی تھی اس نے کہا تھا۔

”ماں رخصت کرتے وقت کہتی ہے مرنا جینا سب خاوند کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی تربیت پر بھی حرف نہیں آنے دینا یوں واپسی کے دروازے ہم خود بند کرتے ہیں۔ خاوند کا نام بیوی کے لیے اتنا معتبر ہوتا ہے کہ وہ اعتبار کے سب رشتے چھوڑ آتی ہے۔ میں کیا ہار مان لوں؟ میری محبت اتنی کمزور نہیں۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں کوئی گرہ ہے جو میں کھول نہیں پارہی۔ جس دن مجھے حل مل گیا سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کے چہرے پر خوش آئند مستقبل کی امید روشنی بن کر چمک رہی تھی۔ وہ بہت پُر امید تھی پھر اگلے سالوں میں دو اور بچے۔ وہ واپسی کا یا علیحدگی کا کیسے سوچتی۔ تیسرے بچے پر وہ بہت کمزور تھی۔ تین سالوں میں تین بچے ڈاکٹر تمہارے ڈیڈی پر بہت ناراض ہوئی انہوں نے کہا۔ ”آپ آپریشن کر دیں۔“ اس پر وہ اور ناراض ہوئی۔ ”اکیس بائیس سال کی لڑکی ہمارے ملک میں بہت چھوٹی سمجھی جاتی ہے۔ آپ خود اپنا آپریشن کروائیں اور اب بچہ ہوا تو میں آپ پر مقدمہ کر دوں گی پھر کورٹ میں جواب دیجیے گا۔“

اگلا سال بہت اچھا گزرا۔ میرا بیٹا ظہیر تم سب کا دیوانہ تھا۔ اس کے لیے آپ تینوں کھلونوں کی طرح تھے۔ اسکول سے آکر تمہارے ساتھ ساتھ رہتا۔ ہاں شاید ایک ضروری بات جو صالحہ آئی نے بتائی کہ جب میں چھوٹی تھی تو رات کو بہت روتی تھی۔ جوں جوں بڑی ہوئی گال پر ہاتھ رکھ کر روتی تھی اور صرف ڈیڈی کی گود میں جا کر

باورچی خانے میں آئی تو اسی وقت شاہینہ ہاتھ روم سے شاید وضو کر کے نکلی تھی، میں ہمیشہ کی بے پروا تو لیا رکھتا ہوں گئی تھی۔ پانی کے قطرے اس کے چہرے پر تھے اور کھڑکی سے آئی مدہم روشنی میں چمک رہے تھے مجھے اس کا چہرہ اتنا خوب صورت لگا کہ میں اپنی نظریں نہ ہٹا پائی۔ اس نے سوچ ڈھونڈ کر روشنی کر دی اور سلام کیا۔

”رات میں تو تعارف نہیں ہو سکا تھا، میں بہت تھک گئی تھی میرا نام شاہینہ ہے اور آپ مسز انور ہیں ہاں.....“ مدہم لہجے میں بولتی وہ مجھے بالکل اپنی سی لگی۔ میں نے اپنا بتایا اور کہا کہ آج سے ہم دوست ہیں۔ اس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور بچوں کی سی خوشی سے بولی۔ ”پکے والے دوست.....“ اور زندگی میں، میں نے اس سے بڑھ کر کسی اور کو دوست نہیں مانا۔ ہم چار سال اکٹھے رہے۔ اسی بلڈنگ میں ہم سے اوپر والا فلیٹ انور نے کوشش کر کے ان کے لیے کرائے پر لے لیا تھا۔ انور نہیں چاہتے تھے کہ تمہارے ڈیڈی شاہینہ کو لے کر کہیں دور جا کر رہیں شاہینہ کو انہوں نے اپنی چھوٹی بہن کی طرح ہمیشہ جانا تھا۔ میری وہ دوست بھی تھی اور بہن بھی..... تمہارے ڈیڈی بظاہر مجھے نظر آنے والے مگر پتا نہیں کیوں ایک ایسے شوہر نہیں تھے۔ شاہینہ سے ان کا رویہ ہنگ آمیز ہوتا تھا۔ اکثر کہتے جاہل ہو، اسماٹ نہیں ہو..... تمہیں کچھ آتا نہیں، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ اسماٹ بھی تھی، بات چیت میں بہت رکھ رکھاؤ تھا۔ بس احمد رضا کا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔ اکثر رات کو کمرے سے تمہارے ڈیڈی کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آتیں مگر اگلے ہی دن ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہوتے اور شاہینہ سمندر کی طرح گہری..... مجال تھی کہ کچھ ظاہر ہونے دیتی۔ ایک دن تو حد ہو گئی شاہینہ کے گال پر پورے ہاتھ کا نشان تھا میں نے دیکھا مگر خاموش رہی۔ انور نہ رہ سکے میرے سامنے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو کہا میں شاہینہ کو بہن مانتا ہوں اور آپ انگلینڈ میں ہیں اگر آئندہ اس پر ہاتھ اٹھایا یا سختی سے بولے تو شاہینہ نے کچھ نہ کیا تو میں پولیس کو بلاؤں گا آپ کا سارا مستقبل، نوکری، واپس پر لگ جائے

سامان فریزر میں رکھا اور کتابیں اور کپڑے ویسے ہی چھوڑ دیے۔ دھیان مہربانو کے خط میں تھا۔ میں نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ یہ پہلا خط تھا جو اتنے عرصے میں اس نے لکھا تھا۔ ٹیلیفون پر کافی تفصیل سے بات چیت ہوتی رہتی تھی مگر خط کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ مہربانو نے اردو میں لکھا تھا اور کافی لمبا خط تھا۔ لگتا تھا اس کے پاس کافی باتیں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ میں نے سرسری طور پر نظریں دوڑائیں پھر کرسی پر بیٹھ گیا جو باتیں اس نے لکھی تھیں وہ میرے لیے بالکل نئی تھیں۔ اس نے لکھا تھا۔

”شاہد تم حیران ہو گے آئی صالحہ ماما کے اور ڈیڈی کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہیں کہ ہم بھی نہیں جانتے۔ ہم کل ساری رات باتیں کرتے رہے تھے۔ انکل بار بار آکر کہتے تھے کہ اب سو جاؤ وہ ماما کی باتیں کر کے خود بھی رورہی تھیں اور پھر مجھے بھی رونا آتا تھا۔ آئی صالحہ کو ایک، ایک لمحہ یاد تھا۔ جب ماما اور پاپا شادی کے بعد یہاں آئے تھے شادی کے پانچ ماہ بعد وہ یہاں آئے تھے اس سے پہلے ڈیڈی اکیلے تین سال کے لیے یہاں آئے تھے تو انکل انور اور وہ اکٹھے رہے تھے اور ان دونوں کی دوستی ہوئی تھی پھر ڈیڈی واپس پاکستان چلے گئے اور تقریباً ایک سال کے بعد ماما کے ساتھ آئے تھے۔ آئی کا کہنا تھا کہ انہوں نے جب ماما کو دیکھا تو سوچا کہ اتنی معمولی سی شکل صورت کی لڑکی جھینمی سی شخصیت اتنے خوب صورت آدمی کو کیسے پسند آگئی۔ انکل انہیں بتا چکے تھے کہ ڈیڈی کی اپنی پسند کی شادی ہے۔ شاہد وہ کہنے لگیں کہ تمہاری ماما سے مل کر میں نے گھر آکر تمہارے انکل سے کہا کہ یہ کیا پسند ہے؟ مگر وہ حسب عادت خاموش رہے ان کی عادت تھی کہ وہ کسی کے بارے میں بھی اپنی رائے کا جلدی اظہار نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے پاس تین بیڈ رومز کا گھر تھا ہم نے ایک کمرہ تمہارے ڈیڈی کے لیے ٹھیک کر دیا تھا۔ تم دیکھ ہی رہی ہو یہاں گھر چھوٹے ہی ہوتے ہیں غسل خانہ بھی ایک ہوتا ہے۔ یہ لوگ رات کو دیر سے پہنچے تھے۔ جہاز میں کھانا کھا چکے تھے لہذا آتے ہی کمرے میں چلے گئے۔ صبح صبح میں

تھی۔ شاہد مجھے ڈر لگتا ہے کیا ہم کبھی دوبارہ اکٹھے اس گھر میں ہوں گے؟ جب میں نے اس دن ماما کو اپنے ساتھ انٹرپورٹ پر نہیں دیکھا تو مجھے ایسا کیوں لگا تھا کہ میں دوبارہ انہیں نہیں دیکھ پاؤں گا۔ میں دوبارہ کبھی ان کے ساتھ نہیں رہ پاؤں گا۔ شاہد میرا دل کیوں ڈرتا ہے؟ میرے بھائی میرے دوست تم جلدی سے میرے پاس آ جاؤ میں اکیلا نہیں رہ سکوں گا۔“

خط پڑھ کر میرا دل بھی بہت اداس ہوا میں پہلے ہی گھر میں آکر ماما کو مس کر رہا تھا، فہد کے خط نے مزید غم زدہ کر دیا۔ میں نے چیزیں اٹھائیں نیچے گیراج میں آکر سامان کار کی ڈیڈی میں رکھا اور سوچا ڈرائیور کو آواز دیتا ہوں کہ مجھے اسلام آباد چھوڑ آئے۔ ڈیڈی کی کار گیٹ سے اندر آئی وہ اکیلے ہی تھے مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔

”تم کہیں جا رہے ہو؟“

”شفیق کے پاس جا رہا ہوں، ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔ ڈرائیور کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”ڈرائیور کا کیوں.....؟“ انہوں نے کہا۔ تمہارا لائسنس آگیا ہے خود گاڑی لے جاؤ۔“ پھر کار سے انہوں میرا لائسنس نکالا اور مجھے دیا۔

”شکریہ ڈیڈی!“ میں فوراً بولا۔

”نہیں شکریے کی ضرورت نہیں..... فہد کا یا مہربانو کا کوئی خط یا فون آیا؟“ بظاہر بڑی بے پروائی سے انہوں نے پوچھا۔ میں نے جانے کس جذبے کے تحت اپنے ہاتھ میں پکڑا فہد کا خط ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

”یہ تو تمہارے نام ہے۔“ انہوں نے لفافے کو الٹ پلٹ کیا۔

”آپ بھی پڑھ لیں کوئی حرج نہیں، مہربانو کا بھی خط ہے مگر میں نے ابھی پڑھا نہیں، اچھا ڈیڈی میں جاؤں میرا کل ٹیسٹ ہے۔“ میں نے غلٹ دکھائی اور کار کی طرف مڑ گیا اور وہ اندر چلے گئے اور میں اسلام آباد چلا آیا۔

شفیق نے ایک چابی مجھے دے رکھی تھی میں نے دیکھا کہ ابھی کمرے میں اندھیرا ہے اس کا مطلب تھا ابھی شفیق کمرے میں نہیں آیا۔ میں نے اندر آکر فریزر کا

”سچ بول دو۔ پریشان تو وہ ہوں گے مگر کچھ جائیں گے کم از کم میں کوفت سے بچ جاؤں گا۔“ اگلے دن ڈاکٹر صاحب کو میں نے اپنا فون نمبر بتا دیا انہوں نے کہا۔ وہ اس وقت مریض دیکھ رہے ہیں، شام میں بات کریں گے اور ماما سے بھی بات کروائیں گے۔ ”بس تم آرام اور یکسوئی سے پڑھائی کرو ماما کی فکر نہیں کرو۔ she is in safe hands“ مجھے تسلی ہوئی۔ کلاسز کے بعد pco سے مہربانو سے بات کی اس نے چھوٹے ہی کہا کہ ماما کالہا ہورے فون آیا تھا وہ اپنی کسی کیملی کے گھر ہیں اس لیے ہم راول پنڈی ٹیلیفون نہ کریں، مجھے حیرت اور خوشی ہو رہی ہے کہ اس تمام عرصے میں ماما پہلی بار کسی کیملی کا ذکر کر رہی ہیں کہ وہ خود ہی کچھ دنوں میں دوبارہ رابطہ کریں گی ہم فون نہ کریں۔ اس سے بات کرتے ہوئے مجھے لگا کہ میرے سر سے ماما نے بہت بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اپنی پریشانی اور طبیعت کی خرابی میں بھی انہیں ہمارا دھیان تھا کہ ہم سکون سے رہیں۔ انہوں نے فہد سے بھی بات کر لی ہوگی مجھے یقین تھا۔

رات آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب کا موبائل پر فون آ گیا۔

”سنو میں تمہیں زیادہ دیر سسپنس میں نہیں رکھنا چاہتا۔ تمہاری ماما کیوں پریشان تھیں ابھی مجھے اس کا کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ آئندہ چند دنوں میں شاید وہ خود ہی کچھ بتادیں یا پھر ہم اپنے طریقے سے معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ تمہیں صرف ایک بات یہ بتانی ہے کہ تمہاری ماما میری بیوی صفیہ کی کزن ہیں اور وہ اس وقت میرے گھر میں ہیں۔ اس کے کمرے میں ٹیلیفون ہے میں تمہاری بات کرواتا ہوں۔ تم جب چاہو، اس نمبر پر بات کر لینا یہی نمبر میرے گھر کا بھی ہے اور میں اس وقت گھر سے ہی بات کر رہا ہوں نمبر تمہارے موبائل میں آچکا ہوگا سیو کر لینا۔ لو اب میں فون تمہاری ماما کو دے رہا ہوں۔“ غالباً وہ کسی دوسرے کمرے سے بات کر رہے تھے ان کے قدموں کی آواز آرہی تھی۔

”ماما آپ کیسی ہیں؟“ میرے منہ سے لفظ نہیں

تھا۔ بعض اوقات رشتے نبھانے واقعی مشکل ہو جاتے ہیں۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔ میں نے مختصر اسے ڈاکٹر سے ملنے کا احوال بتایا اور یہ بھی کہ صبح پہلا کام موبائل فون خریدنا ہے تاکہ ماما سے بات کر سکوں۔ اس نے اپنا فون نکالا اور کہنے لگا۔

”یہ آج ہی ابانے دیا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ یہ فون اب ضرورت کی چیز ہے۔“ ساتھ ہی وہ ہنسا۔۔۔۔۔۔ ”یار شاہد کل تک ہم اسے خرافات اور اسراف سمجھتے تھے اور وقت کا زیاں بھی اب دیکھ لو ہمارے بزرگ بھی وقت کے ساتھ رنگ بدل رہے ہیں، یہ تم رکھ لو، کریڈٹ اباجان نے ڈالوا دیا ہے ہم ہر وقت ساتھ ہی ہوں گے مل کر گزارہ کر لیں گے۔ مجھے ضرورت ہوئی میں استعمال کر لوں گا ورنہ تم ماما سے بات کر لینا۔“

”میرا خیال ہے میں کل دوسرا لے لوں گا یہ تم ہی رکھو۔“ میں ہنسی پکپکایا۔

”دیکھو شاہد تم دو تین ماہ میں انگلینڈ جانے کا سوچ رہے ہو اور سنو مجھے پتا ہے میری کوئی گرل فرینڈ ہے نہ تمہاری جس سے ہم نے چھپ چھپا کر بات کرنی ہے۔ آؤ پہلے اس کی کارکردگی تو دیکھیں۔ ہمارے لیے ایک نئی ٹیکنالوجی ہے یہ ٹیکسٹ میسجز وغیرہ۔۔۔۔۔۔ کرنا آؤ ذرا دیکھیں تو اس میں کیا کیا گن ہیں۔“ ہم موبائل فون چیک کرتے رہے اور ہنستے رہے کہ ایک جہاں اس کے اندر ہے پھر پڑھائی کی اور سو گئے۔ میں نے سوچا تھا کہ گھر سے ماما کو فون کر کے چلوں گا مگر یہ سوچ کر کہ رات میں ڈاکٹر صاحب نے فون کرنے کو منع کیا تھا میں نے انہیں اپنے پیچھے کی اطلاع بھی نہیں دی تھی دوسری فکر مجھے فہد اور مہربانو کی طرف سے تھی، وہ باقاعدگی سے ماما کو گھر میں فون کرتے تھے ماما نے کہا ہوا تھا کہ ہفتے یا اتوار کی رات کو فون کیا کرنا۔ اب اگر گھر سے کسی نے جواب نہ دیا تو وہ ضرور پریشان ہوں گے کہ ماما فون کیوں نہیں اٹھا رہے ہیں۔ مجھے اس مسئلے کا کوئی حل نہیں سوچہ رہا تھا۔ انہیں ماما کی طبیعت کی خرابی کا بتاؤں یا نہیں۔۔۔۔۔۔ اسپتال میں رہنے کا کیا جواز دوں پھر ماما کی بات یاد آئی۔

میں نے اپنے براؤن لینس اتار دیے ہیں۔ آنٹی سے بتایا ہے کہ ماما کو میری نیلی آنکھیں پسند نہیں کیونکہ وہ ڈیلیٹی سے ملتی ہیں تمہیں پتا ہے ناں میں نے ڈیلیٹی کی دوسری شادی پر ناراضی کے اظہار کے لیے براؤن لینس لگا لیے تھے لوگ کہتے ہیں نیلی آنکھیں بے وفا لوگوں کی ہوتی ہیں۔ میں بے وفا نہیں ہونا چاہتی تھی مگر کیا فرق پڑا ماما کو چھوڑ آئی۔ تمہیں چھوڑ آئی۔ فہد دوسرے شہر میں ہے، ڈیلیٹی کا سوچتے ہوئے ایک احساس سر اٹھاتا ہے صرف اور صرف اداسی کا، تہی دامنی کا۔۔۔۔۔۔ وہ ہمارے ہوتے ہوئے بھی ہمارے نہیں۔ ماما کے لیے دل کڑھتا ہے ان کے ہاتھ کیا آیا۔ تنہائیاں اور بے بسی وہ ہمارے لیے سب کچھ سہتی رہیں اور ہم انہیں چھوڑ آئے یہ جدائی ختم ہوگی یا نہیں میرا دل سہار ہتا ہے تم ماما کا دھیان رکھنا اپنا بھی۔۔۔۔۔۔ اور کبھی کبھی۔۔۔۔۔۔ ڈیلیٹی سے بھی ملتے رہتا۔ ہمارے درمیان اللہ تعالیٰ کا بنایا رشتہ تو ہے ناں اللہ حافظ۔۔۔۔۔۔ تمہاری بہن مہربانو۔۔۔۔۔۔“

خط پڑھتے پڑھتے کب میرے آنسو بہنے شروع ہوئے یہ احساس ہی نہیں ہوا۔ پہلے میں بے آواز روتا رہا پھر اٹھا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے غسل خانے میں چلا گیا۔ بے آواز بلند رویا، دھاڑیں مار کر رویا۔۔۔۔۔۔ لگتا تھا آج اس تنہائی کی رات میں میری جان نکل جائے گی مگر پھر آواز ہچکیوں اور سسکیوں میں بدل گئی۔

دروازے میں چابی لگنے کی آواز سنائی دی میں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور خشک کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ شفیق نے میری طرف دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔ کچن کی طرف چلا گیا۔ مجھے آواز دی۔

”شاہد آؤ گرم، گرم کھانا لایا ہوں۔ لاہور سے شادی والے مہمان یہاں چچا کے گھر سیر کے لیے آئے ہیں امی بھی آئی ہیں مجھے پتا تھا تم نے کھانا نہیں کھایا ہوگا جلدی سے آؤ۔ شاندار دعوت تھی وہاں۔ میں اپنا کھانا بھی اٹھا لایا ہوں آؤ مل کر کھاتے ہیں۔“ کھانے کے دوران اس نے لاہور کے ٹرپ کا بھی پوچھا۔

”یار مجھے بہت افسوس ہوا میں وہاں موجود نہیں

چپ ہوتی تھی ورنہ آنکھیں بند کر کے روتی رہتی تھی۔ دو سال کی عمر میں انکل انور اور ڈیلیٹی مجھے سائیکالٹرسٹ کے پاس لے گئے کیونکہ بچوں والی ڈاکٹر بھی پریشان ہوتی تھی۔ انہوں نے مجھے دیکھا پھر ڈیلیٹی سے پوچھا کہ ان کے اپنی وائف سے کیسے تعلقات ہیں آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں گو مجھے امید تو نہیں مگر شاید آپ نے بھی اس کی پیدائش سے پہلے یا اس کے سامنے بیوی کے منہ پر پتھر مارا ہو یا کسی اور کو مارا ہو اور بچی ہم گئی ہے۔ انکل نے ڈیلیٹی کی طرف دیکھا انہوں نے شرمندگی سے گردن جھکالی۔ انکل انور نے بات سنبھالی اور کہا کہ نہیں مگر ہم آئندہ سے دھیان رکھیں گے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ بس ایک علاج ہے کہ جب بچی روئے تو آپ پیار سے بہلائیں، سختی نہ کریں، میں نے آنٹی سے کہا کہ یہ عادت تو میری ابھی تک ہے میں ہسٹریک ہو جاتی ہوں روتے ہوئے۔۔۔۔۔۔ شاہد میں نے انہیں اس فنکشن والی رات کا بتایا پھر باقی باتیں بھی کہ کس طرح سے ڈیلیٹی نے دوسری بیوی کو گھر میں لا کر بٹھایا ہے بغیر یہ سوچے کہ ہم سب پر کیا گزر رہی ہے اور یہ بھی کہ باہر آنے کی اصل وجہ بھی ڈیلیٹی کی دوسری شادی ہے ورنہ ہم اپنا گھر اور ماما کو کبھی چھوڑ کر نہ آتے۔۔۔۔۔۔ اور شاہد میں نے انہیں اس رشتے کا بھی بتایا جو ڈیلیٹی میرے لیے لائے تھے اس پر آنٹی غصے میں آگئیں اور کہنے لگیں۔ ”احمد رضا نے مجھے زبان دی ہوئی تھی وہ کیسے وعدہ خلافی کر سکتا ہے۔ صبح ہی میں اس سے بات کرتی ہوں۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔۔؟ میں حیران ہوئی اس پر وہ چونک کر سیدھی ہو گئیں۔۔۔۔۔۔“ ”اوہو غصے میں پتا نہیں کیا، کیا بول گئی ہوں۔“ میں نے ضد کی۔ ”نہیں مجھے بتائیں اصل بات کیا ہے؟“ اس پر انہوں نے کہا۔ ”ہم سب کی مرضی تھی کہ بچوں کے بڑا ہونے پر اور لائق فائق ہونے پر ہم دوستی کو رشتے داری میں بدل دیں گے اور بس۔۔۔۔۔۔“ میں ہنس کر چپ ہو گئی۔ ابھی تک آنٹی کے بیٹوں سے ملاقات نہیں ہوئی ایک ظہیر ہے اور دوسرا راجیل ہے دونوں نوکری اور پڑھائی کے سلسلے میں گھر سے باہر ہیں۔ ظہیر مجھ سے بڑا ہے اور راجیل تم سے چھوٹا ہے اور شاہد

نکل رہے تھے۔ یہ مشکل بولا۔

”میں ٹھیک ہوں اور شاید تم دھیان سے میری بات سنو..... گھر میں بابا اور اس کی بیوی کو یہ نہ بتانا کہ میں لاہور میں ہوں اور نہ ہی کسی اور کو..... تم اپنی پڑھائی دھیان سے کرو میں بہتر ہوں۔ تم اب امتحانوں کے بعد لاہور آنا اس سے پہلے نہیں..... مگر ٹیلیفون کرتے رہنا اور بینک سے گھر کے اور اپنے خرچ کے پیسے نکالو لیتا۔“ میں نے انہیں بتایا کہ بابا اور ان کی بیوی لمبے عرصے کے لیے گاؤں چلے گئے ہیں اس لیے انہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں اور اپنی جانب سے بھی سلی کروادی اور میں شفیق کے ساتھ ہوں مگر مجھے لاہور نہ آنے کی پابندی پسند نہیں آئی۔

”مما میں آپ کو بغیر دیکھے کیسے اتنا لمبا عرصہ گزراؤں گا۔“

”مہربانو اور فہد بھی تو اتنے عرصے سے بغیر مجھے دیکھے رہ رہے ہیں، تمہیں بھی عادت ہو جائے گی۔ میں اپنا سوچ رہی ہوں کہ میرا کیا ہوگا۔“ ان کی آواز میں بے پناہ اداسی تھی۔

”ماما ہم انشاء اللہ اکٹھے رہیں گے کچھ عرصے کی بات ہے۔“ میں نے انہیں کم اور اپنے آپ کو زیادہ تسلی دی۔ انہوں نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ مجھے تسلی ہو گئی کہ چلو ماما کسی اپنے کے پاس ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے صحیح پہچانا تھا مگر ماما.....؟ شاید اتنا عرصہ گزرنے کے بعد انہیں یاد نہ ہو..... اگلے دو ماہ مصروفیت میں کیسے گزرے ایک تھکا دینے والا وقت تھا۔ گا پے بگا پے pco سے فہد اور مہربانو سے بات چیت ہوتی رہی ماما سے ایک دن چھوڑ کر..... میں اپنی پڑھائی اور امتحانوں کا بتاتا رہا، گھر صرف ایک بار گیا۔ فریزر سے کھانا لینے اور ڈاک چیک کرنے، بلوں کی ادائیگی کی فکر نہیں تھی کیونکہ وہ سارے گھر کے اکٹھے آتے تھے اور ڈیڈی دیتے تھے ہم تو ہر چیز بچت سے کرنے کے عادی تھے بس ہر دفعہ بوجھل پن اور اداسی ذہن پر لے کر آ جاتا۔ سوچا تھا کہ امتحان جس دن ختم ہوا لاہور نکل جاؤں گا مگر شفیق نے کہا وہ بھی ساتھ چلے گا۔

”لاہور میں ڈرائیونگ ذرا اور طرح کی ہے اور مجھے راستے بھی نہیں آتے۔ دوسرے یہ انیکسی خالی کرتی ہے صفائی کروا کر جانا ہے۔ کپڑوں کی دھلائی ہوتی ہے، گندے کپڑوں کا انبار اکٹھا ہو گیا، میس کے بلز دیئے ہیں۔“ کھانا جہاں سے کھاتے تھے دوپہر کا کھانا عموماً ہم اکیڈمی کے میس سے کھاتے تھے کیلینڈر پر نگاہ پڑی تو احساس ہوا جون کا آخری ہفتہ چل رہا ہے۔ کچھ ٹھنڈے کپڑے گھر سے لیتا ہوں۔

ماما سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا گھر کی چابیاں کسی ذمے دار آدمی کے حوالے کر کے آؤں میں نے فوراً کہا۔

”ماما اب میں فارغ ہو گیا ہوں بس میں آپ کو لینے آ رہا ہوں ہم اپنے گھر میں رہیں گے۔“ اس پر انہوں نے بغیر کچھ کہے فون رکھ دیا۔ ہم نے جب پہلے ماما کے ویزے کے لیے اپلائی کیا تھا تو وہاں کے آفیسر نے کہا تھا کہ اگر ڈیڈی اپنے ساتھ ماما کا پاسپورٹ بھیجیں اور وزٹ ویزا کے لیے کہیں تو مل سکتا ہے اب میرا خیال تھا کہ میں ڈیڈی سے کہوں گا کہ وہ اپنے ساتھ ماما کا ویزا اپلائی کریں جائیں یا نہیں جائیں کم از کم ماما کا ویزا تو مل جائے اور وہ میرے ساتھ چلی جائیں گی پہلے ماما نے رخ کر دیا تھا کہ وہ میرے جانے تک کہیں نہیں جائیں گی۔ اب ماما سے دوبارہ بات کرنا تھی۔

میں گھر آیا اسی اداسی اور خاموشی سے سامنا ہوا میں نے اپنے کچھ کپڑے لیے ہر چیز پر گرد کی تہ جی ہوئی تھی۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو نوٹ کیا کہ سب تصویریں غائب ہیں۔ پہلے میں جتنی بار آیا تھا رات میں آیا تھا اور جلدی میں تھا۔ دھیان نہیں دیا تھا، میں واپس کمرے میں گیا تو ایک کارٹن پر نظر پڑی۔ جس پر تصویریں لکھا ہوا تھا۔

”اوہ، ماما نے پیک کر دی ہیں۔“ مہربانو اور فہد کے سوٹ کیمرز بھی پڑے تھے غالباً ماما نے میرے ساتھ روانگی کا پروگرام بنالیا تھا اس لیے یہ سب کچھ پیک کر دیا ہے واپس اسلام آباد آیا باقی کام اگلے دو دن میں ہم نے مل کر سمیٹے اور صبح سویرے لاہور کے لیے نکلے۔ لاہور میں داخل ہو کر شفیق مجھے راستہ بتاتا رہا وہ خود بمن آباؤ میں ہی

منزل تھی جن کی اور

بات ہوئی تھی فکر کی کیا ضرورت ہے۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا۔

”بریگیڈیر صاحب کا کیا حال ہے؟“ انہوں نے چلتے چلتے بریگیڈیر صاحب کے بارے میں پوچھا تھا۔

”ٹھیک ہیں۔ میجر جنرل ہو گئے ہیں۔“

”اچھا..... خوشی کی بات ہے مبارک ہو۔“

”بعض خوشیوں پر ہمارا حق ہوتا ہے پھر بھی وہ

پرائی ہوتی ہیں یہ بھی پرائی ہے ہمارا اس پر کوئی حق نہیں رہا۔“ میری افسردگی پر وہ خاموش رہے۔ آفس پہنچ کر

انہوں نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گئے۔

ایک خاکی رنگ کا لفافہ دراز سے نکالا اور سامنے رکھ لیا۔

پھر کچھ توقف سے بولے۔

”تمہارے آنے سے دو دن پہلے سے میں الفاظ

اکٹھے کر رہا تھا، جملوں کو ترتیب دے رہا تھا کہ تم سے بات

کرنی ہے اب یوں لگ رہا ہے کہ سب لفظ پھر سے غلط ملط

ہو گئے ہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کہاں سے شروع کروں کہ

آخری مرحلہ

اندھی محبتوں اور جذباتی بھونچال کے طفیل کبھی کبھی پیروں تلے ایسے رستے

آ جاتے ہیں جن کی کوئی منزل نہیں ہوتی اور..... زندگی مسائل کے انبار

تلے دبی چلی جاتی ہے، آخری صفحات پر ایچ اقبال کے قلم کا جادو

زخمِ گل

فرش کی خاک جب آسمان کا چاند بنتی ہے تو ہر آنکھ میں حیرانی کی چمک

آ جاتی ہے مگر..... یہ سب اتنا آسان کہاں ہوتا ہے۔ ابتدائی صفحات

کی شان تاریخی لمحات..... ڈاکٹر ساجد امجد کی کاوش

زہر باد

ہر دلعزیز مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کا خوب صورت تحفہ

قارئین پر سوچ کے نئے دروا کرنے والی پر فکر تحریر۔

مسافر

قطرہ قطرہ آنسو بن کر حالات کی سرکش موجوں کے درمیان بہنے

والی میڈم شکیلہ کی اذیتوں کا قصہ..... ناصر ملک کا دلکش انداز

کشکول

زہریلے کرداروں کے درمیان خوب صورت

رشتوں کی کہانی..... انوار صدیقی

کے قلم کی روانی

رہتا تھا ڈاکٹر صاحب کی کلینک کے باہر اس کے بڑے بھائی گاڑی لے کر کھڑے تھے اس نے اپنا سامان نکالا اور مجھے خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ میں نے کار اندر لا کر کھڑی کی۔ ڈاکٹر صاحب مجھے دیکھ کر باہر ہی آ گئے اور ہاتھ ملا کر سفر کے بارے میں پوچھنے لگے اور ساتھ ساتھ کلینک کی طرف چل پڑے۔

”ڈاکٹر صاحب ماما سے ملنا ہے۔“ میں نے کہا،

ان کے کہنے کے مطابق وہ گھر میں تھیں تو دوسری طرف

جانا چاہیے تھا۔

”مجھے تم سے آفس میں بیٹھ کر باتیں کرنی ہیں۔“

”مگر ڈاکٹر صاحب ایک نظر ماما کو تو دیکھ لوں۔“

میں نے بے چینی سے کہا۔

”وہ یہاں نہیں ہیں۔“ انہوں نے کچھ اس طرح

سے کہا کہ میرا دل زور سے دھڑکا۔ اس سے پہلے کہ

میں کچھ کہتا وہ بولے۔

”جہاں اتنے دن انتظار کیا ہے چند گھنٹے اور

سہی۔“ مجھے بھی خیال آیا کہ ابھی دو دن پہلے تو ماما سے

جولائی 2013ء کا شمارہ

رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سیریس ٹانگسٹ

ماہنامہ

کاشف فریض تنویر ریاض

ضیائے نسیم بلگرامی

ڈاکٹر شہیر شاہ سیّد

اوسلہ اندکی ڈپس کہانیاں

مزید

مرزا امجد بیگ کے دلائل، آپ کے خطوط اور محفل شعرو سخن

رکھ کر علامہ

ماہنامہ پاکستان

259 جولائی 2013

258 جولائی 2013

259 جولائی 2013

258 جولائی 2013

کچھ عرصہ یہ ان کے ساتھ رہا۔ بس علیک سلیک تھی۔ غالباً کالج کا کوئی سالانہ فنکشن تھا۔ شجاع فائنل کا امتحان دے چکا تھا، میں ہاؤس جاب کے بعد نوکری کی تلاش میں تھا ہم سب کالج کے لان میں اکٹھے تھے۔ اپنے ساتھ مہمانوں کو لانے کی اجازت تھی۔ انگل اور تینوں لڑکیاں بھی ساتھ تھیں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر احمد رضا بھی موجود ہیں وہ ایف آر سی ایس کر کے کچھ دن پہلے ہی لوٹے ہیں اور پروفیسر زکی دعوت پر آئے ہیں ہم بھی ملنے گئے۔ وہ ہمارے ساتھ کھڑے تھے جب شجاع نے خوشی خوشی بتایا کہ وہ بھی چند دنوں تک انگلینڈ پڑھنے چلا جائے گا۔ ہمیں اس کے پروگرام کا پتا تھا۔ پھر وہ احمد رضا سے کہنے لگا۔

”آئیں سر، میں آپ کو اپنے مہمانوں سے ملواتا ہوں۔“ بریگیڈیر صاحب سے تعارف کروایا وہ ہیلو ہاتے کر کے کسی اور دوست کی طرف چلے گئے۔ پھر شجاع نے نہ جانے کس رو میں شاہینہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ میری کزن ہے۔ خاص کزن، بس سویوں سمجھیں میری خوشی اور زندگی ہے ابھی ایف اے کر رہی ہے جب تک میں واپس آؤں گا یہ ماسٹرز کر چکی ہوگی پھر ہماری.....“ میں نے اسی وقت اسے ٹوک دیا۔

”شجاع ساری باتیں آج ہی کر لو گے۔“ اس پر وہ جلدی سے بولا۔

”سر آپ کل ہمارے گھر آ سکتے ہیں، ہم نے ایک چھوٹی سی پارٹی رکھی ہے صرف چند دوست ہوں گے آپ نے انگلینڈ میں پڑھائی کے بارے میں جانتا ہے؟“ انہوں نے ایڈریس پوچھا اور دوسرے دن شام میں گھر آ گئے۔ زیادہ وقت بریگیڈیر صاحب کے ساتھ بیٹھے رہے۔ شجاع سے اور مجھ سے تھوڑی سی باتیں کیں ہماری پارٹی میں عورتوں میں سے کوئی شامل نہیں تھا۔ شجاع باہر چلا گیا اس کی شاہینہ میں دلچسپی کے بارے میں ہمیں صرف اتنا پتا تھا کہ جب پچھو نے شاہینہ کو مامی کو دیا تو انہوں نے کہا تھا کہ یہ شجاع کے لیے ہمارے گھر میں آئی ہے۔ شجاع نے چھ سال کی عمر کا یہ جملہ سنا ہوا تھا اس کے بعد کبھی کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ سب بچیوں

تولیتے ہیں مگر پچھتااتے ہیں واپس کرنے میں ہنک محسوس کرتے ہیں اور پھر اپنے آپ میں ان چیزوں کو رکھنے کا حوصلہ نہیں پاتے۔ ہم نے عہد کیا کہ ہم آئندہ سے ان کے سامنے کسی چیز کی تعریف نہیں کریں گے۔ ویسے بھی ان کا فائنل ائیر تھا۔ امتحانوں کے بعد کچھ عرصہ ہاؤس جاب کیا پھر سنا وہ باہر پڑھنے چلے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تھوڑا وقف کیا پھر کہنے لگے۔

”اب میں تمہیں شاہینہ یعنی تمہاری ماما کی فیملی کے بارے میں بتاتا ہوں تم کیا جانتے ہو ان کے بارے میں؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”صرف اتنا کہ وہ میرے نانا، نانی، ماموں اور خالہ ہیں سب امریکا میں ہیں، پہلے لاہور میں تھے اور میرے نانا آرمی میں تھے۔ بس اس سے آگے کچھ نہیں، ہم کبھی ملے بھی نہیں۔“

”ماڈل ٹاؤن میں ایک بڑے سے پلاٹ میں دو گھر تھے۔ ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ چھوٹے والے میں ہم تھے اور دوسرا گھر ان بریگیڈیر انکل کا تھا۔ یعنی تمہارے نانا کا۔ پہلے ان کے والدین یہاں رہتے تھے، ریٹائرمنٹ کے بعد خود بھی وہ یہاں آ گئے تھے آنٹی کے چھوٹے بھائی جو عمر میں ان سے بہت چھوٹے تھے اپنے ماں باپ کی وفات کے بعد ان کے ساتھ رہتے تھے۔ اسی گھر میں ان کی شادی ہوئی پھر اوپر کے حصے میں وہ اور نیچے انکل مع فیملی کے رہتے تھے۔ ماموں کے دو بچے تھے شجاع مجھ سے دو سال چھوٹا اور پھر اس سے چھ سال چھوٹی صفیہ۔ شاہینہ، پچھو کی بیٹی تھیں مگر بڑی باجی سے تیرہ سال چھوٹی۔ پچھو نے اسے پیدائش کے بعد مامی کی گود میں ڈال دیا کہ تم ان دونوں کو جڑواں سمجھ کر پال لو انہیں شرم محسوس ہوتی ہے اس عمر میں چھوٹی سی بچی کو سنبھالتے۔ ہم سب میں بہت دوستی تھی میری بہن فاخرہ ان لڑکیوں سے دو سال بڑی تھی مگر بیمار رہنے کی وجہ دیر سے اسکول داخل ہوئی تھی اور انہی کی کلاس میں تھی۔ کہانی مختصر کرتا ہوں۔ شجاع میڈیکل کالج میں مجھ سے دو سال جونیئر تھا۔ جب وہ داخل ہوا تو احمد رضا فائنل ائیر میں تھے پھر اسپتال میں

میں نے کہا کہ میں تو نہیں دوں گا۔ پھر میں کیا کروں گا؟ اپنا پارکر کا چین دے دیتے کہ یہ رکھ لو۔ میں تمہیں چند دن میں واپس دے دوں گا۔ ہم بیٹھے پیچھے جیسے کہ کیسا بے وقوف بنایا۔ کچھ بھی تم سوچ لو۔ کوئی اچھی قیص، جوتا، کتاب، ٹیبل لیپ، بیڈ کور، انہیں یہ باور کروانا کہ یہ ہمیں بہت پسند ہے اور پھر ان کا اس چیز کو حاصل کرنے کا جنون دیکھنے والا ہوتا تھا۔ ایک دن میرا دوست بہت گھبرایا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ یار یہ ڈاکٹر صاحب پاگل ہیں یا ہوسنے والے ہیں۔ ہاں ایک دلچسپ اور عجیب بات تمہیں بتاؤں کہ وہ چیزیں لے کر خود استعمال نہیں کرتے تھے چند دنوں بعد ہمیں وہ ٹوٹی ہوئی یا ڈسٹ بن میں گری ہوئی نظر آتیں یعنی کسی کام کی نہ ہوتیں۔ خیر تو اکرم میرے دوست نے بتایا کہ میں ڈاکٹر احمد رضا کو کسی کام سے بلانے گیا تھا اس سے پہلے کہ دروازہ کھٹکھٹاتا اندر سے ان کی عجیب سی آوازیں سنائی دیں۔ جیسے کسی کو ڈانٹ رہے ہیں یا مار رہے ہیں، میں نے چابی والے سوراخ سے جھانکا جو مجھے نظر آیا وہ تمہیں بتاتا ہوں۔ ان کے قدموں میں بہت سی چیزوں کا ڈھیر تھا وہ زور زور سے ٹھوکریں مار رہے تھے، ہاتھوں سے نوحہ رہے تھے اور ساتھ ساتھ کہہ رہے تھے کہ کیوں؟ کیوں لیں..... عجیب طرح سے غرارے تھے۔ میں نے باہر سے آواز لگائی کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو سرزیری بلارہے ہیں اور بھاگ آیا۔ ہم ان دنوں ہال روڈ والے ہاسٹل میں تھے فائنل ائیر کے اسٹوڈنٹ بھی وہیں ہوتے تھے۔ پیدل کالج کی طرف چل پڑے۔ ہماری پہلی کلاس نہیں تھی اس لیے کینٹین میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے ایک کاغذ کے تین ٹکڑے کیے اور آپس میں تقسیم کیے اپنے دو دوستوں سے بھی کہا اس کارروائی کی وجہ ایک جملے میں لکھیں۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں نے لکھا بلا ضرورت وہ چیزیں لیتے ہیں۔ دوسرے دوست کی چٹ پڑھی اس نے لکھا تھا ان کے دل سے اتر جاتی ہیں یا انہیں پسند نہیں رہتیں۔ اکرم سوچ میں تھا۔ آخر اس نے لکھا guilty۔ یعنی پچھتاوا..... ہم نے اپنی اپنی چٹیں پھاڑ دیں اور سب متفق ہو گئے کہ واقعی! پہلے وہ لے

بات مختصر بھی ہو اور جامع بھی اور تمہیں سمجھ بھی آ جائے۔“ میرا دل پھر زور سے دھڑکا کہ نہ جانے یہ کیسی بات بتانے والے ہیں اور ایک ہی بار کیوں نہیں کہہ چکے۔

”یوں کرو تم پہلے یہ خط پڑھ لو۔“ انہوں نے یہ کہا مگر فوراً ہی ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا۔

”پہلے میں تمہیں کچھ اور بتاتا ہوں کچھ تمہارے ڈیڈی کے بارے میں کہوں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا؟“ ”ڈاکٹر صاحب برا منانے کی اسٹیج سے ہم بہت دور آچکے ہیں۔“ میں برجستہ بولا۔

”ایک بات یہ کہ تم مجھے ڈاکٹر صاحب نہ بولو.....“ انہوں نے ایک دم اپنا لہجہ ہشاش بشاش کر لیا۔ ”تمہاری ماما سے میری رشتہ داری ہے، میں تمہارا انکل لگتا ہوں چچا یا ماموں یا تایا اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔ تمہارے ڈیڈی کے ای میں مجھ سے دو سال سینئر تھے۔ میں انہیں زیادہ نہیں جانتا تھا پھر یوں ہوا کہ میرے والد کی پوسٹنگ کراچی کی ہوگئی، وہ ریلوے میں آفسر تھے۔ مجھے دو سال اسپتال میں گزارنے پڑے۔ جاتے ہی میری کلاس کے لڑکوں نے کہا کہ ایک بات کا دھیان رکھنا سر احمد رضا کے سامنے کسی چیز کی تعریف نہ کرنا۔ کسی بھی طرح تم سے ہتھیالیں گے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اتنا لائق اسٹوڈنٹ جس کی شکل اور عیلت کی دھوم ہے استاد کیا، شاگرد کیا سب ان کی شخصیت سے متاثر ہیں یہ ایسی حرکت کیوں کرتے ہیں، ہم تین دوست تھے اور سائیکا لو جی میں بہت دلچسپی رکھتے تھے فرضی مریض اور فرضی بیماریاں اور پھر ان کے فرضی علاج ہمارا مشغلہ تھا۔ اب ہمارے سامنے ایک اصلی چہرہ تھا ہم اسے سمجھنا چاہتے تھے۔ ہم نے سوچا اور پھر ایک راستہ متعین کیا ہم ان کے سامنے ایک بیکاری چیز کی تعریف کرتے مثلاً سستے سے پین کو یہ کہہ کر کہ یہ پین میرے دادا نے میری سالگرہ پر دیا تھا بس مجھے بہت ہی پسند ہے میں اسے ہر وقت اپنے پاس رکھتا ہوں اور کبھی کسی کو نہیں دیتا۔ وہ آرام سے سنتے رہتے پھر باتوں باتوں میں کہتے۔

”یار وہ پین تو دکھاؤ سنا ہے بہت اچھا ہے۔“ اگر

کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا تھا۔

”اس کے بعد ہمیں پتا چلا کہ احمد رضا صاحب نے آرمی جوائن کر لی ہے۔ چھ ماہ کے بعد وہ لاہور آگئے تھے۔ میری پوسٹنگ ملتان میں تھی۔ اچانک اطلاع ملی کہ شاہینہ کی شادی طے ہو گئی ہے، میں ویک اینڈ پر گھر آیا تو امی نے بتایا کہ پھوپھی کی طبیعت خراب ہوئی ذرا سا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا اس دن میجر احمد رضا ڈیوٹی پر تھے انہوں نے انہیں اسپتال میں داخل کر لیا۔ پھر سنا کہ ان کے ماں باپ رشتہ مانگنے آگئے اور اس طرح سے.....“

”تو ماما نے کچھ نہیں کیا؟“ میں نے ان کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”وہ بہت روئیں بہت منت سماجت کی کہ ان کے بیٹے کی خوشی نہ چھینو مگر کسی نے کوئی توجہ نہیں دی بلکہ انہوں نے زور دے کر کہا کہ شاہینہ کو اس بات کی بھٹک بھی نہ پڑے کہ کبھی بچپن میں یہ بات ہوئی تھی۔ میں اتنا بد دل ہوا کہ شادی میں بھی شامل نہ ہوا۔ بڑے بھائی، باجی سب آئے ہیں ان سے ملنے، میں شاہینہ کی رخصتی کے بعد آیا۔ اس کے بعد ان کی باہر جانے کی اطلاع ملی اور اب میں بیس سال کے بعد شاہینہ سے ملا ہوں جس دن یہ آپ کے ساتھ آئی تھی ڈاکٹر صاحب کی زبانی انکشاف سن کر میں انگشت بدنداں تھا۔

”شاہینہ کی شادی کے بعد ماموں ممانی ناراض ہو کر سن آباد اپنے خریدے گھر میں چلے گئے۔ یہی گھر جس میں اب ہم رہتے ہیں۔ شجاع بہت بیمار رہا بعد میں اس نے ضد پکڑ لی کہ ماموں ممانی اس کے پاس آ جائیں، وہ انگلینڈ سے اپنی پڑھائی چھوڑ کر امریکا چلا گیا تھا۔ پھر بہت سمجھانے پر دوبارہ پڑھائی شروع کی۔ اگلے دو سال میں صفیہ اور فاخرہ دونوں کی شادیاں ہو گئیں..... ماڈل ٹاؤن کے گھروں کی رونق شاہینہ کے جاتے ہی ختم ہو گئی تھی میں نے جب پریکٹس شروع کی تو ماموں ماما دونوں امریکا چلے گئے تھے، یہ گھر بھی خالی تھا ہم اس میں آ گئے۔ فاخرہ اس کامیاں اور میرے والدین پرانے والے گھر میں ہیں۔ انکل اور پھوپھی بھی گھر کرائے پر دے کر امریکا

بھائی جان کے پاس چلے گئے۔ ایک حصہ اپنے پاس ہے جس میں کبھی سال دو سال بعد آتے ہیں۔ بھائی جان اور شجاع کی کوشش سے ماموں ممانی سے صلح تو ہو گئی ہے مگر علیحدہ علیحدہ شہروں میں ہیں اس لیے کبھی کبھار ملتے ہیں۔ ”انکل شجاع نے شادی نہیں کی؟“ میں نے سب وقوفانہ سا سوال کیا۔

”کی تھی یار۔“ انہوں نے ہنس کر کہا۔ ”مامی کی بہت منت سماجت کے بعد وہ مان گیا تھا میری اور صفیہ کی شادی کے ایک ہفتے بعد اس کی شادی ہوئی ماما کی بھانجی کے ساتھ۔ ذہن نے گھر کی سیڑھی پر قدم رکھا تو بے ہوش ہو گئی۔ جون کا مہینہ تھا سب کچھ گرمی سے بے ہوش ہو گئی ہے۔ مگر اس کی بے ہوشی لمبی ہو گئی اسپتال لے گئے۔ وہ ہوش میں تو آ گئی مگر جب سارے ٹیسٹ ہوئے تو پتا چلا کہ دماغ میں رسولی ہے اور کافی خطرناک..... پہلے بھی وہ کبھی کبھار بے ہوش ہو جاتی تھی مگر سب یہ سمجھتے تھے کہ بھوک سے ہوئی ہے یا گرمی لگ گئی ہے۔ شجاع اسے ساتھ امریکا لے گیا۔ تین سال میں تین آپریشن ہوئے علاج وغیرہ سب کچھ کیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکی۔ اس کے بعد شجاع نے کہا کہ بس ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں۔ ہم بڑے دوستانہ ماحول میں باتیں کر رہے تھے انکل نے چائے منگوا لی تھی پھر انہوں نے وہ براؤن لفافہ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اسے کھولا اندر سے اسٹامپ پیپر نکلا جس پر لکھا تھا۔

”میں ڈاکٹر بریگیڈیئر احمد رضا ولد محمد رضا بھٹائی ہوش و حواس اپنی بیوی.....“ آگے مجھے لگا کہ زمین میں دھنس رہا ہوں یا گھپ اندھیرا مجھے نکل رہا ہے، میں نے سر پکڑ لیا۔ انکل نے اٹھ کر مجھے پانی پلایا اور کمر تھپکی۔

”حوصلہ کرو۔ یہ چار سال پہلے سانحہ گزر چکا ہے۔“ وہ طلاق نامہ تھا اور اس پر چار سال پہلے کی تاریخ تھی ساتھ میں ایک خط تھا۔ انگلش میں ڈیڈی کی طرف ہے ماما کے نام۔

”شاہینہ میں نے تم سے شادی کیوں کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آیا۔ تمہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ تم سے ہمدردی

کی وجہ سے نہیں بلکہ اس دس لاکھ کے حق مہر کی وجہ سے چھوڑ نہیں سکتا تھا جو تمہارے لاپچی باپ نے لکھوایا تھا۔ تمہیں چھوڑ دیتا تو تم شاید..... وہ چغہ کیا سمجھتا تھا وہ تمہیں حاصل کر لے گا؟“ یہ دولاٹیں سرخ روشنائی سے انڈر لائن کی ہوئی تھیں غالباً ماما نے کی تھیں کیونکہ خط میں آخر میں ماما کی لکھائی میں ایک شعر لکھا تھا۔ آگے لکھا تھا۔ ”اگر تمہیں پہلے چھوڑتا تو تم بچوں کو ساتھ لے جاتیں۔ اب بچے بڑے ہو گئے ہیں بی بی جان سے وعدہ تھا کہ ان کی زندگی میں تمہیں علیحدہ نہ کروں میں پابند رہا مگر رعنا کی خواہش ہے کہ وہ اس گھر میں تب آئے گی جب میں تمہیں قانوناً طلاق دے دوں تم میری طرف سے آزاد ہو۔ جانا چاہو تو چلی جاؤ ورنہ جب تک شاہد اٹھارہ سال کا نہیں ہو جاتا تم ان کے ساتھ رہ سکتی ہو اسی گھر میں، خرچ اور اخراجات کا میں باپ ہونے کی حیثیت سے ذمے دار ہوں حق مہر کا چیک ساتھ ہے۔“ خط پر جگہ جگہ آنسوؤں کے نشان تھے اور نیچے ماما کے ہاتھ کا شعر لکھا تھا۔

”انجام کارواں تھا اسی بات سے عیاں۔ منزل تھی جن کی اور بنے ہم سفر وہ لوگ۔“

”میری ماما نے یہ خط نہ جانے کتنی بار پڑھا ہوگا اور کتنے آنسو بہائے ہوں گے کس کرب میں چار سال گزارے اور یہ وہی دن بننا تھا جس دن ہم پنڈی سے لاہور آئے تھے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر پانی پلایا۔

”یہ چیک دیکھ رہے ہو، یہ کیش نہیں ہوا۔“ انہوں نے خط کے ساتھ لگا چیک مجھے دکھایا۔ اس پر بڑا سا کراس لگا ہوا تھا۔

”اس کے بدلے میں شاہینہ نے تمہارے ڈیڈی سے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ ان چار سالوں میں بچوں کو نہیں بتائیں گے کہ انہوں نے اسے طلاق دے دی ہے۔ شاہینہ کی حالت بہت خراب تھی دودن اس سے بولا نہیں گیا وہ ایک ہی بات کہتی تھی میرے قدموں تلے زمین نہیں اور میرے سر پر آسمان نہیں، میں کیوں زندہ ہوں؟ چار سال اس نے بڑی بہادری سے گزارے اس کا خیال

منزل تھی جن کی 191

تھا کہ وہ آپ تینوں کے ساتھ لندن چلی جائے گی خود بھی نوکری کر لے گی مگر ایسا نہ ہو سکا۔ وہ اپنی علیحدگی کے بارے میں کسی کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھی انگلینڈ چلے جانے کی صورت میں کسی کو بھی معلوم نہ ہو پاتا۔ چار سال ختم ہو رہے تھے اسے گھر بھی چھوڑنا تھا۔ اخبار تم سے پہلے وہ پڑھ چکی تھی۔ اگر تم نہ کہتے تو پھر بھی اس نے تمہیں میرے پاس ہی لے کر آنا تھا۔ صفیہ کی اور اس کی آپس میں کبھی کبھار بات چیت رہتی تھی مگر مجھے نہیں پتا تھا اور یہاں آ کر بھی اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ میں نے اسے بغیر بتائے دو ٹیلی فون کے ایک بڑے بھائی کو۔ ان سے کہا کہ آپ پاکستان آئیں تھوڑا سا شاہینہ کے بارے میں بھی بتایا۔ انکل اور پھوپھی بھی ساتھ لانے کا کہا۔ بڑے بھائی تو دودن کے بعد پہنچ گئے تھے باقی لوگ بعد میں آئے کوئی پاسپورٹ کا مسئلہ تھا۔ اب چلو تمہیں سب سے ملواتا ہوں۔“

”مگر انکل دوسرا فون کس کو کیا تھا؟“ مجھے خود حیرت ہوئی کہ میرے منہ سے ڈاکٹر صاحب کے بجائے انکل کیسے نکل گیا۔

”اوہ!“ وہ کھڑے ہو گئے۔ ”ارے بھی کس کو کرنا تھا۔ اسی چغہ کو۔ جس کے ایک جملے نے بے قصور شاہینہ کو بیس سال لمبی سزا دلوائی۔ سارا قصور تو اس کا تھا۔ میں نے صرف اس سے یہ پوچھا کہ کیا اب بھی اسے اپنی خوشی اور زندگی عزیز ہے؟“ اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”شاہینہ کہاں ہے؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ ”میں نے کہا یہاں آؤ پھر بات ہوگی۔“ چلتے چلتے ہم کار کی طرف آ گئے تھے۔

”کیوں بھئی ڈرائیو کر لو گے؟“ انہوں نے پوچھا۔ پھر کہنے لگے۔ ”فی الحال میرے ساتھ چلو۔ کار پھر لے جانا۔“ باہر شام ہونے والی تھی اتنا وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں لگا تھا۔ میں ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستہ کافی لمبا تھا۔

”اور کتنی دور جانا ہے اور ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

ہم بچپن میں سنتے تھے۔ وہ سراپا شاہینہ عباس ہیں۔ میری ماما کی کوئی شبیہ ان میں نہیں۔ سوائے اس کے جب وہ میری طرف دیکھتی ہیں۔ وہ یہاں اس گھر میں بیٹی، بہن اور اپنی کزنز کی دوست ہیں، میں اپنے آپ کو کسی کسی وقت بالکل باہر والا محسوس کر رہا ہوں۔ مہربانو تم، فہد اور میں بالکل پس منظر میں چلے گئے ہیں۔ ہمارا کیا بنے گا؟“ مہربانو نے سکون سے سنا اور کہنے لگی۔

”ہم ماما کی خوشی میں خوش ہیں بس! اور تم کب آرہے ہو؟“

”بعد میں بتاؤں گا ابھی تو راول پنڈی جانا ہے۔“ اور خدا حافظ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔ اپنے احساسات بانٹ کر میں ایک دم پُر سکون ہو گیا تھا۔

”میرا خیال ہے یہاں کے کام سمیٹے جائیں ہمیں نوکریوں پر پہنچنا ہے،“ رات کو سب اکٹھے بیٹھے تھے جب ماموں کہنے لگے۔

”میرے بچے اور میاں دہائی چارہ ہیں جلدی آؤ کچھ سوچنا پڑے گا۔“ خالہ نے کہا۔

”ہم تو ابھی نہیں جائیں گے۔ دو ماہ بھی نہیں ہوئے یہاں آئے ابھی تو لوگوں، رشتے داروں سے ڈھنگ سے ملے بھی نہیں۔“ نانا ابو اور نانی اماں کہنے لگیں پھر ماموں کے ماموں بولے۔ ”ہم بھی ٹھہریں گے۔“

نوکریوں والے جائیں میری تو ابھی چھٹی ہے۔ جب تک شاہینہ کے پیپر نہیں آجاتے ہماری خواہش ہے ہم یہاں رہیں۔“ مجھے کچھ سمجھ آرہی تھی اور کچھ نہیں۔ ماموں نے مجھ سے میرے پروگرام کے بارے میں پوچھا۔

”ماموں ابھی تو پنڈی جانا ہے پھر ماما کا پروگرام کیا بنتا ہے؟ اس کے بعد ہی کچھ سوچوں گا اگر ماما نہ جائیں تو میں کئی میں ہی داخلہ لے لوں گا۔“ اس پر ماموں مسکرائے۔

”راول پنڈی کل صبح نکلیں گے وہاں کے کام ختم کرو اور اپنا سوچو، شاہینہ ہماری ذمہ داری ہے، تم فکر نہ کرو۔ اس کے پیپر آجائیں گے ہو سکتا ہے وہ تمہارے ساتھ ہی پاکستان چھوڑے۔ چند دن انتظار کرتے ہیں

دیکھ کر حیران ہوتا رہا کہ سب ماما سے کتنا پیار کرتے ہیں اور اتنے پیارے رشتوں سے ماما اتنا عرصہ کیسے دور رہیں۔ میرا دل ایک دم چاہا کہ میں مہربانو سے بات کروں سوچا باہر نکل کر کوئی پی سی او تلاش کرنا ہوں ماما سے پوچھا اس سے پہلے وہ جواب دیتیں ماموں نے کہا۔

”باہر کیوں جاتے ہو، یہ لو اور ساتھ مجھے کارڈ لیس فون دے دیا جاؤ اندر جا کر بات کر لو اگر ہمارے سامنے نہیں کرنی تو۔“ ماما ہنسنے لگیں۔ میں نے فوراً نمبر ملایا مہربانو نے ہی اٹھایا۔

”مہربانو تمہیں پتا ہے میں اس وقت کہاں سے فون کر رہا ہوں؟“

”ہاں بالکل لاہور پاکستان کا نمبر آیا ہوا ہے میرے سامنے اور اسی لیے میں نے اٹھایا ہے مگر تم ادھر کیوں ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

”میری بات سنو میں عباس ہاؤس ماڈل ٹاؤن میں ہوں۔“

”کیا؟ وہ چینی۔“ نانا کے گھر میں واؤ..... کیسے؟“ میں نے اسے بتایا۔

”کل رات پہنچا ہوں اور صبح سے محبت اور پیار کے منظر دیکھ رہا ہوں۔ صبح جب میں کمرے سے باہر آیا تو نانا، ماما کے ساتھ کھانے کی میز پر تھے اور یقین کرو وہ ماما کے منہ میں نوالے ڈال رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے شاید

میاں آؤ۔ یہ آپ کو بھی ایسے ہی کھلاتی تھی، میری بھی لاڈلی بیٹی ہے آج میرا دل چاہ رہا ہے اس کا بچپن واپس لے آؤں۔ نانی محبت پاش لگا ہوں سے ماما کو دیکھ رہی تھیں۔ ماموں آتے جاتے انہیں پیار کر رہے ہیں نانی ڈھیروں ڈھیر رنگ برنگے کپڑے لائی ہوئی ہیں جو خالہ،

ماما کو اصرار سے پہناتی ہیں ان کی ممانی بھی آتے جاتے کہتی ہیں میری شاہینہ مجھے واپس ملی ہے، میں جتنی خوش

مناؤں کم ہیں۔ میرے لیے وہی زمانہ لوٹ آیا ہے جب یہ یونیفارم میں کالج جاتی تھی پہلے مجھے اور آپا کو بعد میں پیار کر کے جاتی تھی۔ ماما خوب صورت کپڑے پہن کر چلتی

پھر تکی نظر آرہی ہیں اور بات بات پر ہنسی ہیں وہی ہنسی جو

کہ تمہارے بچے ہمارے بچوں کے برابر ہیں، ان کی خوب نہیے گی۔“ بہت خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا۔ ماما رات کو میرے امتحانوں کے بارے میں پوچھتی رہیں، ایک نہ بتانے والی شرمندگی نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ میں ان سے کھل کر بات نہیں کر پارہا تھا۔ پھر انہوں نے گھر کے متعلق اور میرے امتحانوں کے متعلق پوچھا۔ میں نے بھی تسلی بخش جواب دیے۔ میرے باہر جانے کے ارادے سے تو وہ باخبر تھیں، میں نے کہا بس کوشش یہ کرنی ہے کہ ہم تینوں بہن بھائی ایک جگہ ہوں کم از کم ایک ملک میں تو رہیں پھر اخراجات کا سوچنا ہے۔“

”زمینوں سے بی جان کے پیسے جو آتے تھے وہ سب بینک میں جمع ہوتے تھے ان سے ہی فہد اور مہربانو کے جانے کا خرچہ اور فیسوں کا انتظام ہوا تھا۔ ابھی تمہارے لیے بھی پیسے بینک میں ہیں، علی سے کہنا ہے کہ وہ اگر بندوبست کر سکے اور کسی طرح یہ پیسے تم لوگوں کے لیے انگلینڈ بھجوا سکے تو بہتر رہے گا۔ تم چچا سے بات کر لینا۔“ اس پر..... مجھے ڈیڈی کی بات یاد آئی انہوں نے مہربانو اور فہد کو کہا تھا کہ لندن والے فلیٹ کا کرایہ وہاں انہیں مل جائے گا اس کے علاوہ اگر وہ کوئی عیاشی کرنا چاہیں تو خود نوکریاں کریں۔ فہد کو بہت برا لگا تھا مگر وہ ضد میں آکر کہنے لگا۔

”وہ پیسے ہمارا حق ہیں اور ہم ڈیڈی کو منع نہیں کریں گے ورنہ وہ یہ بھی اپنی دوسری بیوی کے نام کر دیں گے۔“ میں ماما کو بتاتے بتاتے رک گیا ڈیڈی کا ذکر کرتے ہوئے ایک جھجک سی آڑے آئی۔

”پاسپورٹ کہاں ہے۔“ پھر انہوں نے پوچھا۔

”سب کچھ ادھر ہی ہے میں نے بتایا۔“

”تمہیں راول پنڈی جانا پڑے گا گھراک کر کے چابیاں اپنے ڈیڈی کے حوالے کرنا۔ کارا اگر تم رکھنا چاہو تو ٹھیک ہے مگر میں اسے استعمال نہیں کروں گی بہتر ہے تم

ہو بیں چھوڑ آؤ۔ بس اپنا سامان لے آنا۔ اگلے ایک دو دن میں یہ کام کرنے ہیں۔“ انہوں نے مجھے ماتھے پر پیار کیا اور کہا۔ ”اب سو جاؤ۔ باقی صبح۔“ اگلا سارا دن میں یہ

”لاہور میں ہر جگہ دور ہے، ہم ماڈل ٹاؤن جارہے ہیں۔“ انہوں نے بتایا میرے عجیب سے احساسات ہو رہے تھے، میں وہ گھر دیکھوں گا جہاں ماما کا بچپن گزرا تھا۔ نانا، نانی، ماموں یہ رشتے کیسے ہوں گے کیسے ملیں گے۔ ڈیڈی کے اس سلوک کے بعد وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے کہیں انہوں نے یہ کہہ دیا جیسا باپ ویسا بیٹا تو میں کیا کروں گا، میرا دل چاہا میں واپس لوٹ جاؤں۔ مگر ماما تو میری ہیں یہ سوچ طمانیت لائی۔ انکل کار چلاتے ہوئے میری طرف بھی دیکھ لیتے تھے اچانک پوچھنے لگے۔

”کیوں ابھی کیا سوچ رہے ہو؟ میں نے ابھی وہاں کسی کو بھی نہیں بتایا کہ تم پہنچ گئے ہو۔ میں پہلے تمہیں سب سنا کر بتا کر یہاں لانا چاہتا تھا۔ اپنی ماما کو نہ بتانا کہ تمہیں میں نے وہ خط پڑھا دیا ہے دیکھتے ہیں وہ خود تمہیں بتاتی ہے کہ نہیں اور نہ ہی ڈیڈی کے بارے میں میری کبھی باتیں بتاتی ہیں کبھی ایک باب زندگی کا ختم ہوا۔ اب نئی شروعات ہے۔ ارے میں یہ تو پوچھنا بھول گیا کہیں تم نے خود تو اپنے آنے کا نہیں بتا دیا تھا؟“

”نہیں میں نے وقت کا نہیں بتایا تھا پر مجھے یہ پتا ہے کہ آج ماما کو میرا انتظار ہوگا اور وہ رات ہونے پر گھبرا ہی ہوں گی کہ میں کہاں رہ گیا۔“ میں ہنس پڑا اور کہا۔

”اچھا یوں کرو فون کر دو اور بتا دو کہ تم میرے ساتھ ہو۔“ میرے پاس فون نہیں تھا اور نہ ہی وہاں کا نمبر تھا انہوں نے کچھ سوچا اور خود اپنے فون سے نمبر ملا کر مجھے پکڑا دیا کہ بات کر لو، اتفاق سے ماما نے ہی فون اٹھایا

میں نے بس اتنا ہی بتایا کہ انکل کے ساتھ تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں وہ بہت خوش ہوئیں۔ دو تین موڑ کے بعد عباس ہاؤس سامنے تھا روشنیاں ہی روشنیاں تھیں یا مجھے اندھیرے راستوں کے بعد چکا چونڈ لگ رہی تھی۔

وہاں سب ملے نانا، نانی، ماموں، ممانی، خالہ بس خالو نہیں آئے تھے خالہ بھی جانے والی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں۔

”واہ بھئی شاہینہ تمہاری جلدی شادی سے یہ تو ہوا

”تمہیں غیرت نہیں آئی ماں کی شادی کروا تے۔“ مجھے بھی غصہ آ گیا حالانکہ غصہ کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”غیرت؟ غیرت تو ہمیں تب آئی تھی جب آپ نے شادی کی تھی اور ہم دوستوں کے سامنے زمین میں گر گئے تھے۔ غیرت سے ہم اس دن بھی مرے تھے جب آپ دوسری بیوی کو گھر میں لائے تھے دوسری شادی سنتے ہی رسول مگر طلاق؟ اسے آپ کیا کہیں گے قبیح حرکت یا نہیں۔ یہ شادی میں نے نہیں ان کے والدین نے کی ہے۔ میں نے آپ کا خط پڑھ لیا ہے۔ آپ ظالم تو تھے مگر اتنے؟ یہ اندازہ نہیں تھا۔ آپ نے ایک ماں کو 10 لاکھ کے عوض ماما کی سولی پر لٹکا دیا۔ چار سال کے لیے یہ کہہ کر کہ ان کی اپنی اولاد ان کے ساتھ نہیں جاسکتی۔ کیوں ڈیڑی کیوں کیا آپ نے ایسا؟ آپ کو بتاؤں ان کی شادی کس کے ساتھ ہوئی ہے اسی سے جن سے آپ نے انہیں چھینا تھا۔ اس چھینا چھینی کی عادت نے آپ سے سارے رشتے چھین لیے۔ باپ، ماں، دوست، بیوی۔ چلیں بیوی ایک گئی دوسری مل گئی۔ اولاد؟ کیا ہے آپ کے ساتھ اور کیا رہ گیا آپ کے پاس۔ تنہا۔ خالی ہاتھ نہ بہن آپ کی نہ بھائی ساتھ میں۔ آپ نے سراسر خسارہ کمایا ہے۔“ میں یہ کہہ کر دروازے کی طرف مڑ گیا پھر خیال آیا کہ نہیں ایک بات کہنا باقی ہے۔

”میری ماما کہتی ہیں باپ کی شفقت اور محنت بھلانے کی بات نہیں ہوتی۔ آپ کی شفقت کے لیے ہم ساری عمر ترسے ہیں مگر محنت کبھی نہیں بھولیں گے۔ آپ نے ہمیں گھر سے نہیں نکالا ہمارے خرچ پورے کیے اس کے لیے ہم تینوں آپ کے احسان مند ہیں اور انشاء اللہ کسی بھی مشکل گھڑی میں آپ کے ساتھ کے لیے ہمیشہ کھڑے ہوں گے۔ اللہ حافظ!“ میں نے دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا اور باہر ماموں کے پاس آ گیا وہ ماما کی طرح میری حالت سمجھ گئے تھے، میرا ہاتھ تھام لیا اور پھر ہم سب گیسو روکنے کو آگے بڑھ گئے۔

جونہی کوئی اطلاع آتی ہے سیٹیں کروالیں گے لیکن تمہارے داخلے کی بات ہے، تم دیر نہ کرنا یہاں سب اس کے ساتھ رہیں گے اسے اب اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ تم سمجھ گئے ہونا کہ اب وہ اکیلی نہیں۔“

اگلے دن ہم راول پنڈی آئے۔ گھر پہنچے مگر ماموں کا ر میں ہی بیٹھے رہے میں اور پر آیا دروازے سے چابیاں نکالیں تو کوئی چیز چمکتی دیکھا تو ماما کی ہیرے کی انگلی تھی پہلے وہ ہمیشہ پہنے رکھتی تھیں اب کافی عرصے سے ان کے ہاتھ میں نہیں تھی وجہ ظاہر تھی میں نے وہ انگلی نکال کر اپنی چھوٹی انگلی میں پہن لی کہ مہربانو کو دے دوں گا۔ پھر اپنی الماری سے پاسپورٹ، یونیورسٹی سے آئے لیٹرز وغیرہ ایک بیگ میں ڈالے۔ سارے کمرے لاک کیے باہر کے دروازے پر تالا لگا یا چابیاں اکٹھی ایک رنگ میں کیں اور باہر آ گیا۔ اسپتال پہنچ کر میں ڈیڑی کے وارڈ میں گیا کچھ دیر باہر انتظار کیا اردلی اندر بتا چکا تھا۔ ڈیڑی مریض کے ساتھ ہی باہر آ گئے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر خوشی آئی یا مجھے محسوس ہوا کچھ کہہ نہیں سکتا۔

”کب آئے اور امتحان کیسے ہوئے؟ انہوں نے پوچھا ساتھ ہی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سوالوں کا جواب دیا اور میز پر کار کی اور گھر کی چابیاں رکھ دیں۔

”یہ کیوں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میں لاہور جا رہا ہوں سوچا آپ کی امانت لوٹا دوں۔“ انہوں نے ایسے پوچھا جیسے کوئی بھولی بات ہو۔

”اور تمہاری ماں؟“ مجھے حیرت ہوئی ان کے سوال پر۔

”میری ماں وہ تو کافی عرصے پہلے چلی گئی تھیں۔“ انہوں نے حیرانی سے دیکھا۔ میں نے پھر کہا۔

”اصل میں وہ چار سال پورے ہو گئے تھے ناں۔“ اوہ..... اور جیسے انہیں یاد آ گیا ہو۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

”آپ نے پوچھا نہیں کہ کہاں گئی ہیں۔ میں ہی بتا دیتا ہوں ان کی شادی ہو گئی ہے۔“ میں نے انہیں خبر سنائی۔ وہ جلال میں آ گئے اور کہنے لگے۔



میرے ہر قدم کا سہارا تھی نیلو فرعباسی

ایک بڑا نام ہے کہ جنہوں نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کو مہدی حسن، ریشماں، شہناز بیگم، مہدی، ظہیر، افتخار عارف، عبید اللہ بیگ، قریش پور جیسے متعدد فنکار، موسیقار، کمپوزر، اسکرز دیے۔ وہ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے، ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل بنے تو اس کی کارکردگی کو عروج پر پہنچایا۔ قمر علی عباسی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”عباسی نے بہت کچھ کیا، ہر طرح کے پروگرام کیے اور نام کمایا، چاق و چوبند، بہت جاگے ہوئے، مہنتی جو کام سونپا گیا اسے پوری ذمہ داری سے نبھانے کی کوشش کی، خود تو عباسی کو نہ جانے اپنی کون سی اداسد ہوگی مگر میرے خیال میں ان کا سب سے بڑا اور منفرد کارنامہ ریڈیو کے رسالے ”آہنگ“ کی ترتیب نو ہے، جب میں نے یہ کام ان کے سپرد کیا تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اسے اس بلند معیار تک پہنچا دیں گے۔“

قمر علی عباسی ایک وقت میں کئی مختلف کام یکساں خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں، 1998ء کی بقرعید کا تیسرا دن تھا، عباسی نے کچھ کاغذات

قمر علی عباسی میری زندگی میں داخل ہوئے تو ایک ہلچل مچ گئی۔ زندگی و توانائی سے بھرپور، گھنٹوں کا کام منٹوں اور منٹوں کا سیکنڈوں میں انجام دینے والے، پارہ صفت اور میں ٹھہری ہمیشہ کی سہل پسند شاید دس برس کی عمر تک اکلونی اولاد ہونے کی وجہ سے جو ناز و فخر میرے اٹھائے گئے تھے یہ اس کا نتیجہ تھا لیکن اس کا جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس ہر دم چاق و چوبند رہنے والے کا ساتھ دینے کے لیے مجھے عادتیں بدلنی ہوں گی۔ آج تک اسی کوشش میں لگی ہوں، قمر علی عباسی صبح پانچ بجے اٹھ جاتے ہیں تو میں سات بجے اٹھ کر جھکتی ہوں کہ تیر مار لیا۔

عموماً ماتحتوں کو اپنے افسران سے اور افسران کو اپنے انڈر کام کرنے والوں سے شکایتیں رہتی ہیں لیکن یہاں میں ایک اقتباس سید علیم گیلانی کی تحریر سے حوالے کے طور پر پیش کروں گی کہ اندازہ ہو کہ جو لوگ صدق دل اور محنت سے کام کرتے ہیں افسران کا انہیں پسند کرنا ”مجبوری“ بن جاتا ہے۔

سید علیم گیلانی براڈ کاسٹنگ اور شعروادب کا

منصوبہ بندی پیش نظر رکھے ہوئے ہیں۔ 32 ناٹ آؤٹ“ میں لکھتے ہیں۔

”آج 13 جون ہے، ہم ساٹھ سال کے ہو گئے زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھیں، ایک لمبا سفر کیا، اسکول کے دن شرارتوں سے بھرے لمحے کالج کے کارڈور ایک کھلنڈر انوجوان، امرودوں سے بھرے درختوں کے نیچے خواب بنتا ہے، خواہشیں کرتا ہے، امیدیں باندھتا ہے، یونیورسٹی کی کینٹین ہے، زور زور سے باتیں قہقہے، گرم گرم مباحثوں کے تذکرے، ٹرافیاں جیتنے کی خوشی، ستاروں کے قصے، بہاروں کے افسانے زندہ ہوتے ہیں۔ زندگی کے بازار میں لوگوں کی بھیڑ ہے، مقابلہ ہے پھر ملازمت، تبادلے، اجنبی انجان صورتیں، چاند چہرہ ستارہ آنکھیں، پھولوں کا موسم، برسی بارشوں کے جلت رنگ ہمارے لیے زندگی پل پل محبتوں، مسرتوں اور کامیابیوں کا نام ہے، عزت، شہرت، دولت، صحت، محبت کرنے والی بیوی نیلوفر..... سعادت مند بچے ثوبیہ، وجاہت، ماریہ اور باوفا دوستوں کو زندگی کہتے ہیں۔

ہم نے 32 سال ریڈیو میں خدمت کی اور آج یوں محسوس ہو رہا ہے ہم 32 سال کے ہیں، جوان گرم خون جسم میں دوڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس بہت سے منصوبے ہیں، کام ہیں، کتنے ملک ہیں جہاں جانا ہے..... ابھی تو بہت لکھنا ہے، بہت بولنا ہے، اس کے لیے نیک تمنا میں درکار ہیں، آپ کی دعا میں چائیں درازی عمر کی کہ میرا رب بڑی دعائیں سننے والا ہے۔“ بے شک اللہ تعالیٰ دعائیں سنتا ہے اور صدق دل سے مانگی دعائیں اس کے در پر ضرور پہنچتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قمر علی عباسی جب ایک بالکل اجنبی شہر، اجنبی دیار نیویارک پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں وہاں بھی عزت وقار اور محبتوں سے سرفراز کیا۔ ایسے دوست اور چاہنے والے دیے جنہوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا..... آج تک سر آنکھوں پر ہٹھا کر رکھا ہے۔

یہ میرا اعزاز ہے کہ مجھے قمر علی عباسی کا ساتھ ملا

اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑے انعام سے انہیں نوازا ہے اور وہ ہے کسی سے جیس نہ ہونا، اپنا قد اونچا کرنے کے لیے دوسروں کی achievements کو نظر انداز نہیں کرتے، دوسروں کی کامیابیوں سے خوش ہوتے ہیں، تعریف کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر منافقت نہیں کرتے جس کے نتیجے میں اس فانی دنیا میں بڑے دھوکے اور نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔

قمر علی عباسی فرشتہ نہیں انسان ہیں، ان میں کمزوریاں بھی ہیں، ان سے کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں، غصہ بھی آتا ہے مگر ان سب پر وہ بہت جلد کنٹرول کر لیتے ہیں۔ یہی سب سے اچھی بات ہے۔

قمر علی عباسی نے تمام عمر اعتماد سے بسر کی فیصلے کیے تیزی سے یقین کے ساتھ جب ریڈیو پاکستان کراچی کے کنٹرولر اور اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کا وقت آیا تو ڈائریکٹر جنرل صاحب نے ملازمت میں توسیع (Contract) کی بات کی، جواب میں قمر علی عباسی کا کہنا تھا ”ہم چاہتے ہیں دوسروں کو موقع ملے، تبدیلی آنی چاہیے، جہاں ہم ہیں وہاں کوئی دوسرا آنا چاہیے، نظام بدل جانا چاہیے۔ یہ قدرت کا اصول ہے، صبح، شام، رات، سردی، گرمی، برسات، بہار، خزاں تبدیلی کے نام ہیں۔“

قمر علی عباسی نے زندگی کو ہمیشہ مثبت انداز سے لیا کسی کے ریٹائرمنٹ کا دن، یقیناً افسردگی کا دن ہوتا ہے ایک ادارے سے طویل وابستگی کا دن جب داخل ہوتا ہے اس انسٹیٹیوٹ میں تو جوان تو انا ہوتا ہے، انگلیں، ولولے ہوتے ہیں۔ بہت سے اچھے دوست ساتھی بنتے ہیں۔ پاور، کرسی۔ کام کرنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں اور پھر ایک دن..... یہ سب چند لمحوں میں ماضی ہو جاتا ہے۔ میں جب کسی کی ریٹائرمنٹ کا سنتی تو قریب قریب اتنی ہی افسردگی اور ملال محسوس کرتی جتنا شاید وہ شخص کر رہا ہوتا لیکن قمر علی عباسی اس موقع پر بھی اپنی روایتی شگفتگی، مثبت سوچ اور مستقبل کی

سے زیادہ ”شاہ کے مصاحب“ ایکٹو تھے۔ ملی ویژن کے پروگرام سات رنگ میں لکھے ایک خاکے پر ان کو سپینڈ کر دیا کیونکہ معین اختر نے اس خاکے میں جو گیٹ اپ کیا تھا وہ مصاحب کے خیال میں جنرل ضیا الحق سے ملتا جلتا تھا۔ اگر ایسا تھا تو اس میں رائٹر کا کیا قصور؟ یہ تو پروڈیوسر اور میک اپ آرٹسٹ اور آرٹسٹ کا معاملہ تھا بہر حال۔

برق گرتی ہے تو پچھارے مسلمانوں پر قمر علی عباسی کو نہ صرف سپینڈ کیا گیا بلکہ Demote بھی کیا حالانکہ وہ پبلک سروس کمیشن سے آئے تھے اور اس طرح کی تنزیلی ڈیپارٹمنٹ نہیں کر سکتا تھا لیکن ہر قاعدے قانون میں ترمیم ہو جاتی ہے۔ کیا مشکل ہے..... کچھ لائنیں کچھ clause ہی تو ادھر ادھر کرنے ہوتے ہیں اور اس ادھر ادھر میں ترمیم علی عباسی کی کئی سال کی seniority ادھر ادھر ہو گئی۔ گورنمنٹ یا نیم سرکاری اداروں میں ترقیاں ویسے بھی دیر سے ہوتی ہیں اور کئی طرح کے طریقہ کار کی مرہون منت ہوتی ہیں ایسے میں یہ ہو جانا کسی کو بھی ذہنی اور جذباتی طور پر توڑ دینے کے لیے کافی ہے لیکن قمر علی عباسی کا کہنا بلکہ یقین تھا میں نے کچھ غلط نہیں کیا انشاء اللہ میری پوزیشن بحال ہوگی۔

کئی بار ایسا ہوا کہ باہر کا ٹور باہر کی ٹریننگ ہے قمر علی عباسی کا نام جانے والوں میں سب سے اوپر ہے مگر کسی کی ”ادپر“ سے سفارش آگئی اور وہ افسر چلا گیا جس نے واپس آ کر ریڈیو پاکستان کو اس ٹریننگ سے کوئی فیض نہ پہنچایا۔ قمر علی عباسی کو لندن (بی بی سی) ٹریننگ پر بھیجا تو واپس آ کر ”لندن، لندن“ تحریر کیا جس میں نہ صرف جو وہاں دیکھا سیکھا اسے ری پروڈیوس کیا بلکہ ریڈیو پاکستان کے ایک افسر کی بطور سفر نامہ نگار بھی پزیرائی ہوئی۔

قمر علی عباسی ان باتوں کی پروا نہیں کرتے ”میرا نصیب“ کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں،

دیے۔ ”انہیں پڑھ لیجیے“ پڑھنا شروع کیا تو پتا چلا کہ انہوں نے ریڈیو کی ملازمت کے آغاز کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی یادوں کو قلمبند کیا ہے، میں خوش ہو گئی کیونکہ میں چاہتی تھی کہ بہت سی بھری ہوئی باتیں، یادیں اور واقعات یکجا ہو جائیں۔ آٹو بائیو گرافی قسم کی کوئی چیز ہو مگر انہوں نے اس کو اپنی بیس سالہ ریڈیو کی ملازمت تک محدود رکھا۔

قمر علی عباسی کا ایک کمال یہ ہے کہ نہایت تیز لکھنا اور سیکڑوں مصروفیات کے درمیان لکھنا ہر قسم کے ماحول، گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر، ایک خوشگوار حیرت سے میں اس وقت دو چار ہوئی جب گیارہویں دن انہوں نے اپنی ریڈیو کی یادداشت 32 ناٹ آؤٹ“ پڑھنے کو دی۔ کتاب کا مسودہ مکمل تھا، ان گیارہ دنوں میں دفتری مصروفیات ہفتے وار کالمز، تقریبات کا سلسلہ بدستور تھا، نہ جانے کس وقت لکھتے تھے؟

قمر علی عباسی کسی سفر پر نکلیں کوئی چیز نوٹ بک میں تحریر نہیں کرتے۔ دماغ کے کمپیوٹر میں محفوظ کر لیتے ہیں پھر بھی واقعات کو جس تواتر اور شگفتگی سے بیان کرتے ہیں وہ ان کا ہی خاصہ ہے۔ مشکل اور بھاری بھر کم الفاظ، تشبیہات و استعارات کا سہارا لے کر اپنی تحریر کو پُر اثر بنانے کی کوشش نہیں کرتے سیدھے سادے الفاظ میں سچائی بیان کرتے ہیں۔ شگفتگی، بے ساختگی دلچسپی صرف تحریر کا نہیں شخصیت کا بھی حصہ ہیں اس لیے عام قاری ان کو اپنے قریب تر محسوس کرتا ہے اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ بغیر کسی سفارش بغیر کسی لائٹنگ یا گروپ سے وابستہ ہوئے قمر علی عباسی کو اللہ تعالیٰ نے پانچ بار رائٹر ز گلڈ ایوارڈ، وزیراعظم کے اے پی این ایس ایوارڈ اور صدارتی تمغہ امتیاز کے علاوہ بھی متعدد ایوارڈز سے نوازا۔

مشکل سے مشکل وقت میں بھی قمر علی عباسی گھبراتے نہیں۔ جنرل ضیا الحق کے دور کا آغاز تھا شاہ

جنہوں نے ہمیشہ میری چھوٹی سی چھوٹی خوشی اور خواہش کو افضل جانا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میں زندگی کی آخری سانس بھی اس دنیا میں لوں جہاں قمر علی عباسی کا توانائی سے بھرپور مہربان وجود ہو۔

کچھ اور مانگنا میرے مشرب میں کفر ہے لا اپنا ہاتھ دے میرے دست سوال میں بشکریہ۔

ماہنامہ چہارسو، راول پنڈی

اس دور کا ابن بطوطہ قمر علی عباسی
انجم انصار

گزشتہ ماہ پاکیزہ کے صفحات پر جناب قمر علی عباسی کی علالت کے حوالے سے دعائے صحت کی اپیل شائع ہوئی تھی۔ ابھی جون کا پاکیزہ ہر جگہ پہنچا بھی نہ ہوگا کہ ان کے انتقال کی خبر آگئی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

جناب قمر علی عباسی کے نام سے تو میں عرصہ دراز سے واقف تھی کہ میرے والد انصار حسین صدیقی ریڈیو ہیڈ کوارٹر اسلام آباد میں کنٹرولر ڈائریکٹر تھے اور عباسی صاحب جب بھی کراچی سے اسلام آباد آتے ان کے پاس ضرور آتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔

شادی کے بعد میں کراچی آگئی..... کچھ عرصے لکھنے لکھانے سے دور رہی اور میری ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ریڈیو پاکستان کراچی کے ڈائریکٹر تھے..... اور اس زمانے میں میرا وہاں ہفتہ وار ڈراما ”راستے دل کے“ نشر ہو رہا تھا جو میرے اپنے ایک ناول سے ماخوذ تھا۔ عباسی صاحب اور نیلو فر سے جو بھی ایک بار ملتا، ان کا گرویدہ ہو جاتا..... ان دونوں کی تعریفیں میں نے بلاشبہ درجنوں لوگوں سے سنی ہیں مگر سیمارضا ردا حقیقت میں عباسی صاحب کی بہت بڑی مداح ہیں، معروف پروڈیوسر ظہیر حسن تو اپنی اور عباسی صاحب کی دوستی پر فخر کرتے ہیں..... پروین خان نے تو

بڑے مغموں لہجے میں مجھ سے نیلو فر کا نمبر لیا کہ دونوں کی قریبی دوست ہیں۔ زرین زبیر، مسز منیر حسین، احمد ندیم، ڈاکٹر احمد شہاب، فیروزہ بیگم، مسز شمع حسین، مسز قیصر قدیر، شیریں حیدر، رفاقت بخاری، میں کس کس کا نام لوں..... جو قمر علی عباسی کے انتقال کی خبر سن کر رنجیدہ ہوئے ہوں..... محترمہ عذرا رسول کا اسی وقت فون آیا..... جیسے ہی انہیں علم ہوا..... اور وہ ان ہی دنوں کو یاد کرتی رہیں..... جب جب نیلو فر کے ساتھ قمر علی عباسی پاکیزہ کے آفس آتے تھے اور ان کی باتیں سن کر سب لطف اندوز ہوتے تھے..... ان کے سامنے نہ کسی دوسرے کو بولنے کی ضرورت ہوتی تھی..... اور نہ ہی کوئی بول پاتا تھا..... کہ وہ ہر موضوع پر بولنے کی قدرت رکھتے تھے..... معروف مقرر تھے..... لفظوں کے اتار چڑھاؤ پر انہیں پورا عبور حاصل تھا..... اور دوسرے کی آواز سن کر پہچان بھی جایا کرتے تھے..... مجھے یاد ہے، جب میں نے پہلی مرتبہ ان کی کتاب کی تقریب پزیرائی میں مضمون پڑھا..... تو فوراً بولے..... ماشاء اللہ..... آپ تو براڈ کاسٹر معلوم ہوتی ہیں۔ تب میں نے انہیں بتایا جی ہاں میں اپنے زمانہ طالب علمی میں ریڈیو کے پروگرام کنڈیکٹ کرتی رہی ہوں۔

13 جون 1938 امر وہہ (یو، پی، انڈیا) میں پیدا ہونے والے قمر علی عباسی بہت بڑے ادیب تھے جنہوں نے 30 سفر نامے، بچوں کے لیے 15 کتابیں دو سوانح عمریاں اور ایک کالموں کا مجموعہ لکھا ہو..... وہ کبھی تھکنا جانتے ہی نہیں تھے۔ پاکستان وہ ہر سال آتے تھے اور جب وہ آتے تو بہار کا موسم نہ ہونے کے باوجود بھی ہر طرف بہاراں ہو جاتی۔ ان کے اعزاز میں تقاریب ہونے لگتیں..... اور وہ خود آتے ہی اپنی کسی کتاب کی تقریب اس طرح سجاتے کہ وہ شادی کی سی تقریب لگتی۔ وسیع و عریض ہال کھپا کھچ بھر جاتا۔

جب سے میں نے ان کی کتابوں پر مضمون پڑھنے کی ابتدا کی تھی..... تو کراچی میں کوئی تقریب

ایسی نہیں ہوتی تھی جو قمر علی عباسی صاحب نے سجائی ہو..... اور اس میں میرا نام بطور اسپیکر نہ شامل ہو..... اس سال بھی ان کا پہلے جنوری پھر مارچ..... اور پھر دسمبر میں آنا طے پایا تھا..... میں عباسی صاحب کو اس دور کا ابن بطوطہ کہتی تھی کہتے ہوں کہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ پورے ایشیا میں کسی دوسرے نے اتنے زیادہ سفر نامے نہیں لکھے ہوں گے..... اور پھر طرز تحریر بھی قمر علی عباسی جیسی کہ سفر نامے میں افسانہ، انشائیہ، مکالمہ، ٹکائیہ، طنز و مزاح، حد تو یہ ہے کہ سپنس کے ساتھ ڈراما تک رچا ہوا تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں الوداع کہتے ہوئے ہماری بھالہ نے اپنے زیورات کے ڈبے سے ایک لمبا کارتوس نکال کر ہمارے حوالے کر دیا۔ بھائی نے بتایا خالی کارتوس تو بہت سے تھے..... سب بانٹ دیے..... ایک رہ گیا ہے..... یہ آپ کے لیے ہے اسے کراچی لے جائیں۔“

قمر علی عباسی..... نے نثر میں شاعری تک کی ہے، اپنے ایک سفر نامے میں لکھتے ہیں۔ ”ایک خوب صورت مکان کی منڈیر سے گلاب کی ایک سرخ ٹکلی ہوا سے کھیل رہی تھی۔ ہمارا راستہ روکتے لگی۔ چند لمحے ہم اسے دیکھتے رہے..... وہ مسکرانے لگی۔ ہم نے ہاتھ بڑھا کر اسے توڑ لیا۔ وہ اور کھل گئی“ ایسے جملے پڑھ کر زبان سے بے اختیار واہ ہی نکلا کرتا ہے۔ آپ کو اعزازات بے شمار ملے، جن میں تمغہ امتیاز بھی شامل ہے مگر اس کے باوجود طبیعت میں منکر المزاجی تھی..... ایک ایسی شخصیت جو باغبان کی سی ہو..... جس کے لہجے میں پھولوں کی لطافت جس کے لفظوں میں پھولوں کی رفاقت ہو..... اس کے جانے پر افسوس تو ہوتا ہے، دعا ہے اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے اور نیلو فر اور بچوں کو صبر جمیل عطا ہو، آمین۔

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

نزہت اصغر
ملکوں، ملکوں کا احوال بتانا اور وہ بھی کچھ اس انداز سے کہ قاری اپنے آپ کو سفر نامہ نگار کے ساتھ

میرے ہر قدم کا ساتھی

ساتھ سفر کرتا محسوس کرے۔ یہ محترم قمر علی عباسی کا ہی خاصہ تھا۔ قمر علی عباسی کو میں فقط ایک براڈ کاسٹر ایک سفر نامہ نگار، ڈراما نگار اور کالم نگار کی حیثیت سے ہی جانتی تھی مگر ایک خوب صورت ذہن و دل رکھنے والے ہمدرد انسان سے مکمل آگاہی جاسوسی ڈائجسٹ پہلی کیشنز کے پانچویں پرچے دلکش کے اجرا کے موقع پر ہوئی جیسی ان سے رو برو ملاقات کا سنہری موقع میسر آیا تھا۔ ادبی تقریبات میں دور سے ادیبوں کو دیکھنا اور سننا ایک الگ بات ہے مگر جب قمر علی عباسی اور نیلو فر صاحبہ پاکیزہ کے آفس تشریف لائے تو ان سے براہ راست گفتگو کا موقع ملا جو بے حد متنوع تھی۔ ان کی گفتگو کی خاص بات حقوق العباد کا از حد تذکرہ ہوتی تھی وہ رب کریم سے دوستی کی بات بڑی آسانی سے کرتے تھے کہ پروردگار کے بندوں کے حقوق پورے کرنے کے ذریعے ہم اللہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی گفتگو میں شکر گزاری اور درگزر کے فلسفے کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ قمر علی عباسی کی معلومات افزا اور مسحور کن باتیں تمام سامعین پر سحر طاری کر دیا کرتی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے انہی دنوں ایک نشست میں انہوں نے سینٹرل ایشیا اور اسپین کی مکمل تاریخ اور مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان بہت جامع اور پُر اثر الفاظ میں بیان کی تو ایسا لگا کہ ہم خشک تاریخ نہیں بلکہ ایک دلچسپ کہانی سن رہے ہیں۔ پہلے ان کی علالت کی خبر اور فوراً ہی انتقال کی خبر نے دل رنج سے بھر دیا۔ ابھی تو عباسی صاحب کو اپنی کتابوں کی گولڈن جوبلی کرنا تھی مگر موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس غم کے موقع پر میں نیلو فر عباسی اور ان کے اہل خانہ کو بھرپور تعزیت پیش کرتی ہوں اور خدا کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ قمر علی عباسی کو پروردگار اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کے خاندان کو صبر و حوصلہ عطا ہو۔ (الہی آمین)

☆☆☆

گلشنِ رہے سدا آباد تیرا

شائستہ زریں

کے شوہر کا دل جیتا جاسکتا ہے۔۔۔ اور جب دلہن اپنے اخلاص و محبت اور دانشمندی سے شوہر کے دل میں گھر بنا لیتی ہے تو سلسلہ یہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ جہاں دلہن اتنا سب کچھ کرتی ہے تو اپنے دولہا میاں کو پیغام دے کر اپنے دل کی بات بھی تو کہہ سکتی ہے ناں۔ تو بس اس مرتبہ ”دلہن نمبر“ کے سروے کے لیے انہی امور کے پیش نظر ہم نے سوال تیار کیے اور سروے میں شریک دلہنوں سے معلوم کیا کہ۔۔۔

۱: آپ کی شادی کی دلچسپ یا پریشان کن رسم؟

یا کوئی یادگار واقعہ؟

۲: شوہر کے دل میں راج کرنے کے لیے فرمانبرداری ہی کافی ہے یا اور کوئی ہنر بھی اختیار کیا جاسکتا ہے؟

۳: دولہا میاں کے لیے کوئی پیغام؟

سروے میں شریک دلہنوں کے نظریات، خیالات اور تجربات پڑھتے ہیں ممکن ہے اس میں سے کوئی نکتہ کسی کی زندگی میں بہاروں کی نوید لے آئے تو گویا ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

روینہ گلزار

۱: دودھ پلائی کی رسم بہت اچھی لگی۔

۲: اچھا کھانا، لڑائی جھگڑے سے گریز، پرسکون ماحول، فضول خرچی سے پرہیز، ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ۔

۳: جو بہت اچھا اب تک کرتے چلے آ رہے ہیں اس پر ہمیشہ ثابت قدم رہیے گالی بھری کے حقوق اور عزت و احترام (چونکہ بیوی، شوہر اور اس

شادی ایک مقدس فریضہ ہے اور ہمیشہ۔۔۔۔۔ سے پاکیزہ کی روایت رہی ہے کہ سال کا ایک شمارہ ”دلہنوں“ سے منسوب کرتے ہیں۔ یوں تو شادی ساری کی ساری ہی یادگار ہوتی ہے لیکن جب دلہن کو خاص کر اس کی شادی کی رسومات یا شادی کے دنوں کے کسی یادگار واقعہ کی جانب متوجہ کرنا چاہیں تو دلہن نوپا ہوتا ہوا پرانی پل کی پل میں بابل کے آئین سے ساجن کی دہلیز پر پہلا قدم رکھنے اور شادی کے تمام مراحل تک ذہنی مسافت۔۔۔۔۔ طے کر لیتی ہے۔ اگر رسومات سادہ اور دلچسپ ہوں تو شادی بیاہ کی تقریبات کا حسن بن جاتی ہیں لیکن جب وقت اور پیسے کے زیاں کے ساتھ غیر ضروری تفریحات کا شکار ہو جائیں تو یہ رسومات اگر نظروں میں خار بن کر کھٹکتی ہیں تو ان کے کانٹے دل میں بھی چبھنے لگتے ہیں۔ اور کبھی کبھی کسی واقعے یا بات سے شادی ہی یادگار بن جاتی ہے۔ زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے یوں تو ذمے داری دونوں فریقین پر ہی عائد ہوتی ہے لیکن ہماری مشرقی دلہنیں کبھی اپنے فرائض نہیں بھولتیں۔ کہنے کو تو یہ چینی روایت ہے کہ ”فرمانبردار بیوی شوہر کے دل پر حکمرانی کرتی ہے“۔۔۔۔۔ ہماری بیشتر دلہنوں کی کامیاب ازدواجی زندگی کا راز اسی گروا پنانے میں مضمر ہے کہ وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ایشیائی مرد خواہ کتنے ہی روشن خیال کیوں نہ ہوں بیوی انہیں فرمانبردار ہی اچھی لگتی ہے۔ اس کے باوجود یہ معرکہ سر کرنے کے لیے محض فرمانبرداری نا کافی ہوتی ہے اور بھی کئی ایسے رویے اور ہنر ہیں جنہیں اختیار کر

گلشنِ رہے سدا آباد

پتیاں نچھاور کی گئیں، نہایت خوشگوار اور اپنائیت بھرا ماحول تھا مجھے احساس تک نہیں ہوا کہ ایک دوسرے خاندان میں آئی ہوں۔

۲: فرمانبرداری کے علاوہ ایک چپ سوکھ کی حکمت پر عمل کریں۔

۳: آئے دن مجھ سے باہر چلنے کی فرمائش کرنے اور میرے انکار پر برا ماننے کے بجائے سوچے کہ پہلے بھی تو جاتی تھی تو اب کیوں نہیں جاسکتی؟ نکاح کے وقت سے لے کر آج تک ہاں کرتی چلی آرہی ہوں، میری مجبوری سمجھ کر آئے دن باہر چلنے کی فرمائش پر کبھی نہ بھی سن لیا کریں۔ انشاء اللہ۔۔۔۔۔ ہاں بھی ممکن ہو جائے گی۔

شنا علی

۱: جوتا چھپائی کی رسم بہت اچھی تھی بہت انجوائے کیا تھا۔

۲: میں سمجھتی ہوں کہ فرمانبرداری کے علاوہ اگر



شنا علی

کوئی ہنر ہے تو صرف اور صرف خوش ذائقہ کھانا کھلانا۔

۳: اپنی واقف کا خیال رکھیں اور شادی سے پہلے کیے جانے والے جو وعدے اب تک وفا نہ ہو سکے انہیں اب نباہ ہی دیجیے۔



روینہ گلزار

کے خاندان کو لے کر چلتی ہے (زندگی کے چھوٹے بڑے فیصلوں میں مجھ سے مشورہ کرنا جس سے میرا اعتماد بھی بڑھا ہے۔ احساس تحفظ بھی ہوتا ہے۔

ثمرین شاہد مسرور

(گھریلو خاتون)

۱: مہندی میں گود بھرائی کی رسم بہت پریشان کن تھی اچھا بلکہ بہت اچھا لگا تھا جب میں رخصت ہو کر سسرال آئی تو میرا والہانہ استقبال کیا گیا، پھول



ثمرین شاہد مسرور

ماریہ عمر

۱: فضول رسم و رواج کے جھنجٹ میں پڑے ہی نہیں اس لیے تمام فنکشن خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچے۔
۲: صرف ان کے لیے تیار ہونا، ان کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا۔ اپنی انا کو پس پشت ڈال کر شوہر کی انا کا خیال رکھنا۔ واپس جواب نہیں دینا، شوہر اور گھر والوں کی محبت کا جواب محبت سے دینا تو بہت ضروری ہے۔ ایسی تمام چیزیں جن سے گھر کا ماحول خوشگوار



ماریہ عمر

رہے، یہ رویہ اختیار کر لیں پھر دل جیتنا کیا مشکل؟
۳: ٹینشن اور stress کم لیا کریں، خوب دل لگا کر کام کریں اللہ کرے کہ آپ کا ماسٹرز کرنے کا خواب جلد پورا ہو جائے۔

کومل سعد قاضی

۱: مہندی کی تقریب رات کو تھی اور سہ پہر کو اچانک ہڑتال کا اعلان ہو گیا۔ اچانک ہی خوشگوار ماحول ٹینشن میں تبدیل ہو گیا، مہندی کی تقریب ملتوی ہو گئی لیکن شام تک حالات معمول پر آ گئے، اگلے روز نکاح تھا پھر یہ فیصلہ ہوا کہ نکاح دوپہر اور شام کو مہندی کی تقریب ہوگی سو ایسا ہی ہوا بہت عمدہ تقریب رہی۔ اس طرح شادی کا یہ فنکشن یادگار بن گیا۔

صائمہ اسفندیار

۱: پوری شادی ایک دلچسپ واردات کی صورت میں منعقد ہوئی جسے ہم سے زیادہ خاندان والوں نے انجوائے کیا۔
۲: صرف فرمانبرداری ہی ضروری نہیں بلکہ اس کے



صائمہ اسفندیار

ساتھ ساتھ محبت، خیال، دوستانہ رویہ، ایک دوسرے کی پسند، ناپسند اور گھر داری بھی بہت ضروری ہے۔
۳: جیو اور جینے دو، ہم ساتھ ساتھ ہیں، ہم ملے پیار ملا۔

فرح طاسین

۱: روایتی رسموں میں سے ایسا کچھ نہیں ہوا تھا مگر فوٹو سیشن ایک ایسی چیز ہے جو پہلے فیشن سمجھا جاتا تھا مگر اب ایک رسم بن چکی ہے وہ بہت تھکا دینے والی اور پریشان کن تھی۔

۲: ویسے تو فرمانبرداری میں سب ہی کچھ آ جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دل سے میاں کی پسند ناپسند اپنانے سے شوہر کے دل پر راج کیا جاسکتا ہے یعنی ہر چیز کو مجبوری سمجھ کر نہ کریں بلکہ دل اور خوشی کے ساتھ ہر کام کو انجام دیں۔

۳: آپ ہمیشہ اللہ کے شکر گزار رہیں کہ آپ وہ خوش نصیب ہیں جن کو دنیا کی بہترین بیوی ملی ہے۔

نخرے اٹھائے جائیں اور خود کو نئی ٹوپلی دہن سمجھنے کے بجائے خود کو گھر کا ایک فرد، فیملی کا ایک حصہ سمجھ لیا جائے تو نہ صرف میاں کے دل میں جگہ بنائی جاسکتی ہے بلکہ گھر والوں کے اور قریب ہو سکتے ہیں ویسے والے دن ہی سے میں نے میاں کے ناشتے، من پسند کھانوں کی ڈنٹ داری لی اور آج جبکہ وہ دوسرے ملک میں ہیں تو میرے ہاتھ کے بنائے کھانوں کا ذکر کرتے ہیں۔

۳: ایک بہترین زندگی اور آنے والے کل کے لیے ہر پل اور خوشی کے لیے اللہ ہم دونوں میں بے پناہ پیار اور اعتماد پیدا کرے آمین۔ ہاں اس کے ساتھ یہ بھی کہوں گی کہ.....

تیری دو ٹکیا کی نوکری میں میرا لاکھوں کا ساون جائے

ڈاکٹر ارم حسن

۱: باڑھ رکوائی کی رسم میں بہت مزہ آیا تھا۔
۲: فرمانبرداری کے علاوہ شوہر کی ضرورتوں، آرام اور خوشیوں کا خیال رکھ کر اور ساتھ ہی ان کے مزاج کے مطابق خود کو ڈھال کر بھی شوہر کے دل پر حکمرانی کی جاسکتی ہے۔

۳: جیسے اب ہیں ہمیشہ ایسے ہی رہے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ اچھے بن جائیں گے۔



ڈاکٹر ارم حسن

ربیعہ شافع

۱: ویسے تو شادی کا ایک، ایک پل یادگار ہوتا ہے مگر میری شادی کراچی کے جن حالات میں ہوئی اس نے شادی کو نہ صرف میرے بلکہ تمام مہمانوں کے لیے سنسنی خیز بنا دیا۔ ڈھولکی کی تقریب سے لے کر ہر، ہر موقع پر دھرنے، ہڑتال، فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ یارات والے دن نکاح کے بعد بم بلاسٹ کی جو کسر رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی، جس کی وجہ سے ایسی جلد بازی میں، نہایت خفیہ



ربیعہ شافع

انداز میں رخصتی ہوئی کہ گھر والوں سے بھی نہ مل سکی اور نہ ہی بچی ہوئی گاڑی میں بیٹھی حد تو یہ ہے کہ اپنی شادی کا کھانا کھانے کا موقع تک نہیں ملا۔ شادی کی تمام تقریبات اس دعا کے ساتھ گزاریں کہ تمام کام خیر و عافیت کے ساتھ ہو جائیں۔

۲: میرے میاں شادی کے پندرہ روز بعد ہی ملک سے باہر چلے گئے مگر ان پندرہ دنوں میں مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ کچھ بھی ہو جب تک سلیقہ، شعور اور گھر والوں کی اجازت سے کوئی کام کرنا جیسے گرنہ ہوں تو میاں کے دل میں جگہ نہیں بنائی جاسکتی۔ فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ اگر میاں جی کے



شادی کی تیاری

انجم انصار

باعث نہیں جاسکتی تھی۔

بنیٹش ندیم اور فہد طلال کی شادی

گزشتہ دنوں اسلام آباد میں میری بھتیجی کی شادی تھی۔ ان دنوں کراچی شہر کے حالات خاصے اترتے۔ الیکشن سے پہلے کا سیزن موسم بہار کا ہوتا ہوئے بھی خزاں آلود سا تھا۔ شوہر کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ ایک دل کہہ رہا تھا کہ نہ جاؤں۔ مگر دوسرا دل کہہ رہا تھا کہ چلی جاؤں۔ وہاں جا کر میاں جی کی طبیعت بھی قدرے بحال ہو جائے گی اور پھر امی کے فون۔۔۔۔۔ بھائی کے فون۔۔۔۔۔ بھتیجیوں کے فون کہ جلدی آئیں۔۔۔۔۔ ورنہ مزہ نہیں آئے گا۔۔۔۔۔ مہندی کی تقریب والے دن میں اور میرے میاں اسلام آباد پہنچے، ان دنوں کراچی میں سالانہ امتحان کا سیزن بھی چل رہا تھا۔۔۔۔۔ یوں عظمیٰ اپنے بچوں کے امتحانات کے

پنجاب کی مہندیاں۔۔۔۔۔ کراچی کے مقابلے میں زیادہ زور شور سے ہوتی ہیں۔ یا مجھے ہی ایسا لگا۔ خوب گانے اور لڈی ہوتی۔۔۔۔۔ لڑکی والوں کی تیاری بہت اچھی تھی۔۔۔۔۔ دولہا کا بھائی یا دولہا کی بہن مقابلے میں قدم رکھنے کی بھی جرات نہیں کر سکے۔۔۔۔۔ مگر سب نے دل کھول کر داد دی۔۔۔۔۔ ماشاء اللہ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں، احمد ندیم صدیقی۔۔۔۔۔ میرے چاروں بھائیوں میں سب سے بڑا ہے۔ ایم فل کر چکا ہے اس کے ریسرچ پیپر ز صرف ملکی سطح پر نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر پسند کیے جاتے ہیں۔ ناہید بھابی بھی ماشاء اللہ ڈاکٹر ہیں اور جاب کرتی ہیں۔ چار بچوں میں سے دو ڈاکٹر ہیں اور دو انجینئرز۔۔۔۔۔ دلہن بنیٹش



حمنہ نجم

واقعہ کی شوہر کے دل پر حکمرانی کی یا شوہر کو پیغام دینے کی ہماری تمام دہنیں اپنے گھر، گھر والے اور گھر والوں سے باعزت اور بے لوث بندھن میں بندھنے ہی میں خوش اور مسرور نظر آئیں یہ بہت خوش آئند ہے بلاشبہ زندگی جن سے وابستہ ہے اگر انہیں خود سے بڑھ کر چاہا جائے، عزت اور اہمیت دی جائے تو وہ خود بخود ہمارے بن جاتے ہیں شرط اخلاص نیت ہے اور جہاں نیت میں کھوٹ ہوتا ہے وہاں ظاہری طور پر بہت کچھ کرنے کے باوجود ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا بے شک اللہ نیتوں کا حال بہتر جاننے والا ہے اور وہی نیتوں کا صلہ بھی دیتا ہے۔ ہاں بھتیجی دہنوں سے پیغام وصول کرنے والے دولہاؤں یہ پیغام ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نہ اڑا دینا قابل عمل پیغام پر عمل بھی کر لینا۔ گھر کو گھر بنانے میں دولہا کا کردار بھی اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا کہ دلہن کا اور ہمارا پیغام دونوں کے لیے یہی ہے کہ نئی زندگی کے نئے راستوں پر تیرا آنگن بہاروں کا مسکن رہے خوشبوؤں کی دھنک سے مہکتا رہے خواب کے آئینوں سے مزین رہے بے مروت ہوائیں نہ آئیں کبھی موسم گل ہمیشہ ہمیشہ رہے



کول سعد قاضی

۲: شوہر کے دل پر راج کرنا قسمت کی بات ہوتی ہے پھر بھی اچھا کھانا بنا کر، نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی بات رکھ کر دل میں جگہ بنانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔
۳: آپ جو ہیں جیسے ہیں اپنی تمام برائیوں اور اچھائیوں سمیت مجھے دل سے قبول ہیں۔
حمنہ نجم
۱: نکاح کے بعد جب یہ سچ پر آئے انہیں میرا ہاتھ پکڑنا تھا لیکن جب ان کی نظر مجھ پر پڑی تو یہ دم بخود رہ گئے۔ میرا جو ہاتھ عمر بھر تھامنے کا عہد کچھ دیر پہلے ہی (نکاح کی صورت) کر چکے تھے وقتی طور پر وہی ہاتھ پکڑنا بھی بھول گئے پلکیں جھپکائے بنا ایک ٹک مجھے تنکے چارے تھے، ان کی حالت پر جب وہاں موجود لوگوں کے تہقے گوئے تب یہ ہوش میں آئے اور اپنی اس کیفیت کا سبب مجھے انہوں نے یہ بتایا تھا کہ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ تم دلہن بن کر اتنی اچھی لگو گی۔ اور یہ میرے لیے بہت یادگار ہے کہ ان کے لیے جو روپ سجایا تھا وہ ان کے من کو بہت بھایا۔
۲: فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ اطاعت گزاری، خدمت گزاری، صرف شوہر کو ہی نہیں ان کے گھر والوں کو بھی اپنا بنانا اور ان کا خیال رکھنا۔
۳: مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے اور محبت بھرے باعزت ساتھ کا بہت شکریہ۔
قارئین! بات شادی کی رسومات کی ہو، یادگار



سب سے برتر ہے۔

انجم طاہر اور طاہر عباس کی شادی ثنا مرتضیٰ

ہر انسان کی زندگی میں چند دن بے انتہا خوب صورت ہوتے ہیں جس میں اپنی یا کسی عزیز ترین ہستی کی شادی کا دن بھی شامل ہے۔ جی ہاں! میرے لیے میرے بھائی کی شادی کا دن وہ بھی بڑے بھائی کی شادی کا دن ایک خوب صورت اور یادگار دن تھا بلکہ شادی کی تیاریوں کا تمام سلسلہ ہی بڑا یادگار تھا۔ میں نے تمام تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

رشتہ طے ہونے سے لے کر ویسے اور چوتھی چالے تک کی رسمیں اور تقریبات سب بے حد مزیدار اور شاندار تھیں۔ اگرچہ اس میں سادگی کا عنصر نمایاں تھا۔ جیسے ہمارے ہاں مہندی کے نام پر کوئی تقریب نہیں ہوتی بس رسم مایوں ہوتی ہے۔ وہ بھی ایک دوسرے کے گھریا قاعدہ آنا جانا نہیں ہوتا۔ تقریبات کا آغاز میلاد شریف کی محفل سے ہوا۔ دسمبر کی وجہ سے موسم نہایت خوب صورت تھا اس لیے تمام تقریبات میں تیار ہونے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا بلکہ بھاری بھاری جوڑے بڑے آرام سے پہنے گئے۔ وہ الگ بات کہ ہم اپنی ایک سالہ بیٹی مناب فاطمہ کی وجہ سے اپنی شادی کا لہنگا بس تھوڑی دیر کو ہی پہن پائے کیونکہ امی اور ساس امی دونوں نے کہہ دیا تھا کہ بھائی کی بارات میں اپنی شادی کا جوڑا پہننا اور خوب بھاری بھر کم بن کر جانا سو بات تو ماننا تھی۔ بہر حال... میلاد کے دو دن بعد رسم مایوں کا دن آیا جس میں زیادہ تر خواتین کی شرکت ہی متوقع تھی۔ ہماری بڑی بہن صبا سجاد اپنی ساری تیاری

میں دھوم مچ گئی..... ”پھپھو کو اسٹیج پر لے کر آؤ۔“ جلدی سے بنیش کو پیار سے اٹھایا..... تو سوال اٹھا..... دعائے خیر کون کرے گا..... میں نے کہا..... میں کروں گی..... اللہ سے اپنی پیاری بیٹی کے اچھے مستقبل کے لیے دعا کی..... تو دلہن تو آب دیدہ ہوئی، دلہن کی شفیق ساس کی بھی آنکھیں بھر آئیں..... یوں دعاؤں کے پھول لے کر میری شہزادی رخصت ہوئی۔ دو دن کے بعد ولیہ تھا..... آج ان کے مہمان زیادہ تعداد میں موجود تھے۔ دولہا، دلہن..... بے حد خوش نظر آ رہے ہیں۔ ویسے کا لباس بھی بہت خوب صورت تھا..... بنیش آج بھی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ دلہن کی بڑی بہن ڈاکٹر ندا اور چھوٹی بہن اریبہ کی ڈرائنگ آج بھی لا جواب تھی۔ رہی بات میرے بھتیجے عدنان کی تو وہ تو ہے ہی ہیرو..... اور بلیک سوٹ میں مروانہ و جاہت کا شاندار نمونہ لگ رہا تھا۔ یہ لڑکا لکھتا نہیں ہے مگر طنز و مزاح خوب بولتا ہے..... اور جب تک میں اسلام آباد میں رہی..... رات دیر تک عدنان سے کی گئی باتیں..... آج بھی یاد کر کے مسکرا دیتی ہوں۔ مہندی سے ویسے تک کی تقریبات میں جویریہ خالد (بنیش کی تند) کی ڈرائنگ بھی لا جواب رہی۔ یہ پیاری سی لڑکی میری بیٹی کی اسکول کے زمانے سے دوست ہے۔ کراچی سے اسلام آباد جانا میرے لیے دوسرے ملک جانے کے برابر ہی ہوتا ہے مگر وہاں جا کر میں جسمانی اور ذہنی دونوں طور پر ہی سرشار ہو گئی..... میری پیاری امی..... اپنے ہاتھوں سے میرے منہ میں کبھی کبھی..... کبھی کبھی دیتی رہیں..... ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان چند دنوں میں مجھے کیا کچھ کھلا دیں..... اور یہی حال میرے بھائی اور ناہید بھابی کا تھا۔

اللہ تعالیٰ سب کو ہمیشہ خوشیوں میں ملائے اور ہمیشہ اپنی پناہ میں رکھے جو برکت والا اور بلند اور

ندیم..... ایم بی بی ایس میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد fcps کا امتحان پاس کر چکی ہیں اور دولہا فہد بلال ماشاء اللہ سی اے ہیں اور ایک اچھی کمپنی میں جاب کر رہے ہیں۔

شادی آٹھ مارچ کو ہوٹل میں تھی..... خاص الخاص مہمان مدعو تھے۔ بارات بھی مختصر آئی..... مگر دلہن کی ڈھیروں ڈھیر سہیلیاں ہر جگہ ان تھیں..... نکاح پہلے ہی ہو چکا تھا..... دولہا کے آنے کے بعد بنیش کو بھی فہد کے برابر لا کر بٹھا دیا گیا..... دلہن کی دادی مستقل اپنی لاڈلی پوتی کے ساتھ تھیں اور پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں..... دلہن کی نانی عابدہ خالہ بھی اپنی نواسی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں..... اس تقریب میں شرکت کے لیے..... دلہن کی ممانی ڈاکٹر زاہدہ اسرار بطور خاص کنیڈا سے آئیں۔

کرنل کلیم اختر اپنی پوری فیملی کے ساتھ موجود تھے مگر ایک بیٹی اور داماد..... ہنی مون پر جانے کے سبب نہیں آ سکے تھے۔ دولہا کے چچا کی روانگی اگلے دن امریکا کی تھی..... مگر وہ سرشار سے تقریب میں موجود تھے۔ صفیہ، آمنہ اور فرخ بھی اپنے اپنے موبائل سے تصویریں بنا رہے تھے۔ دلہن کا مہندی کا لباس تو تھا ہی خوب صورت مگر آج کا شاہانہ لباس بھی بے حد خوب صورت تھا اور بنیش نے اپنی پسند سے ڈیزائن کروایا تھا اور وہ دلہن کے روپ میں بے حد حسین لگ رہی تھی..... کچی آنکھوں والی بنیش..... ہمہ وقت ہنستی ہنساتی رہتی ہے..... مگر آج خاموش سی تھی۔ کھانا پُر تکلف تھا..... جو اچھے ماحول میں کھایا گیا..... آٹھ مارچ کو اسلام آباد کا موسم قدرے سرد تھا۔ ہلکی بارش بھی ہو گئی تھی سب مہمان ہی خاص الخاص تھے..... اس لیے وقت رخصت سب ہی رکے رہے۔ میری بڑی بیٹی ندا سیٹھی کی ساس نے کہا..... ”دلہن کی پھوپھی..... دلہن کو اٹھا کر رخصت کریں گی۔“ ہال



رابیہ عمران چوہدری، جیم یارخان



سائرہ عباس، کوئٹہ



شہزادی، فیصل آباد



آصفہ عتیق، لاہور



نازفطر، کوئٹہ



شمرش یوسف، کوئٹہ



ڈاکٹر نادیہ، راول پنڈی



فاطمہ علی عباس، کوئٹہ



مدحت خرم، کوئٹہ



روبینہ حیات، کراچی



سحر علیم، کراچی



سارہ عاصم، کراچی

حیران تھیں بہر حال یہی تو مواقع ہوتے ہیں جب سب مل کر بیٹھتے ہیں اور پرانی، پرانی باتیں یاد کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں ورنہ کس کو اتنی فرصت کہ یوں آرام سے بیٹھا رہے..... شادی بیاہ اور خوشیوں کی تقریبات ہی آج کل ملن کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

قارئین ایک بڑے مزے کی رسم بتاؤں کہ ہمارے ہاں رت جگے کی صبح میدے یا آٹے کے میٹھے گلگلے بنائے جاتے ہیں جو سب بہت شوق سے کھاتے ہیں اور محلے میں بھی بانٹے جاتے ہیں خاندان میں ضرور کوئی نہ کوئی خاتون ایسی ہوتی ہیں جو اس کی ماہر ہوتی ہیں پھر فجر میں قریم مسجد میں جا کر نیاز ہوتی ہے اور چراغ روشن کیے جاتے ہیں۔ یہ مرحلہ بھی انجام کو پہنچا۔ اگلے دن بارات تھی اور تاریخ تھی 6 دسمبر 2009ء سہرا بندی کے وقت خاندان کے بزرگ پہلے آگئے تھے۔ والد صاحب مرحوم کی یاد بہت آئی کہ بڑے بیٹے کی شادی اپنے ہاتھ سے کر لیتے..... بڑی بہن کو تو اپنی دعاؤں میں رخصت کر دیا تھا..... خیر..... ہماری والدہ صاحبہ بھائی کو لے کر والد صاحب کی قبر پر خاص طور پر فاتحہ خوانی کرنے گئی تھیں کہ بیٹے کی شادی کی خوشخبری سنا دوں۔ یوں تو والد صاحب کی دعائیں ہمارے ساتھ ہی ہیں۔ بہر حال جانے والے چلے جاتے ہیں مگر امور زندگی چلتے رہتے ہیں۔ ہماری بھابی انجم کے والدین بھی حیات نہیں سو ہم ایک دوسرے کے درد کو سمجھ سکتے ہیں۔ بھابی کے گھر والوں نے شادی کی پوری تقریب میں انہیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ان کے والدین حیات نہیں۔ بہت اچھے اور مہربان طریقے سے بیٹی کو رخصت کیا، ہم لوگ بھی بڑی بھابی ہونے کے ناتے بہت خوش تھے۔ طاہر بھائی کسی شہزادے کے مانند آف وائٹ پر میرون اور گولڈن کام کی شیریانی اور میچنگ کلاہ پہنے نہایت جاذب نظر لگ رہے تھے۔



حکومت کی نہیں ہے؟ اور اگر حکومت کی نہیں ہے تو شہری کیا کریں؟ اپنے گھروں میں محسوس ہو کر رہ جائیں یا پھر اپنی لاشیں تلاش کرتے رہیں۔ کچھ جواب اس کا بھی ہو۔

آئیے اب ہمیشہ کی طرح ایک بار درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین مرتبہ آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ آیت کریمہ یہ ہے۔

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور افسانہ نگار اصفاء فیصل ان دنوں ٹی وی کے ایک چینل سے خبریں پڑھتی نظر آرہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ شاعرہ، افسانہ نگار خالدہ نسیم، راول پنڈی سے لندن روانہ ہو گئیں۔ وہ اپنے عزیز واقارب کی شادیوں میں شرکت کرنے آئی ہوئی تھیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی تا حال بسترِ علالت پر ہیں ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی معروف افسانہ نگار نگہت اعظمی کا شمار بھی ٹی وی رائٹر میں ہو گیا ہے۔ گزشتہ دنوں ان کی ٹیلی فلم ایک نجی چینل سے دکھائی گئی..... ان کے حوالے سے دوسری پیاری خبر یہ ہے کہ ان کے پیارے بیٹے کی شادی ہو رہی ہے۔ (مبارک باد)

☆ ملک کے نامور مصنف اور افسانہ نگار اختر عباس کی نئی کتاب ارفع کریم..... دُور کا سوچنے والی دور جا نکلی شائع ہو گئی ہے۔ سات ابواب پر مشتمل اس کتاب میں ارفع کی 21 رنگین تصاویر کے علاوہ انگریزی میں لکھی ہوئی اس کی تمام نظمیں بھی شامل ہیں۔ سفید آفٹ پیپر پر علم و عرفان پبلیشرز نے اردو بازار لاہور سے نہایت خوب صورتی سے شائع کیا ہے اور کتاب کی قیمت صرف 200 روپے ہے۔

☆ ابھرتی ہوئی نئی شاعرہ فرحت جمال کی شاعری کا پہلا مجموعہ محبت اور میں کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے۔ جس میں ان کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ کتاب کا انتساب ان کے شوہر ذاکر جمال اور بچوں جویریہ اور شاہ زیب جمال کے نام ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی اور قرینہ ہے..... کتاب سلیقے سے شائع کی گئی ہے جس کی قیمت صرف 250 روپے ہے۔ کتاب منگوانے کا پتہ ہے الحمد پبلی کیشنز کراچی..... فون نمبر 0322, 2830957۔

☆ ہماری نئی افسانہ نگار فوزیہ احسان رانا کا افسانوں کا مجموعہ موسم کو بدلنے دو کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ جس میں ان کے منتخب افسانے شامل ہیں۔ کتاب کا انتساب ان کے شوہر احسان الحق کے نام ہے۔ کتاب خوب صورت ہے۔ جسے پڑھ کر آپ بھی لطف اندوز ہوں گی اس ضخیم کتاب کی قیمت صرف، تین سو روپے ہے اور منگوانے کا پتہ

یہ ہے۔ خزینہ علم و ادب، الکرم مارکیٹ اردو بازار لاہور فون نمبر 042.37314169

☆ پاکیزہ کی معروف شاعرہ شگفتہ شفیق بفضلِ خدا اب بالکل صحت مند ہیں۔ (ماشاء اللہ) ہماری پیاری شاعرہ شگفتہ شفیق کا تیسرا شعری مجموعہ جاگتی آنکھوں کے خواب شائع ہو گیا ہے۔ جو پہلے دو مجموعوں کے مقابلے میں بہت ہی اچھا ہے..... جس کی ہر نظم دردِ دل پر دستک سی دیتی ہے۔ کتاب کی قیمت صرف 300 روپے ہے۔ اگر آپ کو یہ خوب صورت



بہنوں کی محفل

مدیر

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ پیاری بہنو..... بس چند دنوں بعد ہی..... اسلامی تقویم کا نواں مہینہ رمضان المبارک شروع ہونے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ماہ مبارک کے روزوں کو فرض قرار دیا ہے اور اس کی راتوں کے قیام کو ثواب کا عمل بنایا۔ روزہ خواہشاتِ نفس پر قابو پانے کی تربیت کے ساتھ بہت سی بیماریوں کا بھی مؤثر علاج ہے۔ جب انسان بھوک اور پیاس کی شدت میں کھانے پینے کی اشیاء پاس ہوتے ہوئے بھی خود کو کھانے پر قادر نہیں پاتا تو اسے خداوند تعالیٰ کے سامنے اپنی بے چارگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس جب دائمی کیفیت بن جائے تو اس میں ہر خلافِ شریعت عمل سے رک جانے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے، روزہ رکھنے سے احساسِ بندگی پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے انسانی شعور میں اللہ کی حاکمیت کا اقرار و اعتراف مستحکم ہوتا ہے، مزید یہ کہ اس ماہ مبارک میں بھوکا پیاسا رہ کر انسان کو دوسرے کی بھوک پیاس کا احساس ہوتا ہے اور اس طرح دل میں ناداروں کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ جذبہ جس معاشرے میں ہو وہ اخوت و محبت کا معاشرہ بن جاتا ہے مگر جس شخص پر رمضان المبارک کا یہ مہینہ بھی اسی طرح گزر جائے کہ وہ اپنی بد اعمالیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے... مغفرت سے محروم رہے تو اس کی مغفرت کے لیے اور کون سا وقت ہوگا۔ اور یقیناً..... ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں چاہے گا..... ہے ناں۔

☆ پیاری بہنو! یقیناً آپ سب نے ہی رمضان کے حوالے سے تیاریاں کرنی شروع کر دی ہوں گی..... اس کے ساتھ عید کی بھی..... اور یقیناً ہم سب یہی چاہیں گے کہ ہمارے روزے قبول کیے جائیں، ہماری عبادات کا ہمیں اجر دونوں جہانوں میں ملے..... اور اگر..... ہمارا روزہ، صرف فاقہ ہی سمجھا جائے تو..... تو کس قدر نقصان میں رہیں گے۔ اسی لیے آئیے اپنے روٹھے ہوئے، ناراض عزیز واقارب کو منالیں تاکہ ہمارے روزے قبول کر لیے جائیں۔ یہ حقیقت بھی خاصی تلخ ہے کہ ہمیں سب سے زیادہ دکھ بھی رشتے داروں سے ملا کرتے ہیں مگر یہ بھی سوچ لیجیے کہ ان سے ناتا توڑ کر ہمیں کوئی بھی سکھ نہیں مل سکے گا۔ تو آئیں آج ہی ہم اپنے رشتے داروں کو راضی کریں تاکہ ہمارا رب ہم سے راضی رہے۔ (ابھی فون کر لیں..... کہ آپ آرہے ہیں..... یا میں آ جاؤں)

☆ بہنوں کی ڈاک میں پُر زور اصرار تھا انجم باجی ناول لکھیں یا اپنا کوئی افسانہ تو ضرور دیں..... آپ کی فرمائش کو پورا کرنے کے لیے میں نے ایک دلچسپ سا افسانہ لکھنا شروع کیا..... آدھے سے زیادہ ہو گیا تھا کہ ایک قاری بہن کا میرے پاس فون آ گیا..... اس نے اپنی ٹیلی میں ہونے والے ایک دلدوز واقعے کا مجھ سے ذکر کیا..... آپ یقین کیجیے، میں دو دن تک کچھ نہیں لکھ سکی۔ بار بار میرا ذہن اسی جانب تھا..... تب اپنا ادھورا افسانہ میں نے اٹھا کر رکھ دیا..... اور اس سچے واقعے کے صرف نام تبدیل کر کے اسے افسانے کی شکل دی۔ جگہ تک تبدیل نہیں کی..... اور یہ افسانہ لکھنے کا میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ارباب اختیار کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ ہماری عزت، جان، مال کی حفاظت کی ذمہ داری کیا

کتاب شگفتہ شفیق کے آؤگراف کے ساتھ چاہیے..... تو ابھی فون کیجیے..... 0321.3786601 معروف شمارہ شگفتہ شفیق ان دنوں اپنی چوتھی کتاب پر کام کر رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ میں قسط وار شائع ہونے والا آپ کی باجی انجم انصار کا ناول کا بیچ سی لڑکی کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ اس ناول کی قیمت صرف 250 روپے ہے۔ کتاب منگوانے کے لیے رابطہ کیجیے۔ القریش پبلی کیشنز سرنگر روڈ چوک اردو بازار لاہور۔ فون نمبر 042.37652546 اس خوب صورت ناول کا اقتساب پاکیزہ کی شمارہ اور مستقل تبصرہ نگار ایندہ عندلیب، سلاوالی کے نام ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور جوان بچوں کی ماں فرحت احمد، گلشن حدید، کراچی نے آئی آر میں ماسٹر کرنا ہے۔ (مبارک باد)

☆ معروف شاعرہ فریدہ خانم کے شعری مجموعے مختلف کی تقریب پزیرائی لاہور میں ہوئی۔ (مبارک باد)
☆ معروف شاعرہ اور مصنفہ غزلہ جلیل راؤ، ادکاڑہ ان دنوں ایک اخبار میں قسط وار ناول لکھ رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)
☆ معروف مصنفہ رضوانہ پرلس کا ناول قریبوں کی دوری کو ایک پاگل سی لڑکی کے نام سے ایک نئی ٹی وی چینل پر بطور سوپ پیش کیا جا رہا ہے اور بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ (مبارک باد) رضوانہ کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ انہوں نے اپنی سہیلیوں اور کزنز کو..... اپنے سوپ کی خوشی میں ایک زبردست ہائی ٹی وی۔ (ماشاء اللہ)

☆ معروف اداکار دانش نواز نے فون کر کے کہا کہ انہیں اپنا انٹرویو پاکیزہ میں بہت اچھا لگا..... اور انہیں یہ دیکھ کر بھی بڑی خوشی ہوئی کہ وہ باتیں کتنی دانش مندانہ کیا کرتے ہیں۔ (ماشاء اللہ، ماشاء اللہ..... مگر یہ سب تعریف ہماری رضوانہ پرلس کے کھاتے میں جمع ہوگئی ہے)

☆ معروف شاعر اور حلقہ ارباب ذوق نیویارک کے جنرل سیکریٹری جناب مشیر الحسن طالب نے اپنے حلقہ ارباب میں جناب قمر علی عباسی کے انتقال پر ایک تعزیتی اجلاس کیا۔



☆ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ”فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ میں رضوانہ پرلس نے کمال کا انٹرویو لکھا مگر ہم اسی طرح کے انٹرویوز اپنی رائٹرز کے پڑھنے چاہتے ہیں اگر انٹرویو پڑھتے ہوئے لطف نہ آئے تو میں اس بارے میں کیا کہوں آپ خود ہی سمجھ جائیں..... سدرۃ المنتہی نے بہت اچھا لکھا..... اسما قادری نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس پر بار بار لکھا جا چکا ہے..... مگر پھر بھی اسما نے اچھا لکھا..... قیصرہ حیات کا ناول شاید اب اختتام کی جانب گامزن ہے..... اچھے ٹران آتے ہیں۔ صائمہ اکرم بھی کامیاب رہیں اور سیمایا سکین بچتی بھی..... دیگر مستقل سلسلے بہت اچھے رہے اگر آپ رمضان میں پڑھنے کے لیے بہنوں کو پہلے سے بتائیں تو بہت اچھا رہے گا۔ میں اپنی جانب سے صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ سب بہنیں روزانہ سورۃ النعام (ساتویں پارہ میں ہے) کی ابتدائی تین آیات پڑھا کریں۔ شیطان سے محفوظ رہیں گی۔“ (جزاک اللہ..... پاکیزہ کے روحانی مشورے اس ماہ رمضان کے حوالے سے ہی ہیں)

☆ فرزانہ مسعود، راول پنڈی سے۔ ”میری طبیعت کیسی ہی ہو، میں جب تک پاکیزہ نہ پڑھ لوں مجھے چین نہیں ملتا۔ اب تو میری بہو بھی پاکیزہ پڑھتی ہے۔ پاکیزہ پڑھ کر خاص طور پر بہنوں کی محفل میں سب سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ہر بہن سے ایک انجانا مگر پُر محبت رشتہ ہے۔ ایندہ عندلیب، سلاوالی کی بیماری کا پڑھ کر دل سے دعا نکلتی ہے۔ عزیزہ سید کا ناول بہت پسند آ رہا ہے۔ قیصرہ حیات بھی اچھی رہیں..... آپ کے ناول کا انتظار ہے..... جلدی سے لے کر آئیں۔“ (جی ضرور)

بہنوں کی محفل

☆ طاہرہ، لاہور سے۔ ”باجی آپ بہنوں کی محفل میں جوا جھی اچھی باتیں لکھتی ہیں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ ساری باتیں آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں۔ باجی آپ کی باتیں دل پر اثر کرتی ہیں۔“ (گڑیا میں جو باتیں اپنی بیٹی سے کرتی ہوں وہی آپ سے بھی..... اور میری یہ دلی خواہش ہے کہ آپ کا قدم زندگی کی راہ میں ہمیشہ مثبت اٹھے۔ آپ کی سوچ ثبت رہے..... اور جب کوئی بچی اس سے مستفید ہوتی ہے تو میں اسی طرح خوش بھی ہوتی ہوں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین)

☆ مسز سمیرا حمید فاروقی، کراچی سے۔ ”اس ماہ امانت کی قسط بھر پور رہی..... عزیزہ سید کے ناول میں کردار بہت زیادہ ہیں۔ قیصرہ حیات کے ناول کی قسط بھی اچھی رہی۔ اسما قادری نے اچھا لکھا مگر آپ نے اس کی کتابت بہت باریک کی ہے جو نہیں ہونی چاہیے تھی۔ سہلی غزل کا افسانہ کوئی خاص نہیں لگا۔ سدرۃ المنتہی نے بہت اچھا لکھا۔ صائمہ اکرم نے میلا لوٹ لیا۔ جلتنگ میں اب ساسوں پر بھی لکھیے۔ پورا شمارہ بہترین تھا۔“ (نوازش)

☆ شہزادی، فیصل آباد سے۔ ”میں پاکیزہ کی اس وقت سے تبصرہ نگار ہوں جب میں طالبہ ہوا کرتی تھی۔ اب ماشاء اللہ میرے بچے بھی بڑے ہو گئے ہیں مگر مجھے جو چاہت اور عزت شروع دن سے ملی..... وہ آج تک قائم ہے۔ مجھے حیرت ہے باجی آپ کس طرح سے سب کو یاد رکھ لیتی ہیں اور مجھے تاسف ہوتا ہے کہ بہنیں اس بات پر کیوں ناراض ہو جاتی ہیں کہ ان کا نام لینا باجی بھول گئیں..... سیکڑوں بہنوں کو یاد رکھنا واقعی آپ کا ہی کام ہے اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے اور آپ ہمارے لیے یوں ہی محفلیں سجاتی رہیں جون کے پاکیزہ میں صائمہ اکرم، سدرۃ المنتہی کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آئیں ہاں دانش نواز کا انٹرویو بھی اچھا لگا۔“ (شکریہ)

☆ مسز ایم این، پنجاب۔ آپ کا نام میں قصداً شائع نہیں کر رہی ہوں اور نہ ہی آپ کا خط..... بس آپ کی باتوں کا جواب دے رہی ہیں۔ 1 زیادہ تر (سب نہیں) وہ لڑکے جو اپنی بیوی کو طلاق دیتے ہیں تو وہ ایک ہی بہانہ بناتے ہیں کہ وہ بد معاش تھی، وہ گھر بسا نا نہیں چاہتی تھی جیسی وہ نظر آتی تھی ویسی وہ تھی نہیں۔ 2 میں آپ کو بالکل مشورہ نہیں دوں گی کہ کسی سہیلی کے گھر جا کر رہا جائے 3۔ بیٹا سیاست آج کل کہاں نہیں ہے۔ کرسی کو ہر جگہ سلام کیا جاتا ہے اور جب کوئی چلا جاتا ہے تو اس کی ذات میں بہ آسانی کیڑے ڈال دیے جاتے ہیں، اسے بے ایمان، بد لحاظ کے ساتھ ساتھ چور بھی کہہ دیا جاتا ہے اور یہ باتیں کوئی انہونی نہیں ہیں..... ایسا ہی ہوتا ہے اور ہر طرف ہو رہا ہے مگر جو لوگ جانتے ہیں، سمجھتے ہیں..... وہ مالکان کی ایسی بہتان آمیز باتوں پر یقین نہیں کرتے..... اگر آپ کی جاب بھی ختم ہوگئی ہے تو پریشان مت ہوں، جب پریشانی آتی ہیں تو ہر طرف سے آتی ہیں مگر ان کو دور کرنے والا صرف قادر مطلق ہے۔ آپ دعا کیجیے وہ پریشانی کے ہر باد کو ہٹا دے گا۔ انشاء اللہ۔

☆ مہوش مشتعل، مہتاب کرن، پنجاب سے۔ ”اس ماہ کا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ ماڈل بالکل پاکیزہ، پاکیزہ ہی لگی۔ مجھے آپ کے ناول اور افسانے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ مجھے ناہید سلطانہ اختر اور شیریں حیدر کی تحریریں بہت پسند ہیں۔ آپ ان تک ہمارا سلام پہنچا دیں۔“ (آپ کا محبت بھرا سلام پہنچایا جا رہا ہے)

☆ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ”سب سے پہلے نیلو فر عباسی کو ہماری طرف سے تعزیت پہنچا دیں۔ ٹائٹل موسم کے حوالے سے اچھا لگا۔ ادارہ میں بہت کچھ کہہ جاتی ہو اس شمارے کی جان دونوں مکمل ناول تھا۔ بے گمان لمحے میں صبر و ہمت کی داستان تھی۔ اسما قادری مبارک باد کی مستحق ہیں۔ صائمہ اکرم نے پرانے موضوع کو بہت اچھا لکھا اور گرمیوں میں سردیوں کا موسم یاد دلایا۔ قیصرہ حیات کا ناول ٹھہرا ہوا ہے، لگتا نہیں ہے یہ ناول قیصرہ لکھ رہی ہیں۔ شام شہریاراں پڑھ کر مجھے راشد منہاس یاد آ گئے..... عزیزہ کے ناول میں ہر بات سمجھ میں آ رہی ہے مگر اب طوائفوں کے بارے

میں اتنا زیادہ کیوں لکھا جا رہا ہے۔ نصرت شمشاد کی تحریر پر مزاح رہی۔ سعدیہ رئیس نے گھریلو سیاست کو بخوبی لکھا۔ روشا نے عبدالقیوم نے مکافات عمل کو لکھا۔ پایا اور جگنو کی شادی درمیانے درجے کی تحریریں تھیں۔ نوری کا آغاز بہت خوب صورت رہا مگر اختتام نے افسردہ کر دیا۔ رضوانہ پرنس کے انٹرویو میں اس دفعہ کچھ تشنگی سی رہ گئی اور طویل ہونا چاہیے تھا۔ ان سے فرمائش ہے کہ فواد خان کا انٹرویو کریں۔ جلتنگ میں نغمہ چچی جیسے کردار ہمارے ہاں آس پاس موجود ہیں۔ روحانی مشوروں کے لیے انجم تمہارا بے حد شکریہ۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

بھائی، سنیسم ماہ پارہ، کراچی سے۔ ”جون کا شمارہ پسند آیا۔ اس سے قبل شہزادی کا ٹائٹل حاصل کر کے بے حد خوش ہوئی تھی۔ پاکیزہ میں اس دفعہ بھی ٹاپ پر جلتنگ اور بہنوں کی محفل ہے..... ایسی محفلیں اب ہر سالے میں نظر آنے لگی ہیں۔ مگر اس جیسی بات کسی میں نہیں کہ اس میں جو محبت اور چاہت مزین ہے وہ کہیں نہیں ہے۔ بڑے افسوس کے ساتھ مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ مجھے رفعت سراج کے ناول میں بالکل مزہ نہیں آرہا۔ آپ کب لکھیں گی۔“ (رفعت کے ناول میں کئی نئے موڈ اس ماہ بھی ہیں۔ آپ کو یقیناً لطف آئے گا کہ ان کی طرح مکالمے لکھنا ہر ایک کے بس کی بات کہاں)

بھائی شاہین، رحیم یار خان سے۔ ”جون کا پاکیزہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی کہ آپ نے میرا مان بڑھایا ہے۔ ان دنوں میری آنکھوں میں الرجی ہو رہی ہے۔ پاکیزہ آہستہ آہستہ پڑھا بلکہ بہنوں کی محفل بار بار پڑھی کہ اس کو پڑھ کر جو مزہ آتا ہے وہ میں تحریر نہیں کر سکتی۔ آپ نے ہمیں اپنی محبت کے رشتے سے باندھ رکھا ہے۔ روحانی مشورے پڑھ کر بے اختیار دل سے دعا نکلی۔ صائمہ اکرم کی تحریر پڑھ کر لیوں پر مسکراہٹ آگئی..... جلتنگ کی کیا بات ہے۔ ماشاء اللہ۔“ (پیاری قل شاہین، ہم انشاء اللہ تمہارا مان ہمیشہ رکھیں گے کہ تم ہماری بے حد سیرتیرہ نگار ہو..... ہماری بہت اچھی شاعرہ ہو..... اللہ تعالیٰ تمہیں کلی صحت عطا فرمائے۔ آمین)

بھائی ڈاکٹر شہلا عامر، کراچی سے۔ ”انجم باجی، میں پاکیزہ پڑھ رہی تھی اور جن شہزادیوں کا ذکر ہو رہا تھا ان پر فخر کر رہی تھی کہ اچانک ان میں اپنا نام دیکھ کر میں واقعی اچھل پڑی آپ نے مجھے یاد رکھا..... بے حد شکریہ..... جون کا پاکیزہ سپر ہٹ ہے۔ ساری تحریریں اسے ون، وائٹ نواز کا انٹرویو شاندار رہا، ہمیں ایسے ہی انٹرویوز پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ ہاں افسانہ کب آئے گا آپ کا۔“ (اس ماہ شامل ہے)

بھائی غلام صغریٰ، نواب شاہ سے۔ ”ہمارے علاقے میں پاکیزہ بہت دیر سے آتا ہے۔ آپ ہدایت کیجیے کہ وہ جلدی پہنچایا کریں۔ انجم باجی آپ کی تحریریں پڑھ کر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ بہنوں کی محفل تو پاکیزہ کی جان ہے۔ سب کی خوشیاں اور غم سناجھے لگتے ہیں۔ آپ اپنی دعاؤں میں ہمیں یاد رکھیے گا۔“ (آپ بھی)

بھائی ایلانا ہید، لیہ سے۔ ”باجی آپ کے گھر کا فون خراب ہوتا ہے تو ہمیں بڑی پریشانی ہو جاتی ہے۔ پاکیزہ پڑھ کر ہم بہت سی باتیں سیکھتے ہیں، بہنوں کی محفل میں بھی ایک اسکول موجود ہے۔ جس کو پڑھ کر بہت معلومات ہوتی ہیں۔ اساقادری کا مکمل ناول بہت شاندار رہا دیگر تحریریں بھی اچھی لگیں مگر جلتنگ کا کوئی جواب نہیں۔“ (شکریہ)

بھائی عالیہ، خیبر پختونخواہ سے۔ ”باجی آپ کو ہم..... صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پاکیزہ نہ ہم ناولوں کی وجہ سے پڑھتے ہیں، نہ افسانوں کی وجہ سے بلکہ صرف آپ کی وجہ سے پڑھتے ہیں۔ ہمیں آپ سے بہت محبت ہے۔“ (پیاری عالیہ اس محفل میں خوش آمدید..... محبت کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی۔ آپ کا یہ انداز ہمیں بھی پیارا لگا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے..... ہاں اب ہمیں آپ کا بھرپور تبصرہ چاہیے)

بھائی عینہ عندلیب، سلاوالی سے۔ ”پیاری بہنوں..... ان دنوں میں بہت بیمار ہوں۔ بار بار اسپتال جانا پڑ رہا

ہے۔ میں اس حالت میں بھی آپ سب کو یاد کر رہی ہوں۔ آپ سب کے لیے دعا کر رہی ہوں۔ آپ بھی میرے لیے دعا کریں اللہ تعالیٰ مجھے کلی صحت عطا فرمائے۔ آمین۔“ (پیاری بیٹی انشاء اللہ تم جلد صحت یاب ہوگی، قارئین پاکیزہ تمہارے لیے خوب خوب دعائیں کریں گے)

بھائی نازیہ، جڑانوالہ سے۔ ”عذرا رسول کی زندگی کی کہانی بہت اچھی لگی تھی۔ (انٹرویو) معراج صاحب کیسے ہیں؟ ناول اچھے ہیں، کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ پاکیزہ مشکل سے ملتا ہے۔ ہمارے گاؤں میں نہیں ملتا۔ باجی انجم آپ کی باتیں اچھی لگتی ہیں، اس ماہ ساری کہانیاں شاندار تھیں۔“ (پیاری نازیہ دیکھو..... تمہارا پنجابی کا تبصرہ میں نے کتنی آسان اردو میں لکھ دیا ہے بفضل خدا معراج رسول صاحب پہلے سے بہت بہتر ہیں اور یہ سب آپ بہنوں کی دعائیں ہیں۔ آئندہ بھی رابطہ رکھیے گا)

بھائی فرزانہ شعیب، سوات سے۔ ”انجم جی آپ ہمیشہ میری دعاؤں میں رہتی ہیں، پاکیزہ پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ کتنے ہی اداس کیوں نہ ہوں جلتنگ پڑھ کر مسکرانے لگتے ہیں۔ اس ماہ کا ٹائٹل بھی بہت اچھا لگا..... شہزادیوں کے ٹائٹل واقعی بہت دلچسپ تھے۔ میرا نہیں خیال کسی بھی میگزین میں اپنے لکھنے والوں سے اتنی محبت کی جاتی ہو اور اتنی عزت دی جاتی ہو کہ سب ایک ہی خاندان کے فرد لگیں۔ اس ماہ کی شاندار کہانیوں میں سدرۃ المنتہی، سعدیہ رئیس، صائمہ قیصر اور سیما یاسمین مجتبیٰ رہیں۔ عزیزہ سید اور قیصرہ حیات کے ناول شاندار رہے..... عظمیٰ آفاق اپنی پاکیزہ ڈائری اچھی سجاتی ہیں مگر اپنے افسانے بھی دیا کریں۔“ (جی ضرور۔ ہاں فرزانہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے، آپ کی سرجری بھی تو ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں بھی بتائیے گا)

✉ سیدہ کرن شاہ، گولارچی۔ خوش آمدید آپ اپنی نظمیں الگ، الگ صفحات پر بھیج سکتی ہیں۔ پاکیزہ ڈائری میں صرف ایک شعر شائع نہیں کیا جاتا۔

✉ فائزہ فاروق سحر، لاہور۔ اللہ کا شکر اس مرتبہ تم نے لائٹ پنک کے قلم کے بجائے فیروزی قلم سے خط لکھا مگر یہ کیا..... پورے خط میں صرف جلتنگ کی تعریف..... ہم نے اتنی محنت سے پورا پرچہ ترتیب دیا..... وہ نہیں پڑھا کیا۔ آئندہ تفصیلی تبصرہ لکھتا۔

✉ مسز اے ایچ صدیقی، کراچی۔ میں آپ کی جانب سے بہنوں کو بتا رہی ہوں کہ رمضان المبارک میں یاعزیز یا معنی، تسبیح ملائکہ، پہلا کلمہ، تیسرا کلمہ، درود ابراہیمی کثرت سے پڑھیں۔ جزی اللہ عنہ والادرو دشریف بھی روزانہ پڑھیں کہ یہ ہمارے حضور کو بھی بہت پسند تھا۔ توبہ کے نفل، شکرانے کے نفل بھی روزانہ پڑھنے ہیں اور سب بہنیں پاکیزہ کے تمام قارئین اس میں لکھنے والے، کام کرنے والوں کو اپنی دعاؤں میں لازمی یاد رکھیں۔ (جزاک اللہ)

✉ گلشاد نذیر، مری۔ خیریت سے تو ہو، تم نے کہا تھا اپنے مراسلات مجھے بھیجو مگر تم نے نہیں بھیجے۔ اب جلدی سے ارسال کر دو۔

✉ عروج ذکی، کراچی۔ اپنے نئے مراسلات (نثر میں) جلدی بھیج دو۔

✉ ایشل شادیان، گولارچی۔ بے حد طویل نظمیں ارسال نہ کریں، آپ اپنی تحریر نثر میں بھیجوائیں۔

✉ نجمہ اصغر، کراچی۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے، پاکیزہ آپ کا اپنا پرچہ ہے، اس میں اپنی تحریریں ضرور بھیجیں۔ اپنی نظموں، غزلوں کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی بھیجیں۔

✉ ارم، پنجاب۔ آپ کو بے حد مبارک ہو کہ آپ کے بھائی قومی اسمبلی کی سیٹ جیت گئے ہیں۔

✉ صبا نور، لیہ۔ آپ کی فرمائش کی لمبی لسٹ ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم رضوانہ پرنس سے کہہ رہے ہیں کہ فواد

بتائیے کیوں مسکرائیں نہیں بتائیں (پتا ہے ناں) بہنوں کی محفل اور تمام مستقل سلسلے بہت خوب لگے۔ اس مرتبہ سندھیے بہت اچھا لگا۔ باجی میں تمام بہنوں کی خوشیوں میں برابر کی شریک ہوں اور غمی میں اداسی میں اور تمام علیل بہنوں کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں شغلے کا مدد عطا فرمائے، آمین۔ باجی ایک بات کہوں میں خط کے ذریعے آپ سے رابطہ رکھتی ہوں اور خواہش ہونے کے باوجود بھی صرف آپ کی ڈسٹربنس کے خیال سے آپ کو فون نہیں کرتی۔ کیا اسی لیے میں آپ کی شہزادیوں میں شامل نہیں ہوں؟“ (پیاری شہزادی تم مجھے فون کر لینا)

تنتیلہ، ملتان سے۔ ”زندگی میں پہلی بار آپ کے پرچے پاکیزہ کے لیے کچھ چیزیں ارسال کر رہی ہوں مگر آج تک پاکیزہ پڑھا نہیں، نہ ہی ہمارے گاؤں میں آتا ہے میری کچھ دوستوں نے مجھے کہا کہ پاکیزہ میں لکھوں کا جل شاہ اور فیضہ آصف خان، ملتان کی جو ہیں انہوں نے کافی بار کہا۔ آپ کی خوبیوں کی آپ کے اخلاق کی وہ بہت تعریف کرتی ہیں بلکہ آئیڈیل شخصیت ہیں آپ تو ان کی۔ میں آپ کا پرچہ پنا دیکھے اندازہ بھی نہیں لگا سکتی اس لیے میں ایک افسانہ، چھ تبصرے کے حوالے سے۔۔۔۔۔ غزل اور عید کے حوالے سے غزلیں ہیں۔۔۔۔۔ چوڑیاں تو عید پر ہوتی ہیں اس لیے ایک غزل چوڑیوں پر اور عید پر ارسال کی ہے مزید رابطہ آپ سے رہے گا اگر آپ نے اپنے پرچے میں میرے لیے کچھ گنجائش نکالی تو امید کرتی ہوں کہ آپ اپنے خلوص سے مایوس و محروم نہیں کریں گی۔“ (خوش آمدید، معاف کرنا یہی نام پڑھا گیا ہے جو آپ نے انگریزی میں دستخط کیے تھے۔ آپ کے لیے مشورہ ہے کہ پہلے آپ پاکیزہ کا مطالعہ کریں۔ افسانہ تو شائع نہیں ہو سکتا ہاں شاعری میں جان ہے)

فریدہ فری یوسف زئی، لاہور سے۔ ”ناٹل بے حد دلکش لگا اس میں اپنی غزل دیکھ کر اچھا لگا۔ بے گمان لمحے اسما قادری کا ناول بے حد پسند آیا۔ نوری بھی اچھی تحریر لگی۔ پاپائزہت جیوں تو کھلتی ہی بہت اچھا ہیں۔ گھر کی عزت، ناک آؤٹ، اک خواب تم بھی ہو۔ صائمہ اکرم کا بہت حوالہ نکال کا ناول ہے۔ جنگلوں کی شادی تو بہت ہی مزے دار تھا۔ روحانی مشورے بہت ہی مفید ہوتے ہیں پلیز۔ سندھیے میں سندھیے ہی بھیجا کریں لطافت نہیں۔ کیری کا دو پیازہ اور قلفی کھا کر مزہ آ گیا۔ انجم جی مجھے آپ سے کالج ہی لڑکی منگوانی ہے۔ پیسے آفس کے ایڈریس پر بھیج دوں ضرور بتائیے گا۔“ (آپ لاہور کے اردو بازار سے القریش پبلی کیشنز سے جا کر خرید لیں یا انہیں فون کر دیں۔ وہ کتاب آپ کے گھر بھیج دیں گے۔ ان کا فون نمبر۔۔۔۔۔ بہنوں کی محفل میں مل جائے گا)

بشری سمیل، یو اے ای سے۔ ”جس کہانی نے دل پر حد درجہ اثر کیا وہ ماں کی دعا اور نوشین ناز کی احسان تیرا تھیں پڑھ کر آنسو ہی نہیں رک رہے تھے۔ نیلم احمد بشیر ہمیشہ امریکا ہی کی کہانی لکھتی ہیں شاید کہ وہ وہاں رہتی ہیں مگر ماں سے دوسرے دن سے کچن میں کام کروانا بہت عجیب لگا۔ تین پہر کا جیون بھی سچی کہانی لگ رہی تھی۔ قانتہ رابعہ کی اور گواہ بھی بہت اچھی تھیں تقریباً ہر ایک میں کوئی نہ کوئی دینی نکتہ موجود تھا جو کہ روایتی طریقے کے بجائے بہت اچھی طرح لکھنے سے بہت اچھا لگا۔ رفعت سراج کا ناول اور قیصرہ حیات کا ناول اس قدر بوجھل ہیں کہ پڑھ کر طبیعت پڑمردہ ہو جاتی ہے۔ ایک عجیب سا ماحول ہے دونوں کا خاص کر امانت میں مہر جان کے رویے میں سنسن زیادہ ہو گیا ہے لگتا ہے اصل خان اور گل جان رابی کے ماں باپ ہیں۔ آج کل ہر طرف ویسے ہی شنیشن ہے اس لیے پلیز صائمہ اکرم سے ہر ماہ ضرور لکھوایا کریں اندر تک طبیعت بٹاش ہو جاتی ہے، جیتی رہو صائمہ۔ ساجدہ حبیب سے ملاقات اچھی رہی لیکن اگر رضوانہ پرنس دوبارہ سے انٹرویو شروع کر دیں تو بہت مزہ آئے گا کیونکہ ان کے کیے گئے سارے انٹرویو بے حد دلچسپ اور شگفتہ ہوتے تھے۔ نزہت اصغر کے تھوڑے غیر دلچسپ اور بہت طویل ہوتے ہیں۔ سروے بھی اس دفعہ بور تھا۔ پاکیزہ ڈائری روایتی ہوتا ہے اس میں کچھ جدت لائیں۔ جلتنگ حسب معمول شاندار تھا۔ سندھیے کے بجائے بزم پاکیزہ زیادہ اچھا ہوتا

خان کا انٹرویو جلد از جلد کریں اور ندانواز اور یاسر نواز کا بھی۔

رفعت خادم حسین، بلوچستان۔ گڑیا، خیریت سے تو ہونا۔۔۔۔۔ بہت دن ہو گئے تم نے اپنی باجی کو یاد نہیں کیا۔ جلدی سے اپنی شاعری مجھے بھیجو۔

شیمم فضل خالق، پشاور سے۔ ”مجھے کچھ کہنا ہے کا اس بار کا ٹاپک بہت پسند آیا۔ واقعی اچھے دوست بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ میں تو اپنے دوستوں کے ساتھ بہت خوش رہتی ہوں۔ رشتے داروں کے حقوق ضرور ادا کرتی ہوں لیکن خوش دوستوں کے ساتھ رہتی ہوں امانت ویسے مزہ نہیں دے رہی جو رفعت سراج کی پہلی تحریریں دیتی آئی ہیں معافی بال و پر ایک حقیقی تصویر ہے۔ ساجدہ حبیب کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ لیکن ساجدہ تو بڑی اسمارٹ ہوا کرتی تھی۔ اتنا وزن کیوں بڑھا لیا۔ جلتنگ حسب معمول زبردست تھا وہ آئیں گھر ہمارے، بہت زیادہ اچھا لگا۔۔۔۔۔ بہت ہنسے۔ اور اپنے میاں کو سنایا۔۔۔۔۔ انجم ڈیر۔۔۔۔۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔۔۔۔۔ خدا آپ کے ذہن کو اسی طرح زرخیز رکھے آمین۔“ (نوازش)

شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ”خوب صورت ترین ادارے سے سچا جون کا پاکیزہ جس کا ٹائٹل بھی پیارا ہے۔ بے مثال ٹھہرا۔ وجہ یہ ہے کہ آپ کی بے انتہا محنت نے اس کو خوب صورت افسانوں، ناولٹ اور ناولز سے جگمگا رکھا ہے۔ امانت بہترین چل رہا ہے۔ روبی کی گرفتاری نیا موڑ ہے۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔ نصرت شمشاد نے۔۔۔ ناک آؤٹ بہت خوب لکھا۔ یہ ایک حقیقی المیہ ہے۔ قیصرہ حیات کے ناولٹ کی نویں قسط بے حد پسند آئی۔ سعدیہ رئیس نے بھی خوب ہی لکھا اور معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے کہ اگر کسی کی غلطی کی نشاندہی۔۔۔ کرنا چاہیں تب سارے اپنے بھی آنکھیں سر پر رکھ کے دوسروں کو ہی عتاب کا نشانہ بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ نزہت جیوں ضیا کا پاپا بہت اچھا لگا اور جناب جنگلوں کی شادی بے حد دلچسپ رہا بہت پسند آیا۔ صائمہ اکرم کا بہت حوالہ نکال کا ناول رہا۔ حریم کا فیصلہ بہت بروقت اور بہترین تھا۔ پچھلے ماہ رضوانہ پرنس کا افسانہ بے حد پسند آیا تھا تو ٹریبیڈی لیکن بہت ہی اچھا لگا۔ رضوانہ پرنس کو بے حد مبارک باد کہنی وی پران کا ڈراما بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ اس بار جلتنگ کے دونوں خاکے اس قدر سچے، پیارے اور حقیقی تھے کہ لطف آ گیا۔ آپ کا ماشا اللہ زبردست مشاہدہ ہے۔ بہت ہی پُر لطف لکھتی ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ آخر میں آپ سے شکایت کہ آپ نے سب کو رانی، ملکہ، شہزادی بنایا لیکن چراغ تلے اندھیرا آپ نے غلطی کو کیوں نظر انداز کیا۔۔۔۔۔ احتجاج ہے۔“ (تبصرے کا شکریہ آئندہ پھر کبھی سہی)

فرحت احمد، کراچی سے۔ ”رفعت سراج کی امانت نے دل موہ لیا ہے تجس سے بھر پور ایک خوب صورت تحریر ہے۔ عزیزہ سید کی شام شہر یاراں نے بھی دوسری ہی قسط میں اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔ انشاء اللہ دونوں ناول ایک سے بڑھ کر ایک ثابت ہوں گے۔ قیصرہ حیات کے ناولٹ کہیں دیپ جلے کہیں دل نے توجہ ڈال دیا۔ آنکھ سے زیادہ دل رویا۔ رضوانہ پرنس نے اس شب کی سحر نہیں ہے، میں موجودہ حالات کی عکاسی بہت اچھے طریقے سے کی ہے۔ نیلم احمد بشر کی وہ کھڑکی زندگی کی ایک حقیقت محسوس ہوئی۔ تو قیر عاتشہ، نیانا نام ہے ان کی گواہ نے بحیثیت مسلمان ہم سب لوگوں کی ایک بہت خاص نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اللہ ہم سب کو اللہ کی طرف سے ملنے والے سنگٹل کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ باجی مجھے تو اپریل 2013ء کو آنے والے زلزلے بھی اللہ کی جانب سے سنگٹل ہی محسوس ہوئے ہیں جس میں اللہ نے ہم سب لوگوں کو محفوظ رکھ کر کچھ سوچنے اور کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی رضا میں راضی رہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ ماں کی دعا نے دل ہلا دیا۔ عزم و حوصلے کی ایک خوب صورت تحریر۔ اس کے علاوہ باقی دوسری تمام تحریریں بھی اچھی ہیں۔ سینئر معتمدہ ساجدہ حبیب سے گفتگو بہت پسند آئی۔ خاص کر پہلی تصویر۔۔۔۔۔



پاکیزہ ڈائری عظمیٰ آفاق سعید

نعت رسول مقبول ﷺ

لنا ہمار ہوں میں، خطا کار ہوں میں
شفاعت کی پھر بھی طلب گار ہوں میں
نکل جائے گی میری کشتی بھنور سے
میرے پیارے آقا اگر آپ کہہ دیں
میں بیمار ہوں آپ کو سب خبر ہے
پُر امید ہوں شب کے بعد اک سحر ہے
شفا مجھ کو دے گا خدا یہ یقین ہے
میرے پیارے آقا اگر آپ کہہ دیں
دعا میں میری پوری کردے الٰہی
مجھے صبر دے اور سکون دے الٰہی
اطاعت کی چادر اوڑھادے مولیٰ
میرے پیارے آقا اگر آپ کہہ دیں
میری آزمائش میری زندگی ہے
میری زندگی ہی میری بندگی ہے
میں راضی ہوں اس سے وہ ہو جائے راضی
میرے پیارے آقا اگر آپ کہہ دیں
صدائے گونجتی ہے یہ گلشن میں کس کی
میں عاشق ہوں قرآن، نبی اور خدا کی
جو جذبہ ملا ہے بڑھا دے گا مالک
میرے پیارے آقا اگر آپ کہہ دیں
کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

دعا

عطا ہے تری اے آقا
عطاری ہی بناؤ الٰہ
تجھے بس سوچتی تھی میں
اپنی ناقص فہمی سے
دے کر ہاتھ میں تو نے قلم

ہے۔ روحانی مشورے بہترین ہوتے ہیں یہاں اس سے بہت لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ کیا پاکیزہ یہاں گھر پر ڈیجیٹل ہو سکتا ہے، ضرور بتائیے گا؟“ (جی ہاں، گھر پر پرچہ حاصل کرنے کے لیے اشتہار میں دیے گئے طریقے پر عمل کریں)
شیریں تبسم، کراچی سے۔ ”مجھے کچھ کہنا ہے میں اس ماہ آپ نے بہت زبردست بات کہی ہے جو تمام قلم کاروں کے لیے بہت مفید ہے۔ تقاضے دلوں کے اسی معاشرے کی عکاسی کرتی ہوئی دکھائی دی بہت اچھا لکھا نیلہ ابرار جانے۔ سر پرانز میں اگر مہر روایتی ساس بن جاتی تو واقعی میں ان کا گھرانہ کے بیٹے کا گھر خراب ہو جاتا مگر سیکینہ فرخ نے مہر کا کردار بہت اچھا تخلیق کیا واقعی خواتین کو مہر جیسا ہی سمجھدار ہونا چاہیے۔ شیریں حیدر کی تحریر بھی اچھی لگی۔ باقی تمام غزلیں، تحریریں، جلتزنگ پسند آئے۔ جلتزنگ تو اس مرتبہ ایک ٹکٹ میں تین مزے تھا۔ حسینہ معین سے ملاقات بہت دلچسپ لگی۔“ (تبصرے کا شکریہ)

پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ”افسانے تو ایک سے بڑھ کر ایک تھے ہی مگر حسینہ معین کا مفصل انٹرویو پڑھ کر مزہ آگیا۔ شہزادیوں میں ناچیز کا نام شامل فرمانے پر بہت شکریہ۔ آپ مجھے ہر سال سالگرہ پر یاد رکھتی ہیں۔ آپ نے تو مجھے بن مول خرید لیا ہے۔ میرا نام اپنوں میں شامل کر کے آپ نے میرے دل بلکہ مزاج پر بھی کافی خوشگوار اثرات مرتب کیے ہیں حتیٰ کہ مجھے پہلی بار اپنے ہاتھ کے پکے ہوئے کرلیے بھی کڑوے نہیں لگے۔“ (یہ تو بہت اچھی بات ہے)

نصرت جمیل ملک، خوشاب سے۔ ”اس مرتبہ اسما قادری کے ناول بے گمان لمحے دل کے تاروں کو چھو گئے جس میں گداگری جیسے پٹھے اور اس سے منسلک افراد کی منظر کشی نے متاثر کیا۔ سدرۃ المنتہیٰ کا ایک خواب تم بھی ہوا اچھی تحریر ہے۔ روشنائی عبد القیوم کی وہ ایک پل، نزہت جمیل کی پاپا نے بھی متاثر کیا۔ رضوانہ پرنس نے دانش نواز سے بڑی دلچسپ ملاقات کروائی۔ رضوانہ جی اب ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ خطوط میں ڈاکٹر ممتاز ضیا، نزہت اشفاق، فائزہ شہزاد کے تبصرے مزہ دے گئے۔“ (شکریہ)

افسانہ آفتاب، کراچی سے۔ ”آپی میں باقاعدگی سے پاکیزہ ڈائجسٹ پڑھتی ہوں۔ پاکیزہ کے تمام سلسلے ہی لا جواب ہیں۔ مجھے شاعری سے بے حد لگاؤ ہے۔ رفعت سراج میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ پاکیزہ میں ان کی شرکت بے حد خوشنما محسوس ہوتی ہے۔ آپی میں اپنی چند کاوشیں آپ کی تذکرہ کر رہی ہوں۔“ (اس محفل میں خوش آمدید، میں آپ کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کروں گی)

بہنوں کی محفل اپنے اختتام کو پہنچی..... اب آئیے ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ یا رحمن یا رحیم میرے جسم کو شفا، دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نور بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین تو مجھ سے میری آل اولاد سے ہمیشہ راضی رہنا اور دونوں جہان میں میری خیر عطا فرماتا۔ بے شک میرا رب برکت اور بلندی والا ہے، آمین ثم آمین۔

یا مجیب یا مجیب یا مجیب

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

پھر عشق کا آقا

لکھاری ہی بناؤ الٰہ، وہ کیسے ہیں
کہاں پر ہیں
انہیں میں جان نہ پاؤں
انہیں میں دیکھ نہ پاؤں
یثرب کے اس والی کا
بھکاری ہی بناؤ الٰہ
عطاری ہی بناؤ الٰہ
کسی حصّہ کی صورت میں
کسی خنسا کی صورت میں
دعا میں تجھ سے یہ مانگوں
کنیز فاطمہ یارب مجھے بس تو بنا دینا
عطاری سے کہیں زیادہ مجھے اس
خاتونِ جنت کی باندی ہی بنا دینا
پسند: بشریٰ باجوہ عطاریہ، اوکاڑہ

احادیث نبویؐ

☆ اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں گے۔
☆ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خطرہ شرک اصغر سے ہے۔“ صحابہ نے عرض کی۔ ”یا نبی! یہ شرک اصغر کیا ہے؟“ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”ریا (دکھاوا)“
☆ تقویٰ کو لازمی پکڑو یہ تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔
☆ تم جہاں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو اور جب برائی ہو جائے تو اس کے بعد نیکی کر لو وہ اس کو مٹا دے گی اور لوگوں کے درمیان اچھے اخلاق سے رہو۔
مرسلہ: طلعت اسلام خان، اٹک

گھر۔ اداس۔ ویران جوا اولاد نہیں

آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ اولاد نہ ہونے سے دوسری شادی یا طلاق جیسے گھریلو جھگڑے، اداسیاں اور جدائیاں جنم لے رہی ہیں۔ آپ خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ ہم نے صرف دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ آپ کے ہاں بھی خوبصورت اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔ آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی بے اولادی کورس منگوالیں۔ خدا کے لئے ہمارا اپنے گھر کے ماحول کو تو جنت بنا لیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ

ضلع حافظ آباد۔ پاکستان

0301-6690383

0300-6526061

فون اوقات

صبح 10 بجے سے عصر 4 بجے تک

پہلی بارش

یاد ہے مجھ کو اب بھی ساجن
موسم کی وہ پہلی بارش
نیلے نیلے امبر پر جب
کالی گھٹائیں چھائی تھیں
بارش کی بوندوں نے جیسے
پیار کی دھن بجائی تھی
پیار کی اس برسات میں بجنا
میں بھی خوب نہائی تھی
تیرے ساتھ نے ساجن مجھ پر
روپ نیا چڑھایا تھا
دیکھ کے میرے روپ کو بجنا
چند ابھی شرمایا تھا
اب کے برس پھر بارش برسی
کالی گھٹائیں اب بھی آئیں
بارش کی بوندوں نے ساجن
پھر سے پیار کی دھن بھی بجائی
تجھ کو اپنے ساتھ نہ پا کر
یاد مجھے وہ بارش آئی

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

سکون

سکون حاصل کرنے کی کوشش چھوڑ دو۔ سکون دینے کی فکر کرو تو سکون مل جائے گا۔ اللہ کے فیصلوں پر تنقید نہ کرنا، سکون مل جائے گا۔ بے سکونی تمنا کا نام ہے جب تمنا تابع فرمان الہی ہو جائے تو سکون شروع ہو جاتا ہے، اپنی زندگی میں آپ کو جو چیز سب سے اچھی نظر آئے، اسے تقسیم کرنا شروع کر دو، سکون آ جائے گا۔

تحریر: واصف علی واصف

مرسلہ: جمیر انوشین، منڈی بہاؤ الدین

غزل

زندگی مجھے ملی بھی تو خیرات کی طرح

کرے، اس کی زندگی دراز ہونے کی دعا کرے اور بیمار سے خواہش کرے کہ وہ بھی اس کے لیے دعا کرے چونکہ بیمار کی دعا فرشتوں کی دعا کی طرح ہوتی ہے۔

☆☆☆

☆ حضرت امام جعفر صادقؑ کے ایک صحابی ایک مریض کو چھوڑ کر چلے گئے۔ مریض نے اس کا شکوہ امامؑ سے کیا تو آپؑ نے فرمایا کہ اس کا تمہاری عیادت کرنا مسجد نبویؐ میں نماز پڑھنے سے بہتر تھا۔

مرسلہ: جبیں ہاشمی، بھیرہ

حضرت امام غزالیؒ کی نصیحتیں

☆ رات کو سوتے وقت دن بھر کے کاموں کا محاسبہ کرو۔

☆ کلام میں نرمی اختیار کرو، اس کا اثر الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے۔

☆ تکلف میں زیادتی محبت میں کمی کا سبب بن جاتی ہے۔

☆ عورتوں کی بدخلقی پر صبر کرنے والا حضرت ایوبؑ کے برابر ثواب پائے گا۔

☆ غفلت ایسی لعنت ہے جو بندے کو خدا سے دور پھینک دیتی ہے۔

☆ قرض بغیر تقاضا ادا کر دینا قرض دار کی طرف سے احسان ہے۔

☆ جس احتیاط اور پرہیز سے مسلمان کو رنج پہنچے اسے چھوڑ دو۔

☆ سب سے بڑی دولت زبانِ ذاکر، دلِ شاکر اور فرمانبردار عورت ہے۔

☆ نیک عورت امور دنیا سے نہیں بلکہ اسبابِ آخرت میں سے ہے۔

☆ عورت کی بدخلقی پر صبر کرنا، اس کو ضروریات مہیا کرنا اور راہِ شرع پر قائم رکھنا بہترین عبادت ہے۔

مرسلہ: ام ایمان، کوٹ چٹھ

درود پاک کی فضیلت

☆ درود پاک پڑھنے والا قیامت کے دن سب لوگوں سے حضورؐ کے زیادہ قریب ہوگا۔
☆ درود پاک پڑھنے والے کی دعا قبول ہوتی ہے۔
☆ درود پاک پڑھنے والا لوگوں کی غیبت سے محفوظ رہتا ہے۔

☆ درود پاک پڑھنے والے کے لیے خود اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہے۔

☆ درود پاک پڑھنے سے حضورؐ کی محبت بڑھتی ہے۔
☆ رسول پاکؐ خود درود پاک پڑھنے والے سے محبت فرماتے ہیں۔

☆ درود پاک ساری نفل عبادتوں سے افضل ہے۔
☆ درود پاک پڑھنے والے کے گھر میں آفتیں اور بلائیں نہیں آئیں۔

☆ درود پاک پڑھنے سے دل کی صفائی ہوتی ہے۔
☆ درود پاک پڑھنے والے کی جانکئی میں آسانی ہوتی ہے۔

مرسلہ: تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد

مریض کی عیادت کا اجر و ثواب

احادیث نبویؐ کی روشنی میں

☆ جو کوئی ایک بیمار کی ایک شب و روز تیمارداری کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ محشور فرمائے گا۔

☆ جو کسی مریض کی ایک دن اور ایک رات عیادت کرے اس کا خیال رکھے تو وہ پل صراط سے بچکی کی تیزی اور چمک کی طرح گزرے گا۔

☆ مریض کی عیادت کرنے والا اپنے گھر سے بیمار کے گھر تک چل کر جاتا ہے تو وہ ایسے ہی کہ جیسے بہشت کے باغوں میں سے گزر کر گیا۔

☆ حضرت محمدؐ کا فرمان ہے کہ تم میں سے جب بھی کوئی بیمار کی عیادت کے لیے جائے تو اس سے ہاتھ ملائے اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھے اس کی مزاج پرسی



جانتی تھیں انجمن انصار

سُکھ اور دکھ

یہ کہاوت نئی نہیں ہے بہت پرانی ہے کہ دو بہنوں کی اگر ایک ساتھ شادی کی جائے تو ایک بہن سکھی رہتی ہے اور دوسری بہن دکھی۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ ہم دونوں کے رشتے کچھ ایسے آ رہے تھے جو دو سکے بھائیوں کے ہوتے یا ایک ساتھ شادیاں چاہتے..... اور ہماری اماں انکار کر دیتیں مگر جو قسمت میں ہوتا ہے وہی ہر صورت میں پورا ہوتا ہے۔ دو سکے بھائیوں سے ہم دونوں کی شادی ایک ہی دن ہوئی۔ ”یہ دونوں لڑکے اعلیٰ تعلیم یافتہ، اچھے اخلاق سے آراستہ اور بہت پیے والے ہیں۔ تمہاری دونوں بیٹیاں راج کریں گی۔“ بڑی چچی نے اماں کو خاصا دلاسا دیا تھا اور بعد میں اُن کی بات سچی بھی نکلی کہ 75 فیصد جو برائیاں، جو لڑائیاں اور جو پریشانیاں سسرال میں لڑکیوں کو ہوتی ہیں وہ ہم دونوں بہنوں کو نہیں ہوئی تھیں۔

شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ ہم دونوں کا شمار خوب صورت ترین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ اخلاق اور تمیز بھی ہماری کٹھی میں رچی ہوئی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم اتنا زیادہ جھینر لے کر آئے تھے..... اتنا ان کے خاندان میں کبھی کوئی نہیں لایا تھا۔

اور پھر شادی کو دس سال ہو گئے۔ میرے شوہر اور میرے بہنوئی دونوں بہت اچھے ہیں مگر اس کے باوجود ہم دونوں بہنیں بہت دکھی ہیں۔

ہم دونوں کا دکھ ایسا ہے کہ ایک دوسرے کے سوا کسی سے کہہ تک نہیں سکتے۔ ہم دونوں بہنوں کو آئے دن تقریبات میں جانا پڑتا ہے تو میں یہ دیکھتی ہوں کہ

میرے بہنوئی تقریب میں شریک لڑکیوں کو تو کیا شادی شدہ خواتین تک کو رال بہانے والے انداز میں دیکھتے ہیں اور ان کی ہوس ناک نظریں کتنی ہی خواتین کو نگل رہی ہوتی ہیں جبکہ میرے شوہر کی کو گہری نظر سے تو کیا نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اگر کسی کو دیکھتے بھی ہیں تو اس انداز میں کہ اس کے بجائے کسی اور کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ گھر آتے ہیں تو ان کے تجزیے اور تبصرے میرا دل مسوس دیتے ہیں۔ ”سنو تم نے گلابی جارجٹ والی حسینہ کو نہیں دیکھا؟“

”نہیں دیکھا۔“

”ارے، دیکھنا چاہیے تھا۔“

”کیوں، کوئی خاص وجہ؟“

”ہاں بھئی..... اس پگلو نے گہری گلابی شیز پہن رکھی تھی اور نیچے کالے رنگ کی وہ پہنی ہوئی کتنی بمبار لگ رہی تھی.....“

”خواتین تو ایک دوسرے کو اتنی گہری نظروں سے نہیں دیکھا کرتیں۔“

”بھئی میں اندھا بن کر تو نہیں جاسکتا نا.....“

”اور فیروزی ساڑی والی کی لپ اسٹک کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ کتنے پیارے کٹاؤ ہیں..... اس کے ہونٹوں کے..... اس کی لپ اسٹک کی محراب کو چھو لینے کو دل چاہ رہا تھا۔ بے وقوف بار بار ٹشو پیپر سے لپ اسٹک برابر کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ تو کھانے کے ساتھ..... سب کھا گئی تھی۔ صرف مچلے لب کی آخری سطح پر ہلکی سی رہ گئی تھی۔“

”اور یلو سوٹ والی کو پسینے کس قدر آ رہے تھے۔“

ہنگام سحر کتنے ہی خورشید ڈھلے ہیں جو جھیل گئے ہنس کے کڑی دھوپ کے تیور تاروں کی خنک چھاؤں میں وہ لوگ جلے ہیں اک شمع بجھائی تو کئی اور جلا لیں ہم گردشِ دوراں سے بڑی چال چلے ہیں

مرسلہ: یاسمین کنول، پسرور

یادیں

میری آنکھ میں تیری یاد کا آنسو

بن کر

جو ٹپکتا ہے

وہ ساغر سے بھی گہرا ہے

اس دلیں میں بسنے والے

میرے دل میں خواب تیرا ٹھہرا ہے

شاعرہ: رفعت خادم حسین، ملتان

عادت کب بدلتی ہے

مسافر تو بچھڑتے ہیں رفاقت کب بدلتی ہے محبت زندہ رہتی ہے محبت کب بدلتی ہے تمہی کو چاہتے ہیں ہم، تمہی سے پیار کرتے ہیں یہی برسوں کی عادت ہے اور عادت کب بدلتی ہے انتخاب: صبا نور، لیہ

محبت

محبت لامشروط ہوتی ہے لامحدود ہوتی ہے

محبت کا کوئی بار ڈر نہیں ہوتا

یہ ہر ایک شرط سے آزاد ہوتی ہے

محبت کے پیچھے چاہنے پر بھی کبھی باہر نہیں آتے

☆☆☆

ساتھی چھوٹ جاتے ہیں

رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

بدگمانی دل میں آجائے

تو اپنے روٹھ جاتے ہیں

مرسلہ: صائمہ بگلش، کوہاٹ

☆☆☆

پانی رواں ہے آنکھ سے برسات کی طرح جگر ہے سوختہ دل چور چور ہے میرا لپٹے ہوئے ہیں جاں یہ زخمِ تمغات کی طرح حیراں ہوں میں بھی لوگ بھی اس کی اداؤں سے کرتا ہے پیار مجھ سے تنازعات کی طرح اس نے میری وفاؤں کا ایسے صلہ دیا قرضہ اتارتا ہے وہ صدقات کی طرح

شاعرہ: سیدہ برجیس رباب، ٹیکسلا

نظر

اونچی آواز میں اس نے تو کبھی بات نہ کی خفگیوں میں بھی وہ لہجہ رہا کوئل کی طرح مل کر اس شخص سے میں لاکھ خوشی سے چلوں بول اٹھتی ہے نظر پاؤں کی پائل کی طرح

مرسلہ: مسز نگہت غفار، کراچی

ایسا بھی ہوتا ہے

ایک مرتبہ ایک لڑکی نے بوائے فرینڈ سے پوچھا۔ ”ہم ہر چیز کا ناپ کرتے ہیں۔ وزن کا، لمبائی کا، طاقت کا، اسپید کا، فاصلے کا مگر ہم نے بھی محبت، اعتماد، دوستی اور اخلاق کا ناپ نہیں کیا، آخر کیوں؟“ لڑکے نے تھوڑی دیر سوچا اور خوب سوچنے کے بعد لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو جانو! بکواس کم کیا کرو۔ میں ڈیٹ پر آیا ہوں فزکس کا وائیو دیئے نہیں۔“

مرسلہ: فائزہ شہزاد، پشاور

غزل

یہ فخر تو حاصل ہے برے ہیں کہ بھلے ہیں دو چار قدم ہم بھی ترے ساتھ چلے ہیں جلنا تو چراغوں کا مقدر ہے ازل سے یہ دل کے کنول ہیں کہ بجھے ہیں نہ جلے ہیں نازک تھے کہیں رنگ گل و بوئے سخن سے جذبات کہ آداب کے سانچے میں ڈھلے ہیں تھے کتنے ستارے کہ سر شام ہی ڈوبے

میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے رومال سے اس کے شہابی رخساروں پر پھیلنے والے پسینے کے موتیوں کو جمع کر دوں۔ نیلی ساڑی والی کی چال قیامت تھی، اس کی دراز چوٹی اس کے کولہوں پر پھدک رہی تھی۔

”پر پل ساڑی والی کا فکر بہت اچھا تھا مگر باؤلی نے فل آستینوں والا بلاؤز پہن لیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے سیلوئیس بلاؤز پہنا دوں..... اور جب میں تصور کی آنکھ سے اسے اپنا من پسند بلاؤز پہنا چکا تو وہ اتنی کیوٹ لگ رہی تھی کہ میں بتا نہیں سکتا۔“

”اور سفید سوٹ والی کتنی اتر رہی تھی اور جب اونچی ایڑی پر اس کا پاؤں پھسلا تو امداد طلب نظروں سے اس نے سب سے پہلے مجھے دیکھا تب میں نے سوچا کاش اس کو گود میں لے کر اس کے پاؤں پر گھنٹا، دو گھنٹا مالش کرتا۔ اپنے ساتھ شاپنگ پلازہ لے جا کر اس کے پری جیسے پیروں میں کوئی چپل پہنا تا مگر وہ تو چلی گئی..... کچھ بتائے بغیر..... کچھ سوچے بغیر..... کچھ کہے بغیر..... خیر اب کبھی ملی..... یا اب بھی اس کا پیر میرے سامنے مڑا تو چھلانگ مار کر اسے گود میں اٹھا لوں گا اور اسپتال کی جانب بھاگتا چلا جاؤں گا۔ جیسے فلم کے ہیرو بھاگتے ہوئے جاتے ہیں۔“

ہمارا پورا خاندان یہ کہتا ہے کہ صداقت اور شجاعت میں دونوں بھائی بہت اچھے ہیں اور بے حد نیک ہیں۔ اپنی، اپنی بیویوں کا حد سے زیادہ خیال رکھتے ہیں مگر یہ دکھ..... ہم دونوں بہنیں ہی سمجھ سکتی ہیں کہ یہ دونوں بھائی کس قدر شر اور آفت کی تفصیل ہیں۔

شادی کے جدید کارڈز

آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی..... مورخہ 12 جون کو ٹیٹا کی جی سے شادی فلاں ہال میں ہو رہی ہے جو آپ کی رہائش سے قریب ترین ہے، نیوٹا پانچ سو روپے سے زائد دینے والے ویسے کی تقریب کا کارڈ حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسو سے کم دینے والے مہمان تقریب میں ہرگز شرکت نہیں کریں ورنہ.....!

اہل دل مہمانوں کے منتظر
مسٹر اینڈ مسز ایکس، والی

☆☆☆

ہمارے پیارے بیٹے شہزاد کا ولیمہ فلاں فائیو اسٹار ہوٹل میں ہو رہا ہے۔ بچوں کو لانا منع ہے مرد حضرات کے لیے سیاہ ڈنرسوٹ پہننے کی پابندی ہوگی، ہاں خواتین اپنی پسند کے ملبوسات میں آسکتی ہیں۔

نوٹ: تحائف دینے کے بجائے صرف کیش میں اپنا نیوٹا والدہ شہزاد کو دیا جائے جو استقبالیہ میں موجود ہوں گی۔ (ان کی شناختی علامت گلابی ساڑی، بڑا سا پرس اور دائیں ہاتھ میں موٹا سا کڑا ہے)

منتظر
مسٹر اینڈ مسز شہزاد

☆☆☆

ہماری پیاری بیٹی رضیہ سلطانی کی رسم رخصتی گھر سے ہو رہی ہے، سنگل بلاوا ہے، رخصتی کی تقریب رات کے بارہ بجے ہے۔ آپ پونے بارہ بجے تشریف لائیں ایک ہاتھ سے اپنا نیوٹا دیں اور دوسرے ہاتھ سے برگر اور جوس کا پیکٹ حاصل کریں، آپ کی چند منٹوں کی یہ شرکت ہمارے لیے باعث صداقت ہوگی۔ شکریہ

شرکت کے متمنی
مسٹر اینڈ مسز تجمل

☆☆☆

بفضل خدا ہمارے پیارے بیٹے کی دوسری شادی ہو رہی ہے۔ آپ اس خوش قسمت تقریب میں شرکت کر کے اپنے لائق عمل پر بھی سوچ بچار کر سکتے ہیں، ہماری ہونے والی بہو ایک نامی گرامی پرائیویٹ کالج کی پروفیسر ہے۔ اس کے کالج میں داخلہ لینے والوں کو خصوصی رعایت دی جائے گی۔

استقبالیہ
پہلی والی کے سب بچے۔ منتظر، والدین



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ کائنات، عبدالحلیم..... میر پور خاص
اک طرف جھوم کر بہار آئی
اک طرف آشیاں جلائے گئے
اک طرف خون دل بھی تھا نایاب
اک طرف جشن جاں منائے گئے
☆ نزہت جمیں ضیا..... کراچی

صحرا ہے مری ذات کہ جو مجھ سے ملا ہے
نزدیک تو آیا ہے مگر کھو بھی گیا ہے
☆ نفیسہ آرا..... راس النحیمہ

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے
☆ غزالہ شاہد..... کراچی

تمہارے سحر سے باہر نکل نہیں سکتے
تمہاری یاد ہی اب اوڑھنا بچھونا ہے
غموں کا زور ہے ہر لمحہ دل دھڑکتا ہے
یہ سوچتی ہوں کہ ہو جائے اب جو ہوتا ہے
☆ کوثر خورشید بزمی..... یو کے

یہ ہی معیار دیانت ہے تو کل کا تاجر
برف کے باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

☆ ایلیا عباس..... لاہور
سموم وقت نے لہجہ کو زخم زخم کیا
وگرنہ ہم نے قرینے صبا کے رکھے تھے
ہوا کے پہلے ہی جھونکے سے ہار مان گئے
وہی چراغ جو ہم نے جلا کے رکھے تھے
☆ سامعہ تبسم..... ملتان

تیرا آنا تو خواب تھا لیکن
ہم چراغوں کے ساتھ جلتے رہے
کیا بتائیں کہ اب کے ساون میں
ہم تجھے کتنا یاد کرتے رہے
☆ فصیحہ آصف خان..... ملتان

دل ہوتا جا رہا ہے اب قابو سے باہر
سنا ہے تو بھی شریک ہے اس سازش میں
☆ شائستہ محمد علی..... حیدر آباد

دی ہے شکست جس نے مجھ کو تمام عمر
وہ شخص ہی جان سے پیارا لگا مجھے
☆ قرۃ العین علی..... ڈیرہ غازی خان

بس جی رہے ہیں اتنا غنیمت ہے اے عدم
کس طرح ہو رہی ہے بسر کچھ نہ پوچھیے
☆ عنبر وسیم..... گوجرانوالہ

لو تھر تھرا نہ جائے چراغ حیات کی
اتنا بھی طول دو نہ شب انتظار کو
☆ صبا سجاد..... دہلی

چپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو فراز
دنیا تو عرض حال پہ بے آبرو کرے
☆ امینہ مشیر..... نئی دہلی

اس سے ملے تو زعمِ تکلم کے باوجود
جو سوچ کر گئے وہی اکثر نہیں کہا
☆ فرح صادق..... لاڑکانہ

یہ شب غم گزر ہی جائے گی
صورتِ شمع دل جلایا ہے

میرے ہم دم تری خوشی کے لیے
ہر قدم پر فریب کھایا ہے
☆ شگفتہ نہال..... لاہور

جدا ہوتے ہیں بہت لوگ ایک تم بھی سہی
اب اتنی بات پہ کیا زندگی حرام کریں
☆ وجیہہ حسین..... اسلام آباد

زندگی درد کے افسانے کا دیباچہ تھی
آسمان ٹوٹ پڑا جب کوئی عنوان نکلا
☆ شمرہ حیدر..... کراچی

اب تو ہر سمت کھلے ہیں تری یادوں کے گلاب
دل کے ویرانے میں یہ بات کہاں تھی پہلے
☆ غزالہ طارق..... سرگودھا

اسے فراز اگر دکھ نہ تھا پھڑکنے کا
تو کیوں وہ دور تلک دیکھتا رہا مجھ کو
☆ نوشین اقبال..... گاؤں بدرمرجان

کل اُڑ رہے تھے ستارے ہوا کے ساتھ
اور میں اداس بیٹھا تھا اپنے خدا کے ساتھ
یا تو قبولیت کا طریقہ سکھا مجھے
یا میرے دل کو باندھ دے اپنی رضا کے ساتھ
☆ صبا نور..... لیہ

قدموں میں کائنات بھی رکھ دی گئی مگر
ہم نے تمہاری یاد کا سودا نہیں کیا
☆ راحت و فارا جیوت..... لاہور

یہ سوچ کر کہ تو کھڑکی سے جھانک لے شاید
گلی میں کھیلنے بچے لڑا دیے میں نے
☆ سعدیہ مریم نوری..... گولاپچی

عجب رسم ہے چارہ گروں کی محفل میں
لگا کے زخم نمک سے مساج کرتے ہیں
غریب شہر ترستا ہے اک نوالے کو
امیر شہر کے کتے بھی راج کرتے ہیں
☆ صدیقہ خان..... باغ آزاد کشمیر

مجھ کو مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں
میرے آنسو نے کہا مدعا میرا

☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر

یہ روشنی بھی عطا ہے تیری محبت کی
جو میری روح کے منظر مجھے دکھاتی ہے
امید وصل بھی امجد ہے کالج کی چوڑی
کہ پہننے میں کئی بار ٹوٹ جاتی ہے
☆ سامعہ تبسم..... ملتان

ایسا لگتا ہے ہر امتحان کے لیے
زندگی کو ہمارا پتا یاد ہے
☆ شائستہ..... حیدر آباد

ہم تو جکڑے ہیں آج بھی اس کے لفظوں کے جال میں
اس کے وعدے ہی کسی دھاگے کی طرح کچے نکلے
☆ سونیا رحمت..... فیصل آباد

میری روح کو پہنچے نہ رنجش کوئی
سو دو پھول قبر پہ چڑھا گیا
کی ناز برداری میری کچھ یوں
کہ وہ شمع جلتی بجھا گیا
☆ نگہت آصف..... اسلام آباد

ہمیں جو ہوش میں لائے گوزلزلہ ہی کوئی
وہ بے حسی کا نشہ ہے کہ ٹوٹا ہی نہیں
☆ عرشہ جنید..... کراچی

دکھ درد ہیں زندگی میں کیا، کیا ہدم
کس کس کا علاج تم سے ہوگا ہدم
کانٹوں کی کسک تو دور کردی تم نے
پھولوں کی کسک کا بھی مداوا ہدم
☆ ممتاز خانم..... کراچی

ملک کی تعمیر کو ہمت کا ساماں چاہیے
اک دل و جاں کیا یہاں لاکھوں دل و جاں چاہیے
سائرہ عباس..... کراچی

اگر قلب تیاں کی آرزو ہے
لپٹ جا کر کسی خونیں جگر سے
نگاہیں کیوں جمی ہیں بوالہوس پر
ملے گا کیا چراغ راہ گزر سے
☆☆☆

سندیسے



صرف ایک بات

کھیل بہت سے لوگ کھیلتے ہیں، میدان میں
بہت سے اترتے ہیں، سکندر وہی ہے جس کا مقدر
اس کے ساتھ ہے۔ بہت سوں میں سے صرف تین
لوگ جیتتے اور انعام پاتے ہیں۔ محنت کرنے والے،
ثابت قدم اور خوش قسمت۔

از: سامعہ تبسم، ملتان

چیلہ

ابلیس: ”یہ آج تمہیں اتنی ہنسی کیوں آرہی ہے؟“
چھوٹا شیطان: ”میں نے ابھی ابھی ہزاروں
ساڑیوں کے ساتھ ایک عورت کو ایک کمرے میں بند کر دیا
ہے اور لطف یہ ہے کہ کمرے میں کوئی آئینہ نہیں۔“
از: ارم کمال، فیصل آباد

سچے مذاق

لڑکی: آج تم جو بولو گے میں مانوں گی۔
لڑکا: ہر بات مانوں گی؟
لڑکی: ہاں ہر بات کچھ بھی ہو۔

لڑکا: سوچ کر کہو؟

لڑکی: ہاں، ہاں، ہاں بھی جو تم کہو۔
لڑکا: تو پھر آج کے بعد پانچ وقت کی نماز
پڑھنا، ہر لڑکا خبیث نہیں ہوتا، کچھ لڑکے میری طرح
نیک بھی ہوتے ہیں۔

☆☆☆

چھوٹے سردار جی نے اپنی مس سے پوچھا.....
مس..... کیا رات کو آپ مجھے کال کر رہی تھیں؟
مس نے جواب دیا۔ نہیں
چھوٹا سردار، کمال ہے، صبح میرے موبائل
پر لکھا تھا مس کال۔

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

سن تو سہی

زیر بنہ بن، زیر بن، کل کو پیش بھی ہوتا ہے۔
بابا بلھے شاہ

از: فائزہ شہزاد، حیات آباد

دکھ

دکھ پھڑکنے کا نہیں ہوتا بلکہ ان رشتوں کے ٹوٹنے
کا ہوتا ہے۔ جو برسوں کی رفاقت کے بعد اک پل
میں ٹوٹ جاتے ہیں اور ہم ہی دامان رہ جاتے ہیں۔

از: امینہ عندلیب، سلا نوالی

تنہائی

موسم عجب ہوسندرسندر
کول کول لمحے ہوں
ایسے کوئی بات کرے
نہ سننے کی چاہت ہو
گھنگور گھٹاؤں کے مانند
وقت ہمیں لے جائے اڑا
خاموشی ہو، مدہوشی ہو
میں اور میری تنہائی ہو

از: صبا نور، لیہ

روحانی مشورے

رمضان المبارک کا چاند دیکھ کر

☆ رمضان المبارک کا چاند دیکھ کر..... چاند رات کو 133 مرتبہ پارہ 28 سورہ جمعہ آیت نمبر 4 پڑھیے۔

ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ
نوٹ: یہ دعا پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم کر کے اپنے چہرے پر پھیریں اور پانی پر دم کر کے پی جائیں۔
☆ ماہ رمضان المبارک کا چاند دیکھ کر سورہ فتح تین مرتبہ تلاوت کیجیے۔ وسعت رزق کے لیے مجرب نسخہ ہے۔

فرمان رسول اکرم ﷺ

جس شخص نے رمضان المبارک کی آمد کی خوشی منائی اللہ تعالیٰ اسے ایک سال تک خوشیاں نصیب فرماتا ہے اور جس نے رمضان المبارک کے جانے کا غم کیا اللہ تعالیٰ اسے ایک سال تک ہر غم سے محفوظ رکھتا ہے۔

ماہ رمضان کی پہلی شب

☆ ماہ رمضان کی پہلی شب بعد نماز عشا تین مرتبہ سورہ فتح پڑھنا بہت افضل ہے۔

ماہ رمضان میں سحری کے وقت

ماہ رمضان کی پہلی سحری میں بعد نماز تہجد آسمان کی طرف منہ کر کے بارہ مرتبہ یہ دعا پڑھنا بہت افضل ہے بلکہ ہر سحری میں یہ دعا پڑھنے کا ثواب ضرور ملے گا۔ (انشاء اللہ) دعا یہ ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْحَيُّ الْقَيُّومُ
الْقَائِمُ عَلَى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ

اعمال روز و شب رمضان المبارک

اس مقدس مہینے میں ہم جتنی بھی عبادت کریں



ادارہ

وہ کم ہے۔ کوشش یہی کرنی چاہیے کہ روزانہ دو نفل توبہ کے ضرور پڑھیں..... دو نفل شکرانے کے پڑھیں..... پہلا کلمہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں پڑھیں۔ سفر کرتے ہوئے..... بستر پر لیٹے ہوئے پہلے کلمے اور تیسرے کلمے کی تسبیح پڑھ سکتی ہیں۔ رات کو سوتے وقت جب بھی آنکھ کھلے..... پہلا کلمہ پڑھنا چاہیے۔ اس کا بے حد ثواب ہے۔ درود ابراہیمی کی تسبیح بھی صبح شام پڑھیں۔ ہر جمعہ کو یاد سے صلوٰۃ تسبیح کی نماز ادا کریں۔

اللہ کے ناموں کی تسبیح بھی آپ اس ماہ میں خوب پڑھیں۔

افطار کے وقت قبولیت دعا کی ساتتیں ہوتی ہیں۔ اس وقت گھر کے سب لوگ دعا مانگیں اور اس دعا میں اپنے ساتھ بچوں کو بھی شریک کریں تاکہ شروع سے ہی ان کو یہ معلوم رہے کہ اس وقت ہم نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنی ہے۔

یوں تو خوش قسمت لوگ روزانہ ہی نماز تہجد ادا کرتے ہیں مگر ہم جیسے لوگوں کے لیے تہجد کی نماز پڑھنا اس لیے آسان ہو جاتا ہے کہ سحری میں اٹھنے کے بعد پہلے تہجد کے نفل پڑھ لیں تو یہ کام کوئی مشکل نہیں لگتا۔ سحری کر کے روزہ رکھنے کا تو ثواب ہے ہی..... مگر جو خواتین اپنے گھر کے لوگوں کو سحری بنا کر کھلاتی ہیں..... وہ دُہرے ثواب کی حقدار ہیں کہ رات کو اٹھ کر روزہ رکھوانے کے لیے ان کی کوششیں بھی رائیگاں نہیں جائیں گی..... اس لیے محبت سے، اپنے گھر کے افراد کے لیے سحری بنائیں اور احسان نہ جتائیں..... عید کی تیاری یقیناً سب نے کرنی ہوتی ہے..... لیکن خیال رکھیں کہ جاگنے والی شبوں میں عبادت کریں..... بازاروں میں ماری ماری نہ پھریں۔

سحر و افطار کی تیاری کرتے ہوئے آیات قرآنی کا ورد کرتی رہیں۔ قرآن پاک کی تلاوت ترجمے کے ساتھ بھی کرنے کی کوشش کریں..... اور اپنی زکوٰۃ پوری ادا کریں..... کہا جاتا ہے کہ جس اسلامی ملک میں اگر وہاں کے لوگ اپنی زکوٰۃ پوری ادا کریں تو وہاں کوئی بھوکا نہ لگتا..... اس کا مطلب یہی ہے کہ ہم لوگ اپنی زکوٰۃ پوری نہیں دے رہے..... اللہ تعالیٰ ہمیں نیک کاموں کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری عبادتوں اور نیک کاموں کو قبول فرمائے، آمین۔

شادی کے لیے مجرب عمل

اس سادہ سے عمل کو کر کے بہت سے لڑکوں، لڑکیوں کی شادیاں ہوئی ہیں..... اور یہ صرف رمضان المبارک کی مخصوص تاریخوں میں کیا جاتا ہے۔ گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں رمضان المبارک کی شب کو بعد نماز عشا 12 نفل پڑھنے ہیں۔ دو، دو نفل کر کے پڑھنے ہیں۔ ہر نفل میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ اخلاص 12 مرتبہ پڑھنی ہے۔ پورے بارہ نفل پڑھنے کے بعد 100 مرتبہ درود ابراہیمی پڑھ کر شادی کی دعا مانگنی ہے۔ یہ وظیفہ رمضان میں صرف تین بار کیا جاتا ہے۔ گیارہ، بارہ اور تیرہ رمضان کو۔ اللہ تعالیٰ تمام لڑکے، لڑکیوں کی خیر و عافیت کے ساتھ شادیاں ہوں اور شادیوں کے بعد بھی وہ سب خوش رہیں اور ان کی مرادیں پوری ہوں۔ اس کے لیے دو نفل شکرانے کے پڑھنے تو روزانہ لازمی ہیں۔

برائے رشتہ

جس کسی کے بیٹے یا بیٹی کا رشتہ طے نہ ہوتا ہو وہ 21 روز سورہ فرقان کی آیت نمبر 54، 313 مرتبہ پڑھے۔ روزانہ 313 مرتبہ پڑھنے کے بعد اس طرح دعا کریں۔

خود کو مر اپا ادب بنا کر انتہائی عاجزی و انکساری

روحانی مشورے

کے ساتھ اپنی بندگی اور حق تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرتے ہوئے پہلے حق تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کریں، درود تحینا پڑھیں، استغفار پڑھیں، اپنے مقصد کے لیے دعا کریں، آخر میں درود شریف پڑھ کر ختم کریں۔

نوٹ: نماز فجر یا درمیان عصر و مغرب یا نماز عشا کے بعد پڑھیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

نوٹ: دعا کرتے وقت خالص دھیان اللہ کی طرف رہے ادھر ادھر نہ رہے کیونکہ غیرت الہی یہ برداشت نہیں کرتی کہ اس کا بندہ/بندی دعا تو اس کی طرف رخ کر کے کرے اور دھیان غیر کی طرف ہو۔

دعا برائے امراض ذیابیطس

اگر کسی کی شوگر اچانک بڑھ جائے تو 41 مرتبہ یا کم سے کم 11 مرتبہ سورہ بنی اسرائیل کی یہ آیت پڑھ کر دم کر دے۔

رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مَدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مَخْرَجِ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّىْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا

اگر خدا نخواستہ بلڈ بریشر اچانک بڑھ جائے یا دل کی تکلیف ہو جائے تو اول آخر تین مرتبہ درود شریف اور گیارہ بار درود ذیل دعا پڑھ کر مریض پر دم کر دیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
حَوْلٌ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ..... يَا اللّٰهُ..... يَا رَحِيْمُ.....
بِحَقِّ رَحِيْمِ قَلْبِ مَا رَا كُنْ مُسْتَقِيْمُ
بِحَقِّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ
يَا سَلَام..... يَا قَادِر..... يَا قَدِيْر.....

اگر مریض خود نہ پڑھے اور دوسرا پڑھے تو وہ قلب مارا کن مستقیم کی جگہ قلبش کن مستقیم پڑھے گا۔ اس کے علاوہ امراض قلب کے مریض صبح شام اول و آخر درود شریف کے ساتھ 11 مرتبہ یہ آیت پڑھ کر خود پر دم کر دیں انشاء اللہ حمد قلب (ہارٹ ایکس) سے محفوظ رہیں گے۔) آیت یہ ہے۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنْكَ يَضِيْقُ

صدر ك بَمَا يَقُوْلُوْنَ۔ (الحجر 97)



ہوتا جا رہا ہے۔ برائے مہربانی کوئی دو تجویز فرمائیے جس سے میری بیٹی کا قد بڑھ سکے۔

جواب:- بی بی قد بڑھانے میں خاندانی قد و قامت کی بڑی اہمیت ہے، وہ آپ نے نہیں بتایا۔ اچھی غذا، مناسب ورزش اور ذہنی سکون بھی قد بڑھانے میں بڑے معاون ہوتے ہیں۔ فی الحال آپ Alfalfa Q کے دس قطرے ایک گھونٹ پانی میں تین مرتبہ دن میں کھانے سے آدھا گھنٹا پہلے اور Calc. Phos 30 کے 5,5 قطرے دن میں تین مرتبہ کھانے کے بعد دیں۔ یاد رہے کہ یہ ادویات ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی ہی کی لیں۔ پھر ایک ماہ بعد آکر ملیں۔ نمبر ڈائجسٹ والوں سے لے لیں۔

☆☆☆

بال، لیکوریا اور بواسیر مہوش، شجاع آباد

سوال:- میرا مسئلہ یہ ہے کہ ایک سال پہلے میرے بال گرنا شروع ہوئے تھے اور اتنے گرے کہ میرا گنج پن ظاہر ہونے لگا۔ Left Side کے سارے بال گر گئے ہیں۔ پہلے ڈاکٹر کا ٹریٹمنٹ لیا مگر کوئی خاص افادہ نہیں ہوا۔ پھر میں نے حکیم کی میڈیسن لی اس سے میرے نئے بال آگئے اور میری کافی جگہ کور ہو گئی یہ علاج کئی مہینے چلا مگر میرے بالوں کی جڑیں بہت کمزور ہیں۔ روٹ سے بال سفید ہوتے ہیں اور اوپر جا کر کالے۔ میرے بالوں کی چٹیا ایک انگلی کے برابر ہوتی ہے۔ بالوں کی گروتھ بھی کم ہے۔ پلیز اس کا کوئی حل بتائیں۔

میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے لیکوریا ہے۔

Jec 6 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ کھانے کے بعد پیئیں۔ غذا متوازن رکھیں، جلدی سوئیں اور صبح سویرے اٹھ کر چہل قدمی کیا کریں، ساتھ ساتھ نماز کی پابندی بھی کیا کریں۔

مسئلہ نمبر 2

میری بھانجی جس کی عمر 9 سال ہے۔ اس کے چہرے پر بہت زیادہ رُواں ہے۔ یہ رُواں کمر، ہاتھوں اور چہرے پر زیادہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کا قد تو عمر کے حساب سے ٹھیک ہے لیکن وزن زیادہ ہے۔ برائے مہربانی ایسی دوائیں دیں کہ اس کا وزن عمر کے لحاظ سے نارمل ہو۔ دوائیں کب تک استعمال کرنی ہیں یہ بھی بتائیں۔

جواب:- عمر کے ساتھ اگر وزن اور قد بھی لکھ دیتیں تو ہم کو بھی معلوم ہو جاتا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ بہر حال وزن کی زیادتی کے لیے مرغن غذا لیں، فرائز، برگر، پیزا نہ کھائیں۔ ٹی وی یا کمپیوٹر کے آگے ایک دو گھنٹے سے زیادہ نہ بیٹھنے دیں۔ بھاگ دوڑ والے کھیل کی طرف راغب کریں اور ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات دو ماہ تک استعمال کرائیں پھر آکر ملیں۔ Calc. Carb 30 اور Calc. Phos 30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ دیں۔

☆☆☆

قد کا مسئلہ

ایمان قمر، کراچی

سوال:- میری بیٹی کا نام ایمان ہے۔ اس کی عمر 14 سال ہے اور اس کا قد پانچ فٹ دو انچ ہے۔ وزن 35 کلو ہے۔ بھوک بہت کم لگتی ہے اور کھانا بھی بہت کم کھاتی ہے۔ اس کا چہرہ بھی خراب



From Nature.
For Health.

شوا بے
ہومیوکلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیوپیٹھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہروں تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

غیر ضروری بال

اسماء مقصود، کراچی

سوال:- میری عمر 30 سال ہے۔ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ میرے چہرے اور پورے جسم پر جہاں

ٹوکن

برائے شوا بے ہومیوکلینک

اگست 2013

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: _____

پتا: _____

نہیں ہونے چاہئیں وہاں غیر ضروری بال ہیں۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے لیکوریا کی شکایت ہے۔ جو گاڑھے سفید لیسدار رطوبت کی شکل کا ہوتا ہے۔ میرے چہرے پر چھائیاں ہیں جس کی وجہ سے چہرے پر رونق نہیں ہے۔ میں نے اب تک اس کا کوئی علاج نہیں کروایا۔ برائے مہربانی میرے مسئلے کے حل کا جواب دیں اور ان دوائیوں سے مجھے کوئی نقصان تو نہیں ہوگا کیونکہ دوائیوں سے میرے معدے میں درد ہونے لگتا ہے یہ دوائیں کتنے عرصے تک استعمال کرنی ہیں یہ بھی بتائیں۔

جواب:- آپ کیا کرتی ہیں؟ کیا کھاتی ہیں؟ گھر کا ماحول کیسا ہے؟ وزن کتنا ہے؟ خون کا ایک ٹیسٹ CBC کرا کر رپورٹ بھیج دیں۔ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات دو ماہ تک استعمال کریں پھر حال بتائیں۔ Alfalfa Q کے دس قطرے ہر کھانے سے آدھا گھنٹا پہلے لیں۔ Borax 30, Sepia 30, Oleum



ہوں امید ہے آپ شنوائی کریں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے کیرا گلے میں گرتا ہے۔ پہلے بہت زیادہ کبھی ایک طرف سے یا دونوں طرف سے ناک بند ہو جاتی تھی اب ناک تو بند نہیں ہوتی مگر کیرا مسلسل گرتا ہے۔ بہت پہلے ڈاکٹر نے آپریشن بتایا تھا جو کہ معاشی تنگی کے باعث نہیں کروا سکی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ناک کی ہڈی بڑھ گئی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ایک تو گلے میں ریشہ ہر وقت گرتا ہے اور منہ سے بہت زیادہ بدبو آتی ہے۔ منہ کا ذائقہ ہر وقت خراب رہتا ہے۔ کسی کے پاس بیٹھ کر بات نہیں کر سکتی۔ معدہ اور نظام ہاضمہ دونوں خراب رہتے ہیں۔ جسم میں خون نہیں بنتا، اعصابی کمزوری بہت زیادہ ہے۔ آپ سے التجا ہے کہ میرے لیے کوئی اچھی سی دوا لکھ دیں تاکہ میں بھی صحت مند زندگی گزار سکوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

دوسرا مسئلہ میرے بیٹے کا ہے جس کی عمر تقریباً چودہ سال ہے۔ اس کی ناک بھی کبھی ایک طرف سے یا دونوں طرف سے بند رہتی ہے۔ ریشہ گلے میں گرتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ناک کی ہڈی ٹیڑھی ہے آپریشن ہوگا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس کا قدم عمر کے لحاظ سے چھوٹا ہے اور کمزور بھی بہت زیادہ ہے۔ دانت ہر وقت صاف کرتا ہے لیکن دانت صاف نہیں ہوتے۔ رات کو سوتے ہوئے منہ سے رال بہتی ہے، منہ سے پانی آتا ہے جو کہ بدبودار ہوتا ہے۔ ساتویں جماعت میں پڑھتا ہے اور پڑھائی میں ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ میں اس کی صحت کے بارے میں ہر وقت فکر مند رہتی ہوں۔ بچے کے لیے کوئی اچھی سی دوا لکھ دیں جس

گولی لیتی ہوں اور کبھی کبھی دو بھی ہو جاتی ہیں جب جا کر کہیں ٹینڈ آتی ہے۔ دوسرا مسئلہ دن بدن بڑھتا ہوا مٹاپا ہے۔ میرا پیٹ اور کولہ ضرورت سے زیادہ بھاری ہو گئے ہیں اور سینہ کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ میں شادی شدہ ہوں اور میرے چار بچے ہیں۔ میں جاب کرتی ہوں۔ جاب پر سب لوگ موٹا ہونے کی وجہ سے مجھ کو پسند نہیں کرتے جو کہ مجھ کو اچھا نہیں لگتا۔ مجھ کو بھوک بہت لگتی ہے، کھانا کھانے کے بعد بھی بھوک لگتی ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ میرے ان مسئلوں کا کوئی حل بتائیں تاکہ میں بھی عام عورتوں کی طرح دکھائی دوں۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی۔ میرے پاؤں میں بہت درد رہتا ہے۔ ان تمام مسائل کے جواب کا انتظار کروں گی۔

جواب:- بی بی لگتا ہے کہ آپ کو ڈپریشن ہے۔ نیند نہ آنے کی وجوہات پر غور کریں۔ آپ ذہنی طور پر تھک جاتی ہیں۔ رات کو کھانے کے بعد بستر پر چلی جاتی ہیں۔ گھریلو ماحول کیسا ہے (شوہر، بچے، ساس اور آفس والے) نیند نہ آنے سے یا مناسب نیند نہ لینے سے آنکھوں کے گرد حلقے بڑھتے ہیں اور مٹاپا بھی ہو جاتا ہے۔ ڈپریشن کے مریض کھانا زیادہ کھاتے ہیں۔ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی Laikan کی ایک گولی تین مرتبہ صبح، دوپہر اور شام لیں۔ جبکہ سونے سے آدھا گھنٹا پہلے Valexan کی دو گولیاں تھوڑے پانی کے ساتھ لگیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

ناک کا مسئلہ

نوازش علی، ضلع اٹک

سوال:- آپ کے کالم میں پہلے بھی خط لکھ چکی ہوں لیکن جواب نہیں آیا۔ دوبارہ جسارت کر رہی

دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا تھا کہ گھٹنے بالکل ناکارہ ہو چکے ہیں، آپ کو آپریشن کروانا پڑے گا۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ اب اس عمر میں، میں کیا آپریشن کرواؤں۔ معلوم نہیں کہ آج ہوں کل نہیں۔ اس کے بعد ہی میں نے آپ کو خط لکھا تھا۔ آپ نے بلڈ ٹیسٹ کے لیے پوچھا وہ تو ابھی نہیں کروایا۔ مگر 2009 میں آغا خان کے ڈاکٹر نے کروایا تھا جس کی ڈپلیکٹ آپ کو بھیج دی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب آپ سے گزارش ہے کہ برائے مہربانی مجھ کو کوئی درد کی ایسی دوا لکھ دیں کہ جب زیادہ درد ہو تو میں وہ کھالوں۔ کیونکہ اب گھٹنوں کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ ایلو پیتھک کی گولیاں سائیڈ ایفکٹ کرتی ہیں اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ مجھ کو کوئی ایسی دوا لکھ دیں جس سے میرا درد کنٹرول ہو جائے۔

جواب:- ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی Calc. Carb 30, Arnica 30, Bryonia 30 ہر دوا کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں ایک ماہ تک۔

☆☆☆

نیند کا نہ آنا اور مٹاپا

صائمہ، کراچی

سوال:- ڈاکٹر صاحب میرے مسئلے تو بہت زیادہ ہیں۔ پاکیزہ میں آپ کے بہت سارے اچھے مشورے پڑھ کر میرا دل چاہا کہ میں بھی آپ سے اپنے مسائل کا حل پوچھوں۔ میں امید کرتی ہوں کہ آپ مجھے ناامید نہیں کریں گے اور مجھے شکریہ کا موقع دیں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری آنکھوں کے گرد حلقے ہیں جو ختم نہیں ہوتے اور نہ مجھ کو نیند آتی ہے جس کی وجہ سے مجھ کو گولیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ایک

میرے مینسز آتے تو صبح ٹائم پر ہیں مگر شروع ہونے سے پہلے دو دن ایسے آتے ہیں جیسے آخری دنوں میں۔ دو دن بعد نارمل شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسا کبھی ہوتا ہے۔

میرا تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بارہ سال سے Piles کی شکایت ہے۔ مستقل تو مجھے نہیں رہتی مگر جب میں بے احتیاطی کروں تو ہو جاتی ہے۔ میں اس کے لیے اسپنول کا چھلکا اور Hadensa استعمال کرتی ہوں۔ مجھے بادی اور خونی بوا سیر دونوں ہوتی ہیں۔

جواب:- آپ کے احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ غذائی قلت کا شکار رہتی ہیں۔ اسی لیے یہ سب مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ سر کے بال گرنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں جن کا دیکھ کر ہی تعین کیا جاسکتا ہے۔ لیکوریا کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے (لیکوریا کا رنگ، خارش اور جلن کب زیادتی ہوتی ہے لکھیں) بوا سیر کی عمومی وجہ قبض ہوتی ہے۔ اس لیے پہلے تو متوازن غذا استعمال کریں اور ایک ماہ تک ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔

Natr. Mur 30, Acid Phos 30, Kreosote 30, Hamamelis 30 ہر دوا کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر تین مرتبہ دن میں استعمال کریں۔

☆☆☆

گھٹنوں کا درد

جمیلہ بیگم، کراچی

سوال:- ڈاکٹر صاحب آپ نے پاکیزہ ڈائجسٹ کے ذریعے مجھ کو جواب دیا تھا۔ عرض یہ ہے کہ گھٹنوں کا ابھی ایکس رے کروایا تھا۔ اس کو

ہی بلڈ پریشر کی شکایت ہے۔ لیکن گردن کو دائیں بائیں موڑنے سے گردن کے پٹھوں میں کھنچاؤ محسوس ہوتا ہے۔ میں روزانہ رات دس بجے سوتا ہوں اور صبح چار بجے تہجد کی نماز کے لیے اٹھتا ہوں۔ اس کے علاوہ فجر کی نماز کے بعد پارک میں چہل قدمی کرتا ہوں۔ مہربانی فرما کر میرے لیے کوئی ہومیو پیتھک ادویات تجویز فرمادیں تاکہ میری داڑھی اور سر کے بال گرنے بند ہو جائیں اور ان بالوں کی گروتھ بھی دوبارہ شروع ہو جائے۔ بال گرنے کی وجوہات کیا ہیں؟ پریہیز اور خوراک کے بارے میں بھی تحریر فرمائیں۔ شکریہ۔

جواب:- بالوں کے گرنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں جن میں سے کچھ وجوہات جو آپ میں ہو سکتی ہیں مثلاً بالوں تک خون کا نہ پہنچنا جس سے ان میں غذا کی کمی ہو سکتی ہے۔ کسی کلر یا تیل کا استعمال جو آپ کی جلد پر کسی جلدی بیماری کا سبب بنے مثلاً ایگزیم وغیرہ۔ متوازن خوراک کا استعمال کریں۔ کیمیکل والی چیزوں کا استعمال اندرونی و بیرونی بالکل نہ کریں۔ Calendula Q کے 20 قطرے تھوڑے سے پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ داڑھی کو دھویا کریں اور جب نہائیں تو سر کو بھی دھوئیں۔ 200 Bacillinum کی صرف ایک خوراک پہلے لے کر اس کے دوسرے دن سے 30 Rhustox اور 30 Graphites کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ لیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ واضح رہے کہ یہ تمام ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی ہی کی ہوں۔

سے اس کی ناک بھی ٹھیک ہو جائے اور اس کے قد میں بھی اضافہ ہو جائے۔ ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گی۔

جواب:- ہمیں جب بھی کوئی خط ملتا ہے ہم اس کا جواب ضرور دیتے ہیں۔ لیٹ بے شک ہو جاتا ہے لیکن جواب اس کا ضرور دیا جاتا ہے۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Merc. sol Teucrium Mar 30, Nux Vomica 30 کے 5,5 قطرے ہر کھانے کے بعد آدھا کپ پانی میں ڈال کر استعمال کریں اور ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

بیٹے کے لیے بھی 30 Merc. sol Staphysagria 30, Teucrium 30, Baryta Carb 30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں اور ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ یاد رکھیں یہ تمام ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی ہی کی ہوں۔

☆☆☆

سر اور داڑھی کے بالوں کا گرنا

سید محبوب علی شاہ، لاہور

سوال:- میری داڑھی کے بال جڑ سمیت اور ٹکڑوں کی شکل میں گرتے ہیں۔ فوٹو میں داڑھی لمبی ہے لیکن اب اس سے بھی آدھی رہ گئی ہے اور داڑھی کے بال مزید گر رہے ہیں۔ مذکورہ بیماری عرصہ ایک سال سے ہے اس کا ہومیو پیتھک علاج کروایا لیکن کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا۔ داڑھی اور سر کے بالوں کی گروتھ بھی رک گئی ہے۔ مجھے نہ تو کوئی شوگر ہے اور نہ



Dr. Willmar Schwabe, Germany.

Available at All Leading Medical & Homoeopathic Stores